عشقِ آتش
سعدیہ راجپوت
پاک سوسائٹی

پیش لفظ

قارئین السلام علیکم!

''زندگی میں کم از کم ایک بار تو سبھی پیار کرتے ہیں۔'' یہ ایک معارف جملہ ہے، جس کی سچائی سے مجھے کوئی بحث نہیں۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ ایک جملہ ایسا بھی ہے جو سو فیصد سچ ہے لیکن اسے زبان پر لاتے ہوئے سب ہی گھبراتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ یہ جملہ اعتراف ہے غلطیوں اور کوتاہیوں کا......
ان غلطیوں اور کوتاہیوں کا، جن کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب انہیں درست کرنے کا وقت بھی گزر چکا ہوتا ہے۔ وہ جملہ ہے...... ''زندگی میں کم از کم ایک بار تو سبھی پچھتاتے ہیں۔'' یہ سچ ہے کہ ہم سب ہی پچھتاتے ہیں۔ کبھی کسی جلد بازی پر، کبھی کسی تاخیر پر، کبھی کسی کم ہمتی پر، کبھی بے جا دلیری پر، کبھی کسی فیصلے پر، کبھی کسی مصلحت پر۔ اور کبھی تو پچھلی گزر چکی تمام عمر پر۔ کبھی یہ پچھتاوا محض پل بھر کا احساس ہوتا ہے اور کہیں یہ باقی ماندہ زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔

انسان خطا کا پُتلا ہے، اس لئے پچھتانا اس کا مقدر ہے۔ جو کبھی نہیں پچھتاتے وہ یا تو بدنصیب ہیں جنہیں شعور کی وہ ذرا سی گہرائی بھی میسر نہیں جو چلّو بھر پانی میں ہوتی ہے یا پھر وہ خوش نصیب ہیں جنہیں توازن حاصل ہے۔ اور توازن قائم رکھنا آسان نہیں۔ اگر آسان ہوتا تو کوئی کبھی پل صراط سے گزارا نہ جاتا۔

اس خیال کو بیان کرنے کے لئے میں نے عشق کا سہارا اس لئے لیا کہ عشق حقیقی ہو یا مجازی، یکلخت رونما ہونے والی تبدیلیوں سے مشروط ہے۔ اس سرکش جذبے کے پاؤں جہاں پڑ جائیں، وہاں چیزوں کا اپنی جگہ سے سرکنا لازم ہے۔ اگر یوں نہ ہو تو جان لیں وہ جذبہ عشق نہیں، کچھ اور ہے۔ اور ہر شے کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا قیامت کی نشانی ہے۔ کیونکہ جب ایک سسٹم میں موجود چیزیں اچانک اپنی جگہ

چھوڑ دیں گی تو ٹکراؤ unavoidable ہوگا۔ مطلب تباہی یقینی ہے۔ کڑے توازن کے سوا کوئی چیز ٹکراؤ کو روک نہیں سکتی۔ یعنی ایک ٹھہرا ہوا وجود مضطرب ہو جائے مگر اس احتیاط سے کہ اس کا اضطراب اردگرد کی چیزوں کے اضطراب میں خلل نہ ڈالے۔ ساکن کا توازن کمال نہیں، مضطرب کا توازن کمال ہے اور حقیقی امتحان بھی۔

''عشق آتش'' کے کچھ کردار آپ کو توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے نظر آئیں گے تو کچھ کردار ٹکراؤ کے نتیجے میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے ہوئے ملیں گے۔ اور کچھ کردار ایسے بھی ہوں گے جنہیں آخر کار پچھتاوے جکڑ لیں گے۔

میں القریش پبلی کیشنز کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے ''عشق آتش'' کو کتابی شکل میں آپ تک پہنچایا۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں کرن ڈائجسٹ کی بھی مشکور ہوں کیونکہ اس کتاب کے مرتب ہونے کی نوبت ہی نہ آتی اگر کرن ڈائجسٹ اس ناول کو قسط وار شائع نہ کرتا۔ آخر میں دعاؤں کی درخواست ہے۔ خدا حافظ!

سعدیہ راجپوت

کون کہتا ہے زندگی سمجھی اور سمجھائی نہیں جا سکتی۔ جبکہ مردہ جسموں سے بھرے قبرستان قدرت کی یونیورسٹیز ہیں اور دو گز زمین تلے دبا ہر شخص زندگی کا پروفیسر۔

تو پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم پیدا ہوتے ہیں، مر جاتے ہیں پر جی نہیں پاتے کہ ہم نے تو بس وقت کو جینا سیکھا ہے۔ زندگی کو تو ہم نے کبھی جیا ہی نہیں اور جب یہی وقت ہمارے پاس ختم ہو جاتا ہے تو سوچتے ہیں کہ ہم جو عمر بھر وقت کے کتابچے میں نفع و نقصان درج کرتے رہے تو وہ کون سا پیمانہ تھا جو اس ناپ تول کے کام آیا؟ اور کیا کوئی ایسا فارمولا بھی ہے جو بتا سکے کہ نفع فائدے کے سوا کچھ بھی نہیں اور نقصان تو بس نقصان ہی دے سکتا ہے۔ جبکہ سچ تو یہ ہے کہ زندگی نفع دیتی ہی کب ہے؟ یہ تو سودا ہی گھاٹے کا ہے۔ ہم تو عدم میں بہت آرام سے تھے پھر اس زندگی کے ہاتھوں وجود میں بدل کر اس متضاد دنیا میں آئے یعنی آزمائش میں ڈالے گئے اور آزمائش میں نہ تو منافع کی امید ہوتی ہے اور نہ نقصان کی۔ مگر حیرت ہے پھر بھی ہم خسارے کی فہرست مرتب کرتے رہے۔

زندگی کو تو جیسا گزرنا تھا، ویسے ہی گزر جاتی...... کم از کم وقتِ رخصت یہ خلش تو نہ ہوتی کہ ہم نے جو نقصان کا کھاتہ بند کر دیا ہوتا تو شاید زندگی کچھ سہل ہو جاتی۔ مگر ہم سمجھتے ہی نہیں اور وقت ہے کہ ختم ہوتا جاتا ہے۔ کبھی دوسرے کا تو کبھی ہمارا...... صدیوں سے یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ ہم آتے ہیں...... سیدھے راستوں کو خود اپنے لئے پیچیدہ بناتے ہیں اور یہ کہتے گزر جاتے ہیں۔

اب جو دیکھیں تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی
یہ شب و روز، ماہ و سال کا پُر پیچ سفر
قدرے آسان بھی ہو سکتا تھا
ہم ذرا دھیان سے چلتے تو وہ گھر
جس کے در و بام پہ ویرانی ہے
جس کے ہر طاق پہ رکھی ہوئی حیرانی ہے

جس کی ہر صبح میں شاموں کی پریشانی ہے
اس میں ہم چین سے آباد بھی ہو سکتے تھے
اب جو دیکھیں تو بہت صاف نظر آتے ہیں
سارے منظر بھی، پس منظر بھی
لیکن اس دیر خیالی کا صلہ کیا ہوگا
وہ جو ہونا تھا ہوا، ہو بھی چکا
لائنیں کٹتی رہیں، لفظ بدلنے کے سبب
حاصل عمر یہی چند ادھورے خاکے
کوئی تصویر مکمل نہیں ہونے پائی

ملیحہ فاروقی 26 مئی 1977ء

❁❁❁

وہ ہاتھ میں بکے پکڑے اجنبی چہروں کے درمیان کسی شناسا چہرے کو ڈھونڈ رہی تھی کہ کسی نے اس کا نام پکارا۔ ''تانیہ!''

وہ مڑی اور آواز کی ست دیکھ کر جوش سے ہاتھ ہلایا۔

''فائزہ!'' دونوں نے ایک دوسرے کی سمت قدم بڑھائے اور قریب آنے پر گلے لگ گئیں۔

''بھائی کی انگیج منٹ مبارک ہو۔'' تانیہ نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

''تھینکس۔'' فائزہ نے مسکرا کر مبارکباد قبول کی۔

''چلو تمہیں اپنی ہونے والی بھابی سے ملواؤں۔'' پھر تانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج پر چڑھ گئی۔ تانیہ نے فائزہ کے بھائی کو وِش کر کے اس کے ساتھ بیٹھی سجی سنوری اور کچھ شرمائی سی لڑکی کو بکے پیش کیا اور پھر چند جملوں کے تبادلے کے بعد فائزہ کے ساتھ ہی اسٹیج سے اُتر گئی۔

''تمہاری ممی نظر نہیں آرہیں۔''

''ابھی تو یہیں تھیں۔'' فائزہ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا پھر تانیہ کو لئے آگے بڑھ گئی۔

''سنو!'' تانیہ نے اسے مخاطب کیا جو چلتے چلتے رک کر مہمانوں سے حال احوال بھی دریافت کرتی جا رہی تھی۔

''ہوں۔'' فائزہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''وہ نہیں آیا؟''

''کون؟......کس کی بات کر رہی ہو؟'' وہ مسکراہٹ دبا کر انجان بنتے ہوئے بولی۔

''تمہارے کزن کی۔'' تانیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ فائزہ مستقل شرارت کے موڈ میں تھی۔

''میرے تو سبھی کزن یہاں ہیں۔'' فائزہ کی لاپروائی عروج پر تھی۔

''میں شایان کا پوچھ رہی ہوں۔'' بالآخر تانیہ نے چڑ کر کہا۔

''اچھا تو یوں کہو نا۔'' اس کے بن کر بولنے پر تانیہ نے اسے ہاتھ جڑ دیا۔

''مار کیوں رہی ہو؟...... بس آتا ہی ہوگا۔ ویسے بھی اس کی پولیس ٹریننگ ہی ختم ہوئی ہے، ابھی پوسٹنگ کے آرڈرز نہیں آئے۔ اور ایسے فارغ بندے کے لئے دعوت اُڑانے سے اچھی کیا مصروفیت ہو سکتی ہے؟''

بات ختم کرتے ہی وہ پیچھے ہٹی کہیں تانیہ، شایان کی حمایت میں اسے ایک تھپڑ اور نہ جڑ دے۔ تانیہ نے اسے گھورا مگر پھر قصداً نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایک بات تو بتاؤ۔''

''پوچھو۔'' صورتِ حال قابو میں دیکھ کر فائزہ اس کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

''شایان کس رشتے سے تمہارا کزن ہے؟''

''اصل میں میری ممی، شایان کی مدر کی کزن ہیں۔''

''اچھا۔'' سر ہلاتے ہوئے تانیہ نے سامنے دیکھا تو اس کی نظر ڈنر سوٹ میں ملبوس شایان کے دراز قامت وجود پر پڑی۔ اس نے فائزہ کو پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

''شایان آ گیا۔''

''شکر ہے۔ نہیں تو تم مجھے مار ڈالتیں۔''

''بکو مت۔'' تانیہ نے شایان کو دیکھتے ہوئے اسے ڈانٹا جو سیدھا ان ہی کی طرف آ رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' وہ پاس آ کر بولا۔

''تمہارے آنے کی خوشی میں تانیہ میرا گلا دبانے والی ہے۔'' فائزہ بے چارگی سے بولی۔ شایان نے پہلے اس کی شکل دیکھی پھر تانیہ کی جس کے دونوں ہاتھ پیچھے سے فائزہ کے شانوں پر تھے۔ تانیہ نے بدک کر اپنے ہاتھ ہٹائے اور زور سے اسے دھکا دے کر بولی۔

''دفع ہو جاؤ۔''

''ہاں ہو رہی ہوں۔ ویسے بھی تم جیسے کبابوں کی ہڈی بننے میں اپنا ہی نقصان ہے۔ اور ہاں۔'' جاتے جاتے وہ بولی۔ ''یہاں سے ہلنا مت۔ میں ممی کو لے کر آتی ہوں۔''

وہ چلی گئی تو شایان نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا۔ ''کیا تم واقعی اس کو مار رہی تھیں؟''

''بے کار کی باتیں مت کرو۔'' تانیہ برا منا کر بولی۔ ''تمہیں نہیں پتہ، اسے ایکٹنگ کرنے کا کتنا شوق ہے۔''

''تانیہ!'' کچھ پل کی خاموشی کے بعد شایان نے اسے پکارا تو وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ ''ایک بات کہوں؟''

''کہو۔'' شولڈر کٹ بالوں کو چہرے سے ہٹا کر وہ سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی تو وہ دھیرے سے مسکرا کر بولا۔

''پہلی بار تمہیں یوں سجے سنورے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ اچھی لگ رہی ہو۔''

وہ پزل ہو گئی۔ واقعی وہ ہمیشہ بہت سادہ سے حلیے میں رہا کرتی تھی۔ اپنی طرف سے خاصی لاپروا۔ لیکن آج خلافِ معمول ہلکی ایمبرائیڈری کے شیفون کے شلوار قمیض میں دوپٹہ کندھوں پر ڈالے ہلکے میک اپ کے ساتھ میچنگ جیولری پہنے کافی مختلف لگ رہی تھی۔ اور تو اور آج بال بھی بینڈ کی قید سے آزاد شانوں پر لہرا رہے تھے۔ شایان کے اس قدرے ڈائریکٹ جملے پر حالانکہ وہ بس ایک پل کو ہی گڑبڑائی تھی، پھر بھی محظوظ سی ہنسی ہنس کر تانیہ نے خفگی سے اس کی سمت دیکھا۔

''کیا یہی کہنا تھا؟'' وہ فوراً بولی۔

''نہیں۔ کہنا تو کچھ اور ہے۔ پر سوچا تمہاری تھوڑی سی تعریف کر دوں۔ سنا ہے لڑکیوں کو اپنی تعریف بہت اچھی لگتی ہے۔ پھر ان سے جو بھی کہا جائے وہ فوراً مان جاتی ہیں۔''

''تم کیا منوانا چاہتے ہو؟'' شایان کی بات سے قیاس لگا کر اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ کچھ بھی کہنے سے پہلے وہ کچھ پل چپ رہا جیسے الفاظ ترتیب دے رہا ہو۔ پھر دھیرے دھیرے بولنے لگا۔

''تانیہ! میں نہیں جانتا، میں نے کب اس طرح سے سوچنا شروع کیا مگر یہ بات میرے دل میں بہت عرصے سے تھی۔ بس کبھی کہا نہیں۔ سوچا مناسب وقت آنے پر تم سے کہوں گا۔'' کچھ لمحے خاموشی سے سرک گئے۔ ''وقت پتہ نہیں مناسب ہے یا نہیں مگر میں اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔'' اپنی بات کے آخر میں اس نے تانیہ کی طرف دیکھا جو ایک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ شایان کا گمبھیر لہجہ، سحر زدہ الفاظ اور آنکھوں کا والہانہ پن۔ تانیہ کو لگا، شایان آج وہ سب کہہ دے گا جسے سننے کی خواہش تین سال سے اس کے دل میں تھی۔

''تانیہ! میں تم سے......''

''ایکسکیوز می پلیز۔'' فائزہ کی تیز آواز سے طلسم ٹوٹ گیا اور وہ دونوں چونک کر اس کی طرف مڑے جو قدرے بھاری جسامت والے مگر گریس فل مرد کا ہاتھ پکڑے ان کی طرف آتی دُور سے ہی چلّائی تھی۔

''ممی تو بزی ہیں، مگر دیکھو میں پاپا کو لے آئی ہوں۔'' وہ بولتے ہوئے ان کے پاس آ کر رکی، پھر تعارف کرانے لگی۔

''تانیہ! ان سے ملو۔ یہ میرے پاپا ہیں۔''

پھر تانیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور پاپا! یہ میری بیسٹ فرینڈ تانیہ فاروقی۔ موسٹ ایلیجبل بزنس مین نورالہدیٰ فاروقی کی بیٹی۔ ہم دونوں ایم بی اے کلاسز میں ساتھ ساتھ تھے۔'' فائزہ کی بات پر وہ بری طرح چونکے۔

''تم نورالہدیٰ کی بیٹی ہو؟''

''جی۔''

نورالہدیٰ فاروقی ایک مشہور شخصیت تھے اور اکثر تانیہ کے بتانے پر ان کے حوالے پر لوگ چونک کر یہ سوال کرتے تھے، اس لئے تانیہ نے کچھ خاص نوٹس نہ لیا۔

''کیا آپ میرے پاپا کو جانتے ہیں؟''

''انہیں کون نہیں جانتا؟'' اب وہ سنبھل کر بول رہے تھے۔ ''ہی از دا لیڈنگ انڈسٹریلسٹ آف دا کنٹری۔ اور لاسٹ وِیک بزنس میگزین میں جواُن کا انٹرویو چھپا تھا، کمال کا تھا۔ وہ بہت سے لوگوں کے لئے انسپریشن ہیں۔ اینی وے ایم بی اے تو کمپلیٹ ہو گیا، اب کیا کر رہی ہو؟''

اپنے پاپا کی تعریف پر اسے فطری طور پر خوشی ہو رہی تھی۔ ان کی بات کے جواب میں وہ مسکرا کر بولی۔

''پاپا کا آفس جوائن کرلیا ہے۔''

''گڈ۔'' وہ خوش دلی سے بولے۔

''او کے بیٹا! مجھے کچھ اور مہمانوں کو بھی وقت دینا ہے۔ تم لوگ انجوائے کرو۔'' وہ ناقابلِ فہم انداز میں مسکراتے ہوئے چلے گئے تو تانیہ کو یک دم سے شایان کا خیال آیا۔ وہ پلٹی، مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے نظریں دوڑائیں مگر شایان کہیں نظر نہیں آیا۔

''کیا بات ہے؟'' فائزہ نے اسے کچھ ڈھونڈتے پا کر پوچھا۔

''شایان ابھی تو یہیں تھا۔ کہاں چلا گیا؟''

''ارے ہاں۔ یہ اچانک کہاں غائب ہو گیا؟''

تانیہ اُس کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے شایان کی تلاش میں گیٹ تک آئی تو اس نے شایان کو ہال سے باہر جاتے دیکھا۔

''شایان! بات سنو۔'' وہ بے ساختہ پکاری مگر شایان نے جیسے سنا ہی نہ ہو اور باہر نکلتا چلا گیا۔ تانیہ اس کے پیچھے لپکی مگر جب وہ باہر آئی، شایان اپنی بائیک پر بیٹھ کر جا چکا تھا۔ اس خیال نے تانیہ کو آزردہ کر دیا کہ وہ کچھ کہے بغیر ہی چلا گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اندھیرے میں بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

✿✿✿

وہ کب سے شایان کے موبائل پر کال کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر دوسری طرف فون بند تھا۔

''آجاؤ۔'' دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس نے بلند آواز میں بے زاری سے کہا اور پھر سے موبائل پر

نمبر ملائے۔

"جی ماما!" دروازہ کھول کر اپنی ماما کو اندر آتے دیکھ کر اس نے موبائل نیچے کر دیا۔

"دو بار خدیجہ کو تمہیں بلانے کے لئے بھیج چکی ہوں۔ آ کر کھانا تو کھالو تانیہ!" انہوں نے اسے سرزنش کی۔

"آپ چلیں۔ میں بس تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔" وہ زِچ ہو رہی تھی۔ آخر شایان نے موبائل آف کیوں کیا ہے؟

"جب سے آفس سے آئی ہو، فون سے چپک کر بیٹھی ہو۔ آخر کس کو فون کر رہی ہو؟"

"ایک دوست کو، جس ایڈیٹ نے پرسوں سے اپنا موبائل بند رکھا ہوا ہے اور میں اس سے بھی بڑی ایڈیٹ ہوں جو بار بار اس کا نمبر ٹرائی کر رہی ہوں۔" موبائل سے نظر ہٹائے بغیر تانیہ نے کہا اور دوبارہ نمبر ڈائل کرنے لگی تو ماما نے آگے بڑھ کر موبائل اس کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"فون بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ اب چلو تمہارے پاپا انتظار کر رہے ہیں۔"

"پاپا آ گئے؟" وہ گود میں رکھا تکیہ بیڈ پر رکھ کر اُٹھ گئی۔

"ہاں۔ اور تم پانچ منٹ میں نیچے آ جاؤ۔ ورنہ میں تمہارے پاپا کو بھیجتی ہوں۔" وہ دھمکی آمیز انداز میں کہہ کر کمرے سے چلی گئیں تو تانیہ نے بھی فٹافٹ منہ ہاتھ دھویا اور بال کلپ میں جکڑ کر نیچے ڈائننگ روم میں آ گئی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے نورالہدیٰ سے کہا۔

"کیا بات ہے پاپا! آج آپ نو بجے ہی گھر پر نظر آ رہے ہیں۔"

"بس بیٹا! گھڑی نے دھوکا دے دیا۔ ورنہ میں تو بارہ بجنے کے بعد ہی گھر آیا تھا۔ شاید اٹک گئی ہے۔" تانیہ کے شرارتی انداز میں پوچھنے پر وہ سنجیدگی سے بولتے ہوئے آخر میں یوں انگلی سے کلائی پر بندھی گھڑی کو ٹھونکنے لگے جیسے گھڑی واقعی اٹک گئی ہو۔ ٹیبل پر اپنی نگرانی میں کھانا لگواتیں مریم فاروقی نے ان کی بات سنتی تو ان کے مذاق کو سمجھ کر خفگی سے بولیں۔

"کیوں؟ بارہ بجے سے پہلے گھر آنے پر پابندی ہے؟" مزے سے ہنستی تانیہ نے ایک دم منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی اور محظوظ انداز میں نورالہدیٰ کی طرف دیکھنے لگی جو پہلے جیسی سنجیدگی سے بولے۔

"نہیں۔ لیکن پابندی تو بارہ بجے کے بعد آنے پر بھی نہیں ہے۔" تانیہ کی ہنسی چھوٹ گئی تو مریم سلگ کر زور سے بولیں۔

"بہادر! پانی اب تک ٹیبل پر نہیں پہنچا۔" تانیہ نے ان کے غصے کو محسوس کر کے کہا۔

"بس پاپا! اب خیریت اسی میں ہے کہ چپ کر کے کھانا کھا لیں ورنہ آپ کو ماما سے زبردست ڈانٹ پڑ سکتی ہے۔"

"مشورہ تو بہت اچھا ہے تانیہ! پر بات یہ ہے کہ تمہاری ماما کو مجھے ڈانٹنا پسند ہے اور مجھے ان سے ڈانٹ سننا۔"

''نورالہدیٰ! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' ان کے تنبیہی انداز میں ٹوکنے پر نورالہدیٰ نے بڑی فرماں برداری سے سامنے رکھی پلیٹ میں سالن ڈالا اور چپاتیوں کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''تمہارے صاحبزادے نظر نہیں آ رہے۔ کہاں ہیں؟''

''وہاں۔'' مریم نے سامنے رکھے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا، جس پر پاکستان انڈیا کرکٹ میچ لائیو ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ نورالہدیٰ اور تانیہ نے ایک ساتھ ٹی وی کی طرف دیکھا اور تانیہ حیرت سے بولی۔

''ٹی وی میں؟''

''ٹی وی میں نہیں اسٹیڈیم میں۔ دوستوں کے ساتھ میچ دیکھنے گئے ہیں۔'' جواب دے کر وہ تانیہ کی پلیٹ میں سالن نکالنے لگیں جس کی پلیٹ اب تک خالی تھی۔

''دادا جان بھی ساتھ گئے ہیں؟'' تانیہ نے پوچھا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ آج پھر ڈپریشن کا دورہ پڑا ہے۔ صبح سے دروازہ بند کر کے بیٹھے ہیں۔ کتنی بار ان کا دروازہ بجا چکی ہوں مگر وہ کوئی جواب ہی نہیں دے رہے۔'' دادا جان کے اس طرزِ عمل کے سبھی عادی تھے اور اب تو کوئی کنونس بھی نہیں کرتا تھا۔ مریم نے بنا کسی تشویش کے اطلاع دی اور اپنی پلیٹ میں کھانا نکال کر کھانے لگیں۔ نورالہدیٰ بھی کسی تاثر کے بغیر کھانا کھا رہے تھے لیکن تانیہ نے سامنے رکھے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

''پتہ نہیں دادا جان کو ایک دم سے کیا ہو جاتا ہے؟ کیوں خود کو کمرے میں بند کر لیتے ہیں؟ پھر اگلے کئی دنوں تک انہیں کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ پاپا! آپ کو پتہ ہے دادا جان ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' افسردگی سے خود کلامی کرتے ہوئے آخر وہ نورالہدیٰ سے پوچھنے لگی۔ کھانا کھاتے ہوئے ایک پل کو نورالہدیٰ کا ہاتھ رُکا، پھر وہ تلخی سے بولے۔

''ہوں گے عمرِ رفتہ کے کچھ زخم جو بے کل کرتے ہوں گے۔ اس عمر میں یوں بھی آدمی کے پاس پچھتانے کے لئے بہت کچھ ہوتا ہے۔'' تانیہ کو ان کا انداز اور ان کی بات دونوں ہی ناگوار گزرے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں دادا جان کو لے کر آتی ہوں۔ انہوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔'' پھر کسی کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

لاؤنج میں دائیں اور اور بائیں دونوں جانب سیڑھیاں تھیں۔ دائیں طرف کی سیڑھیاں اوپر منزل کے کاریڈور سے جڑی تھیں جبکہ بائیں جانب کی سیڑھیاں بیسمنٹ میں جاتی تھیں جہاں اسٹڈی سے ملحق کشادہ لائبریری تھی۔ بیسمنٹ کی انہی سیڑھیوں کے ایک جانب اظہر فاروقی کا کمرہ تھا۔ تانیہ کی کئی بار کی دستکوں کے بعد بھی اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

''دروازہ کھولئے دادا جان!''

مگر اندر ہنوز خاموشی کا راج تھا۔

''میں آپ کو لینے آئی ہوں اور لئے بغیر نہیں جاؤں گی۔''

جواب ندارد۔

''ٹھیک ہے، آپ کو دروازہ نہیں کھولنا تو نہ کھولیں۔ میں بھی یہیں دروازے کے پاس ہی بیٹھی رہوں گی۔''

اور پھر وہ سچ مچ دروازے کے پاس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اگلے کچھ اور پلوں کی خاموشی کے بعد ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ تانیہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو اظہر فاروقی ذرا سا دروازہ کھول کر چہرہ باہر نکالے اسے دیکھ رہے تھے۔

''اندر آ جاؤ۔'' اتنا کہہ کر وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر واپس مڑ گئے۔ تانیہ اُٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔

''بیٹھو۔'' انہوں نے تانیہ سے بیٹھنے کو کہا تو تانیہ کو محسوس ہوا جیسے ان کی آواز رُندھی ہوئی ہے۔ ان کے چہرے پر بھی آنسوؤں کے نشان تھے۔ آنکھیں جھکا رکھی تھیں۔ پھر بھی تانیہ کو اندازہ تھا کہ وہ سرخ ہو رہی ہوں گی۔

ہر بار کی قیدِ تنہائی کے بعد ان کی حالت ایسے ہی دگرگوں ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی تانیہ کو عجیب لگا۔ وہ ریٹائرڈ کرنل تھے اور ان کی بارعب شخصیت سے جاہ پسندی ٹپکتی تھی۔ ستتر برس کی عمر میں بھی ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔ کچھ سالوں سے بلڈ پریشر کے مسئلے کے سوا ان کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ البتہ عمر کی زیادتی کی وجہ سے ان کے شانے قدرے جھک گئے تھے مگر ان کے رعب، دبدبے اور شخصیت سے یکسر مختلف تانیہ نے ہمیشہ انہیں نرم مزاج ہی پایا تھا۔ ان کی کڑکڑاتی بھاری آواز تانیہ نے ہمیشہ سرگوشیوں جیسی دھیمی ہی سنی تھی۔ گو ملال کی ایک مستقل کیفیت ان کے سرخ و سفید چہرے کی مکین تھی پھر بھی تانیہ کو وہ چٹان کی طرح مضبوط لگا کرتے تھے۔ مگر اس وقت تو وہ بے حد کمزور اور شکستہ دکھائی دے رہے تھے۔ تانیہ دل ہی دل میں اُلجھتی بیڈ کے کونے پر ٹِک گئی۔ وہ آہستہ خرامی سے چلتے آتش دان کے پاس کرسی کے ساتھ رکھی تپائی تک آئے۔ اس پر کھلی پڑی ریڈ کور کی ڈائری اٹھائی اور اسی طرح چلتے اسٹڈی ٹیبل تک آ گئے۔ ڈائری کو دراز میں رکھ کر دراز کو لاک کیا اور چابی ہاتھ میں لے لی پھر تانیہ کو مخاطب کئے بغیر کہا۔

''میں فریش ہو کر آتا ہوں۔'' اور کمرے میں بنے اٹیچڈ باتھ روم میں چلے گئے۔ تانیہ نے غیر دلچسپی سے یہاں وہاں سر گھمایا، پھر ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر آتش دان کے اوپر لگی تصویر کو دیکھنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد اظہر فاروقی باتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئے۔

''آؤ چلیں۔'' انہوں نے کہا۔ تانیہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ساتھ ساتھ دونوں کو ڈائننگ روم کے دروازے سے آتا دیکھ کر نورالہدیٰ کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ وہیں

رک گیا۔ انہوں نے نوالہ پلیٹ میں رکھا اور عجیب سی نظروں سے اظہر فاروقی کو دیکھنے لگے۔ کرسی کھینچ کر انہیں بٹھاتے ہوئے تانیہ نے اپنے پاپا کو دیکھا تو ٹھٹک گئی۔ دوسری طرف نورالہدیٰ نے اس کی نگاہوں کو محسوس کر کے آنکھیں جھکاتے ہوئے پلیٹ سے نوالہ اٹھا کر منہ میں رکھا مگر اسے نگلنے کے لئے انہیں پانی کا سہارا لینا پڑا تھا۔ تانیہ قصداً انہیں نظرانداز کر کے خود بھی بیٹھ گئی۔ اظہر فاروقی کی پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے اٹھلاتے ہوئے مریم سے کہا۔

''دیکھا ماما! میں نے کہا تو دادا جان فوراً آ گئے۔ دادا جان کبھی میری بات ٹال ہی نہیں سکتے۔''

''پر جس کی ماننی چاہئے تھی، اس کی تو انہوں نے کبھی نہیں مانی۔'' نورالہدیٰ کے لہجے کی ترشی کو دونوں ماں بیٹی نے محسوس کیا تھا مگر اس گھر کے غیر اعلانیہ قوانین میں ایک قانون یہ بھی تھا کہ ان باپ بیٹے کے معاملے میں کوئی بھی نہیں بولے گا سو وہ دونوں تو خاموش رہیں۔

مگر دادا جان کے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس چھلک پڑا تھا۔ تانیہ نے فوراً ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اظہر فاروقی کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں سونے کے لئے آئی تو موبائل دیکھ کر اسے شایان کا خیال آیا۔ بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے شایان کو فون کیا مگر اس کا سیل فون حسبِ سابق بند تھا۔

''بس بہت ہو گیا۔ اب دوبارہ ٹرائی نہیں کروں گی۔'' اس نے موبائل تکیے پر پٹخا اور دھپ سے لیٹ گئی۔ پر صبح سب کچھ بھلائے وہ پھر سے شان کا نمبر ٹرائی کرتی رہی۔

❁❁❁

''فائزہ پلیز! میں پریشان ہو گئی ہوں۔ پہلے تو اس نے فون بند کر رکھا تھا اور اب کال تو جاتی ہے مگر وہ فون نہیں اٹھا رہا۔''

''ایک تو تانیہ! تم نا ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہو۔''

''یہ ذرا سی بات ہے؟'' وہ بھڑک گئی۔ ''پچھلے دو ہفتوں سے میں پاگلوں کی طرح اسے کال ملا رہی ہوں اور وہ جناب فون ہی نہیں اٹھا رہے۔''

''بھئی ہو سکتا ہے وہ بزی ہو۔'' فائزہ نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا پر وہ اور بھی بدک گئی۔

''بیٹھے بٹھائے اے ایس پی صاحب نے ایسی کیا مصروفیت ایجاد کر لی ہے جو فون نہیں اٹھا سکتے؟'' اب کے فائزہ بھی زِچ ہو کر بولی۔

''افوہ، تمہاری سُوئی تو ایک ہی جگہ پر اٹک گئی ہے۔ اب فون رکھو۔ میرا باس سارا کام چھوڑ کر مجھے اپنی اُلّو جیسی آنکھوں سے گھور رہا ہے۔ نوکری سے نکلواؤ گی؟''

''زیادہ اوور ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی آفس میں ہی بیٹھی ہوں۔''

''وہ آفس تمہارے پاپا کا ہے جبکہ میرا باس، میرا چاچا بننے کو بھی تیار نہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ تم مجھے شایان کے گھر کا نمبر دو۔ پھر میں فون رکھتی ہوں۔''

''گھر کا نمبر کیوں؟'' تانیہ نے بے اختیار دانت پیس کر کہا۔

''ویسے جلدی جلدی کی رٹ لگا رکھی ہے مگر ''کیوں؟'' ''کس لئے؟'' بھی پوچھنا ضروری ہے۔'' پھر کچھ نارمل لہجے میں کہا۔ ''دیکھو موبائل پر تو وہ کال ریسیو کر نہیں رہا، گھر کا فون تو اٹھائے گا۔''

''ہاں مگر میرے پاس اس کے گھر کا نمبر نہیں ہے۔''

''واٹ؟'' وہ دھاڑی۔

''شایان تمہارا کزن ہے اور تمہارے پاس اس کے گھر کا نمبر نہیں ہے۔''

''ہے۔ مگر وہ پرانا والا ہے۔ نیا مجھے یاد نہیں۔ ممی کی ڈائری میں لکھا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ گھر پہنچتے ہی مجھے فون کرنا۔''

''کروں گی اور اب فون رکھ دو۔ بائے!'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے لائن کاٹ دی تو تانیہ نے بھی فون رکھ کر ویکسی نیشن اسٹیٹمنٹ پر نظر ڈالی جسے وہ فون کرنے سے پہلے چیک کر رہی تھی۔ تبھی کسی نے اس کے آفس کے دروازے پر دستک دی۔

''کم اِن۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ کوئی دروازہ کھول کر آفس میں آیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ تانیہ کے متوجہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

تانیہ نے کسی کی آمد کو تو محسوس کیا پھر جب کوئی آواز نہیں آئی تو اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا صاف رنگت والا لمبا مگر دُبلا لڑکا، گرے رنگ کی پینٹ پر اسی رنگ کی شرٹ پہنے بازو سینے پر لپیٹے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ تانیہ کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی طرف آ گیا پھر ایک ہاتھ ٹیبل پر رکھ کر جھکتے ہوئے بولا۔

''آپ کو ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔'' اس کی بات سن کر تانیہ دلچسپی سے مسکرائی اور ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر وہ ٹیبل پر آگے ہوئی، اسی کے انداز میں بولی۔

''اور اگر میں نہ جاؤں تو......؟''

''تو میں آپ کو زبردستی کندھوں پر اُٹھا کر لے جاؤں گا۔''

''واقعی؟'' تانیہ مرعوب ہوئے بغیر اطمینان سے بولی۔

''آزما لیں۔'' ادھر اس کے اطمینان میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

''تو ٹھیک ہے۔'' تانیہ نے اپنی سیٹ پر پیچھے ہوتے ہوئے مسکراہٹ دبائی۔

''اُٹھا کر لے جاؤ۔'' اب اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ وہ آنکھیں سکیڑے تانیہ کو گھورتا

رہا پھر سر جھٹک کر سیدھا ہوا اور دروازے کی طرف منہ کر کے زور سے بولا۔

''نمبر دو۔'' ابھی اس کی آواز کی بازگشت باقی تھی کہ دروازہ کھلا اور اس کی عمر اور اسی جیسے حلیے والا قدرے سانولی رنگت کا اس کا ہم شکل کارپٹ پر لڑھک گیا۔ فرش پر پڑے لڑکے نے اپنے گوگلز کارپٹ سے اٹھائے اور گھٹنوں پر سے پینٹ جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''عمیر کے بچے! تمہیں کتنی دفع منع کیا ہے، مجھے ''نمبر دو'' نہ کہا کرو۔'' عمیر آنکھیں پھاڑے کسی بت کی طرح ایک ہی سمت دیکھے جا رہا تھا۔

''اب یہ اسٹیچو بنے کیوں کھڑے ہو؟'' اس نے ٹوکا پھر خود بھی مڑ کر دیکھا تو فوراً ہی اسے اپنے فرش نشین ہونے کی وجہ سمجھ آ گئی۔

''مارے گئے۔'' ایک دم اس کے منہ سے نکلا۔ عمیر نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''بھاگ عذیر!'' ہ دونوں بھاگ کر تانیہ کی چیئر کے پیچھے جا چھپے جو دونوں ہاتھ منہ پر رکھے ہنسی روکنے کی کوشش میں لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

''باہر نکلو تم دونوں۔'' دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کھڑے نورالہدیٰ غصے سے بولے تو وہ دونوں لٹکے ہوئے چہروں کے ساتھ سامنے آ گئے۔

''ان دونوں کو پارکنگ میں دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سیدھے تمہارے پاس ہی آئیں گے۔ عمیر تو اندر تھا پر تمہیں پتہ ہے عذیر کیا کر رہا تھا۔ یہ صاحبزادے گھٹنوں کے بل بیٹھے کی ہول سے تمہارے کمرے میں جھانک رہے تھے۔ دیکھو ذرا ان دونوں کی حرکتیں۔'' ہر چند کہ تانیہ کو معلوم تھا، ان کا غصہ مصنوعی ہے پر اپنے بھائیوں کے اُترے چہرے دیکھ کر کہا۔

''جانے دیں نا پاپا! بچے ہیں۔'' مگر بیٹوں کی رڈی ہوتی حالت انہیں اتنا محظوظ کر رہی تھی کہ وہ مزید کھنچائی کرنے کے انداز میں بولے۔

''پہلے پوچھو ان سے یہ دونوں یہاں کیا کارنامہ کرنے آئے تھے؟'' عذیر جلدی سے بولا۔

''ہم کارنامہ کرنے نہیں آئے پاپا! ہم تو آپی سے ملنے آئے تھے۔ صبح ناشتے پر ان سے ملاقات نہیں ہوئی اس لئے دل بے چین سا تھا۔ پھر کالج سے واپس آ کر ہم نے سوچا، آپی سے آفس جا کر مل لیتے ہیں۔ بول نا عمیر!'' اعلیٰ پائے کی بکواس ایکٹنگ کرتے ہوئے اس نے عمیر سے مدد مانگی جو فوراً ہی مل گئی۔

''بالکل پاپا! یہ دو نمبر ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''تم نے پھر مجھے دو نمبر کہا۔'' عذیر سب چھوڑ اس کے پیچھے پڑ گیا۔

''تم مجھ سے پورے پندرہ منٹ چھوٹے ہو تو ہوئے نا نمبر دو۔''

''ہاں۔'' عذیر کی ''ہاں'' اس قدر مدبرانہ تھی جیسے یہ بات آج ہی اس کے علم میں آئی ہو۔

''تم دونوں پھر سے شروع ہو گئے۔'' نورالہدیٰ انہیں ٹوکتے ہوئے تانیہ کی طرف مڑے۔

''یہ دونوں اگر پانچ منٹ اور آفس میں رہے تو بھونچال آ جائے گا اور تمہیں لئے بغیر یہ ٹلیں گے نہیں۔ اس لئے تم ان دونوں کے ساتھ جاؤ۔ تمہارا کام طارق دیکھ لے گا۔''

''او کے۔'' تانیہ سر ہلا کر بولی تو عمیر جلدی سے آگے ہوا۔

''ہم صرف آپی کو لینے نہیں آئے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔'' وہ پلٹنے لگے تھے، رک کر پوچھا۔

''خیریت؟''

''دادا جان کا برتھ ڈے ہے اور آپ ہمیشہ بھول جاتے ہیں۔ تو ہم نے سوچا اس بار آپ کو خود ہی لینے آ جاتے ہیں۔ چلیں۔'' عذیر بولتے ہوئے پاس آ کر ان کے بازو تھام کر بولا۔

''سوری بیٹا! میں اس بار بھی نہیں آ پاؤں گا۔'' ایک پل میں ان کے چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔ عمیر کو بہت برا لگا تھا۔

''کیوں؟''

''میری فارن ڈیلیگیشن کے ساتھ میٹنگ ہے۔ میں کیسے آ سکتا ہوں؟''

عذیر بچوں کی طرح منہ پھلا کر بولا۔ ''میٹنگ کینسل کر دیں۔''

انہوں نے بھی بچوں کی طرح عذیر کو پچکارا۔ ''سمجھا کرو بیٹا! میٹنگ کینسل نہیں ہو سکتی۔''

''تو پھر آپ نے آج کے دن میٹنگ رکھی ہی کیوں؟ جبکہ پتہ ہے 29 نومبر کو دادا جان کا برتھ ڈے ہوتا ہے اور ہم سب مناتے بھی ہیں۔'' اس سے پہلے کہ نورالہدیٰ اسے بہلانے کو کچھ اور بولتے، تانیہ نے کہا۔

''جانے دو عذیر! پاپا نہیں آئیں گے۔ میٹنگ واقعی بہت اہم ہے۔'' نورالہدیٰ نے اس کی بات پر چونک کر اسے دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ تانیہ جانتی ہے کہ وہ جس فارن ڈیلیگیشن کی بات کر رہے ہیں، وہ کل دوپہر کو واپس جا چکا تھا اور اسی بات نے انہیں چونکایا تھا۔ پھر انہوں نے تانیہ کا چہرہ دیکھا تو سمجھ گئے کہ اس نے جو کچھ بھی کہا ہے، ان کا بھرم رکھنے کے لئے نہیں کہا بلکہ وہ ان پر جتا رہی ہے۔ وہ شرمندہ ہو گئے اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔

تانیہ نے اشارے سے عذیر اور عمیر کو چلنے کے لئے کہا اور خود وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی نورالہدیٰ کے سامنے جا رکی۔

''آپ دادا جان کا برتھ ڈے کبھی نہیں بھولتے، ہے نا پاپا؟'' انہوں نے بس اسے دیکھا اور چپ چاپ وہاں سے چلے گئے۔

✿✿✿

ہائی کلاس کی باقی خواتین کی طرح مریم فاروقی کو بھی سوشل ورک کا شوق تھا۔ ہاں مگر یہ بات تو تھی کہ

ترجیحات کی لسٹ میں ان کے بچے سب سے پہلے آتے تھے۔ کسی ورک شاپ اور کانفرنس کو انہوں نے کبھی بھی بچوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس دن بھی کلب کے ممبرز کی جوائنٹ میٹنگ تھی مگر وہ معذرت کر کے اٹھ گئیں۔ ان کے پہنچنے تک قصرِ فاروقی میں اچھا خاصا ہنگامہ بپا ہو چکا تھا۔

لان چیئرز کے ساتھ رکھے ٹیبل سے غباروں کا ایک گچھا بڑے اہتمام سے بندھا ہوا تھا۔ اور شوخ رنگ کے ہر غبارے پر ہیپی برتھ ڈے لکھا نظر آ رہا تھا۔ راہداری میں بھی ایسے غبارے ہر جگہ بندھے تھے۔ وہ ہر طرف کا جائزہ لیتیں سٹنگ روم میں پہنچیں جہاں رکھا بھاری فرنیچر نہ جانے کس طرح کھسکا کر من پسند کونوں میں گھسایا گیا جس کے بعد خالی پڑے قالین پر لکڑی کی اونچی پشت والی کرسی ایک چھوٹے سے ٹیبل کے ساتھ بالکل درمیان میں رکھی تھی۔ جس کے سامنے اور دائیں بائیں کشن پڑے ہوئے تھے۔ اور بہت سے غبارے اضافی آرائش کے طور پر یہاں بھی سجائے گئے تھے۔ مریم فاروقی نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے اس گھر میں؟..... خدیجہ!..... بہادر!..... رشیدہ!'' وہ ایک ایک کر کے تمام ملازموں کو آواز دینے لگیں۔ ایک ملازم کسی کونے سے نکل کر سامنے آیا۔

''جی بیگم صاحب!''

''یہ فرنیچر یہاں سے کیوں ہٹایا ہے؟..... اور یہ غبارے کس نے باندھے ہیں؟''

''جی وہ.....'' مریم سمجھ گئیں۔

''اچھا تو یہ ان تینوں کی حرکت ہے۔ کہاں ہیں یہ تینوں؟''

''کچن میں۔''

''اب وہاں یہ لوگ کیا طوفان مچائیں گے؟'' وہ بڑبڑاتی کچن کی طرف چل پڑیں۔

ڈائننگ روم سے باہر تک سنائی دیتے قہقہوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ تینوں اپنی پسند کا کوئی کارنامہ کر چکے ہیں۔ اور کچن کے دروازے سے داخل ہوتے ہی ان کے خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ کچن اس طرح پھیلا ہوا تھا جیسے دو طاقتور فوجوں کے بیچ گھمسان کا رن پڑا ہو۔ فرش پر پڑے عجیب سے آمیزے سے بچتے ہوئے ان کی نظر بہادر پر پڑی۔

وہ دونوں پیر اُٹھا کر سٹول پر رکھے بیٹھا دونوں ہاتھوں سے اپنا کھچڑی بالوں والا سر پکڑ کر بند آنکھوں سے آگے پیچھے جھولتا ہوا جیسے اپنے اندر اُٹھتے اُبال کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس پر سے نظر ہٹا کر انہوں نے کچن ٹیبل کے گرد کھڑے اپنے سپوتوں کو دیکھا جو سامنے رکھی پلیٹ میں کوئلے جیسی چیز کو دیکھ کر بری طرح ہنس رہے تھے۔

''یہ کیا لگا رکھا ہے تم تینوں نے؟..... اور یہ کیا چیز ہے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جھڑک کر بولیں۔ ساتھ ہی پلیٹ میں رکھے عجوبے کے بارے میں سوال کیا۔

"کیک۔" عذیر نے بڑی سادگی کے ساتھ یک لفظی جواب دیا۔ جبکہ باقی دونوں صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھ کر خاموش رہے۔

"یہ کیک ہے؟" وہ حیران ہوئیں۔ "کس نے بنایا ہے؟"

"آپی نے۔" وہ فوراً بولا۔

تانیہ نے کھینچ کر ہاتھ اس کی گدی پر مارا۔ اس وارننگ کے ساتھ ہی اس نے بیان بدل دیا۔

"نہیں۔ عمیر نے۔"

"میں نے کب بنایا؟" اس نے آنکھیں دکھائیں۔

"تم لوگ کبھی چپ بھی کر جایا کرو۔" وہ ڈانٹ کر بولیں۔

"اور تم......" وہ تانیہ کی طرف مڑیں۔ "حد کرتی ہو تانیہ! بڑی ہو۔ بجائے اس کے کہ بھائیوں کو ٹوکو تم بھی ان کے ساتھ مل گئیں۔"

"ہم تو بس دادا جان کے لئے برتھ ڈے کیک بنا رہے تھے۔" اس نے کمزور سی آواز میں صفائی دی۔

عمیر نے اس کے جملے کو اچک کر کہا۔ "وہ الگ بات ہے کہ اوون سے کوئلہ برآمد ہوا ہے۔" اور وہ تینوں کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔ وہ کچھ نرم ہو کر بولیں۔

"کیک میں بیک کر دیتی ہوں۔ مگر ایک شرط پر۔"

"کیا؟" تینوں ہم آواز ہو کر بولے۔

"جتنی دیر میں، میں فریش ہو کر آتی ہوں، تم تینوں کچن صاف کرو گے اور بہادر صرف نگرانی کرے گا۔ اُٹھو بہادر! اور دیکھنا ان میں سے کوئی بھاگنے نہ پائے۔" وہ جا چکی تو بہادر سینہ چوڑا کر کے سٹول سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیں عمیر صاحب! آپ فرش صاف کریں۔ اور تانیہ بی بی! آپ عذیر صاحب کے ساتھ مل کر برتن دھوئیں۔"

"اتنا ماروں گی نا، یاد رکھو گے۔" تانیہ نے دھمکانے کے انداز میں ہاتھ اٹھایا تو بے چارہ بہادر وہیں دبک گیا۔ عمیر نے ڈسٹر اٹھایا اور جا کر بہادر کے ہاتھ میں دے دیا۔

"چلیں بہادر صاحب! فرش صاف کریں۔ پھر آپ کو برتن بھی دھونے ہیں۔"

مریم واپس آئیں تو بہادر رگڑ رگڑ کر فرش صاف کر رہا تھا۔ انہوں نے تینوں کو گھورا جو خود بھی گڑبڑا گئے تھے۔

"کیا کہا تھا میں نے؟"

"ہم تو فرش صاف کر رہے تھے۔ بہادر خود ہی......"

''شٹ اپ۔'' انہوں نے تانیہ کو بیچ میں ہی چپ کرا دیا۔ پھر بہادر کو ایک طرف سٹول پر بیٹھنے کو کہا اور ان تینوں سے پورا کچن صاف کروایا۔ ان کو منہ بند کر کے کام کرتا دیکھ کر بہادر دانت نکال رہا تھا اور وہ تینوں اس کے دانت دیکھ کر آنکھیں۔ مگر ماما کی موجودگی کی وجہ سے اسے کچھ کہہ نہیں سکے۔

وہ جب کیک بیک کر چکیں تو تینوں کو لے کر سٹنگ روم میں آ گئیں اور ان کی ارینج منٹ کو چھیڑے بغیر انہی سے سارا فرنیچر اس کی جگہ پر واپس رکھوایا۔ اُٹھواتے وقت انہوں نے صرف آرڈرز دیئے تھے۔ اب خود بھاری فرنیچر اٹھانا پڑا تو عقل ٹھکانے آ گئی۔

''ہائے ماما! بازو دکھ رہے ہیں۔'' فرنیچر سیٹ کر کے تینوں قالین پر ڈھیر ہوئے کراہ رہے تھے۔

''جتنا چاہے شور مچالو، مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔'' اُنہیں بھی پتہ تھا، ماما پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس لئے جلد ہی کراہنا بھول کر کیرم کھیلنے بیٹھ گئے۔ اور ساتھ میں مریم کو بھی ملا لیا۔

''نو بج گئے ہیں ماما! میں دادا جان کو بلا کر لاتی ہوں۔ کیک کاٹ لیتے ہیں۔'' نو بجتے ہی تانیہ اُٹھ گئی۔

''اپنے پاپا کو تو آ جانے دو۔'' ان کے ٹوکنے پر وہ تلخ سے لہجے میں بولی۔

''29 نومبر کے دن پاپا کی واپسی دو ڈھائی بجے سے پہلے نہیں ہوتی۔''

''مگر بابا جان تو ہر بار ان کا پوچھتے ہیں۔'' وہ رسان سے کہہ کر چپ ہو گئیں۔

''ٹھیک ہے۔ کیک نہیں کاٹیں گے۔ پر کھانا تو کھا سکتے ہیں۔'' اس نے بالآخر ان کی بات مان کر کہا اور اظہر فاروقی کو بلانے چلی گئی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد کوئی آواز نہیں اُبھری تو تانیہ نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا گھمایا اور دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ کمرے کی ہلکی زرد روشنی میں تانیہ نے اندر جھانکا تو نگاہ سیدھی قدیمی طرز کے بنے گیس سے جلنے والے آتش دان پر لگی تصویر پر پڑی۔ اور ہمیشہ کی طرح آج بھی تانیہ کو وہ تصویر سانس لیتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اظہر فاروقی آتش دان کے سامنے راکنگ چیئر پر بند آنکھوں کے ساتھ نیم دراز تھے۔ ریڈ ڈائری بند ان کے سینے پر رکھی تھی۔ اور ایک ہاتھ اس ڈائری پر تھا، دوسرا ہاتھ بے جان سے انداز میں ان کی سنہرے فریم کی عینک کو پکڑے گود میں دھرا تھا۔

آتش دان روشن تھا اور کمرے میں پھیلی زرد روشنی اسی سے نکل رہی تھی جس نے ماحول کو پراسرار بنا دیا۔

تانیہ نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور دبے قدموں چلتی ان کے سامنے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ انہیں آواز دیتے ہوئے وہ ہچکچا رہی تھی کہ کہیں وہ سو نہ رہے ہوں۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ہاتھ ان کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

کرنل اظہر فاروقی بہت زور سے چونکے۔ یہ انداز تو کسی کی پہچان تھا۔ انہوں نے تڑپ کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ مگر انہیں دکھائی ہی نہیں دیا۔ تانیہ نے انہیں آنکھیں کھولتا دیکھ کر کچھ کہا تھا مگر انہیں کچھ سنائی ہی نہیں دیا۔ ان کی آنکھیں کسی اور ہی منظر میں اُلجھ گئی تھیں۔ ان کے کان اس آواز کو سن رہے تھے جسے ایک بار

اور سن لینے کی خواہش برسوں سے ان کے دل میں تھی۔ تانیہ کے ایک غیر ارادی عمل نے انہیں بہت پیچھے دھکیل دیا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو...... ہیپی برتھ ڈے ٹو یو...... ہیپی برتھ ڈے ڈیئر بابا......!''

آتش دان کے سامنے راکنگ چیئر پر نیم دراز اظہر فاروقی نے اس کی گنگناتی آواز بھی سنی تھی۔ اور اس کا اپنے قدموں میں بیٹھنا بھی محسوس کیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ آنکھیں بند کئے اس پل کا انتظار کرتے رہے جب وہ ان کی ساری تھکن سمیٹ لیتی۔ اور پھر اس نے بہت آہستہ سے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اظہر فاروقی نے دھیرے سے آنکھیں کھول کر آسمانی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس اُس آسمان کی پری کو دیکھا جس کے چہرے کے گرد بکھرے لمبے سنہری مائل گھنے بال رات اور چاند کا عکس لگ رہے تھے۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیئے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہیپی برتھ ڈے بابا جان!''

''تھینک یو بیٹا!'' وہ بولے اور شکایت کرنے لگے۔ ''تاریخ بدلنے میں اب بس چند منٹ ہی باقی ہیں۔ اب جا کر باپ کو وِش کرنے کا خیال آیا ہے؟''

''سوری بابا جان! مگر مجھے یاد تھا۔ بس ہادی بھائی کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ آ جائیں تو کیک ساتھ میں ہی کاٹیں گے۔'' بولتے ہوئے وہ ذرا سا تپائی کی طرف کھسک گئی۔ اور کیک پر لگی کینڈل کو جلانے کے لئے ماچس اٹھالی۔ اظہر فاروقی نے سوال کیا۔

''نورالہدیٰ ابھی نہیں آیا؟''

''نہیں۔''

''تو پھر اسے آجانے دو۔''

ماچس جلاتے اس کے ہاتھ وہیں رک گئے۔

''بابا جان! بارہ تو بس بجنے ہی والے ہیں۔ اور سالگرہ تو اپنی تاریخ پر ہی اچھی لگتی ہے۔''

''مگر انتظار کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔'' اپنی بات کہہ کر وہ اُٹھے اور کھڑکی کے ساتھ رکھے سٹڈی ٹیبل پر ترتیب سے رکھی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھا کر اس کے ورق پلٹنے لگے۔ اور وہ چپ سی ہو گئی۔ پھر اس نے انگلیوں میں دبی ماچس کی تیلی کو جلایا اور جب رقص کرتے ننھے سے شعلے کا عکس اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا تو پھونک مار کر ماچس بجھاتے وہ اُٹھ گئی۔ اور ساتھ ہی تپائی پر سے کیک کی پلیٹ بھی اٹھالی۔

اپنے نظر انداز کئے جانے پر اس کے چہرے سے جھلکتی تکلیف جسے وہ آج اپنے دل میں محسوس کر رہے تھے، اُس دن انہوں نے دیکھی بھی نہیں تھی۔ وہ دروازے تک بھی نہ پہنچی تھی کہ ہارن کی تیز آواز سنائی دی۔

''ہادی بھائی آ گئے۔'' کہہ کر اس نے پلیٹ واپس رکھی اور باہر کی طرف دوڑ گئی۔ بھاگتے ہوئے لاؤنج

سے گزر کر وہ انٹرنس ڈور کی طرف بڑھی۔

ٹھیک اسی وقت نورالہدیٰ دروازہ کھول کر اندر آنے لگے اور سامنے سے آتی لڑکی سے ٹکرا گئے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ انہیں ساتھ لے کر دوسری طرف جا گرتی، خود کو سنبھالتے ہوئے نورالہدیٰ نے اسے بھی سنبھال لیا۔

''ارے بھئی آرام سے۔ گر جاؤ گی۔'' اسے خود سے الگ کرتے ہوئے وہ بولے۔ ''بائے دا وے اگر تمہارا ارادہ اولمپکس میں حصہ لینے کا ہے، تب بھی دوڑ کر گریس جانے کی کیا ضرورت ہے؟'' اسے خجل سا چھوڑ کر وہ لاؤنج کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے تو وہ پیچھے سے بولی۔

''ہادی بھائی! کہاں جا رہے ہیں؟''

''اپنے کمرے میں۔'' وہ پلٹ کر بولے۔

''جی نہیں۔'' پاس آ کر ان کا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ ''آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں۔''

''تمہارا اس وقت آؤٹنگ کا پروگرام ہے؟'' وہ گھبرا کر بولے۔ حالانکہ وہ تھک چکے تھے اور فوراً سونا چاہتے تھے۔ پھر بھی ان کے لہجے میں اُکتاہٹ کی بجائے وہی نرمی تھی جو اس لڑکی کے لئے مخصوص تھی۔

''نہیں بھئی۔ بابا جان کے پاس چلنے کو کہہ رہی ہوں۔ وہ کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''بابا جان ابھی تک جاگ رہے ہیں؟'' وہ چونک کر بولے۔ ''اس کا مطلب آج تو دیر سے آنے پر ڈانٹ پڑے گی۔''

''اور پڑنی بھی چاہئے۔ مگر اس وقت بابا جان آپ کی کلاس لینے کے لئے نہیں بلکہ اپنا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے کے لئے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''ارے ہاں...... آج تو 29 نومبر ہے۔'' وہ سر پر ہاتھ مار کر بولے۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اگر میں بھول ہی گیا تھا تو تم مجھے یاد نہیں کرا سکتی تھیں؟''

''ایکسکیوز می۔'' وہ برا مان کر کہنے لگی۔ ''آپ تو ہر سال بھول جاتے ہیں۔ ہمیشہ مجھے ہی یاد کرانا پڑتا ہے۔ ورنہ خود سے آپ کو اپنا برتھ ڈے بھی یاد نہ رہے۔''

''او کے...... او کے۔'' وہ جلدی سے بولے۔ ''یہ جھگڑا بعد میں دیکھیں گے۔ ابھی بابا جان کے پاس چلو۔'' پھر اس کے کندھوں پر بازو پھیلا کر ساتھ لئے وہ بابا جان کے کمرے میں آ گئے۔

''آئیے برخوردار! کب سے آپ کا انتظار ہے۔'' بابا جان انہیں دیکھتے ہی بولے۔

''ہیپی برتھ ڈے!'' نورالہدیٰ بازو پر ڈالا کوٹ بیڈ پر اُچھال کر ان سے بغل گیر ہو گئے۔ ''سوری بابا جان! اس بار میں بھول گیا۔'' ان سے الگ ہوتے، اسے کن انکھیوں سے دیکھ کر وہ اسے چھیڑنے کے لئے بولے۔

اُس نے منہ پھلا کر رخ پھیر لیا۔

''چلیں بیٹھیں۔'' انہیں صوفے پر بٹھاتے ہوئے اُن کی نظر کیک پر پڑی تو پلٹ کر کیک کی پلیٹ اور ماچس اُٹھا کر صوفے پر آبیٹھے۔ پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر انہوں نے موم بتی جلائی اور کیک کاٹنے کی چھری اٹھا کر بابا جان کو پکڑائی۔ پھر اسے دیکھ کر بولے۔

''وہاں کیوں کھڑی ہو؟...... اِدھر آؤ۔''

اور وہ آکر بابا جان کے دوسری طرف بیٹھ گئی۔

''دادا جان! کیک کاٹ لیں۔''

''کیا؟''

''بابا جان! بچے کیک کاٹنے کو کہہ رہے ہیں۔''

اب کے ذرا دھیان سے انہوں نے اپنے آس پاس دیکھا۔ تانیہ ہاتھ میں چھری لئے منتظر سی ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ جبکہ مریم دوسری طرف تھی۔ اور عمیر، عذیر سامنے بیٹھے تھے۔ سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''نورالہدیٰ نہیں آیا؟''

''نہیں۔ اور اب تو بارہ بجنے والے ہیں دادا جان!...... کیک کاٹ لیجئے۔''

''ہاں۔ اور سالگرہ تو اپنی تاریخ پر ہی اچھی لگتی ہے۔'' تانیہ کی بات پر برسوں پہلے کسی کا کہا جملہ شکستہ انداز میں ان کے لب سے ادا ہوا تھا۔

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

❁❁❁

اتوار کا دن تھا۔ فائزہ کچھ دیر پہلے جاگی تھی۔ اور ابھی ناشتے سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ اُسے ملازمہ نے تانیہ کی آمد کے بارے میں بتایا۔ وہ فوراً ہی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

''مجھے شایان کے گھر لے چلو۔'' سلام دعا کے بعد جو پہلی بات تانیہ نے کہی، وہ یہی تھی۔ وہ گڑبڑا گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔

''تم بیٹھو۔ چائے آتی ہوگی۔ پھر بات کرتے ہیں۔''

اس نے فائزہ کا بازو گرفت میں لے کر کہا۔

''فائزہ! مجھے شایان سے ملنا ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔''

فائزہ نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ اسے ٹینس ہوتے دیکھ کر تانیہ نے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''شایان کراچی میں نہیں ہے۔'' توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ ''اُس کی پوسٹنگ ہو چکی ہے اور تین دن

پہلے وہ اپنا چارج سنبھالنے سکھر جا چکا ہے۔"
تانیہ کے لئے یہ اطلاع اس قدر غیر متوقع تھی کہ وہ کافی دیر تک کچھ بول ہی نہ سکی۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد اس نے بے یقینی سے کہا۔
"وہ مجھ سے ملے بغیر چلا گیا؟" پھر اُس نے شاکی نظروں سے فائزہ کو دیکھا۔"اور تم نے بھی مجھے انجان رکھا۔"
"مجھے ایسا کرنا پڑا۔" وہ جلدی سے صفائی دیتے ہوئے بولی۔"جواد کی انگیج منٹ کے دوسرے ہی دن اس کی پوسٹنگ کے آرڈر آ گئے تھے۔ مگر شایان نے مجھے منع کر دیا کہ تمہیں نہ بتاؤں۔ پھر جب میں نے اس سے کہا کہ تم اس سے بات کرنا چاہتی ہو تو اُس نے کہا کہ وہ تم سے بات نہیں کر سکتا۔ پتہ نہیں کیوں؟ مگر مجھے وہ کافی اپ سیٹ لگ رہا تھا۔" فائزہ چپ ہوئی تو تانیہ نے کہا۔
"بات نہیں کر سکتا؟......مگر کیوں؟ ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے بات بھی نہ کرے۔ تم نے اس سے پوچھا نہیں، وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟" تانیہ اب بھی حیران تھی۔ فائزہ سے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں گیا۔ سر جھکا کر بولی۔
"پوچھا تھا۔ لیکن اُس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ تو میں نے سوچا شاید تم دونوں میں ان بن ہو گئی ہو گی۔"
"ہمارے بیچ تو کچھ نہیں ہوا۔" تانیہ نے فوراً تردید کی۔
"امپوسیبل۔" فائزہ نے ماننے سے انکار کر دیا۔"کچھ تو بات ہوئی ہو گی۔ بنا کسی بات کے وہ تعلق کیوں ختم کرے گا؟ اُس نے تم سے کچھ تو کہا ہو گا۔"
"یقین کرو فائزہ! کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔" وہ پریشان سی ہو کر چپ ہو گئی۔ پھر جیسے یاد آنے پر بولی۔
"لیکن انگیج منٹ والے دن وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔"
"کیا؟" فائزہ کو تجسس ہوا۔
"پتہ نہیں۔" تانیہ نے جان بوجھ کر یہ بات چھپالی کہ اس کے خیال میں شایان اُس دن اُسے پرپوز کرنے والا تھا۔
"وہ کہنے ہی والا تھا کہ تم اور انکل وہاں آ گئے۔ پھر وہ کوئی بات کئے بغیر اچانک ہی چلا گیا۔" وہ رُکی پھر تلخ سی ہنسی کے ساتھ بولی۔"وہ تو ہمیشہ ہی کچھ کہے بغیر چلا جاتا ہے۔"
ملازمہ اسی وقت چائے کی ٹرالی کے ساتھ اندر آئی تو دونوں چپ کر گئیں۔ ملازمہ کے جانے کے بعد فائزہ نے چائے کا کپ اٹھا کر تانیہ کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"پر تانیہ! تم شایان کی طرف سے پہل کا انتظار کیوں کرتی رہیں؟ خود سے کیوں نہ کہہ دیا؟"
دونوں ہاتھوں سے کپ پکڑے وہ بے بسی سے بولی۔

''کیسے کہہ دیتی؟ جبکہ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا بھی ہے یا نہیں؟''

''تم تو اس سے محبت کرتی ہو نا۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟''

تانیہ نے کچھ کہے بغیر کپ ٹیبل پر رکھا اور کھڑی ہوگئی۔ ''میں اب چلوں گی۔''

فائزہ نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ ٹھہری ہی نہیں۔ فائزہ اُسے باہر تک چھوڑنے آئی۔ تانیہ کار کا دروازہ کھولنے کے لئے کی ہول میں چابی ڈال رہی تھی، جب اس نے فائزہ کو کہتے سنا۔

''ایک بات مانو گی تانیہ! اگر وہ نہیں کہتا تو تم کہہ دو۔ اور اگر نہیں کہہ سکتیں تو اس انتظار کو ختم کر کے آگے بڑھ جاؤ۔ کب تک اس پل صراط پر کھڑی رہو گی؟ تکلیف میں رہو گی۔ یا تو ہٹ جاؤ یا گزر جاؤ۔ ٹھہرنا مت۔ ٹھہرنے والے کا پور پور زخم بن جاتا ہے۔''

وہ چپکے سے کار میں بیٹھی اور چلی گئی۔

'تمہارے اندیشے چاہے کتنے ہی درست ہوتے شایان! مگر آگہی کے بعد جدائی بخشنے کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا۔' فائزہ نے تاسف سے سوچا۔

❀❀❀

ایک ہاتھ میں فائلز اور دوسرے میں دوپٹہ پکڑے اُس کی آمد کافی افراتفری میں ہوئی تھی۔ نورالہدیٰ نے اخبار نیچے کر کے اُسے دیکھا۔

''میں سوچ رہا ہوں، دیر سے آفس آنے والوں کی تنخواہ کاٹنا شروع کر دوں۔''

مریم ان کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

''ایسا مت کرنا نورالہدیٰ! ورنہ تنخواہ کے نام پر تانیہ کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔''

''ویری فنی۔'' فائلز اور دوپٹہ ساتھ والی چیئر پر رکھ کر ہاتھ میں پکڑا کلپ لاپروائی سے سلکی براؤن بالوں میں اٹکاتے ہوئے وہ برا مان کر بولی۔ ''ویسے پاپا! ایک بات میں آپ کو بتا دوں، جس دن آپ نے میری تنخواہ کاٹی، اگلے دن میں ریزائن کر دوں گی۔''

''دھمکی دے رہی ہو؟'' وہ آنکھیں نکال کر بولے۔

''آپ بھی تو دے رہے ہیں۔'' آرام سے کہہ کر اس نے سلائس اٹھا لیا۔

''اچھا آرام سے کھاؤ'' اسے جلدی جلدی سلائس منہ میں ٹھونستے دیکھ کر مریم نے ٹوکا۔

نورالہدیٰ نے اخبار لپیٹ کر سائیڈ میں رکھ دیا انہیں اخبار رکھتے دیکھ کر مریم نے چائے کا کپ سامنے رکھتے ہوئے گلاس میں جوس نکال کر انہیں تھمایا۔ ناشتے کے بعد اخبار پڑھنا ان کا معمول تھا۔ پھر اخبار سے فارغ ہو کر جوس پیتے اور آفس کے لئے نکل جاتے۔ جتنی دیر میں انہوں نے جوس پیا، تانیہ ناشتہ نمٹا چکی تھی۔ اس نے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے دوپٹہ گلے میں ڈالا۔

''پاپا! چلیں۔''

''تم بعد میں چلی جانا۔'' ان سے پہلے مریم بول پڑیں۔ پھر اس پر سے نگاہ ہٹا کر انہوں نے نورالہدیٰ کو دیکھا۔ ''میں تانیہ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''او کے۔'' انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

''اچھا سنو۔'' انہیں اٹھتا دیکھ کر وہ مزید بولیں۔ ''آفس جانے سے پہلے بابا جان سے ملتے جانا۔ رات ان کی طبیعت کافی خراب تھی۔''

ان کا موڈ ایک دم سے بدل گیا اور رُکھائی سے بولے۔ ''میں بزنس مین ہوں، ڈاکٹر نہیں۔''

وہ چلے گئے تو تانیہ، مریم کی طرف مڑی۔

''سمجھ نہیں آتا ماما! آخر پاپا، دادا جان کے ساتھ اتنا رُوڈ بی ہیو کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ جانتی ہیں، ان دونوں کے درمیان کیا ٹینشن ہے؟''

''میں کیسے جان سکتی ہوں؟'' انہوں نے فوراً لاعلمی کا اظہار کیا۔ ''میں نے ان دونوں کو ہمیشہ ایسا ہی دیکھا ہے۔ اب تو خیر عادت ہو چکی ہے، لیکن شادی کے ابتدائی سالوں میں، میں بھی پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دو دفعہ نورالہدیٰ سے پوچھا بھی تو کہنے لگے، تمہارا وہم ہے۔ وہ شاید بتانا نہیں چاہتے، اس خیال سے میں نے کبھی زیادہ کریدا نہیں۔ اور اب تو مجھے بھی یہ اپنا وہم ہی لگتا ہے۔ تم خود غور کرو، نورالہدیٰ کا ان کے ساتھ روّیہ اپنی جگہ مگر وہ کبھی بھی بابا جان کی طرف سے غافل نہیں ہوئے اور مجھ سے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ بابا جان میرے بچوں کے دادا ہیں اور ان کی اس حیثیت میں کبھی فرق نہیں آنا چاہئے۔ یوں بھی دونوں کے بیچ ناراضی کی کوئی وجہ بھی تو نظر نہیں آتی۔'' پھر اس کا گال تھپکتے ہوئے کہا۔ ''ان باتوں کو اتنا سیریسلی مت لیا کرو۔''

''آپ مجھ سے کچھ بات کرنے والی تھیں۔'' وہ سر جھٹک کر بولی۔

''ہاں، آؤ۔ تمہارے روم میں چل کر بات کرتے ہیں۔''

تانیہ اپنی فائلز اٹھا کر ان کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اپنے کمرے سے بریف کیس اُٹھا کر دو دو سیڑھیاں اُترتے ہوئے وہ لاؤنج میں آئے تو بجائے آگے بڑھنے کے رک گئے۔ بابا جان کی خراب طبیعت کا سن کر وہ پریشان ہو گئے تھے اور تفکر ان کے چہرے سے بھی نظر آ رہا تھا۔ کچھ پل ٹھہر کر وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ان کے کمرے کے دروازے پر جا رکے اور دستک کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا، انہوں نے اُٹھتے ہوئے ہاتھ کی مٹھی بنا کر بھینچ لیا۔ اچانک ہی ان کے چہرے سے بے حسی جھلکنے لگی تھی۔ پھر وہ مڑے اور تیز قدموں سے چل کر باہر نکل گئے۔

تانیہ دونوں پیر اٹھائے بیڈ پر بیٹھی تھی اور مریم اس سے کچھ فاصلے پر گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔

تانیہ نے خود سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تو چپ کر کے انہیں دیکھنے لگی۔

وہ ہمیشہ کی طرح ہی سلک کی ساڑھی پہنے ہوئے تھیں۔ تانیہ نے کبھی بھی انہیں بہت زیادہ لمبے بالوں کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اس وقت بھی ان کے لہر دار بالوں کی اسٹیپ کٹنگ کمر کے خم سے کچھ اوپر ہی ختم ہو رہی تھی جو کبھی سچ مچ ہی گہرے کالے رنگ کے ہوا کرتے تھے مگر اب اڑتالیس برس کی عمر میں انہیں پابندی سے ڈائی کرانا پڑتا تھا۔ البتہ ان کی فگر پر عمر کا کچھ خاص اثر نہیں پڑ سکا۔

سوچتے سوچتے اب اس کی ذہنی رو نورالہدیٰ کی طرف مڑ چکی تھی۔ اس نے اپنی عمر کی کئی لڑکیوں کو ان کی پرسنالٹی کو سراہتے سنا تھا۔ کنپٹیوں سے ان کے بال سفید ہو چکے تھے جنہیں انہوں نے کبھی کلر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان کے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بولنے میں بھی خود اعتمادی جھلکتی تھی۔

وہ متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ ان دونوں لوگوں کو ساتھ دیکھ کر تانیہ کے دماغ میں ایک ہی بات آتی۔ ''Made for each other''

ابھی بھی یہی سوچ کر اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی تھی جسے فوراً ہی دباتے ہوئے اس نے مریم سے کہا۔ ''ماما! مجھے ابھی آفس بھی جانا ہے۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' وہ بول کر پھر رکیں، کچھ سوچا، پھر آخر اسے مخاطب کر ہی لیا۔

''تمہیں انصر کیسا لگتا ہے؟'' اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

''جیسا ہے، ویسا ہی لگتا ہے۔'' اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

''یہی تو پوچھ رہی ہوں، کیسا ہے؟'' وہ زور دے کر بولیں۔

''مجھے کیا معلوم؟'' اس نے پہلوتہی کی۔

''معلوم کیوں نہیں ہے؟ آخر تم دونوں بچپن کے دوست ہو۔''

''بچپن کی دوستی تو ماما! بچپن میں ہی ختم ہو گئی، جب وہ پڑھنے کے لئے ابروڈ چلا گیا تھا۔ اب وہ میرا دوست نہیں ہے، صرف فاروقی گروپ آف انڈسٹریز کا Vendor ہے۔ اور اگر وہ میرے لئے کچھ ہے بھی تو بس تیمور انکل کا بیٹا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔'' اس بار وہ بولی تو اس کے لہجے میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مریم نے سانس بھر کر کہہ ہی دیا۔

''انصر نے تمہیں پرپوز کیا ہے؟''

''خود۔'' وہ حیران ہوئی۔

''مجھ سے تو عروسہ نے ہی بات کی ہے مگر ظاہر ہے بیٹے کی مرضی سے ہی کی ہو گی۔'' وہ خاموش بیٹھی رہی۔

''وہ باقاعدہ طور پر رشتہ لے کر آنے کی اجازت مانگ رہی ہے۔ تمہارے پاپا کو بھی پرپوزل اچھا لگا ہے اور دادا جان نے بھی اپروو کر دیا ہے۔ مگر ظاہر ہے، آخری فیصلہ تم کو ہی کرنا ہے۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔''

''ماما! لیکن......'' اس نے کچھ بولنا چاہا پر مریم نے بیچ میں ہی روک دیا۔

''دیکھو اس بار کوئی ٹال مٹول نہیں چلے گی۔ جب تک تم پڑھ رہی تھیں، تب تک تو ٹھیک تھا پر اب جو سال بھر سے تم بہانے بنا رہی ہو، وہ میری سمجھ سے باہر ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا، آخر تم شادی کے بارے میں کب سیریس ہو گی؟''

''ماما پلیز! اس ذکر کو ابھی رہنے دیں۔'' اس نے کوشش کر کے بول ہی دیا۔ مگر انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔

''تمہیں کچھ اندازہ ہے تمہاری عمر کتنی ہو چکی ہے؟'' ظاہر سی بات ہے، یہ سوال اس سے جواب مانگنے کے لئے نہیں کیا گیا تھا۔

''چوبیس سال۔'' وہ بولیں۔ ''اور جب میں چوبیس سال کی تھی تو تم میری گود میں تھیں۔'' وہ رک کر اس کی فق ہوتی شکل دیکھ کر بولیں۔ ''میں نے پہلے بھی تم سے کہا ہے اور اب پھر کہہ رہی ہوں کہ اگر تمہاری اپنی کوئی چوائس ہے تو کھل کر کہہ دو۔ مجھے یا کسی بھی دوسرے شخص کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔'' اس کی آنکھوں میں ایک دم ہی شایان کا چہرہ اُبھر آیا تو اس نے سختی سے پلکیں بند کیں، پھر کھول کر انہیں دیکھا۔

''اور اگر تمہاری کوئی چوائس نہیں ہے تو بیٹا! میں کہوں گی کہ تمہارے لئے انصر سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے توقف کیا پھر پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ''تانیہ! یہ وقت جو اس پل تمہارے ہاتھ میں ہے، بہت خوب صورت ہے۔ اسے نہ گنواؤ۔''

''میں جاؤں؟'' کچھ دیر بعد اس نے ہلکے سے پوچھا۔

''ہاں جاؤ۔'' انہوں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ان کے پاس سے اٹھ کر وہ دادا جان کے پاس آ گئی۔

''تم گئی نہیں؟'' وہ خلافِ معمول اس وقت اسے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئے۔

''بس جا ہی رہی ہوں۔'' پھر بیڈ پر ان کے برابر ٹکتے ہوئے بولی جہاں وہ نیم دراز تھے۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''تمہیں دیکھ کر ٹھیک ہو گئی ہے۔'' وہ قصداً مسکرائی۔ اظہر فاروقی کچھ جھجکے، پھر پوچھا۔

''نورالہدیٰ ابھی گھر پر ہے؟''

''نہیں۔ وہ آفس جا چکے ہیں۔'' آہستہ سے کہہ کر اس نے ان کا ہاتھ چوم کر کہا۔ ''آئی لو یو دادا جان!'' وہ جانتی تھی کہ یہ الفاظ ان کی تکلیف کا نعم البدل نہیں ہو سکتے پھر بھی وہ مسکرائے تو اسے حوصلہ ہوا، پھر انہیں اللہ حافظ کہہ کر وہ باہر پورچ میں آ گئی۔ اپنی کار ریورس کر رہی تھی کہ ڈاکٹر سراج بیک ویو مرر میں گیٹ سے اندر آتے دکھائی دیئے۔ وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ اس وقت؟ ویسے ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔ آج دادا جان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔''

وہ کھڑکی کے پاس آ کر جھکتے ہوئے بولے۔ ''ہر منگل کو مجھے کرنل صاحب کے چیک اَپ کے لئے آنا ہی

ہوتا ہے۔ اور آج بھی میں شام کو آنے ہی والا تھا پر فاروقی صاحب کا فون آیا کہ کرنل صاحب کی طبیعت ناساز ہے تو میں صبح آ گیا۔''

''آپ کو پاپا نے فون کیا ہے؟'' وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

''ہاں۔''

''اچھا۔'' وہ ہنسی۔ ''یہ بات دادا جان کو ضرور بتائیے گا۔''

''بتا دوں گا۔'' وہ ناسمجھی سے بولے۔ اور تانیہ انہیں حیران چھوڑ کر اپنی کار نکال لے گئی۔

❀❀❀

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں کتنی تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔ یوں ہی کیلنڈر کو دیکھتے ہوئے تانیہ کو احساس ہوا کہ شایان کو سکھر گئے دو مہینے سے زیادہ ہو چکے تھے اور اس تمام عرصے میں شایان کی صورت دیکھنا تو دُور اس نے شایان کی آواز تک نہیں سنی تھی۔ حالانکہ اس کا دل بہت چاہا، کم از کم ایک بار تو اسے فون کر لے مگر اس نے سختی سے خود کو روک لیا۔ وہ اتنی ارزاں بھی نہیں تھی۔ انٹر کام کی بیپ پر اس کا دھیان بٹا تھا۔

''ہیلو!'' انٹر کام کا بٹن پریس کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''میڈم! مس فائزہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''ہاں اندر بھیجو۔ اور چائے بھی۔'' فائزہ کے نام پر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

تانیہ حیران ہو کر فائزہ کے یوں آفس آنے کی وجہ سوچنے لگی۔ چند لمحوں بعد فائزہ ایک دم سے اس کے آفس کا دروازہ کھول کر اندر آئی اور آتے ہی بولی۔

''شایان کے فادر کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔''

تانیہ کتنی ہی دیر کچھ بول نہ سکی پھر کوشش کر کے اس نے خود کو بولنے پر آمادہ کیا۔ ''وہ ٹھیک ہیں؟''

''سمجھو جان بچی ہے۔'' فائزہ خود بھی پریشان نظر آ رہی تھی۔

''یہ بھی بڑی بات ہے۔'' تانیہ نے اسے دلاسا دینے کو کہا پھر پوچھا۔ ''اب ان کی کنڈیشن کیسی ہے؟''

''ابھی تو صبح انہیں روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ پرسوں رات سے تو آئی سی یو میں تھے۔'' تانیہ کو خیال آیا کہ وہ جب سے آئی ہے، کھڑی ہے۔

''اچھا بیٹھ تو جاؤ۔''

''نہیں۔'' وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ ''میں ہسپتال جا رہی ہوں۔ راستے میں تمہارا آفس آیا تو سوچا تمہیں اطلاع کر دوں۔''

''میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔'' تانیہ نے جلدی سے کہا پھر انٹر کام پر طارق صاحب کو بیٹھنے کا کہہ کر اپنے سامنے کھلی فائلیں سمیٹنے لگی۔

''یس میڈم!'' ذرا دیر میں ایک ادھیڑ عمر صاحب آفس میں تھے۔

''طارق صاحب! یہ فائل میں نے دیکھ لی ہے۔ جیسے ہی پاپا فیکٹری سے آئیں، سائن کروا لیجئے گا۔ اور یہ کوٹیشن سپریم کورٹ کارپوریشن کو آج ہی فیکس ہو جانی چاہئے۔ اور اگر پاپا میرا پوچھیں تو کہہ دیجئے گا ضروری کام سے گئی ہوں، ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جاؤں گی۔'' جلدی جلدی بولتے ہوئے اس نے دو فائلیں ان کو پکڑائیں پھر بیگ کا اسٹریپ کندھے پر ڈال کر موبائل اور چابیاں اٹھاتی فائزہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی آفس سے نکل گئی۔

فائزہ کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''کون سے ہسپتال میں ہیں؟''

''آغا خان۔'' سڑک پر آتے ہی تانیہ نے پوچھا تھا اور فائزہ کے جواب پر وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔ مگر کچھ یاد آنے پر پوچھا۔

''شایان کو پتہ ہے؟''

''انکل کو ہارٹ اٹیک ہفتہ کی رات کو ہوا تھا اور شان ہر وِیک اینڈ پر کراچی آتا ہی ہے۔ انکل کو ہسپتال بھی وہی لے کر گیا تھا۔'' تانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''شایان ہر وِیک اینڈ پر کراچی آتا ہے؟''

''ہاں۔'' فائزہ نے اس کے لہجے پر دھیان دیئے بغیر کہا۔

''بہت پریشان ہے بے چارہ۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں خود بیمار نہ پڑ جائے۔ انکل سے محبت بھی تو بہت کرتا ہے۔ پرسوں رات سے ہاسپٹل میں ہے، ایک پل کے لئے نہیں سویا۔ نہ کھانے پینے کا ہی کچھ ہوش ہے۔'' وہ شایان کا احوال کیا سنتی، ابھی تک اس کی حیرت ہی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فائزہ ذرا دیر کو خاموش ہوئی تو اس نے پھر پوچھا۔

''فائزہ! کیا واقعی شایان ہر وِیک اینڈ پر کراچی آتا ہے؟''

''ہاں بابا! ہر وِیک اینڈ پر۔'' وہ تانیہ کی بار بار کی تکرار سے اُلجھ گئی۔ ''اگر کوئی ضروری کام ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ وہ اپنی روٹین نہیں بدلتا۔

''کمال ہے۔'' وہ وِنڈ اسکرین کے پار دیکھ کر بولی۔ فائزہ کو ایک دم خیال آیا اور وہ تیزی سے اس کی طرف مڑ کے بولی۔

''کیا وہ تم سے نہیں ملتا؟''

تانیہ نے تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔

''فون تو کرتا ہوگا۔''

اس بار تانیہ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ فائزہ چپ سی ہوگئی۔

'واہ۔ شایان صاحب! پاس تھے تو جلاتے تھے۔ دور گئے تو راکھ کر ڈالا۔ اس پر کیا شانِ بے نیازی ہے کہ مڑ کر خبر تک نہ لی۔ مگر کیا میرے رت جگے اتنے ہی بے اثر تھے کہ تمہاری نیند نہ اُڑا سکے؟' اس کی آنکھوں میں چبھن بڑھنے لگی تو اس نے ڈیش بورڈ پر رکھے سن گلاسز اُٹھا کر آنکھوں پر چڑھا لیئے۔ چوٹ تو لگ چکی، اب زخم دکھانے کا کیا فائدہ؟ گاڑی ہسپتال کے سامنے رک گئی۔ فائزہ نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور اُترنے لگی تو دھیان آیا، وہ ابھی تک اپنی سیٹ پر ہے اور اس نے انجن بھی بند نہیں کیا تو پلٹ کر پوچھا۔

''تم اندر نہیں آؤ گی؟''

''تم چلو، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' وہ بدستور سامنے دیکھتے ہوئے بولی اور فائزہ کے اُترتے ہی وہ زناٹے سے گاڑی بھگا لے گئی۔

کافی دیر تک بے مقصد شہر کی سڑکوں پر گاڑی بھگانے کے بعد بھی خون کے اُبال میں کمی نہیں آئی تو تھک کر اس نے گھر کے راستے پر گاڑی موڑ دی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ملازمہ پر پڑی تو اسے پکار کر کہا۔

''خدیجہ! میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ اور کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔''

پھر وہ رُکی نہیں اور سیدھی اپنے رُوم میں آ گئی۔

جذباتی ٹوٹ پھوٹ کے بعد اب اس کے اعصاب شکستہ ہونے لگے تھے۔ اس پر ہیجان طاری تھا۔ دروازہ لاک کر کے اس نے ہاتھ میں پکڑی ہر چیز بیڈ پر پھینکی اور خود کارپٹ پر گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ ہولے ہولے لرزتے ہوئے خود کلامی کر رہی تھی۔

''میرا اعتبار توڑنے کی تمہارے پاس کوئی وجہ نہیں تھی شایان! اگر کوئی وجہ ہوتی تو تم مجھ سے لڑتے، مجھے الزام دیتے۔ مگر تم تو بنا کچھ کہے ہی پلٹ گئے۔ لفظوں کا آزار دے جاتے۔ میں کب تک تمہاری خاموشی سنوں؟ کچھ تو بولا ہوتا شایان! میں سمجھا لیتی خود کو کہ تم نے دھوکا دیا ہے۔ مگر اب کیا کروں؟ خود کو کیسے سمجھاؤں؟'' اب اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ درد سے پھٹتے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

''قصور تمہارا نہیں، غلطی میری ہے۔ میں نے کیوں تم پر اعتبار کیا؟ میں نے کیوں تم سے محبت کی؟ کیوں میں آج بھی تم سے محبت کرتی ہوں؟ جب ساتھ ہی نہیں دینا تھا تو تم کیوں میرے پاس آئے؟ اگر جانا ہی تھا تو میری زندگی میں، میرے دل میں آنے کا تمہیں کیا حق تھا؟ پاس آ کر دُور جانے کا، جھلک دکھا کر چھپ جانے کا کھیل بہت بار کھیلا ہوگا۔'' وہ اب چلّا رہی تھی۔

''بہت سوں کو تڑپایا ہوگا۔ بہت ہوں گی جو تمہارے لئے روتی ہوں گی۔ مگر میں تانیہ فاروقی ہوں۔ ان بہت سی لڑکیوں سے بہت الگ۔ مجھے تڑپتا دیکھنے کی تمہاری خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی شایان! نہ میں تڑپوں

گی نہ روؤں گی۔تم وہ نہیں جس کے لئے میں خود کو برباد کرلوں۔'' وہ کہہ رہی تھی کہ وہ نہیں روئے گی مگر دونوں بازو سختی سے اپنے گرد لپیٹ کر پیشانی گھٹنوں سے ٹکا کر گٹھڑی بنی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

سورج ڈھل چکا تھا اور کمرے میں اندھیرا ابھرنے لگا تھا لیکن تانیہ نے لائٹ جلائی نہ ہی پردے سمیٹے۔ وہ بے حس و حرکت اوندھے منہ کارپٹ پر سمٹ کر لیٹی تھی۔اب وہ رو نہیں رہی تھی۔اس کا چہرہ ستا ہوا تھا، بال بے ترتیب ہو رہے تھے۔بکھرے بکھرے حلیے کے ساتھ اس کے سر میں درد کی تیز لہریں اُٹھ رہی تھیں۔کئی گھنٹوں تک رونے کی وجہ سے وہ تھک چکی تھی اور اب اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ اُٹھ کر بیڈ کے دراز سے پین کلر ہی نکال کر لے لے۔پھر کچھ وقت سے ہی سہی مگر اس نے خود کو ہلنے پر آمادہ کر ہی لیا۔وہ کھسک کر ٹیبل کی طرف گئی۔ٹیبل کے سہارے سے بیٹھنے کے بعد اس نے جگ سے پانی گلاس میں ڈالا اور گلاس پکڑ کر اُٹھتے ہوئے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔پھر دراز کھول کر پین کلر نکالی اور دو گولیاں پانی کے ساتھ لے کر گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سو جائے مگر آنکھوں میں درد اتنا زیادہ تھا کہ بند کرنا بھی مشکل تھا۔وہ چت لیٹی نیند آجانے کا انتظار کرتی رہی۔

اگلی صبح شاور لے کر ڈریسنگ روم میں آئی تو آئینے میں اپنی ہی صورت دیکھ کر حیران رہ گئی۔آنکھوں کے گرد حلقے سوجے ہوئے تھے۔نہانے سے چہرے کی پژمردگی تو کم ہوگئی تھی مگر زردی جھلک رہی تھی۔اس حالت میں سب کا سامنا کرنا مشکل لگ رہا تھا۔مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔گیلے بالوں کو ڈرائیر سے خشک کر کے وہ ڈائننگ روم میں آہی گئی۔عمیر، عذیر تو کالج جا چکے تھے اور دادا جان بھی ناشتہ ان کے ساتھ کر کے اس وقت اسٹڈی میں چلے جاتے تھے۔مریم البتہ نورالہدیٰ کے ساتھ ہی ناشتہ کرتی تھیں۔اور جب سے تانیہ نے آفس جانا شروع کیا تھا، وہ بھی ان کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر موجود ہوتی۔نورالہدیٰ اس پر نظر پڑتے ہی چونک گئے۔انہوں نے مریم کی طرف دیکھا، ان کے تاثرات بھی نورالہدیٰ سے مختلف نہیں تھا۔

''بہادر! میرے لئے چائے لے آؤ'' سلائس پر بٹر لگاتے ہوئے وہ خود کو نارمل پوز کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ اونچی آواز میں بولی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' مریم اس کے پوز کرنے سے ذرا بھی مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔تانیہ کو بھی اندازہ تھا کہ ''کچھ بھی نہیں'' سے کام نہیں چلے گا۔اس نے چائے کا کپ اٹھایا جسے ابھی ابھی بہادر چھوڑ گیا تھا اور سیب لے کر بولی۔

''اب تو ٹھیک ہوں۔مگر طبیعت خراب ہوگئی تھی۔اسی لئے آفس سے جلدی اُٹھنا پڑا۔پھر جو ٹیبلٹ لے کر سوئی ہوں تو ایک گھنٹہ پہلے ہی آنکھ کھلی ہے۔''

اُس نے غیر محسوس انداز میں کل سارا دن کمرہ نشین رہنے کی بھی وضاحت کر دی۔

''مجھے ابھی بھی تم ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔''

''جی ماما!'' وہ ان کی تاکید کے جواب میں بولی۔
مریم تو قدرے مطمئن ہو کر ناشتہ کرنے لگیں۔ مگر نور الہدیٰ مستقل اسے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا مگر ان کا اس طرح دیکھنا تانیہ کو پریشان کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ آرام سے ناشتہ کرتی رہی۔ آخر انہوں نے تانیہ پر سے نگاہ ہٹالی۔
''میرا خیال ہے، آج تم آفس مت جاؤ۔ گھر پر ہی رہ کر آرام کرو۔''
''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔'' اس نے کپ میں جھانکتے ہوئے کہا۔ نور الہدیٰ اپنی جگہ سے اُٹھے اور اس کے پاس آکر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی طرف کیا۔
''تمہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مگر اس وقت تکلیف اور بھی زیادہ ہوگی جب تم اپنی تکلیف مجھ سے چھپاؤ گی۔'' تانیہ کو ان کے چہرے پر وہی کھویا ہوا سا تاثر نظر آیا، جو اکثر تانیہ کو دیکھتے ہوئے اُبھر آتا تھا۔ وہ جھکے اور اس کے ماتھے کو چوم لیا۔ ان کی چوڑی پشت کو دیکھتے ہوئے تانیہ حیران ہو رہی تھی۔ نہ اس نے کچھ کہا، نہ پاپا نے کچھ پوچھا۔ انہیں پھر شک کیسے ہوا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے؟ پھر وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اور جب یقین ہو گیا کہ نور الہدیٰ چلے گئے ہیں تو لاؤنج میں آکر وقت گزاری کے لئے ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ مریم کہیں جانے کی تیاری میں لاؤنج سے ہو کر گزریں۔ تانیہ نے دور سے ہی انہیں بائے کہا۔ مسکرا کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھولا۔ پھر کچھ سوچتی نظروں سے گلاس وال کے دوسری طرف تانیہ کو دیکھ کر انہوں نے دروازہ بند کیا اور لاؤنج میں آگئیں۔
''کچھ خاص پروگرام دیکھ رہی ہو؟''
''نہیں۔'' فوراً سیدھے ہو کر اس نے ٹی وی کی آواز کم کر دی۔
''تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔'' وہ صوفے پر اس کے ساتھ بیٹھتی بولیں۔
''کہیں۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔
''بات تو کوئی نئی نہیں ہے۔ پر عروسہ کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ حالانکہ میں بہت واضح انداز میں اس سے کہہ چکی ہوں کہ تم ابھی شادی کے لئے تیار نہیں ہو۔ مگر وہ کہتی ہے، شادی نہ سہی منگنی تو کی جا سکتی ہے۔ اور سچ پوچھو تو مجھے بھی اُس کی بات پسند آئی ہے۔ فی الحال منگنی کر دیتے ہیں۔ پھر جب تم ذمے داری اٹھانے کو تیار ہو جاؤ تو شادی کر دیں گے۔ اور کیا پتہ، ایک بار النصر کے ساتھ رشتے میں بندھ کر شادی کا فیصلہ تمہارے لئے زیادہ آسان ہو جائے۔'' پھر اسے چپ دیکھ کر بولیں۔ ''چپ کیوں ہو؟...... کچھ تو بولو۔''
''کیا بولوں ماما؟'' وہ ہنسی۔ ''پل صراط پر ٹھہروں یا ہٹ جاؤں۔ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پر شاید کچھ گنوانا بھی نہ پڑے۔ لیکن اگر گزر جاؤں تو سب گنوا دوں گی۔ مگر شاید تب بھی میرے ہاتھ خالی نہیں رہیں گے۔ بن مانگے ہی سہی، لیکن زندگی کچھ عطا تو کرے گی۔ پر نفع کس میں ہے اور نقصان کہاں؟ حساب کروں گی تو ہی پتہ

چلے گا۔‘‘

’’کیا کہہ رہی ہو؟‘‘ وہ خاک بھی نہ سمجھیں۔ تانیہ انہیں دیکھ کر مسکرائی۔

’’آپ چاہتی ہیں نا، میں شادی کرلوں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’میں سوچ کر جواب دوں گی۔‘‘

’’پتھر میں جونک تو لگی۔‘‘ اُس کی بات پر مریم نہال ہوگئیں۔ ’’بس اب چاہے تم کچھ بھی جواب دو، میرے لئے تو یہ بھی بہت ہے کہ تم شادی کے بارے میں سوچنے کو تیار ہوگئی ہو۔‘‘ تانیہ انہیں خوش دیکھ کر شرمندہ ہوگئی۔ اپنی خوشیوں کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ ان کی خوشیوں سے کتنا دور ہوگئی تھی۔ جانے سے پہلے کتنی ہی دیر تک وہ اسے خود سے لپٹا کر پیار کرتی رہیں۔ اُس نے کہہ تو دیا کہ سوچے گی۔ پھر کچھ سوچنے کی کوشش میں وہ کچھ بھی سوچ نہیں پا رہی تھی۔

کتنا وقت گزر گیا، اُسے کچھ احساس بھی نہیں تھا۔ کسی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر مڑی اور اپنے برابر بیٹھے عمیر کو دیکھ کر اسے ایک بار پھر چونکنا پڑا۔ وہ یونیفارم بدل چکا تھا۔ جس کا مطلب تھا، اسے کالج سے آئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ تانیہ کو یقین نہیں ہوا کہ وہ پچھلے تین چار گھنٹوں سے ایک ہی حالت میں بیٹھی تھی۔

’’بیٹھے بٹھائے کھو جانے کی عادت یا دادا جان کی ہے یا پھر پاپا کی۔ آپ نے یہ عادت کب سے اپنا لی؟ اتنی دیر سے آپ کو آواز دے رہا ہوں، مگر آپ ہیں کہ کچھ سنتی ہی نہیں۔‘‘

’’وہ...... میں کچھ سوچ رہی تھی۔‘‘ وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ’’عذیر کہاں ہے؟‘‘

’’ڈائننگ ٹیبل پر آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ اور دادا جان بھی وہیں ہیں۔‘‘

’’چلو پھر۔‘‘ وہ ڈائننگ روم میں آگئی۔ اُسے بھوک نہیں تھی پر سب کا ساتھ دینے کو اُس نے تھوڑے سے چاول پلیٹ میں نکال لئے۔

’’آپی! صبح بتا دیا ہوتا، آپ چھٹی کرنے والی ہیں۔ میں بھی کالج نہیں جاتا۔‘‘

’’بہت اچھا کیا میں نے جو صبح نہیں بتایا۔ ورنہ بے کار کالج بنک کرتے۔‘‘ وہ عذیر کے تاسف سے بولنے پر بولی تو عمیر ہنسا۔

’’یوں بھی اس کے ساتھ پورا دن بتانا آسان نہیں۔ وہ تو میری ہی ہمت ہے جو اسے جھیل لیتا ہوں۔‘‘ دادا جان، تانیہ اور عمیر ہنسنے لگے تو وہ منہ بنا کر شکایتی انداز میں بولا۔

’’تم دونوں کیوں ہر وقت اسے چھیڑتے رہتے ہو؟‘‘ اس کی دادرسی میں دادا جان ذرا رعب سے بولے تو عمیر جھٹ سے بولا۔

’’ہمیں چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ پیدائشی چھیڑا ہوا ہے۔‘‘ اور پھر تانیہ کے ساتھ مل کر ہنسنے لگا۔ بات

صحیح تھی اس لئے اظہر فاروقی بھی مسکرائے تو عذیر بے چارہ اور روہانسا ہو گیا۔
''روتے نہیں بیٹا! تم ان نامعقولوں کو چھوڑو اور کھانا کھاؤ'' انہوں نے اسے پچکارتے ہوئے نوالہ اس کے منہ میں رکھا تو وہ سچ مچ بہل کر کھانے لگا۔
''دیکھا، تم تینوں میں ایک عذیر ہی ہے جو سیدھا اور معصوم ہے۔ اور تم دونوں ہر وقت اس کی معصومیت کا مذاق اُڑاتے ہو۔''
عذیر نے یوں گردن اکڑا کر دیکھا جیسے اظہر فاروقی نے اسے کوئی اعزاز بخشا ہو۔ اور اس کی اس حرکت پر وہ دونوں اور بھی ہنسنے لگے۔

❁❁❁

وہ بھی ایک سہانی شام کا منظر تھا۔ گرم گھاس پر بھری ہوئی ٹرے تھامے وہ سہج سہج قدم اُٹھاتی لان میں رکھی چیئرز کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی جن پر براجمان اظہر فاروقی اور نورالہدیٰ دنیا و مافیہا سے بے خبر نہ جانے کن باتوں میں اُلجھے تھے۔ ان دونوں نے ہی اس کی آمد کو محسوس نہیں کیا تھا بلکہ نورالہدیٰ تو اس وقت چونکے جب ٹرے رکھنے کے لئے جھکتے ہوئے اس کا کاسنی دوپٹہ شانے سے سرک کر گھٹنے پر رکھے ان کے ہاتھ پر آ پڑا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ کندھے پر ڈالتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں بڑا سا کپ اٹھا کر بابا جان کی طرف بڑھایا۔ مگر انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار ایک دم ہی اپنے سامنے پھیلا لیا۔ وہ سُن سی ہو گئی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اظہر فاروقی نے اسے اپنی طرف کپ بڑھاتے نہ دیکھا ہو۔ نورالہدیٰ کو بھی ان کی حرکت اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ خود کو بولنے سے روک نہ پائے۔
''بابا جان! وہ آپ کو کپ پکڑا رہی ہے۔''
اظہر فاروقی نے ذرا سا اخبار کا کونا نیچے کرتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا۔
''ٹیبل پر رکھ دو نا بیٹا!'' اور پھر سے اخبار اپنے سامنے کیا۔ اُس نے کپ ان کے سامنے رکھا اور اسی خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کا چہرہ پتھر کی طرح بے جان تھا۔ ہر بار اپنے نظر انداز کئے جانے پر اس کی کیفیت اتنی ہی شدید ہو جایا کرتی تھی۔ نورالہدیٰ اُس کی اس قدر حساسیت پر اکثر حیران اور کبھی کبھار تو پریشان ہو جاتے۔ اُسے اس ٹرانس سے باہر لانے کے لئے نورالہدیٰ نے کپ اُٹھا کر اس کے سامنے کیا اور اپنی عادت کے مطابق بشاشت سے بولے۔
''کیا شام کی چائے پینا بھی چھوڑ دیا ہے؟''
اُس نے چونکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور سادگی سے مسکراتے ہوئے ان کے ہاتھ سے کپ لے کر

گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

''گھر میں بیکار بیٹھ کر کیا کرو گی؟ تم یونیورسٹی میں ایڈمیشن کیوں نہیں لے لیتی؟'' اُنہیں لگتا تھا، اس کی حد سے بڑھی ہوئی حساسیت کی وجہ تنہائی ہے۔ حالانکہ گھر میں بابا جان اور خود وہ موجود تھے مگر نورالہدیٰ اپنی مصروفیت کی وجہ سے اسے ٹھیک سے ٹائم نہیں دے پاتے تھے۔ اور بابا جان گو کہ ریٹائرڈ تھے مگر الگ تھلگ رہنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے سوچا، یونیورسٹی جانے سے اس کی تنہائی ختم ہو جائے گی۔ اور پھر شاید اس کی جذباتیت بھی کم ہو جائے۔ مگر اس نے فوراً ہی ان کے خیال کو مسترد کر دیا۔

''بی اے کر لیا، کافی ہے۔ مجھے آگے نہیں پڑھنا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ ٹوک کر بولے۔

''بس۔'' کچھ سمجھ نہیں آیا تو اس نے کندھے اچکا دیئے۔

''بس کیا؟'' وہ کبھی کبھار ہی بڑے پن کا رعب جھاڑتے تھے۔ اور جب ایسا کرتے، بڑے آرام سے مرعوب ہو جاتی جیسے ابھی ہو گئی تھی۔ وہ اسی لہجے میں بولے۔

''میرا خیال ہے، ایڈمیشن تو اوپن ہو چکے ہوں گے۔ میں کسی دن فارم لے آؤں گا۔ تم بس فل کر دینا۔''

''مگر ہادی بھائی! مجھے آگے نہیں پڑھنا۔'' وہ منمنائی۔

''کیوں؟'' ان کا انداز ہنوز وہی تھا۔

''مجھے کورس کی کتابیں اچھی نہیں لگتیں۔'' بڑا معصوم سا انداز تھا۔ نورالہدیٰ مسکرا دیئے۔

''پھر کیا اچھا لگتا ہے؟''

''بتاؤں؟'' وہ اسی بھولپن سے جوش میں بولی، پھر ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر شروع ہو گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دور تک پھیلے آسمان کو دیکھا اور کہا۔

''مجھے آسمان کو دیکھنا اچھا لگتا ہے، اس میں اُڑتے بادل اور پرندوں کی چہکار، سورج کی کرنیں اور چاند کی چاندنی، پھول، تتلی، خوشبو، صحرا میں بہتی ہوا کی آواز، سمندر کی لہریں، سردیوں کا موسم۔'' بولتے بولتے وہ اچانک ہنس پڑی، پھر انہیں دیکھ کر بولی۔ ''ہادی بھائی! مجھے زندگی اچھی لگتی ہے۔''

وہ ہنس پڑے۔ مگر وہ ایک دم سے چپ ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ پھر اس نے کپ ٹیبل پر رکھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر گھاس پر بابا جان کے قدموں میں بیٹھ گئی جو لاتعلق سے اخبار میں گم تھے۔ انہیں متوجہ کرنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ اظہر فاروقی کے گھٹنے پر رکھ دیئے۔ انہوں نے اخبار ہٹا کر اسے دیکھا۔

''بابا جان! آرٹس کونسل میں نوآموز مصوروں کی پینٹنگز کی نمائش ہو رہی ہے۔ میں نے بھی اپنا نام دیا تھا۔ اور پتہ ہے، میرا سلیکشن بھی ہو گیا ہے۔ سترہ دسمبر سے تین دن کی نمائش ہے۔ آپ آئیں گے نا؟'' جوش میں بولتے آخر میں اس کا لہجہ منت بھرا ہو گیا تھا۔

''تم جانتی ہو کہ بھیڑ بھاڑ والی جگہوں پر جانا مجھے پسند نہیں۔'' انہوں نے مکمل انکار نہیں کیا تھا، اسی سے حوصلہ پکڑ کر وہ بولی۔

''مگر تھوڑی دیر کو تو جا سکتے ہیں بابا جان! یہ میری پہلی ایگزیبیشن ہے اور اس بہانے آپ میری پینٹنگز بھی دیکھ لیں گے۔ جانتے ہیں، اس بار میں نے اسٹل لائف اور لینڈ اسکیپنگ کے علاوہ سی اسکیپس بھی بنائے ہیں۔ اور کیلی گرافی تو میں نے پہلی بار ہی کی ہے۔ پچھلے مہینوں میں، میں نے اتنے سارے نئے کینوس بنا لئے ہیں اور آپ نے ابھی تک کوئی بھی نہیں دیکھا۔''

''اگر دکھانا مقصود ہے تو آج ہی ایک نشست تمہارے کمرے میں رکھ لیتے ہیں۔ لیکن میں ایگزیبیشن میں نہیں آپاؤں گا۔ آرمی لائف کے دوران بھی پُر ہجوم جگہوں پر جانا مجھے پسند نہیں تھا اور اب تو میں ریٹائرڈ لائف گزارتے گھر تک ہی محدود ہو گیا ہوں۔ اینی وے، بیسٹ آف لک۔''

'کیا ہو جاتا اگر بابا جان اس کا دل رکھنے کی خاطر کچھ دیر چلے جانے کی ہامی بھر لیتے۔' نورالہدیٰ نے تاسف سے سوچ کر اسے دیکھا۔

اس نے اپنی آنکھیں جھکا رکھی تھیں پھر بھی اس کی پلکوں پر لرزتے آنسو نورالہدیٰ کو صاف نظر آئے تھے۔ نورالہدیٰ بے چین ہو کر اُٹھے اور اس کے پاس والی چیئر پر بیٹھ کر ٹیبل پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ کے نیچے سے نکالا اور اُٹھ کر یوں ہی رخ پھیرے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

جوتوں سمیت بیڈ پر چت لیٹے نورالہدیٰ کو اپنی کنپٹیوں پر نمی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھے۔ اپنے چہرے پر سے آنسوؤں کو صاف کر کے ہاتھ اپنی آنکھوں کے سامنے کیا اور پوروں پر ٹھہری نمی کو دیکھنے لگے۔

'جو آج تم یہاں ہوتیں تو دیکھتیں کہ جو آنسو تمہاری آنکھوں سے نہ بہہ سکے وہ ستائیس سالوں سے میرا چہرہ بھگو رہے ہیں۔'

بے سبب تو نہیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا
ضبط کا حوصلہ بڑھا لینا
آنسوؤں کو کہیں چھپا لینا
کانپتی ڈوبتی صداؤں کو
چپ کی چادر سے ڈھانپ کر رکھنا
بے سبب بھی کبھی ہنسنا
جب ہو بات کوئی تلخی کی

موضوعِ گفتگو بدل دینا

بے سبب تو نہیں تیری یادیں

تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا

وہ تھکے تھکے سے اُٹھے اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ پورچ کی تیز روشنی میں تانیہ بار بار ہارن بجا رہی تھی۔ پھر اظہر فاروقی چند لمحوں بعد اپنے پوتوں کے ساتھ نظر آئے۔

"سنبھلنے کے لئے ہمیشہ ٹھوکر کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟" فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھتے اظہر فاروقی کو دیکھ کر انہوں نے سوچا تھا۔

❁❁❁

ہاتھ میں بکے پکڑے تانیہ نے ہسپتال کے انفارمیشن کاؤنٹر پر شایان کے فادر کا نام بتا کر ان کا رُوم نمبر پوچھا۔

"رُوم نمبر 5۔" دُبلی پتلی لڑکی نے کمپیوٹر سے چیک کر کے اسے بتایا۔

"تھینکس۔" کہہ کر تانیہ لفٹ کی طرف آئی۔ لفٹ سے نکلتے ہی تانیہ کو سامنے سے فائزہ آتی دکھائی دی۔ پاس آنے پر وہ بولی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"گھر" فائزہ نے جواب دے کر پوچھا۔ "مگر پرسوں کیا ہوا تھا؟ تھوڑی دیر کا کہہ کر تم تو غائب ہی ہو گئیں۔"

"ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا" اس نے کہا۔ فائزہ گھر جانے کا ارادہ ترک کر کے اس کے ساتھ ہی چلتے ہوئے روم میں آ گئی۔

پہلا قدم کمرے میں رکھتے ہی تانیہ نے شایان کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا مگر جان بوجھ کر نظر انداز کر کے وہ بیڈ پر لیٹے شخص کی طرف آ گئی۔ بیڈ کے ساتھ ہی رکھی میز پر بکے رکھ کر اس نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"ان کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"کافی بہتر ہے۔" اپنے پیچھے سے شایان کی بھاری آواز سن کر وہ سنبھل کر پلٹی۔ کوشش کر کے حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"تم....." پھر قصداً مسکرائی۔ "سوری، میں نے تمہیں دیکھا نہیں۔" تبھی اس کی نظر صوفے پر بیٹھی سبز آنکھوں والی عورت پر پڑی۔ اس نے فوراً انہیں سلام کیا اور فائزہ کی طرف دیکھنے لگی کہ ان کا تعارف کروائے گی۔ خود سے وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ وہ شایان کی مدر ہیں یا کوئی رشتہ دار۔ ایسا ہی سوال تانیہ کے لئے ان کی آنکھوں میں تھا۔ فائزہ نے دانستہ ان سوالوں سے آنکھ چراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے، باہر چل کر بات کرتے ہیں۔ یہاں ہماری آواز سے انکل کی نیند خراب ہو گی۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی تو تانیہ اور شایان بھی آگے پیچھے باہر آ گئے۔ تانیہ، فائزہ کے ساتھ ہی بینچ پر

بیٹھ گئی۔شایان دیوار سے کمر ٹکائے سامنے کھڑا تھا۔اتنی دیر میں پہلی بار تانیہ نے اس کی طرف دیکھا۔بلیو جینز اور وائٹ شرٹ پہنے اس کا حلیہ رف سا تھا۔کالے بال بے ترتیبی سے ماتھے پر پڑے تھے۔شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں کے نیچے حلقے نظر آ رہے تھے۔

'اپنے فادر کے لئے بہت پریشان ہے۔' تانیہ نے دل میں اس کے لئے ہمدردی محسوس کی۔

''بہت اپ سیٹ ہو؟'' آخر اس نے بات شروع کی۔

''ابو میری زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر ان کی تکلیف نہیں۔''

''انشاء اللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' تانیہ نے دل سے کہا۔

''آج کل کیا کر رہی ہو؟'' وہ بات بدلنے کو بولا۔

''کچھ خاص نہیں۔''

''تو کرو نا۔اور کتنا انتظار کرواؤ گی؟''

''کیا مطلب؟.......میں سمجھی نہیں۔''

''شادی کی بات کر رہا ہوں۔ویسے تم دونوں نے بہت مایوس کیا ہے۔کیریئر کے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔ورنہ میرا خیال تھا، ایم بی اے کی ڈگریاں ملتے ہی تم دونوں ڈولی میں بیٹھ جاؤ گی۔'' جان بوجھ کر اس نے یہ ٹاپک شروع کیا ہے، اس خیال سے تانیہ کو اس پر غصہ آنے لگا۔فائزہ بھی کچھ چڑ گئی۔

''تم اپنا خیال چھوڑو اور انکل کا خیال کرو۔کتنا ارمان ہے انہیں تمہارے سر پر سہرا دیکھنے کا۔یوں بھی عمر میں تم ہم دونوں سے ہی تین سال بڑے ہو۔پہلے تمہاری شادی ہو گی۔ہمارا نمبر تو بعد میں آئے گا۔''

''میں اس کی شادی تک انتظار نہیں کرنے والی۔''

''مطلب؟'' فائزہ نے پوچھا۔

''میں شادی کر رہی ہوں۔'' وہ غصے میں بنا سوچے سمجھے ہی بول گئی۔

''زبردست۔'' شایان کی آواز پر اس نے اس کی طرف دیکھا۔اگر کوئی اُمید تانیہ کے دل میں تھی بھی تو اس وقت ختم ہو گئی۔شایان کے چہرے پر خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔''کب کر رہی ہو شادی؟''

''بہت جلد۔'' وہ جز بز ہو کر بولی۔

''شادی میں بلاؤ گی نا؟''

''آف کورس۔اور بھلا میری شادی تمہارے بنا ہو سکتی ہے؟'' وہ دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو شایان بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔پھر وہ فوراً ہی اُٹھ گئی۔

''اچھا فائزہ! میں اب چلتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔میں شام کو فون کروں گی۔''

''بائے۔'' وہ کہہ کر شایان کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے چلتی لفٹ کا انتظار کرنے کی بجائے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی۔

شایان کوریڈور کے بیچوں بیچ کھڑا اُسے لمحہ لمحہ خود سے دُور جاتا دیکھ رہا تھا۔ فائزہ اُٹھ کر اس کے پاس آکر بولی۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شایان! تم نے کبھی تانیہ سے محبت کی ہی نہیں۔'' اس کی آواز میں تپش محسوس کر کے شایان نے اسے دیکھا اور دھیمی آواز میں کہا۔

''محبت کرتا ہوں، اسی لئے تو......'' پھر ہونٹ کاٹ کر بیچ میں ہی چپ ہو گیا۔

''تب تو مجھے تم پر غصہ نہیں، ترس آنا چاہیے۔ محبت سے ڈر جانے والے کمزور شخص پر ترس ہی آسکتا ہے۔'' بول کر وہ رُکی نہیں، ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی اور شایان شکستہ سے انداز میں وہیں بینچ پر بیٹھ گیا۔

❁❁❁

انٹرنس سے اندر پیر رکھتے ہی تانیہ نے ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں کو سنا، وہ وہیں رک گئی۔ اندر مریم کے مہمان آئے بیٹھے تھے۔ اندر سے آتی آوازوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ عروسہ بھی ڈرائنگ روم میں موجود تھیں مگر وہ اس وقت کسی میل ملاپ کے موڈ میں نہیں تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور لاؤنج کی سیڑھیاں ٹھیک ڈرائنگ روم کے سامنے تھیں اور یہی سیڑھیاں اس زینے تک جاتی تھیں جس پر تانیہ کا کمرہ تھا۔ اب اگر وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیوں تک آتی تو کھلے دروازے سے اسے دیکھا جاسکتا تھا۔ تانیہ نے کچھ سوچ کر دروازہ بند کیا اور باہر آگئی۔ لان کا چکر کاٹ کر وہ قصرِ فاروقی کے پچھلے حصے کی طرف نکل آئی۔

اب اس کے سامنے سیاہ آبنوس کا بے حد لمبا اور کافی چوڑا منقش دروازہ تھا مگر اس دروازے کے دونوں پٹوں کو پکڑ کر دھکیلتے ہوئے تانیہ کو کچھ زیادہ طاقت نہیں لگانی پڑی۔ دروازہ کھلتے ہی تانیہ پر جیسے طلسم ہوشربا کا کوئی باب کھلا تھا۔ کم از کم تانیہ کو یہ جگہ کسی جادونگری کی طرح ہی لگا کرتی تھی۔ قصرِ فاروقی کا یہ پورشن باقی گھر سے الگ تھلگ تھا اور تقریباً نہ استعمال ہونے والا تھا۔ تانیہ نے ایک قدم اٹھایا اور وسیع ہال میں آگئی۔ ہال کے دونوں جانب آمنے سامنے دو دروازے تھے۔ بائیں طرف کا دروازہ ڈائننگ روم میں کھلتا تھا جس کے ایک جانب کچن موجود تھا۔ ڈائننگ روم میں دوسری طرف ایک اور دروازہ تھا جو راہداری سے جڑا تھا جس کے آگے لاؤنج تھا۔

دوسرا دائیں جانب کا دروازہ ایک لمبے کوریڈور میں پہنچتا جس کے آگے سٹنگ روم اور اس سے آگے لاؤنج تھا۔ لاؤنج میں بائیں جانب اظہر فاروقی کا کمرہ اور اس کے ساتھ ہی لائبریری سے ملحق اسٹڈی تھی جبکہ دائیں جانب رہائشی کمرے تھے اور دائیں جانب سے ہی سیڑھیاں اوپر کے کاریڈور تک جاتی تھیں جہاں دونوں

جانب کمروں کی قطاریں تھیں۔ یعنی اگر کوئی اس ہال کے ایک دروازے سے نکلتا تو پورے قصرِ فاروقی کا چکر کاٹ کر واپس یہیں آ پہنچتا۔

اس پورشن کی یہ انوکھی خصوصیت تھی کہ وہ بیک وقت گھر کے ہر حصے سے جڑا بھی تھا اور پورے گھر سے الگ بھی تھا۔ ہال کے داخلی دروازے کے سامنے دبیز قالین کا بڑا سا ٹکڑا تھا جس کے ساتھ رکھا لکڑی کا آرام دہ فرنیچر اسے نشست گاہ کا روپ دے رہا تھا۔ دائیں طرف کی دیوار پر بڑا سا آئینہ تھا جس پر آرٹ ورک کیا گیا تھا۔ آئینے کے نیچے ایک چھوٹی میز کے ساتھ دو کرسیاں تھیں۔ جبکہ ہال کی باقی دیواروں پر بھی کئی طرح کی پینٹنگز آویزاں تھیں اور چھت سے بڑا سا جھومر لٹک رہا تھا۔ ناک کی سیدھ میں تھوڑا آگے جا کر سیڑھیاں تھیں جن کے بائیں جانب ایک اونچا لکڑی کا اسٹول تھا جس پر گھومنے والے ڈائلر کے ساتھ پرانی طرز کا فون رکھا تھا مگر اس فون کا کنکشن نکال دیا گیا تھا۔

سیڑھیوں کے اوپری زینے کے سامنے ایک دروازہ تھا جس کے دونوں پٹوں سے لٹکتی زنجیر میں تالا لگا تھا۔ تانیہ نے ہمیشہ یہی سنا تھا کہ وہ کمرہ سٹور روم ہے۔ یہ جگہ اتنی کشادہ تھی اور دروازے سے سیڑھیوں کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ زینے والے کمرے کی بالکونی عمارت کے سامنے کی طرف سے دائیں جانب کھلتی تھی۔ ویسے تانیہ کے لئے تو اسٹور روم میں بالکونی کی موجودگی کافی حیران کن تھی۔ جبکہ بالکونی میں بڑا سا لکڑی کا جھولا تھا اور چھت سے ونڈ چائمز لٹک رہے تھے، جن کا مدھر سنگیت چاندنی رات میں مبہوت کر دیا کرتا تھا اور اضافی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ بالکونی میں رکھے گملوں میں لگے پودے اور مورننگ گلوری کی خوب صورت بیل ہری بھری تھی لیکن تانیہ نے کبھی کسی کو انہیں پانی دیتے نہیں دیکھا تھا۔

گھر کے کسی فرد سے تو پوچھنا ہی بے کار تھا مگر نوکروں سے بھی ایک آدھ بار اس نے جاننا چاہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کبھی اس کمرے میں نہیں گئے۔ اس ہال کے تمام دروازے، سیڑھیوں اور زینے کی ریلنگ، حد تو یہ ہے کہ تمام فرنیچر بھی منقش آبنوسی لکڑی کا تھا۔ یوں تو سارا قصرِ فاروقی ہی سفید سنگِ مرمر سے بنا تھا مگر سیاہ اور سفید کا یہ پُرکشش امتزاج گھر کے اور کسی حصے میں نظر نہیں آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ باقی گھر کی رینویشن تو ہوتی رہی مگر اس حصے کو جان بوجھ کر ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ یہاں وقت کو قید کر دیا گیا تھا۔

ہال کے دروازے سے اندر داخل ہو کر بائیں طرف کے دروازے سے گزر کر ڈائننگ روم میں آتے تانیہ کو محض چند سیکنڈ ہی لگے تھے مگر اسے یوں لگا، جیسے ایک عہد سے گزر آئی ہو۔ لاؤنج میں قدم رکھنے سے پہلے اس نے ڈرائنگ روم سے آتی آواز پر دھیان دیا۔ وہ سب بدستور گپ شپ میں مصروف تھے۔ تانیہ اطمینان سے اظہر فاروقی کے کمرے تک آئی اور دستک دینے والی تھی کہ کسی نے کہا۔

”کرنل صاحب اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔“ تانیہ نے مڑ کر بہادر کو دیکھا جو ڈرائنگ روم میں چائے لے

کر جاتا اسے دیکھ کر رُک گیا تھا۔

''کہاں گئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''زمینوں پر گئے ہیں۔ کل شام تک آ جائیں گے۔ آپ کو کچھ کام تھا تانیہ بی بی؟''

''نہیں۔ تم جاؤ۔'' تانیہ نے اسے جانے کو کہا، پھر خود ہی اسے آواز دے کر روک لیا۔ ''بہادر!''

''جی تانیہ بی بی؟'' وہ روبوٹ کی طرح واپس مڑا۔

''جب مہمان چلے جائیں تو مجھے بتا دینا، میں دادا جان کے کمرے میں ہوں۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ کہہ کر چلا گیا تو تانیہ دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر تک تو وہ یوں ہی کھڑی رہی جیسے سوچ رہی ہو، اب کیا کرے۔ پھر اس نے ہینڈ بیگ بیڈ پر ڈالا اور خود بھی جوتے اتار کر آرام سے لیٹ گئی۔ وہ جس زاویے سے لیٹی تھی، آتش دان کے اوپر لگی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ کرنے کو اور تو کچھ تھا نہیں، وہ یوں ہی اس تصویر کو دیکھنے لگی۔

یہ تصویر کسی اُنیس، بیس سال کی نوجوان لڑکی کے چہرے کا کلوز اپ تھی۔ کشادہ پیشانی پر تیکھے ابرو کمان کی طرح کاٹ دار تھے۔ بڑی بڑی سنہری مائل غلافی آنکھیں جن پر خم دار پلکوں کی گھنی جھالر تھی۔ ستواں ناک، گال سرخی مائل بھرے بھرے تھے۔ ہونٹ گداز اور ٹھوڑی قدرے باریک تھی۔ چہرے کی رنگت کندنی تھی جس کے اطراف میں شہد جیسی رنگت والے سلکی لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں میں موتیوں کے آویزے لٹک رہے تھے اور کندھوں پر پڑا سفید دوپٹہ بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ جو بھی تھی، بلاشبہ حسین تھی۔ مگر حُسن بھی تو دو طرح کا ہوتا ہے۔ کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جن کو دیکھتے ہی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ کیونکہ کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ پھر جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو ذہن یوں ہڑبڑا کر جاگتا ہے جیسے نیند سے جاگا ہو۔ پھر جتنی بار انہیں دیکھا جائے، اپنی کشش کھوتے جاتے ہیں۔

البتہ کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو آنکھوں کو چندھیاتے نہیں، باندھ لیتے ہیں یوں کہ پھر کسی اور طرف دیکھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ پھر چاہے وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں، ان کا اثر باقی رہتا ہے۔ اور جتنی بار وہ سامنے آئیں، لگتا ہے پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ اس لڑکی کا چہرہ بھی ان چہروں میں سے تھا جن سے نظر نہیں ہٹتی۔ بالکل اسی طرح، جیسے اب تانیہ کی نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ تانیہ نے کئی بار دیکھا تھا کہ اظہر فاروقی کسی بت کی طرح بیٹھے گھنٹوں اس تصویر کو تکا کرتے تھے۔ ان کی محویت پر تانیہ کو حیرت ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب خود اس تصویر کو دیکھتے ہوئے بالکل محو ہو چکی تھی۔ مگر اس کی محویت کی وجہ محض اس لڑکی کا حُسن نہیں تھا۔ تانیہ نے وہ تصویر تو سینکڑوں بار دیکھی تھی مگر تصویر والی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں اسے یہ چہرہ بہت مانوس لگتا تھا۔ اس کے ذہن میں وہ سوال سر اُٹھا رہے تھے جو بچپن میں اس تصویر کو دیکھ کر اس کے ذہن میں آتے تھے۔

'وہ کون ہے؟...... اس کی تصویر اس گھر میں کیوں لگی ہے؟...... اس کا اس گھر کے مکینوں سے کیا تعلق

ہے؟'' مگر تانیہ جانتی تھی کہ ان سوالوں کو سوچ لینا جتنا آسان ہے، ان کے جواب جان پانا اتنا ہی مشکل۔ اسے یاد تھا، ایک بار جب وہ بہت چھوٹی تھی تو اس نے مریم سے پوچھا تھا۔

''ماما! وہ لڑکی کون ہے جس کی تصویر دادا جان کے کمرے میں لگی ہے؟''

''تمہیں اُس کے بارے میں جاننا ہے؟'' وہ ایک دم غیض وغضب سے بولیں۔ تانیہ نے چاہا انکار کر دے مگر ننھی سی بچی سہم کر ہاں میں سر ہلا بیٹھی۔ پھر کیا تھا۔ مریم نے جھپٹ کر اس کا بازو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا اور اس کے گالوں پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

نورالہدیٰ نے مریم کو اس حرکت پر ڈانٹا اور کونے میں کھڑی دہشت سے کانپتی تانیہ کے پاس آئے۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہو چکی تھی کہ رو بھی نہیں پا رہی تھی اور رونے کی کوشش میں اس کے حلق سے لایعنی آواز ہی نکل رہی تھی۔ پانچ چھ سال کی بچی کو گود میں اٹھا کر وہ صوفے پر آ بیٹھے۔ کتنی ہی دیر تک نورالہدیٰ اسے اپنے سینے سے لگائے تھپکتے رہے۔ وہ کبھی اس کے بالوں میں اُنگلیاں چلاتے، کبھی اس کے مسلے گئے گالوں پر پیار کرتے۔ بہت دیر بعد کہیں جا کر وہ نارمل ہوئی تھی۔ مگر اس کے ذہن میں خوف بیٹھ چکا تھا۔ پھر کچھ دن بعد اظہر فاروقی نے اسے بہت نرمی سے سمجھایا کہ وہ کبھی تصویر والی لڑکی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرے گی۔ اس کا خوف کچھ اور گہرا ہو گیا۔ پھر اس نے خوف کے مارے کبھی اس لڑکی کا ذکر نہیں کیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ تانیہ کا خوف تو ختم ہو گیا مگر وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ وہ لڑکی چاہے جو بھی ہو اس کا ذکر شجرِ ممنوعہ ہے۔ پھر ایسے سوال کرنے کا کیا فائدہ جن کا جواب نہ ملے۔ یہ سوچ کر اس نے کبھی اس لڑکی کے بارے میں اپنے ذہن میں تجسس پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔ بھلا اگر دادا جان کے کمرے میں کسی لڑکی کی تصویر لگی ہے تو لگی رہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک دم سے تانیہ کو احساس ہوا جیسے وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت ضائع کر رہی ہے۔ وہ بے زاری سے رخ بدل کر اُٹھ بیٹھی۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی کبھی نہیں بتائے گا کہ یہ کون ہے؟'' اس نے کوفت سے اپنا سر جھٹکا اور بیڈ سے اُٹھنے ہی والی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی نظر دادا جان کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھی ریڈ ڈائری پر اتفاقاً ہی پڑ گئی تھی۔ لوگ ڈائری لکھتے ہیں مگر اس نے دادا جان کو ہمیشہ ڈائری پڑھتے دیکھا تھا۔

'دیکھوں تو اس ڈائری میں کیا لکھا ہے؟' اس کے اندر تجسس جاگا۔ ٹیبل سے ڈائری اٹھا کر وہ دوبارہ بیڈ پر آ بیٹھی۔ تکیہ رکھ کر نیم دراز ہوتی وہ ڈائری کا پہلا صفحہ کھول کر پڑھنے لگی۔

❁❁❁

میاں جی، نواب شاہ کے متمول اور با اثر زمیندار تھے۔ بلند و بالا حویلی سمیت کئی ایکڑ پر پھیلی زرعی اراضی پشتوں سے ان کی خاندانی جاگیر کے طور پر ورثے میں ان کے حصے میں آئی تھی۔ بیگم حیات نہیں تھی البتہ مرحومہ نے دو اولادیں چھوڑی تھیں اور دونوں ہی بیٹے تھے۔ بڑے مظہر فاروقی اور چھوٹے اظہر فاروقی۔ مظہر

فاروقی، میاں جی کی طرح ہی پکے زمیندار تھے اور واجبی سی تعلیم کے بعد ہی وہ زمینداری کے کاموں میں جت گئے۔ اظہر فاروقی کا مزاج تو زمیندارانہ تھا مگر انہیں اپنے آبائی پیشے سے کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ اس کے بجائے انہیں تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی تھی۔

میاں جی کو بیٹے کا شوق پسند تھا اور ساتھ ہی وسائل کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے اظہر فاروقی کو حصولِ تعلیم کے لئے بخوشی کراچی بھیج دیا جو اس وقت ایک اُبھرتا ہوا چھوٹا سا شہر تھا البتہ ہوسٹل کی رہائش انہیں پسند نہ تھی۔ جب تک اظہر فاروقی میٹرک کر کے کالج میں پہنچے، انہوں نے کراچی میں ہی وسیع رقبے پر حویلی کی تعمیر مکمل کروالی۔

ایک ہزار گز پر تعمیر کیا گیا قصرِ فاروقی، سفید سنگِ مرمر سے بنی پُرشکوہ عمارت تھی جس کے چاروں طرف دائرے کی شکل میں پانچ سو گز چوڑا خوب صورت لان تھا۔ باہر سے اگر یہ عمارت سبز و سفید کا شاہکار تھی تو اندر سے سیاہ و سفید کا عجوبہ۔ قصرِ فاروقی کی تزئین و آرائش میں لکڑی کا بکثرت استعمال ہوا تھا۔ وہ بھی صرف آبنوس کی لکڑی کا۔ اظہر فاروقی نے قصرِ فاروقی میں رہتے ہوئے ہی گریجویشن کا ایگزام دیا اور اس کے بعد آرمی میں جانے کی خواہش ظاہر کر دی۔ میاں جی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ چاہتے تھے، تعلیم حاصل کرنے کے بعد اظہر فاروقی واپس حویلی آ جائیں اور اظہر فاروقی کو یہ منظور نہیں تھا۔ آخر مظہر فاروقی ان کی مدد کو آئے اور نہ جانے کن مشکلوں سے انہوں نے اظہر فاروقی کو آرمی جوائن کرنے کی اجازت دلوا دی۔ بہر حال جب سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے تو انہیں بیٹوں کی شادی کا خیال آیا۔ اس معاملے میں اظہر فاروقی نے بڑے بھائی کی طرح ہی فرماں برداری سے سب کچھ ان پر چھوڑ دیا۔

میاں جی نے خود بہوؤں کے انتخاب میں احتیاط برتی۔ مظہر فاروقی کی بیگم نورین، زمیندار گھرانے سے تھیں البتہ چھوٹی بہو فریال کراچی کے پڑھے لکھے خاندان سے تھیں اور خود بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ شادی کے پہلے سال ہی مظہر فاروقی، بیٹے کے باپ بن گئے اور پوتے کی پیدائش کے چند ہفتوں بعد ہی میاں جی قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

دُکھ کتنا ہی بڑا ہو، زندگی نہیں رُکتی۔ یہی سوچ کر دونوں بھائی اپنی زندگیوں میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن اظہر فاروقی کے نصیب میں ایک دکھ اور لکھا تھا۔ اظہر فاروقی آرمی جوائن کرتے ہی مسافر ہو گئے تھے اور ان کا پڑاؤ کبھی ایک تو کبھی دوسرے شہر ہوتا۔ مگر فریال کو بھی گاؤں کا ماحول پسند نہیں تھا اور اظہر فاروقی کی غیر موجودگی میں ان کا حویلی میں رہنا ایسا ضروری بھی نہیں تھا اس لئے وہ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی قصرِ فاروقی شفٹ ہو گئیں۔ لیکن ان کا اپنے سسرال سے مکمل رابطہ تھا۔ کبھی وہ خود حویلی چلی جاتیں تو کبھی ان کے جیٹھ اور جیٹھانی، بیٹے کو ساتھ لئے کراچی آ جاتے۔ اس بار بھی ان کی واپسی ایک لمبے قیام کے بعد ہوئی تھی۔ مگر وہ نواب شاہ تک نہیں پہنچ سکے۔ راستے میں ہی ان کی کار کا مسافر کوچ کے ساتھ زبردست

تصادم ہوا تھا۔ حادثے کی اطلاع ملتے ہی اظہر فاروقی جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ مگر جب وہ پہنچے تو ان کے بھائی اور بھابی دم توڑ چکے تھے لیکن تین سال کا ان کا بیٹا معجزانہ طور پر محفوظ رہا تھا۔ بھائی، بھابی کی تدفین سے فارغ ہو کر جب دونوں میاں بیوی نے رختِ سفر باندھا تو اس ننھے سے بچے کو بھی ساتھ کراچی لے آئے۔

فریال کی اپنی گود تو اب تک خالی تھی، انہوں نے بہت آسانی سے اس بچے کو اپنے بیٹے کی حیثیت سے قبول کر لیا اور بہت جلد ہی وہ ان کی زندگی کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ شادی کے ساتویں برس منتوں اور دعاؤں کا ثمر بن کر پیدا ہونے والی ملیحہ فاروقی بھی اس کے لئے فریال کی محبت کو کم نہ کر سکی۔ پھر اس کے سات سال بعد جیسے اظہر فاروقی حصولِ تعلیم کے لئے کراچی آئے تھے، اپنے بھتیجے کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیج دیا مگر چار سال بعد ہی انہیں واپس آنا پڑا۔ ملیحہ کی پیدائش کے وقت ہی فریال کو کچھ پیچیدگیوں سے گزرنا پڑا تھا اور پھر اس کے بعد وہ مستقل بیمار رہیں اور گیارہ سال کی بیماری کے بعد وہ خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ پالنے والی ماں کو کندھا دے کر وہ پھر لندن سدھار گئے۔ مگر ملیحہ کی زندگی میں خلا ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا۔ حالانکہ بابا جان نے بہت جلد ہی ریٹائرمنٹ لے لی شاید ملیحہ کی تنہائی کے خیال سے۔ مگر پاس ہونے اور ساتھ ہونے میں فرق ہوتا ہے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ وہ یا تو اپنی اسٹڈی میں وقت گزارتے ہیں یا اپنے پرانے دوست ملک ناصر کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہیں۔ اور میری یعنی ملیحہ فاروقی کی روٹین بھی بس یوں ہی سی ہے۔ میں نے حال ہی میں گریجویشن کیا ہے اور میرا سارا وقت گھرداری میں یا پھر پینٹنگ میں گزرتا ہے۔ ہاں روز ہی کچھ وقت نکال کر میں لائبریری چلی جاتی ہوں۔ ویسے تو بابا جان کی لائبریری میں میرے لئے بہت سی کتابیں ہیں مگر لائبریری جانے کی وجہ صرف اتنی ہے کہ میں اس تنہائی سے کچھ دیر کو پیچھا چھڑا سکوں جو امی جان کے انتقال کے نو سال بعد بھی مجھے بوکھلا دیتی ہے۔ مگر اب شاید تنہائی کا احساس کچھ کم ہو جائے۔

پڑھائی ختم کر کے نورالہدیٰ نے لندن میں جاب بھی کر لی تھی۔ پر اب سنا ہے کہ بابا جان کے بھتیجے ہمیشہ کے لئے واپس آ رہے ہیں۔

تانیہ کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی۔ پھر اس نے اس لائن کو دوبارہ پڑھا۔ پھر تیسری اور چوتھی بار۔ ہر بار پڑھنے سے ایک ہی بات سمجھ میں آئی۔

''پاپا، دادا جان کے بیٹے نہیں ہیں۔'' یہ اس کے لئے انکشاف تھا۔ وہ سوچنے لگی، اگر یہ بات سچ ہے تو بھی چھپائی کیوں گئی؟ بھلا اس بات کے پتہ چل جانے میں کیا حرج ہے؟

اظہر فاروقی اگر نورالہدیٰ کے چچا بھی تھے تو تانیہ کے بہر حال دادا ہی تھے۔ پھر اس نے سوچا، جب تک وہ سب کچھ جان نہیں لیتی، اس بات کو خود تک محدود رکھے گی۔ اسی وقت دستک کی آواز پر تانیہ اُچھل گئی۔ اس نے جلدی سے ڈائری اپنے پیچھے چھپا لی۔

''دروازہ کھلا ہے۔'' اس کی آواز پر ملازمہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

''مہمان چلے گئے ہیں تانیہ بی بی! اور سب آپ کا کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔''

''پاپا آگئے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم چلو، میں آتی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد وہ ڈائری ہاتھ میں لئے اُٹھی اور چلتے ہوئے تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''مجھے شک سا ہو رہا ہے کہ ملیحہ فاروقی آپ ہی ہیں۔ اور اگر آپ ملیحہ ہیں تو یہ ڈائری بھی آپ نے ہی لکھی ہوگی۔ ہمیشہ سے میرا دل چاہتا تھا کہ میں آپ کے بارے میں کچھ جان پاؤں۔ اور اب یہ ڈائری مجھے آپ کے بارے میں کافی کچھ بتانے والی ہے۔ مگر گھبرائیے مت، پڑھ کر آپ کی ڈائری واپس کر دوں گی اور اس میں جو بھی لکھا ہے، وہ میرے اور آپ کے درمیان رہے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' وہ چپ ہوئی، پھر اپنی ہی حرکت پر ہنستی کمرے سے باہر آگئی۔

اس نے ڈائری اپنے کمرے میں رکھی اور کھانا کھانے نیچے آگئی۔ ڈائری پڑھنے کی جلدی میں اس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا اور چند نوالے لے کر ہی اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں آکر اس نے لائٹ آن کی اور دروازہ لاک کر کے دراز میں سے ڈائری نکال کر بیڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

❀❀❀

ملیحہ لائبریری میں بیٹھی کتاب کے مطالعے میں غرق تھی کہ اسے اپنے چہرے پر کسی کی نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا مگر کوئی بھی متوجہ نظر نہیں آیا تو سر جھٹک کر واپس کتاب پر نظریں جما دیں۔ مگر کسی کی نظروں کا احساس بدستور تھا۔ وہ چڑ گئی۔ آج تیسرا دن تھا کہ وہ کتاب لے کر بیٹھتی اور کسی کی نظروں کی شدت اسے بے چین کرنے لگتی۔ دو دن تک وہ اپنا وہم سمجھ کر نظرانداز کرتی رہی مگر آج سچ مچ اسے غصہ آگیا تھا۔ اس نے کتاب بند کی اور اپنے اطراف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کے بالکل سامنے ایک انکل اخبار پڑھ رہے تھے مگر ان کی سفید داڑھی کا احترام کرتے ہوئے اس نے اپنے دائیں جانب چہرہ موڑ کر دیکھا۔ وہاں یونیورسٹی کے کچھ اسٹوڈنٹس بیٹھے کمبائن اسٹڈی کر رہے تھے۔ وہ گروپ کے لڑکوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگی مگر کسی نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تو اس نے دوسری طرف دیکھا۔ وہ کوئی لڑکی تھی اور ظاہر ہے یہ حرکت وہ تو نہیں کرے گی۔ ہال میں کچھ اور لوگ بھی تھے مگر ملیحہ نے کسی کو بھی اپنی طرف دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

'کیا مصیبت ہے؟' اسے سخت بے زاری ہوئی۔ دو دن سے یہی ہو رہا تھا۔ بیٹھے بٹھائے محسوس ہونے لگتا کہ کوئی اسے بہت توجہ سے دیکھ رہا ہے مگر ڈھونڈنے پر کوئی نظر نہیں آتا اور وہ غصے میں کھولتی گھر آجاتی۔

اپنی طرف سے تو اس نے مسئلے کا یہ حل نکالا تھا کہ آج صبح کے بجائے شام کو آئی تھی اور اپنی مخصوص جگہ سے ہٹ کر بیٹھی تھی۔ مگر سامنے والا بھی کافی مستقل مزاج تھا۔ گھر کی تنہائی سے گھبرا کر وہ یہاں آتی تھی پر اب لگ رہا تھا کہ اس نادیدہ مہربان کی وجہ سے یہ اکلوتی سرگرمی بھی ترک کرنی پڑے گی۔ وہ اُٹھی اور کتاب گھر جا کر پڑھنے کے خیال سے ایشو کرواتی باہر آ گئی۔

''ایکسکیوزمی مس!'' وہ پتھر کی چوڑی سیڑھیاں اُتر رہی تھی جب کوئی اس کے پیچھے سے بولا تھا۔ وہ رک کر پلٹی تو دیکھا سانولے رنگ کا ایک لڑکا بلیک پینٹ شرٹ پہنے اس کی طرف آ رہا تھا۔

''جی۔'' وہ قریب آ گیا تو ملیحہ نے کہا اور اس جی کے جواب میں اس نے جو کہا، اسے سن کر ملیحہ کا جی چاہا کہ اس کا سر پھاڑ دے۔ بے فکری سے ماتھے پر آئے کالے بادلوں کو ایک ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے وہ بڑے عام سے انداز میں بولا تھا۔

''آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' ملیحہ کو پہلے تو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے پھر اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر پھر اپنا ارادہ ترک کر کے وہ پلٹی اور سیڑھیاں اُترنے لگی۔ وہ بھی ساتھ ہولیا۔

''دیکھئے نہ تو میں آپ سے مذاق کر رہا ہوں اور نہ میرا ارادہ فلرٹ کرنے کا ہے۔ میں پوری سنجیدگی سے آپ کو پرپوز کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے آپ کو یہ سب عجیب لگ رہا ہو مگر میں ریکویسٹ کرتا ہوں کہ پلیز سوچ کر جواب دیجئے گا۔ مجھے جواب جاننے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو کل جواب دیں، پرسوں دیں، ایک ہفتے بعد، ایک سال بعد، دس سال بعد یا چاہے قیامت کے دن۔ میں یہیں لائبریری میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔'' ملیحہ نے پہلے تو اپنے قدموں کی رفتار تیز کی پھر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور آخر میں اس نے دوڑ لگا دی۔ دوڑتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی آواز آنی بند ہوگئی ہے تو اس نے رک کر ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا۔ دور تک سڑک سنسان تھی۔ اسے اطمینان ہوا۔ بھاگتے ہوئے سانس پھول گیا تھا۔ وہ وہیں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سانس درست کرنے لگی۔

''بدتمیز، کمینہ، لوفر کہیں کا۔ کہتا ہے شادی کرے گا۔ ایسا ماروں گی کہ شادی، بربادی سب بھول جائے گا۔ ایڈیٹ جواب لینے آئے گا بدتہذیب انسان۔ آئے گا تو آتا رہے۔ میں تو اب مر کر بھی ادھر کا رخ نہ کروں۔'' وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی اونچی آواز میں اسے صلواتیں سنا رہی تھی۔ وہ تو شکر تھا، سڑک بالکل خالی تھی ورنہ اگر کوئی اسے اس حال میں دیکھ لیتا تو ہاتھ پکڑ کر پاگل خانے چھوڑ آتا۔

''پاگل ہوں نا میں کہ کوئی بھی راہ چلتا شادی کی آفر کرے گا اور میں چل پڑوں گی۔'' بڑبڑاتے ہوئے وہ اُٹھی۔ اب جو اپنے اطراف غور کیا تو جی چاہا، سر پیٹ لے۔ یہ جگہ اس کی جانی پہچانی تو تھی مگر اس کے گھر سے کافی دُور تھی۔ بنا دیکھے سرپٹ دوڑتے وہ اپنے گھر جانے والی سڑک کے بجائے دوسری طرف نکل آئی تھی اس خیال سے کہ وہ کہیں راستے میں نہ مل جائے۔ واپس پلٹنے کے بجائے اس نے آگے جا کر مین روڈ سے گھر

جانے کا سوچا اور آگے بڑھی۔ پھر ایک دم ہی غصے میں پلٹ کر جہاں سے آئی تھی، اس طرف منہ کر کے زور سے بولی۔

''اُلّو کا پٹھا..... بابا کو بتا دوں نا تو کل اسی گلی سے تمہارا جنازہ نکل رہا ہو گا۔فوجی کا ہاتھ پڑا تو دماغ ٹھکانے پر آجائے گا۔'' وہ یوں بول رہی تھی جیسے وہ وہاں کھڑا سن رہا ہو۔

وہ سارے راستے بکتے جھکتے گھر پہنچی تو اظہر فاروقی لان میں ہی مل گئے۔ وہ تو سیدھی اندر جانے الی تھی پر انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ ان کی طرف بڑھی۔

''السلام علیکم بابا جان!''

''وعلیکم السلام! آج تم نے کچھ زیادہ ہی دیر کر دی۔'' ان کی بات پر اس نے بے ساختہ کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ عام طور سے دو ڈھائی گھنٹے میں واپس آجاتی تھی مگر آج اس کی واپسی تین گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ ایک تو پہلے اس نے خوب دماغ خراب کیا پھر غصے میں اتنا خیال بھی نہیں آیا کہ رکشہ یا ٹیکسی ہی کر لیتی، اسے کوستے پیدل ہی چلی آئی۔

''ایک پاگل جوٹل گیا تھا، پھر دیر کیسے نہ ہوتی؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' اس کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ آپ میرا انتظار کر رہے تھے تو کچھ کام تھا۔''

''ہاں مجھے پوچھنا تھا، تم نے نور الہدیٰ کا کمرہ تو ٹھیک سے سیٹ کر لیا ہے؟''

''کتنی بار پوچھیں گے؟'' اس نے دل میں کہا پھر ان کی تشفی کرنے کے خیال سے بولی۔ ''آپ بے فکر رہیں بابا جان! میں نے ان کے کمرے کی ہر چیز خود اپنے ہاتھوں سے سیٹ کی ہے۔'' پھر ان کے پاس سے ہٹ کر وہ کچن کے سامنے سے گزرتی پچھلی طرف کے ہال میں آ گئی۔ ہال کی سیڑھیاں ایک ایک کر کے چڑھتی وہ اپنے کمرے میں آئی۔ یہ کمرہ بہت کھلا اور کافی بڑا تھا اور آرائشی لڑیوں کی مدد سے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک طرف کا حصہ بیڈ روم تھا جس میں وارڈ روب بھی ساتھ ہی جوڑا گیا تھا۔ وارڈ روب کے ایک طرف اٹیچڈ باتھ روم تھا۔ بیڈ کے پائنتی کی طرف تھوڑا ہٹ کر صوفہ سیٹ رکھا تھا جس کے درمیان میں درمیانے سائز کا ٹیبل بھی موجود تھا۔ دوسرا حصہ آرٹ اسٹوڈیو کا لُک دے رہا تھا۔ سامنے کی دیوار پر لکڑی کا لمبا سا ریک مناسب اونچائی پر دیوار سے جوڑا گیا تھا جس پر کچھ کینوس سوکھنے کے لئے رکھے تھے۔ کچھ کینوس دیوار کے ساتھ بھی رکھے تھے۔ ایک طرف رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ کرسی رکھی تھی۔ ایک گول اونچا ٹیبل بھی تھا جس پر کلر ٹیوبز اور پینٹنگ برش رکھے تھے۔ پاس ہی ایزل بھی موجود تھا۔ کمرے میں بالکونی بھی تھی جس کی چھت سے ملیحہ نے ڈھیر سارے ونڈ چائمز لٹکا رکھے تھے۔ بالکونی میں موجود جھولے سے بھی اس نے چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ ملیحہ کو ان ملی جلی آوازوں کا مدھم سریلا شور بہت پسند تھا۔

اکثر چاندنی راتوں میں وہ جھولے میں لیٹی ان آوازوں کو سنتی رہتی۔ یہ کمرہ کشادہ تو تھا، اس کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ یہ باقی گھر سے منسلک ہوتے ہوئے بھی کافی الگ تھا اور اسی وجہ سے ملیحہ نے اسے اپنے لئے منتخب کیا تھا کہ وہ یہاں یکسوئی سے اپنا کام کر سکتی تھی۔ ملیحہ نے کتاب ٹیبل پر رکھی اور فریش ہونے کے لئے باتھ روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ تولیے سے خشک کرتی ایزل کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ یہ کینوس اس نے کافی دن پہلے شروع کیا تھا مگر ابھی تک آسمان کا کچھ حصہ اور ایک سوکھا درخت ہی پینٹ کر پائی تھی۔ اس نے سوچا، آج اس کینوس کو ضرور مکمل کر لے گی۔ اس نے ٹرے میں کلر مکس کر کے برش پر لگایا اور کینوس پر کچھ اسٹروک لگا کر ہی اس نے ہاتھ روک لیا۔ پتہ نہیں کیوں اس کا ذہن یکسو نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس نے ایک بار اور کوشش کی مگر ذہن اب بھی بٹا ہوا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز اسے ڈسٹرب کر رہی ہے۔

'شاید وہ وِنڈ چائمز کی آواز' اس نے سوچا اور اُٹھی۔ بالکونی کے سلائیڈنگ گلاس ڈور کو بند کر کے وہ مطمئن سی ہوتی، کرسی گھسیٹ کر ایزل کے سامنے آرام سے بیٹھ گئی۔ مگر اب کمرے کی خاموشی اسے چبھنے لگی تھی۔ وہ چڑ سی گئی۔ اسی ماحول میں وہ گھنٹوں کینوس پر کام کیا کرتی تھی مگر آج وہ اپنا ذہن تک نہیں بنا پا رہی تھی۔ تنگ آ کر اس نے برش رکھا اور کچن میں آ گئی۔ سامنے ہی کچن ٹیبل کے ساتھ رکھے اسٹول پر چڑھا۔ اس کا ہم عمر دُبلا پتلا سا بہادر سلاد کاٹ رہا تھا۔

''تم......؟'' وہ اسے دیکھ کر حیرت سے بولی۔ ''گل بانو کہاں ہے؟''

''اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو آج کھانا میں نے بنایا ہے۔''

''ہونہہ......'' ملیحہ نے ہنکارا بھرا اور کھانے کا جائزہ لینے لگی۔

''بی بی صاب! مہمان رات کو دیر سے آئیں گے۔'' بہادر نے سلاد فریج میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''مہمان نہیں، چھوٹے صاحب آ رہے ہیں۔'' ملیحہ نے تصحیح کی۔

''چھوٹے صاحب کیا یہیں رہیں گے''

''ظاہر ہے۔ انسان اپنے گھر میں ہی رہتا ہے۔''

''تو پھر وہ لندن میں کہاں رہتے تھے؟'' بہادر نے سوچتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں سوال کیا۔

''فٹ پاتھ پر۔'' وہ چڑ گئی۔ ''تم کیا ناشتے میں کوّے کھاتے ہو؟ جب دیکھو زبان چلتی رہتی ہے۔ ذرا دیر کو چپ نہیں رہا جا سکتا۔''

بہادر کی شکل بتا رہی تھی کہ اسے ملیحہ کا ڈانٹنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا مگر ملیحہ نے پروا کئے بغیر مزید کہا۔

''اگر رائتہ بنا چکے ہو تو ٹیبل پر کھانا لگا دو اور بابا جان سے بھی کہہ دو، کھانا تیار ہے۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ رُوٹھے رُوٹھے انداز میں بول کر برتن لگانے لگا۔

ایک بھتیجے کے آنے پر قصرِ فاروقی کو نئے انداز سے سجایا گیا تھا جس کی وجہ سے ملیحہ کو کافی کوفت ہوئی تھی۔

ملیحہ چاولوں کی ڈش ٹیبل پر رکھ رہی تھی کہ بہادر آ کر بولا۔

''کرنل صاحب کہہ رہے ہیں، وہ کھانا چھوٹے صاب کے ساتھ کھائیں گے۔''

ملیحہ نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور خود بلانے چل پڑی۔ اس نے اسٹڈی میں پیر رکھا ہی تھا کہ اس کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ ہمیشہ کی طرح سفید براق کُرتا شلوار میں کالے رنگ کے سادہ سے چپل پیروں میں ڈالے سنہرے فریم کے عینک لگائے وہ سامنے کرسی پر اٹین شین بیٹھے تھے اور نظریں وال کلاک پر جمی تھیں۔ وہ آگے بڑھی اور چلتے ہوئے ان کے پاس فرش پر بیٹھ کر اپنا ہاتھ ان کے گھٹنے پر رکھا۔ یہ اس کی بچپن کی عادت تھی۔ اسے جب بھی بابا جان کو متوجہ کرنا ہوتا تو مخاطب کرنے کے بجائے ان کی طرف دیکھنے لگتی۔ اظہر فاروقی نے کلاک سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

''کھانا کھالیں بابا جان!''

''آج تو کھانا نورالہدیٰ کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ تم جا کر کھالو۔''

''بابا جان! ان کی فلائٹ گیارہ بجے لینڈ کرے گی اور گھر آنے تک ڈیڑھ بج جائیں گے۔ اتنی رات کو آنے کے بعد وہ صبح کے ناشتے سے پہلے کچھ نہیں کھائیں گے۔''

''مجھے کھانا نہیں کھانا۔'' انہیں ملیحہ کی بات صحیح لگی تھی پھر بھی کھانے کے لئے نہیں مانے تو ملیحہ نے پھر اصرار کیا۔

''تھوڑا سا کھالیں۔ آپ جانتے ہیں مجھے اکیلے کھانا کھانا پسند نہیں۔''

''کھانا کھانے کے لئے بھوک کا لگنا ضروری ہے، کسی کا ساتھ ہونا نہیں۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو جا کر کھالو۔'' انہوں نے نرمی سے مگر قطعی لہجے میں کہا۔ اسے برا تو لگا مگر مزید کچھ نہیں کہا۔ وہ اُٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئی۔

''بہادر!'' اس کی آواز پر بہادر، بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

''کھانا اُٹھا دو۔'' وہ اپنے کمرے سے جا کر لائبریری سے ایشو کروائی کتاب اُٹھائے لاؤنج میں آ بیٹھی۔

گیارہ بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ بابا جان اسٹڈی سے نکل کر لاؤنج میں آئے، پھر اسے دیکھ کر بولے۔

''ملیحہ۔''

''جی بابا جان!'' وہ کتاب بند کرتے ہوئے بولی۔

''میں ایئرپورٹ کے لئے نکل رہا ہوں۔ پھر سوچا ایک نظر نورالہدیٰ کا کمرہ دیکھ لوں۔''

''آیئے بابا جان!'' وہ ان کا اشارہ سمجھ کر فوراً کھڑی ہو گئی۔ ملیحہ سے آگے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ایک دم ہی پلٹ کر بولے۔

''تم نیچے کا کوئی کمرہ ٹھیک کروا لیتیں۔ اب وہ اتنی رات کا تھکا ہوا، سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں

جائے گا۔'' ملیحہ چاہتے ہوئے بھی نہ کہہ سکی کہ آپ نے ہی کہا تھا کہ نور الہدیٰ کے لئے اوپر والا کمرہ ٹھیک کروانا۔ اسے گراؤنڈ فلور پر رہنا پسند نہیں۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ کمرے میں جا کر انہیں مین میخ نکالنے کا موقع نہیں ملا۔ ملیحہ نے بڑے دھیان سے کمرہ سیٹ کیا تھا اور ضرورت کی ہر چیز وہاں پہنچائی تھی۔ وہاں سے باہر نکلے تو سارے ملازموں کو لائن میں کھڑا کر کے ہدایتیں دینا شروع کیں۔

''جب تک میں نور الہدیٰ کو لے کر ایئر پورٹ سے آ نہیں جاتا، تم میں سے کوئی سرونٹ کوارٹرز کی طرف پھٹکے گا بھی نہیں۔ بہادر اور نذیر! تم دونوں فوراً گاڑی رُکتے ہی نور الہدیٰ کا سامان نکال کر اس کے کمرے میں پہنچا دینا۔ اور گلاب خان!'' وہ چوکیدار کی طرف مڑے۔ ''پہلے ہارن پر ہی گیٹ کھل جانا چاہئے۔ اگر دیر لگی تو یاد رکھنا، میری رائفل کو ابھی زنگ نہیں لگا۔ اور یہ ڈرائیور کدھر رہ گیا ہے؟ دیکھو ذرا اس نے گاڑی تیار کی یا نہیں۔'' ایک ملازم بھاگا بھاگا باہر کی طرف گیا پھر بھاگتے ہوئے ہی واپس آیا۔

''جیپ تیار ہے کرنل صاحب!''

پھر جب ان کی گاڑی گیٹ سے نکل گئی تو ہر ایک نے سکون کا سانس لیا۔

''کوئی مجھے ایک گلاس پانی کے ساتھ سر درد کی ٹیبلٹ دے گا؟'' صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے ملیحہ نے صدا لگائی۔ اسے اتنی دیر تک جاگنے کی عادت نہیں تھی مگر آج تو جاگنا مجبوری تھی۔ کچھ دیر بعد ہی ملازم نے پانی کے گلاس کے ساتھ ٹیبلٹ لا کر اسے پکڑا دی۔ ٹیبلٹ لے کر ملیحہ نے کتاب پھر سے کھول لی۔ ایک بجتے ہی ملیحہ کی نظر وال کلاک سے جیسے چپک گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیڑھ بجے تک تو ہر حال میں وہ لوگ آ جائیں گے مگر دو بجے۔ پھر ڈھائی، پھر پونے تین اور تنگ آ کر تین بجے ملیحہ نے ایئر پورٹ انکوائری کا نمبر ملا دیا۔ پتہ چلا فلائٹ تین گھنٹے لیٹ تھی اور یہ تو سوچنا بھی بے کار ہے کہ ''بابا جان مجھے فون کر کے اطلاع دیتے'' ریسیور رکھتے ہوئے اس نے خود سے کہا پھر بہادر اور نذیر کے علاوہ اس نے سب نوکروں کو سرونٹ کوارٹر میں بھیج دیا اور خود لاؤنج میں آ کر سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ جہاں وہ بیٹھی تھی، وہاں سے مین انٹرنس بالکل اس کی نظر کے سامنے تھی۔ دونوں پاؤں صوفے پر رکھے کشن گود میں لئے وہ سمٹ کر بیٹھی تھی۔ نیند کے مارے اس کا برا حال تھا لیکن جانتی تھی اگر نور الہدیٰ کے استقبال کو وہ بہ نفس نفیس موجود نہ ہوئی تو بابا جان ناراض ہوں گے۔

'انتظار کرنا بھی کتنا مشکل کام ہے۔' تھک کر سوچتے ہوئے اچانک ہی اس کی ذہنی رو بہک گئی۔

''آپ چاہے کل جواب دیں، پرسوں...... یا چاہے قیامت کے دن...... میں انتظار کروں گا۔'' اس وقت تو اسے غصے ہی آیا تھا مگر اب وہ گم سم ہو گئی تھی۔

'کیا کوئی قیامت کے دن تک کسی کا انتظار کر سکتا ہے؟' اس نے خود سے سوال کیا اور پھر فوراً ہی جواب بھی دے ڈالا۔

''امپوسبل۔''

ساڑھے چار بجے کے قریب ہارن کی آواز آئی۔

''فلائٹ ایکچوئیلی ٹیک آف کے وقت ہی لیٹ ہو گئی تھی۔ لندن کا موسم تو آپ جانتے ہیں۔ ایئرپورٹ جانے سے پہلے اگر آپ انکوائری سے معلوم کر لیتے تو اتنی زحمت نہ ہوتی اور......'' اظہر فاروقی کے ساتھ اندر آتے نورالہدیٰ نہ جانے کیا بولنے والے تھے کہ صوفے پر بے خبر سو رہی لڑکی کو دیکھ کر چپ ہو گئے۔ ابا جان نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

''یہ اس طرح کیوں سو رہی ہے؟'' وہ ناگواری سے پاس کھڑی ملازمہ سے بولے جو گاڑی کی آواز پر کوارٹر سے نکل کر پورچ میں آ گئی تھی اور اب ان کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔

''بابا جان پلیز!'' انہوں نے آہستگی سے انہیں ٹوکا پھر ملازمہ سے کہا۔ ''تم جاؤ۔''

بابا جان کو ساتھ لئے ان کے کمرے میں چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے صوفے کے پاس سے گزرے تو غیر ارادی طور پر بازو پر لٹکتا کوٹ جھکتے ہوئے اس پر پھیلا دیا۔ وہ اپنے کمرے میں آئے اور جوتوں سمیت ہی بیڈ پر لیٹ گئے۔

❁❁❁

تھکن کے مارے ملیحہ کا برا حال تھا۔ درد سے بدن ٹوٹ رہا تھا۔ پھر بھی فجر کی اذان کے ساتھ ہی حسبِ عادت اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی اسے سب سے پہلے نورالہدیٰ کا خیال آیا اور وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑے ہوتے ہی کوئی چیز اس کے وجود پر سے پھسلتی ہوئی اس کے پیروں پر گر گئی۔ اس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔

یہ کوٹ کس کا تھا اور اس پر کس نے ڈالا ہوگا؟ ملیحہ کو یہ سمجھنے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں لگی۔ جھک کر کوٹ اُٹھا کے بازو پر ڈالتے ہوئے وہ عجیب سے احساس سے دوچار ہوئی تھی۔ وہ کوٹ لئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کوٹ بیڈ پر ڈال کر وہ شاور لینے چلی گئی۔ دس منٹ بعد ہی وہ گیلے بالوں کے ساتھ کمرے میں آئی۔ بالوں کو تولیے سے سکھا کر اس نے چادر اوڑھی اور جائے نماز بچھا کر قبلہ رو کھڑی ہوتی اس نے نیت باندھ لی۔

نورالہدیٰ یوں بھی سحر خیز تھے۔ پھر وہ فلائٹ میں نیند پوری کر چکے تھے۔ سورج کے جھب دکھاتے ہی وہ ٹریک سوٹ پہنے لان میں نکل آئے۔ دوڑتے ہوئے لان کے کئی چکر کاٹ کر وہ ایک جگہ رکے، بار بار جھک کر اپنے پنجوں کو چھوتے وہ ایک بار اُٹھے اور پھر جھکنا بھول گئے۔ وہ اپسرا نہیں تھی مگر اپسرا لگ رہی تھی۔ سفید کپڑوں میں اہتمام سے دوپٹہ شانوں پر پھیلائے ہوئے اس کے لمبے نم بال ہوا سے لہراتے بار بار اس کے چہرے پر آ رہے تھے مگر وہ بے نیازی بنی جھولے پر بیٹھی تھی جو اس کے گداز پیروں کے دھکے سے آہستہ آہستہ آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ وہ سر اٹھائے بڑی محویت سے آسمان کو دیکھ رہی تھی کہ تبھی سورج کا راستہ روکے بادل ذرا سا کھسکا اور اس کا وجود کرنوں کی زد میں آ گیا۔ وہ ہنس پڑی اور ہنستے ہوئے اس نے یوں ہی اپنا سر

جھکایا تو نظر ٹریک سوٹ پہنے بت کی طرح ساکت کھڑے شخص پر پڑی۔ وہ جھجک گئی۔
وہ اس وقت نورالہدیٰ کی وہاں موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ ہی سوچ لیا تھا کہ رات گئے آنے والا، دن چڑھے تک تھکن اُتارتا رہے گا۔ وہ اُٹھی اور گھوم کر کمرے میں چلی گئی۔
''مون لائٹ اِن سن لائٹ۔ امیزنگ!'' وہ آہستہ سے بڑبڑائے۔
وہ بال سمیٹ کر کچن میں آ گئی۔ فٹافٹ اورنج جوس نکال کر اس نے جگ میں ڈالا اور جگ، گلاس سمیت ٹرے میں رکھ کے بہادر کو تھما کر لان میں بھیجا پھر اپنے ناشتے کی ٹرے تیار کر کے وہ کچن سے نکلنے والی تھی کہ نورالہدیٰ جوس کا گلاس ہاتھ میں لئے کچن کے دروازے سے اندر آ گئے۔
''ہیلو ملیحہ!'' اسے دیکھ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے وہ بولے تو ملیحہ نروس ہو گئی کہ ان سے ہاتھ ملائے یا نہیں۔ اسی گھبراہٹ میں وہ ان کے ہیلو کا جواب نہیں دے سکی تو وہ غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ نیچے کر کے اس کی طرف جھک کر بولے۔ ''آئی ایم رونگ۔'' اس بار وہ اعتماد سے مسکرائے۔
''Not indeed'' پھر ان کے ہاتھ میں پکڑے آدھے خالی گلاس کو دیکھ کر بولی۔ ''اور چاہیئے؟''
''نو تھینکس۔''
ملیحہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان سے کس انداز میں بات کرے۔ اس لئے بات کرنے سے بچنے کی خاطر وہ ٹرے اٹھائے ان کے برابر سے گزر کر آگے بڑھ گئی مگر اگلے ہی قدم پر اسے رک جانا پڑا۔
''میں پندرہ منٹ میں نہا کر آتا ہوں۔ تب تک آپ میرا ناشتہ تیار کر لیں۔ کوئی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس جو باقی گھر والے لیتے ہوں۔ البتہ چائے اسٹرونگ ہونی چاہیئے۔'' گل بانو کو ہدایات دے کر وہ پلٹے تو ملیحہ کو دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا۔ ''واٹ ہیپنڈ؟''
اس نے بھی فوراً سے جواب دیا۔ ''نتھنگ۔'' اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ نورالہدیٰ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔
ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ ٹراوزر پر ٹی شرٹ پہنے ڈائننگ روم میں تھے۔ ملیحہ ڈائننگ ٹیبل پر ہی ان کی منتظر تھی۔ انہیں دیکھ کر اس نے گل بانو کو آواز دے کر ناشتہ لانے کو کہا۔
ناشتہ لگ چکا تھا۔ نورالہدیٰ نے نوالہ منہ میں رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اخبار اٹھایا پھر ملیحہ کی طرف بڑھا کر سوالیہ لہجے میں بولے۔
''نیوز پیپر۔''
ملیحہ نے ناشتے سے دھیان ہٹا کر ان کے ہاتھ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔
''میں ناشتے کے وقت اخبار نہیں پڑھتی۔''
''کیوں؟'' وہ یوں ہی پوچھنے لگے۔

''کیونکہ اخباروں میں ایسی خوفناک خبریں چھپتی ہیں کہ پڑھ کر بھوک ہی اُڑ جائے۔''

''سچ کہا۔'' بولتے ہوئے انہوں نے اخبار کھولا اور پڑھنے لگے۔ ناشتہ ختم ہونے تک وہ اخبار بھی ختم کر چکے تھے۔نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے انہوں نے اخبار کو تہ کر کے رکھا اور اپنے لئے چائے نکالتے ہوئے اس سے بولے۔''چائے لو گی؟''

''میں چائے کم پیتی ہوں۔ دن میں صرف ایک کپ۔ وہ بھی شام میں۔'' وہ بھی ناشتہ کر چکی تھی، نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے بولی۔ پھر اخبار اٹھاتے ہوئے اس نے بہادر کو آواز دی۔ بہادر کو بھی جیسے پتہ تھا کہ آواز کیوں دی گئی ہے۔ وہ دوسرے ہی لمحے جوس کا گلاس لئے آ پہنچا۔

''تم لوگوں نے ناشتہ کر لیا؟'' گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر اس نے پوچھا۔

''جی بی بی صاب!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔''

نور الہدیٰ نے چائے پی کر خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس سے کہا۔''فارغ ہو کر میرے روم میں آ جانا۔''

وہ سمجھ گئی سامان سیٹ کروانا چاہ رہے ہیں اور ہاں میں سر ہلا دیا۔

وہ کچھ دیر بعد نوک کر کے ان کے کمرے میں آئی تو سارے بریف کیس کھلے ہوئے تھے۔ ایک بڑا اٹیچی کیس تو بیڈ پر ہی کھلا رکھا تھا اور خود نور الہدیٰ ہاتھ میں ہینگر لگے کپڑے پکڑ کر وارڈ روب کا دروازہ کھول کر اس کے سامنے کھڑے تھے۔

''ملیحہ! آ جاؤ۔'' انہوں نے پلٹ کر اس سے کہا پھر وارڈ روب میں دیکھتے بولے۔''یہ سب کس نے خریدا ہے؟''

''میں نے۔ بابا جان کا حکم تھا کہ کمرے کے ساتھ آپ کا وارڈ روب بھی سیٹ کر دوں۔ میں نے تو ان سے بہت کہا کہ پتہ نہیں آپ کو میری پسند اچھی بھی لگے یا نہیں مگر......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر یوں ہی چپ ہو گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

''تمہاری پسند اتنی اچھی ہے کہ بری لگ ہی نہیں سکتی۔ مگر ایک پرابلم ہے۔''

''کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''انہیں کہاں رکھوں؟'' انہوں نے کپڑوں سے بھرے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

''لائیں میں رکھ دیتی ہوں۔'' اس نے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے کپڑے لے کر بیڈ پر رکھے اور وارڈ روب میں جگہ بنانے لگی۔ پھر سوٹ کیس سے کپڑے نکال کر وارڈ روب میں لٹکانے لگی۔ اسے مصروف دیکھ کر نور الہدیٰ سائیڈ میں ہو گئے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ نکالا، پھر لائٹر سے سگریٹ جلاتے وہ سوٹ کیس میں سے اپنے ڈاکومنٹس والا بیگ نکالنے لگے۔ تمباکو کی بُو محسوس کر کے ملیحہ نے

وارڈروب میں سے سر نکال کر دیکھا اور ان کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ دیکھ کر بولی۔
''سگریٹ پیتا آدمی ہو یا دھواں چھوڑتا ریل کا انجن، دونوں دِکھنے میں ایک سے لگتے ہیں۔'' نورالہدیٰ نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا تو کہنے لگی۔ ''میں آپ کو سگریٹ پینے سے منع نہیں کرتی مگر میرے سامنے سگریٹ پینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے بالکل پسند نہیں۔ سگریٹ بجھا دیں۔'' اچانک ہی اس کے لہجے میں جو استحقاق آیا تھا، اسے خود بھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن نورالہدیٰ نے نہ صرف محسوس کیا تھا بلکہ انہیں اچھا بھی لگا تھا۔ زیرلب مسکراتے ہوئے انہوں نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا۔
''اور کوئی حکم؟'' ان کی بات پر اسے لگا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے تو فوراً ہی معذرت کرنے لگی۔
''سوری۔ میں عام طور پر اس انداز سے بات نہیں کرتی۔ مگر مجھے سگریٹ سے بہت چڑ ہے۔''
''کوئی بات نہیں۔ تم مجھ سے ہر انداز میں بات کر سکتی ہو۔'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولے تو ملیحہ نظرانداز کرتے ہوئے سوٹ کیس میں سے ایک بڑا سا پیکٹ نکالنے لگی۔ وہ فوراً بولے۔
''اسے میں خود رکھ لوں گا۔ تم رہنے دو۔'' وہ اسے چھوڑ کر پرفیومز کی بوتلیں نکال کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھنے لگی۔ نورالہدیٰ نے وہ پیکٹ نکالا اور اسے رکھنے وارڈروب کی طرف آئے۔
اسی وقت بابا جان دروازہ بجا کر اندر آ گئے۔
''آیئے بابا جان!'' نورالہدیٰ نے جلدی سے سب چھوڑ چھاڑ کر بیڈ پر سامان ہٹا کر ان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ ''کیا بات ہے، تم اتنی صبح جاگ گئے۔ نیند نہیں آئی؟''
''نیند تو آ گئی پر آنکھ جلد ہی کھل گئی۔ فلائٹ میں سوتا رہا تھا، شاید اس لئے۔''
''اب آگے کیا ارادہ ہے؟ کیا جاب کرو گے؟''
''نہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ بزنس شروع کروں۔''
''کیوں نہیں؟'' وہ خوش ہو کر بولے۔
''تم نے اس بارے میں کچھ سوچا ہے، کیا بزنس کرو گے؟''
''کچھ پلانز تو ہیں مگر میرا خیال ہے پہلے یہاں کی مارکیٹ کو سرچ کر لوں۔''
''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر آتے ہی کام میں لگ جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کچھ دن آرام کرو، پھر ان معاملات پر غور کرنا۔ ویسے اب تم آ گئے ہو تو ساری ذمہ داریاں بھی تمہیں ہی اٹھانی ہوں گی۔ سفر کی تھکن اُتار لو، پھر میں تمہیں زمینوں کا حساب کتاب بھی سمجھا دوں گا بلکہ اگلی بار نواب شاہ جاتے ہوئے میں تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔''
''بابا جان پلیز! زمینداری وغیرہ میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ویسے تو میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں اور جاؤں گا بھی۔ لیکن حساب کتاب والا معاملہ آپ اپنے ہاتھ میں ہی رکھیں۔'' نورالہدیٰ بڑی انکساری سے

بولے تھے۔ بابا جان ہنسے اور کہنے لگے۔
"مظہر فاروقی کا بیٹا کہتا ہے کہ اسے زمینداری سے دلچسپی نہیں۔ یہ تو کمال ہی ہو گیا۔ بھائی جی پکے زمیندار تھے۔ میاں جی کی زندگی میں ہی فصلوں کی بوائی کٹائی کا کام انہوں نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔" پھر وہ اچانک ہی سنجیدہ ہو گئے۔ "دلچسپی کی بات کی ہے تم نے۔ مجھے بھی زمینداری سے دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہے۔ بھائی جی جب تک تھے، میں نے کبھی مڑ کر بھی زمینوں کی طرف نہیں دیکھا۔ مگر باپ دادا کی نشانیاں خود سے الگ بھی تو نہیں کی جا سکتیں۔"

ملیحہ، نورالہدیٰ کے بغیر تو سامان سیٹ کر نہیں سکتی تھی اور نورالہدیٰ، بابا جان کے ساتھ باتوں میں مگن تھے۔ وہ کچھ دیر تو کھڑی ان کی باتیں سنتی رہی مگر جلد ہی بور ہو گئی۔ بابا جان بیڈ پر بیٹھے تھے اور نورالہدیٰ ان کے سامنے جس جگہ کھڑے تھے، ملیحہ کی طرف ان کی پشت تھی اور وہ ان کی نظر میں آئے بغیر کمرے سے نکل سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی چیزیں آہستگی سے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھیں اور نامحسوس انداز میں دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر جانے کے لئے وہ جیسے ہی نورالہدیٰ کے پیچھے سے گزری، بالکل اچانک ہی انہوں نے پلٹ کر اس کی نازک کلائی اپنی گرفت میں لے لی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ گڑبڑائی، پھر سنبھل کر بولی۔

"اپنے کمرے میں۔"

"کوئی کام ہے یا آرام کرنا چاہتی ہو؟"

"دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔" ان کے لہجے میں اپنے آپ استحقاق آ گیا تھا اور پھر فوراً ہی اپنی بات کہہ کر وہ ملیحہ کا ہاتھ چھوڑتے، بابا جان کی طرف مڑ گئے تھے جیسے جانتے تھے کہ ملیحہ ہر حال میں ان کے حکم کی تعمیل کرے گی۔ ملیحہ نے بھی ان کا حق جتانا محسوس کیا تھا مگر اسے بالکل بھی برا نہیں لگا اور پاس ہی رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نورالہدیٰ اور بابا جان ایک بار پھر اپنی باتوں میں لگ گئے تھے اور وہ پھر سے بور ہونے لگی تھی۔ مگر اس نے دوبارہ باہر جانے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ وہاں ایک شخص ایسا تھا جو اسے پوری جان سے محسوس کر رہا تھا۔

✿✿✿

ملیحہ نے واقعی سوچ لیا تھا کہ وہ دوبارہ لائبریری نہیں جائے گی مگر اس دن جو کتاب اس نے ایشو کروائی تھی، وہ تیسرے دن ہی اسے واپس لے آئی۔ لائبریری کے اندر قدم رکھتے ہی اس نے محتاط نظروں سے ہر طرف کا جائزہ لیا تھا اور جب وہ نظر نہیں آیا تو مطمئن سی ہو کر کتاب واپس کر کے باہر آ گئی۔

'اچھا ہوا جان چھوٹ گئی اور مجھے خود پر جبر بھی نہیں کرنا پڑا۔'

دل ہی دل میں خوش ہوتی سیڑھیاں اُترتے ہوئے اس نے پتھریلی روش پر قدم رکھا اور ٹھٹک کر رک گئی۔ روش کے ساتھ لگی درختوں کی قطار میں وہ سامنے ہی ایک درخت کے سائے میں کھڑا بازو لپیٹے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ملیحہ کو رُکتے دیکھ کر وہ چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

''دو دن پہلے میں نے آپ سے کچھ کہا تھا۔ اُمید ہے آپ نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا ہوگا۔'' وہ ایسے بولا جیسے اسے شرمندہ کرنا چاہتا ہو اور ملیحہ ایک پل کو شرمندہ ہو بھی گئی مگر فوراً ہی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ یا تو پاگل ہیں یا دیوانے۔'' ملیحہ کے چڑنے کے جواب میں وہ شرارت سے بولا۔ ''اتنا بڑا راز آخر آپ کو کس نے بتا دیا؟''

''میرے وجدان نے۔'' وہ کہہ کر بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''سچ کہہ رہی ہیں؟'' وہ بول کر ہنسا۔

''کیا مطلب؟'' وہ بالکل نہیں سمجھی۔ مگر جواب دینے کے بجائے وہ ہنستا ہی رہا۔ وہ اُلجھن بھرے انداز میں اسے ہنستا ہوا دیکھتی رہی۔ اپنی کہی بات کو سوچا تو بھی ایسا کوئی لطیفہ سمجھ نہیں آیا جس پر وہ یوں ہنس رہا تھا۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے جو آپ یوں ہنس رہے ہیں؟'' زبردستی اپنی ہنسی روک کر اس نے ملیحہ کو دیکھا اور کہا۔

''میرا نام وجدان مصطفیٰ ہے۔''

ملیحہ کو فوراً ہی اس کے ہنسنے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ وہ ایکبار پھر دل ہی دل میں فل اسپیڈ سے اسے گالیوں سے نوازنے لگی۔

''اور میں پاگل بھی ہوں اور دیوانہ بھی۔ کس لئے ہوں؟ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔''

ملیحہ نے سر کو جھٹکا اور آگے بڑھ گئی۔

''کیا آپ آرام سے کہیں بیٹھ کر میری بات سن سکتی ہیں؟'' اس کی آواز پر ملیحہ رُکی تو وہ منت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ ''بس پانچ منٹ۔ زیادہ آپ کا وقت نہیں لوں گا۔''

اب ملیحہ نے ذرا دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔ شکل سے تو سلجھا ہوا، پڑھا لکھا نظر آ رہا تھا۔ ملیحہ نے سوچا، بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شکل سے تو شریف آدمی لگتا ہے۔ اگر میں طریقے سے سمجھا دوں تو ہوسکتا ہے دوبارہ پریشان نہ کرے۔ سوچتے سوچتے وہ سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میری یہ خواہش شرعاً یا قانوناً ناجائز ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' ملیحہ نے بولنے میں سیکنڈ کی دیر نہیں لگائی۔

''تو پھر؟'' اس نے پوچھا۔
''پھر یہ کہ ایک چیز ہوتا ہے معاشرہ اور جس معاشرے میں آپ اور میں رہتے ہیں، وہاں راستے میں بیٹھ کر شادیوں کے فیصلے نہیں کیئے جاتے۔''
''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' اس نے بھی پل بھر کی تاخیر کے بغیر تائید کی۔ ''ایسا کریں، مجھے اپنا ایڈریس دے دیں اور کل یہی بات میرے پیرنٹس آپ کے گھر جا کر آپ کے پیرنٹس سے کریں گے۔ تب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''
''آپ بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔'' وہ چڑ کر بولی۔ ''جب میرے بابا مجھ سے پوچھیں گے کہ میں آپ سے کہاں ملی؟ تو کیا کہوں گی کہ راستے میں روک کر آپ نے مجھے پرپوز کیا اور میں نے ہاں کر دی۔ آپ میں کچھ سینس ہے کہ نہیں؟''
''مجھے معلوم ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے مگر میں نے خود بھی نہیں سوچا کہ میرے ساتھ کبھی ایسا ہوگا۔ کیا کوئی بھی شخص یقین کرے گا کہ مجھے محبت ہو گئی ہے، وہ بھی ایسی لڑکی سے جسے میں نے پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ جس کا میں نام تک نہیں جانتا۔ اگر کچھ دن پہلے کوئی مجھ سے کہتا کہ راستے میں کسی لڑکی کو روک کر اسے شادی کے لئے مناؤ تو میں کسی بھی قیمت پر ایسا احمقانہ کام کرنے کے لئے راضی نہیں ہوتا۔ مگر اب میں یہی سوچ رہا ہوں۔ یہ سب بہت عجیب ہے۔ مگر کیا ان عجیب باتوں کو سوچنے کے بجائے آپ صرف میرے بارے میں نہیں سوچ سکتیں؟'' وہ ملیحہ کے پیچھے بنی عمارت کو دیکھ کر بول رہا تھا جیسے اس سے مخاطب ہو۔ دھیمی مگر مضبوط آواز میں نرم لہجے کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر بولتا، بلاشبہ اس کی آواز میں تسخیر کر لینے کی طاقت ہے۔ ملیحہ قائل ہو گئی۔ وجدان اب ملیحہ کو دیکھ رہا تھا۔
''میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ آپ کا جواب ہاں میں ہونا چاہئے۔'' وہ ایک پل کو رکا، پھر بولا۔ ''آپ اگر چاہیں تو انکار بھی کر سکتی ہیں۔ آپ کو حق ہے۔ بس اتنی سی درخواست ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے بس ایک بار میرے بارے میں سوچ لیجئے گا۔ میری زندگی آپ کے فیصلے سے جڑی ہے۔''
''بھلا میں کسی اجنبی کے بارے میں کیوں سوچوں؟'' وہ بے مروّتی سے بولی۔
''اجنبی ہی سہی مگر کیا آپ اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک پل بھی مجھے نہیں دے سکتیں؟'' وہ اس طرح سے بولا کہ ملیحہ نے گھبرا کر سر ہی جھکا لیا تو وہ پژمردگی سے مسکرایا۔
''اور میں نے اپنے دن رات آپ کو دے دیئے ہیں۔ نہ میں آپ کے سوا کچھ سوچ سکتا ہوں نہ آپ کے سوا کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔ بہت چاہا تھا میں نے کہ آپ کی چاہت نہ کروں۔ مگر اب کر بیٹھا ہوں تو مجھے خود پر کوئی اختیار ہی نہیں رہا۔ نہ جانے وہ کیا کشش ہے جو مجھے آپ کی طرف کھینچتی ہے اور میں کھنچا چلا آتا ہوں۔''
ملیحہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ سر جھکائے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ مگر یہ سرگوشیاں بھی اتنی واضح تو تھیں کہ اس

کے کان کی لویں سرخ ہوگئیں۔

'مجھے اس کی بات ماننی ہی نہیں چاہئے تھی۔' اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا اُٹھ کر بھاگ جائے مگر وجدان سامنے ہی کھڑا تھا۔ اگر ہاتھ پکڑ کر روک لیا تو؟ وہ اسکن کلر کے سوٹ پر اوڑھے میرون دوپٹے کا کونا مٹھی میں جکڑے فرار کے امکانات پر غور کر رہی تھی کہ تبھی وجدان ناراضی سے بولا۔

''آپ ہمیشہ یہی کرتی ہیں نا؟''

''کیا؟'' بے ساختہ وہ بولی۔

''یہی کہ جب بات آپ کے فیصلے کی آئے تو فرار کی راہیں ڈھونڈ لیں۔''

'یہ کیا کہہ رہا ہے؟' اس نے گھبرا کر سوچا۔

''میں جو بھی کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' وہ جیسے ملیحہ کی سوچ کو سن رہا تھا۔ ''آپ فیصلہ کرنے سے ڈرتی ہیں۔ فیصلہ تو پھر بھی بڑی چیز ہے، آپ کو تو رائے کا اظہار بھی مشکل لگتا ہوگا۔''

'میری کوئی رائے ہو تو اظہار بھی کروں۔' وہ نروٹھے پن سے دل میں بولی۔

''اور یہ تو ناممکن ہے کہ آپ کی کوئی رائے ہی نہ ہو۔''

ملیحہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''آپ کے پاس دماغ ہے، سوچ سکتی ہیں تو رائے بھی رکھتی ہوں گی۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ آپ اپنی سوچ کو ہی چھپالیں، جس طرح اپنے جذبات چھپالیتی ہیں۔ اب یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے جذبات ہی نہ ہوں۔ جب محسوسات ہیں تو جذبات اپنے آپ ہی اُبھر آئیں گے۔''

'چلو اگر ہوں بھی تو کسی کو کیا پروا ہے؟' ایک اور تلخ سی سوچ اُبھری۔

''کسی اور کو نہ سہی، آپ کو تو اپنے جذبات کی پروا کرنی چاہئے۔'' وہ رسان سے سمجھا رہا تھا۔ ''جذبات ہی تو روح کا عکس ہوتے ہیں اور انسان کی شناخت محض وجود سے نہیں کی جا سکتی۔ پتہ نہیں کیوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ آپ نے خود کو محدود کرلیا ہے۔ اپنی ذات کے گرد کھنچے اس حصار کو توڑ ڈالئے۔ کیونکہ کوئی اور تو شاید اس حصار کو پار کر ہی لے، مگر آپ خود اس حصار کو پار نہیں کر پائیں گی۔'' ملیحہ کو اپنے سامنے کھڑے شخص سے خوف آنے لگا تھا۔ شاعر نے کہا تھا۔

''میرا بھی چہرہ پڑھ، میرے بھی حالات بتا۔'' ملیحہ نے تو ایسی کوئی فرمائش نہیں کی تھی مگر وجدان اتنی فرصت سے اسے پڑھ رہا تھا جیسے خاص طور پر اسی کام سے آیا ہو۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

'یہ میرے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتا ہے؟ کیا میرے چہرے پر لکھا ہے؟' سوچتے ہوئے غیر محسوس انداز میں ملیحہ نے اپنے چہرے کو چھوا۔ وجدان سے اس کی یہ حرکت بھی چھپی نہیں رہ سکی۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''آپ کا چہرہ آپ کا دوست ہے۔ یہ آپ کے بارے میں کسی کو نہیں بتاتا۔'' اسے خاموش دیکھ کر وہ ہنسے

لگا۔ ''پوچھیں گی نہیں، مجھے آپ کے بارے میں یہ سب کس نے بتایا ہے؟'' وہ اب بھی خاموش رہی تو وجدان نے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''آپ کی آنکھوں نے۔ آپ جتنا چپ رہتی ہیں، یہ اتنا ہی بولتی ہیں۔ بس سننے والا ہونا چاہئے۔''

ملیحہ نے فوراً ہی پلکیں گرالیں، تو وہ اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر کے بات بدل گیا۔

''آپ نے مجھے لائبریری میں ہر طرف تلاش کیا۔ اگر بالکونی میں دیکھ لیتیں تو آپ کی تلاش ختم ہو جاتی۔''

ملیحہ کو یاد آیا کہ لائبریری میں بالکونی بھی تھی اور اس دن اس نے وجدان کی تلاش میں ہر طرف دیکھا تھا لیکن بالکونی کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

''آپ کتاب پڑھا کرتیں اور میں آپ کو۔ ایک بات کہوں، میں نے آپ سے پہلے کبھی کسی کو نہیں پڑھا۔ اور آپ کو تو لگتا ہے، حفظ کر لیا ہے۔ مگر کیا آپ کو پتہ ہے کہ آپ کی آنکھوں سے آپ کی روح تک سیدھا راستہ ہے۔ آپ کی اُٹھتی گرتی پلکوں کو دیکھتے ہوئے میں وہ راستہ کھوج آیا ہوں۔ اب آپ چاہے کچھ بھی کر لیں مگر مجھے خود تک پہنچنے سے روک نہیں پائیں گی۔'' وہ چیلنج نہیں کر رہا تھا مگر ملیحہ کو اتنا ہی برا لگا۔

''اتنا سب کہنے کے باوجود آپ مجھے سمجھا نہیں سکے کہ آخر میں آپ سے شادی کیوں کروں گی؟''

''نہیں۔'' وہ کہنے لگا۔ ''پوچھنا ہے تو یہ پوچھیں کہ میں آپ سے شادی کیوں کروں گا۔'' وہ ملیحہ کی آنکھوں میں جھانکتا دو قدم آگے آ گیا۔ اس کی سیاہ مقناطیسی آنکھوں کی کشش نے ملیحہ کو گم سم سا کر دیا تھا۔

''کیوں؟'' وہ اتنی ہلکی آواز میں بولی کہ وجدان نے شاید سنی بھی نہ ہو گی۔

''کیونکہ جب سے میں نے آپ کو حفظ کیا ہے، خود کو بھول گیا ہوں۔''

❀❀❀

جب وہ جان گئی تھی کہ اس کے لہجے میں تسخیر کر لینے کی طاقت ہے تو یہ کیوں نہ مانی کہ وہ اسے تسخیر کرنے آیا تھا۔ وہ لاؤنج میں آئی اور بنا کسی طرف دیکھے سیدھی اپنے کمرے میں جانے کے لئے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''ملیحہ!'' اپنا نام سن کر وہ پلٹی۔ لاؤنج کے صوفوں پر بابا جان اور ملک ناصر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ٹیبل پر شطرنج کی بساط بچھی تھی۔

''بیٹی! ذرا ہمارے پاس تو آؤ۔'' اسے آواز دینے والے ملک ناصر اب اسے بلا رہے تھے۔ پاس جا کر اس نے سلام کیا جس کا جواب دے کر وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''جیتی رہو۔ ادھر بیٹھو میرے پاس۔'' انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ''کہاں سے آ رہی ہو؟''

''لائبریری سے۔''

''پر اتنی گم سم سی کیوں ہو؟''

''نہیں انکل! آپ کو یوں ہی لگ رہا ہے۔'' اس نے تردید کرنا چاہی۔

''یوں ہی تو نہیں۔ کچھ اُلجھی ہوئی تو ہو۔ بیٹی! ہم نے تو سوچا تھا کہ نور الہدیٰ آ جائے گا تو ہماری گڑیا بھی ہنسنا بولنا سیکھ جائے گی۔ پر لگتا ہے ابھی تک بھائی سے دوستی نہیں ہوئی۔''

''ابھی نور الہدیٰ کو آئے بس دو دن ہی تو ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی کیا دوستی ہو گی؟'' اس کی طرف سے بابا جان بولے۔

''یہ بات بھی صحیح ہے۔'' وہ ہنسے تھے۔

''ملک انکل! میں جاؤں؟'' موقع دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔ انہوں نے فوراً اجازت دے دی۔

''ہاں بیٹی! جاؤ۔'' وہ اُٹھنے لگی تو اظہر فاروقی نے اس سے کہا۔ ''ملیحہ! چائے بھجوا دینا۔ اور ذرا جلدی۔''

''جی بابا جان!'' وہاں سے اُٹھ کر کچن کی طرف سے گزرتے ہوئے اس نے بہادر کو چائے کا کہا اور اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔

وہ نیچے سے ہی دیکھ چکی تھی کہ اس کے کمرے کے دروازے کے دونوں پٹ پورے کھلے ہوئے تھے۔ وہ حیران ہوتی کمرے میں آئی تو اس نے نور الہدیٰ کو اپنے اسٹوڈیو میں دیکھا۔ وہ اسی طرف چل پڑی۔ نور الہدیٰ ایک کینوس ہاتھ میں پکڑے دیکھ رہے تھے۔ آہٹ پر اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ملیحہ کو بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں آ جائیں گے۔ مگر انہیں جیسے پروا ہی نہیں تھی۔ کہنے لگے۔

''تم نے بتایا نہیں، تم پینٹنگ کرتی ہو۔ اور نہ کبھی بابا جان نے ہی ذکر کیا۔'' یہ بات برائے بات تھی۔ وہ بھلا جواب میں کیا کہتی؟ وہ بھی جواب کے لئے نہیں رکے۔ ''ویسے تمہیں پینٹر بنانے میں میرا بڑا ہاتھ ہے۔''

''وہ کیسے؟'' یوں ہی اس نے پوچھا۔ وہ کینوس رکھ کر اس کی طرف مڑے۔

''وہ ایسے کہ میری سکول کی کاپیوں کتابوں پر تم نے جی بھر کے پریکٹس کی ہے۔ پتہ ہے تم ڈھائی تین سال کی تھیں جب میرے بیگ سے کتابیں نکال کر تم نے کلر پنسل سے ان پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنا شروع کی تھیں۔ اور ایک بار تو تم نے میرے پورے جرنل پر مارکر سے نشان بنا دیئے تھے۔ ٹیچر سے ڈانٹ تو پڑی ہی ساتھ میں سزا بھی ملی تھی اور پورا جرنل جو دوبارہ بنانا پڑا تھا، وہ الگ۔'' اتنے سالوں بعد بچپن کی ایک حرکت پر وہ شرمندہ ہو گئی۔

''ہاں مجھے یاد ہے۔ امی نے بھی مجھے بہت ڈانٹا تھا مگر غلطی پوری طرح سے میری نہیں تھی۔ میں آپ کے سامنے بیٹھ کر ہی آپ کی کتابیں خراب کیا کرتی تھی۔ لیکن آپ نے مجھے کبھی نہیں ٹوکا۔'' خجالت مٹانے کو وہ بولی تھی۔

''تو ٹوکتا بھی کیسے؟ ایک بار کہیں منع کیا تھا تو تم رونا شروع ہو گئیں۔ میں ٹیچر کی ڈانٹ تو سن سکتا تھا مگر

تمہارے آنسو کیسے برداشت کرتا؟ سچ کہوں، جب کبھی تم روتی تھیں تو میرا دل چاہتا تھا، میں بھی زور زور سے روؤں۔'' وہ ہنستے ہوئے مزے سے بولے اور ان کے انداز پر ملیحہ بھی ہنس پڑی۔

''لیکن تمہارے شوق بھی عجیب ہوا کرتے تھے۔ گرمیوں کی دوپہر کو ضد کرتیں کہ میں تمہیں سائیکل پر بٹھا کر لمبی سیر کراؤں۔ آئس کریم کی فرمائش سردیوں کے لئے مخصوص تھی۔ مجھے تو تمہارے دانتوں کو صحیح سلامت دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔ بچپن میں تم جس رفتار سے کینڈیز اور چاکلیٹس کھاتی تھیں کہ مجھے یقین تھا بڑے ہونے تک تمہارے منہ میں ایک دانت بھی نہیں بچے گا۔ اور یاد ہے کس طرح تم میرے کندھوں پر چڑھ کر ''کہانی سننی ہے'' کی رٹ لگاتی تھیں۔ بچے رات کو سونے سے پہلے کہانی سنانے کی فرمائش کرتے ہیں لیکن تمہیں صبح جاگنے کے بعد کہانی سننے میں مزا آتا تھا۔''

''ہاں یاد ہے۔'' ان کی باتوں پر بے تحاشا ہنستی ملیحہ ہنسی کے بیچ میں بولی۔ ''اور یہ بھی یاد ہے کہ مجھے کہانی سناتے سناتے آپ سو جاتے تھے اور پھر دیر سے سکول جانے پر ٹیچر سے ڈانٹ بھی پڑتی تھی۔ اور پتہ ہے میں یہ سب جان بوجھ کر کیا کرتی تھی۔'' ملیحہ نے ایک پرانے راز سے پردہ اٹھایا تھا۔ نورالہدیٰ نے آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورا۔

''تم جان بوجھ کر مجھے ڈانٹ پڑواتی تھیں؟''

''ہاں۔'' وہ ان کے گھورنے سے بالکل متاثر نہیں ہوئی۔ ''جب مجھے امی ڈانٹتیں اور آپ فوراً مجھے سپورٹ کرتے، میری سائیڈ لیتے تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن شروع شروع میں، میں ڈر بھی جاتی کہ اب آپ مجھے ڈانٹیں گے یا کم از کم دوبارہ مجھے کہانی نہیں سنائیں گے۔ مگر آپ مجھے ڈانٹے بغیر روز کہانی بھی سنا دیتے۔''

''تمہیں کوئی کچھ نہ کہے، اس لئے میں سب کچھ خود پر لے لیتا اور تم اس بات کا مزا لیتی تھیں۔'' انہیں جیسے واقعی صدمہ ہوا تھا۔

''ہاں۔ مگر میں پھر یہی کہوں گی کہ غلطی صرف میری نہیں تھی۔ آپ نے ہی مجھے سر چڑھا رکھا تھا۔ میں آپ کی شہہ پر ہی شرارتیں کیا کرتی تھی وہ بھی صرف آپ کے ساتھ۔ پھر آپ کے جانے کے بعد میں نے سب ہی شرارتیں چھوڑ دیں۔ اور امی بھی تو کہا کرتی تھیں، نورالہدیٰ نے ہی ملیحہ کو بگاڑ رکھا ہے۔ اور میں سچ مچ ہی بگڑ جاتی اگر آپ لندن نہ چلے گئے ہوتے۔''

''ہاں ہاں، ساری برائی میرے سر ڈال دو۔ میرے جانے سے تمہاری جان چھوٹ گئی تھی۔ مگر وہاں کتنے دن تمہیں یاد کر کے میں اُداس رہا تھا، کچھ اندازہ ہے تمہیں؟ بار بار فون کرتا کہ تمہاری آواز ہی سن لوں مگر ہر بار جواب ملتا، ملیحہ بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''وہ تو میں آپ سے ناراض تھی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''وہ کیوں بھلا؟'' نورالہدیٰ حیران ہوئے۔

''کتنے آرام سے مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہ بھی نہیں سوچا، میرا کیا ہوگا۔ امی تو ہمیشہ بیمار ہی رہتیں اور بابا جان کبھی بھی بہت دنوں کے لئے گھر نہیں رہے۔ میرا سارا وقت بس آپ کے ساتھ ہی تو گزرتا تھا۔ مجھے آپ کے چلے جانے پر بہت غصہ آیا تھا۔ اسی لئے جب آپ کا فون آتا تو میں چھپ جاتی تھی۔''

''اتنی لمبی ناراضی کہ پھر سالوں تک بات ہی نہیں کی۔'' وہ شکوہ کر رہے تھے۔

''ایسا تو نہیں تھا کہ کبھی بات ہی نہیں کی۔ فون تو میں بھی کیا کرتی تھی۔''

''ہاں۔ سال میں ایک بار۔ ایسی بھی کیا ناراضی؟''

''ناراضی تو بس شروع کے کچھ مہینوں تک ہی تھی مگر پھر بہلنے کے ساتھ ساتھ میں آپ کو بھول بھی گئی تھی۔ بھلا تب میری عمر ہی کیا تھی۔ چھ یا شاید سات سال۔ بہت جلد ہی اجنبی ہو گئے تھے آپ، اسی لئے آپ سے فون پر بات نہیں کر پاتی تھی۔''

''جانتا تھا، تم مجھے بھول چکی ہو۔'' وہ اچانک ہی سنجیدہ ہو گئے تھے۔

ملیحہ کو اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر اس کے بچپن کے حوالے سے بات کر رہے تھے اور اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ کس طرح باتوں باتوں میں وہ ان سے بے تکلف ہو گئی تھی۔

''فرینڈز۔'' انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو ملیحہ نے بلا تامل ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''Always and forever'' انہوں نے پل بھر کو اس کا ہاتھ تھام کر چھوڑتے ہوئے ایک پیکٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ یہ وہی پیکٹ تھا جو ملیحہ اس دن ان کے سامان میں دیکھ چکی تھی۔ ''پرانی دوستی کی نئی شروعات کے لئے۔'' انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے بھی ایک مسکراہٹ کے ساتھ پیکٹ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

''تھینک یو ہادی بھائی!''

''اوہ گاڈ!'' وہ بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔ ''کان ترس گئے تھے اس طرزِ تخاطب کو سننے کے لئے۔'' وہ خجل سی ہو گئی۔

کھلے دروازے پر بہادر کی دستک پر دونوں ہی ادھر متوجہ ہوئے تھے۔

''کہئے بہادر صاحب! آپ کو کیا کہنا ہے؟'' نورالہدیٰ کے اس طرح بولنے پر وہ کچھ شرما سا گیا اور کہا۔

''بی بی صاحب کے لئے سمیرا بی بی کا فون ہے۔''

وہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔

''سمیرا تمہاری فرینڈ ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ پھر خیال آنے پر بتایا۔ ''لیکن میری کزن بھی ہے۔ افتخار ماموں کی بیٹی۔''

''اچھا۔'' انہوں نے کہا اور وہ جھٹ پٹ فون سننے کے لئے کمرے سے نکل گئی۔

❀❀❀

رات عشاء کی نماز پڑھ کر ملیحہ اپنی ڈائری لیے بالکونی میں آ گئی۔

"جن کی نگاہ جسم کے پار جا سکتی ہو، وہ بھی دل سے آگے احساس تک پہنچ کر رک جاتے ہیں۔ مگر وجدان مصطفیٰ عجیب شخص ہے۔ روح کی باتیں کرتا ہے اور باتیں بھی ایسی کہ سنو تو دل چاہے سنتے ہی جاؤ۔ پر میری دعا ہے کہ میں وجدان مصطفیٰ سے دوبارہ کبھی نہ ملوں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ مجھ سے وہ سب کروا لے گا جو میں کبھی کرنا نہیں چاہتی۔ جسے کرنے کی مجھ میں ہمت بھی نہیں ہے۔"

ہم اپنے دل کو تھپکتے ہیں اور سوچتے ہیں
کہ تتلیوں کے پروں پر کہانیاں لکھ کر
بچائیں کیسے انہیں دھوپ کی تمازت سے

وجدان کے ساتھ ہوئی اس دوسری ملاقات کو دو مہینے ہونے والے تھے مگر ملیحہ نے اس دوران ایک بار بھی لائبریری کا رخ نہیں کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ابھی بھی اسی درخت کے نیچے کھڑا ہوگا جہاں اس روز وہ اسے چھوڑ آئی تھی۔ وہ لاکھ انکار کرتی مگر یہ سچ تھا کہ وہ اسے ڈسٹرب کر گیا تھا۔ اس کے دل کے دروازے تو بند ہی رہے مگر وہ ہی دل میں اس ادا سے آیا جیسے سورج کی روشنی بند دروازوں کی جھریوں سے گزر کر اندر کے منظر کو روشن کر کے اپنے ہونے کا اعلان کر دے۔ ملیحہ کی حالت اس نادان جیسی تھی جو ان عیاں ہوتے مناظر سے صرفِ نظر کرنے کو ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لے۔ پر جب اُجالے نے بند پلکوں میں بھی راستہ بنا لیا تو تڑپ کر وہی ہتھیلیاں آسمان کی طرف اُٹھا دیں کہ سورج کو ہی ڈھانپ لیں۔

وجدان مصطفیٰ کے وجود سے پھوٹتی روشنی نے جب پہلے پہل ملیحہ کی آنکھوں کو چھوا تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور پھر اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اس کی بے خبری میں اس کے آس پاس کتنا اُجالا بکھر گیا تھا۔ اور جب معلوم ہوا تو وہ اندیشۂ محبت سے گھبرا اُٹھی۔ عجیب سی حالت ہو گئی تھی اس کی۔ بیٹھے بیٹھے چونک جاتی، بولتے بولتے ایک دم ہی چپ ہو جاتی۔ اور جب کچھ سمجھ نہیں آتا تو نورالہدیٰ کے پاس پہنچ جاتی۔ اظہر فاروقی نے ملیحہ میں آئی ان تبدیلیوں کو محسوس بھی نہیں کیا تھا لیکن نورالہدیٰ نے نہ صرف ان تبدیلیوں کو محسوس کر لیا تھا بلکہ وہ ٹھٹک بھی گئے تھے۔ ملیحہ کا بے اختیار اپنی طرف آنا انہیں چونکا گیا تھا۔

انہیں اسٹڈی میں بیٹھے کام کرتے ہوئے بہت رات ہو گئی تھی۔ انہوں نے وال کلاک کو دیکھا جو بارہ بجا رہا تھا۔ پھر باقی کام کل نمٹانے کا سوچ کر وہ پیپرز سمیٹنے لگے۔ تبھی ملیحہ آ گئی چائے کے دو کپ ٹرے میں لیے۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی، خود بھی ایک چیئر پر بیٹھ گئی۔

"تم تو جلدی سو جاتی ہو۔ آج ابھی تک کیسے جاگ رہی ہو؟ اور چائے بھی دو کپ بنائی ہے۔ کیا ساری قسمیں آج ہی توڑ دو گی؟"

''نیند نہیں آ رہی ہادی بھائی!'' اس نے جیسے شکایت کی۔

''مگر مجھے تو بہت نیند آ رہی ہے اور میں بس ابھی سونے ہی جا رہا تھا۔'' وہ اسے چھیڑنے کو بولے اور ان چھیڑ بھی گئی۔

''آپ کوئی سونے نہیں جا رہے بلکہ میرے ساتھ چائے پئیں گے اور باتیں کریں گے۔''

وہ اسے دیکھ کر بولے۔ ''زبردستی ہے؟''

''ہاں۔ ہے تو۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مگر صرف آپ کے ساتھ۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' انہوں نے کپ اٹھا لیا اور گھونٹ بھر کر کہا۔ ''افتخار ماموں آئے تھے۔''

''ہاں۔'' کپ ہونٹوں سے ہٹا کر اس نے کہا۔ ''لیکن آپ تو اس وقت گھر پر نہیں تھے۔''

''سڑک سے اندر آتے ہوئے میں نے ان کی گاڑی گیٹ سے نکلتے دیکھی تھی۔'' انہوں نے کہا تو ملیحہ ہلاتے ہوئے بتانے لگی۔

''ان کے ساتھ منیر ماموں بھی تھے۔ وہ دونوں مجھے لینے آئے تھے۔''

''کیوں؟'' انہوں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''میں نے بتایا تھا نا، پچیس نومبر کو سمیرا اور آفاق بھائی کی شادی ہے۔ سب رشتے دار اکٹھے ہو چکے ہیں۔ کل لاہور سے خالہ بھی آ جائیں گی تو ماموں نے سوچا مجھے بھی آ کر لے جائیں۔''

''پھر تم گئی نہیں؟''

''بابا جان نے منع کر دیا کہ جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ شادی میں بھجوا دیں گے۔''

''اس میں بھلا ضرورت کا کیا چکر ہے؟ تمہارے سب کزنز آئے ہوئے ہیں ان کے ساتھ تھوڑا انجوائے کر لیتیں۔ اور یہ آفاق بھی تمہارا کزن ہی ہے نا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''منیر ماموں کے بڑے بیٹے ہیں اور اس دن کارڈ دینے بھی تو آئے تھے۔''

''پھر تو تمہیں ضرور جانا چاہئے۔ تمہارے دو دو کزنز کی شادی ہے۔''

''مگر بابا جان نے منع کیا ہے۔'' اس نے سر جھکا کر ہلکے سے کہا۔

''تم جانا چاہتی ہو؟'' وہ جھک کر اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ کچھ دیر اس کی جھکی پلکوں کو دیکھ کر انہوں نے اس پر سے نظر ہٹا لی۔ اب وہ دراز میں رول کئے ہوئے چارٹس نکال رہے تھے۔ پھر ایک چارٹ کھول کر انہوں نے ملیحہ کے آگے رکھا۔

''یہ دیکھو، یہ گارمنٹس فیکٹری کا نقشہ ہے۔ ادھر پروڈکشن ہے، یہ سپروائزر کا آفس اور اس طرف آگے جا کر ورکرز کے کوارٹرز ہیں۔'' وہ نقشے پر کئی جگہ اُنگلی سے نشان دہی کرتے جا رہے تھے۔ ''کیسا لگا؟''

''اچھا ہے۔'' وہ نقشے کو دیکھتے ہوئے مختصراً بولی۔

نورالہدیٰ نے باقی کے دو چارٹس بھی کھول کر پہلے سے کھلے چارٹ پر برابر برابر رکھ دیئے۔

''اور یہ دونوں آفس کی بلڈنگ کے نقشے ہیں۔''

''دو آفس بنوائیں گے؟'' اس کے پوچھنے پر نورالہدیٰ مسکرا دیئے۔

''نہیں۔ آفس تو ایک ہی ہوگا۔ یہ نقشے دو الگ انجینئرز نے بنائے ہیں اور یہ دونوں ہی اتنے اچھے ہیں کہ میں کسی ایک کا انتخاب کرتے ہوئے کنفیوز ہو رہا ہوں۔ ذرا تم بتاؤ ان میں سے کون سا نقشہ زیادہ بہتر ہے؟''

ان کی بات پر ملیحہ گڑبڑا گئی۔ ''میں کیسے بتا سکتی ہوں؟''

''تم پینٹر ہو اور مجھ سے بہتر ان نقشوں کو سمجھ سکتی ہو۔''

''مگر پینٹنگ اور آرکیٹکشن میں فرق ہوتا ہے ہادی بھائی! سینٹی میٹر ناپ کر کھینچی گئی لائنوں کو سمجھنا میرے لئے آسان نہیں۔'' اس نے اب بھی گریز کیا تو نورالہدیٰ کچھ چڑ سے گئے۔

''ایک ذرا سی رائے ہی تو دینی ہے ملیحہ! اور تم اس قدر ہچکچا رہی ہو۔'' اور اس نے بھی تو کہا تھا۔

''آپ کو تو رائے کا اظہار بھی مشکل ہی لگتا ہوگا۔''

اچانک وجدان کا جملہ سماعتوں میں بازگشت کرنے لگا۔ ملیحہ نے دھیرے سے اقرار کر لیا۔

''ہاں۔ کیونکہ کبھی کسی نے میری رائے پوچھی ہی نہیں۔'' نورالہدیٰ نے پل بھر کو اسے دیکھا پھر اس کے گال پر ہاتھ رکھ کے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

''اب میں جو پوچھ رہا ہوں۔''

کچھ پل یوں ہی خاموشی کی نذر ہو گئے، پھر ملیحہ نے ان کے چہرے سے نظر ہٹا کر نقشوں کو دیکھا اور کچھ دیر غور کرنے کے بعد ایک نقشہ ان کی طرف کیا۔ نورالہدیٰ نے اس نقشے کو دیکھا اور توصیفی انداز میں کہا۔

''اور تم کہتی ہو تمہیں سینٹی میٹر ناپ کر کھینچی گئی لائنوں کی سمجھ نہیں۔''

وہ ان کی بات کو اَن سنی کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''آپ نے یہ نقشے ابھی اپروو نہیں کروائے؟''

''تم سے اپروو کروائے بغیر میں انہیں اپروول کے لئے کیسے بھیج سکتا تھا؟'' چارٹس کو رول کر کے ربڑ بینڈ چڑھاتے وہ سرسری سے انداز میں بول رہے تھے۔ ملیحہ نے ان کی طرف دیکھا اور بس دیکھ کر رہ گئی۔

❁❁❁

اگلی دوپہر کھانا کھاتے ہوئے نورالہدیٰ، بابا جان سے کہنے لگے۔

''میں سوچ رہا تھا، آج شام کو منیر ماموں کی طرف چلا جاؤں۔''

''خیریت؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ لیگل معاملات پر مشوروں کی ضرورت آن پڑی ہے۔ پھر کمپنی کی رجسٹریشن کے پیپرز بھی بنوانے ہیں۔ منیر ماموں وکیل ہیں۔ سوچا ان سے ہی بات کروں۔ ان سے زیادہ قابل اعتماد اور کون ہو سکتا ہے؟''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' بابا جان نے کہا۔ نورالہدیٰ مزید بولے۔

''آج کل ان کے گھر میں شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں تو میرا خیال ہے وہ آفس تو نہیں جا رہے ہوں گے۔ گھر پر ہی بات ہو سکے گی اور...... ارے ملیحہ! تم بھی ساتھ چلو نا۔'' وہ ایسے بولے جیسے بولتے ہوئے اچانک یاد آیا ہو۔ ملیحہ نوالہ چبانا بھول کر انہیں دیکھنے لگی جو خود بھی نوالہ منہ میں رکھ کر کچھ سوچتے ہوئے انداز میں بول رہے تھے۔

''بلکہ ایک کام کرو۔ ساتھ میں بیگ بھی تیار کر لینا۔ شادی میں دو چار دن ہی رہ گئے ہیں۔ سب رشتے دار بھی آ چکے ہوں گے۔ تم بھی کچھ دن کے لئے رہ آؤ۔''

ملیحہ کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ اس نے فوراً پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر نورالہدیٰ انجان بنے اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

''آج میں تمہیں چھوڑ آؤں گا اور ولیمہ کے اگلے دن میں تمہیں لینے آ جاؤں گا۔ ٹھیک ہے؟''

ملیحہ نے اب بابا جان کی طرف دیکھا جو اس ساری بات چیت سے لاتعلق نظر آ رہے تھے۔ نورالہدیٰ کھانا کھا چکے تھے۔ ہاتھ صاف کر کے اُٹھتے ہوئے پھر بولے۔

''شام کو پانچ بجے تک بالکل تیار رہنا۔'' یہ تو وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ یاددہانی اسے نہیں، بابا جان کو کروائی جا رہی ہے۔ مگر بابا جان نے کوئی ایسی بات ہی نہیں کی تو وہ اطمینان سے ٹیبل سے اٹھ گئے۔

اب ملیحہ کے لئے بھی کھانا کھانا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر جیسے ہی بابا جان کھانا ختم کر کے اٹھے وہ نورالہدیٰ کے

کمرے کی طرف بھاگی۔ نورالہدیٰ لائٹ آف کر کے سونے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ ملیحہ آندھی طوفان کی طرح کمرے میں آئی اور لائٹس آن کر کے ان کے بیڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ نورالہدیٰ اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''کیا بات ہے؟''

''ابھی آپ نیچے کیا کہہ رہے تھے؟''

گو کہ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گئے تھے پھر بھی معصوم بن کر بولے۔ ''شام پانچ بجے تک تیار رہنا۔'' انہوں نے اپنے الفاظ دہرائے۔

''مگر بابا جان نے منع کیا تھا۔''

''کب؟'' وہ اب بھی بن رہے تھے۔ ''وہ تو کچھ بولے ہی نہیں۔ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔''

''افوہ! میں ابھی کی بات نہیں کر رہی۔ کل بابا جان نے ماموں کو منع کیا تھا۔ رات کو بتایا تو تھا'' اسے اُلجھے دیکھ کر وہ سنجیدہ ہو گئے۔

''کل منع کیا تھا، آج تو نہیں۔ تم بس جانے کی تیاری کرو۔''

''مگر بابا جان کو کتنا برا لگے گا؟ ان کے منع کرنے کے بعد آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔''

''برا کیوں لگے گا بھئی؟'' وہ حیرت سے بولے۔

''کل جب ماموں تمہیں لینے آئے تو کیا میں گھر پر تھا؟''

''نہیں۔''

''کیا بابا جان کو پتہ ہے کہ تم نے مجھے ان کے آنے کے بارے میں بتایا تھا؟''

''نہیں۔''

''تو پھر انہیں برا کیوں لگے گا؟ جبکہ وہ جانتے ہیں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے تو یوں ہی باتوں میں ایک بات کہی تھی۔ انہیں اگر منع کرنا ہوتا تو منع کر دیتے۔ سمپل۔''

''تو آپ نے دھاندلی کی ہے۔'' ان کی چالاکی سمجھ کر وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ''مجھے نہیں پتہ تھا کہ لندن والے اتنے بے ایمان ہوتے ہیں۔''

''مگر یہ بھی تو دیکھو کہ لندن والے بے ایمانی بھی کس قدر ایمانداری سے کرتے ہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بول کر ہنسے۔

''کیا خاک ایمانداری ہے۔ شرم تو نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔ سیدھے دوزخ میں جائیں گے۔'' اس کی ملامت کا نورالہدیٰ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا، بولے۔

''ٹھیک ہے، چلا جاؤں گا۔ مگر اب تم یہاں سے جاؤ۔ مجھے سونا ہے۔ رات بھی تم نے میری نیند برباد کی تھی۔'' سے جانے کا کہہ کر وہ آرام سے لیٹ گئے مگر ملیحہ ہلی بھی نہیں۔ اسے اب ایک نئی پریشانی شروع ہو گئی تھی۔

''مگر ہادی بھائی! اگر میں چلی گئی تو گھر کا خیال کون رکھے گا؟ اور آپ دونوں کیسے رہیں گے؟''
نورالہدیٰ نے سر پر سے چادر ہٹا کر اسے دیکھا پھر کہنی کے بل اُٹھتے ہوئے کہا۔
''گھر کا خیال رکھنے کے لئے ملازم ہیں اور میں اور بابا جان بچے نہیں ہیں جو تمہارے بغیر رہ نہ سکیں۔''
''لیکن کھانا پکانے کے لئے بھی تو کوئی ہونا چاہیے۔ بابا جان کو نمک مرچ اپنی پسند کی ہی کھانی ہوتی ہے اور آپ بھی رات کو دیر سے گھر آتے ہیں۔''
''تمہارا اسسٹنٹ بہادر ہے نا، بھلا وہ کس مرض کی دوا ہے؟''
ملیحہ تپ کر بولی۔ ''وہ کسی مرض کی دوا نہیں ہے بلکہ خود لاعلاج مرض ہے۔ تینوں ٹائم مجھے اس کے سامنے کھانا رکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ بہادر صاحب! کچھ کھا لیجئے ورنہ فوت ہو جائیں گے۔'' اس نے اس طرح سے کہا کہ نورالہدیٰ ہنسنے لگے اور ہنستے ہنستے بولے۔
''گل بانو بھی تو ہے۔ وہ سب سنبھال لے گی۔ اور پھر ایک ہفتے کی ہی تو بات ہے۔'' پھر ایک دم رعب سے بولے۔ ''اب اُٹھو، یہاں سے نکل چلو۔'' انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ سے اٹھا دیا مگر وہ گھوم کر واپس بیٹھتی کہنے لگی۔
''ہادی بھائی! ایسا کرتے ہیں، آج جانے کے بجائے دو دن بعد مہندی کے دن رہنے چلی جاؤں گی۔ پھر ولیمہ میں تو آپ آئیں گے ہی۔ تو آپ کے ساتھ ہی واپس آ جاؤں گی۔'' اسے اب تک جوڑ توڑ میں اُلجھے دیکھ کر وہ گہرا سانس بھرتے اُٹھ بیٹھے۔
''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں اور بابا جان تمہارے بغیر رہ نہیں پائیں گے؟ آخر ایک نہ ایک دن تم شادی کر کے بھی تو چلی ہی جاؤ گی۔''
ایک پل وہ ان کی بات پر شرمائی پھر ڈھیٹ بن کر بولی۔ ''میری شادی ہو گئی تو آپ کون سا کنوارے بیٹھے رہیں گے؟ دیکھ لیجئے گا، میرے جانے کے بعد آپ کی بیگم آ کر مجھے ری پلیس کر دیں گی۔''
''بہت بولنے لگی ہو۔ مگر مزید میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتا۔ مجھے سونا ہے۔''
''لیکن ہادی بھائی!'' وہ پھر سے کچھ کہنے لگی تو نورالہدیٰ چادر پھینک کر بستر سے اُٹھے اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف لے جاتے بولے۔
''تمہارے جتنے بھی لیکن ویکن ہیں، اگر مگر ہیں، ان کا جواب میں شام میں دوں گا۔ اور اگر تم نے پانچ بجے سے پہلے میرے کمرے میں قدم بھی رکھا تو تمہیں ایسی جگہ چھوڑ کر آؤں گا کہ کبھی چاہ کر بھی واپس نہ آ سکو گی۔'' اسے کمرے سے باہر چھوڑ کر وہ واپس اندر مڑے تو ملیحہ بھی۔ ''ہادی بھائی! بات سنیں۔'' کہتی ان کے پیچھے آئی۔ مگر دروازہ دھاڑ کرتا اس کے منہ پر بند کیا۔ ملیحہ نے مُکا بنا کر دروازے پر مارنے کے لئے اٹھایا مگر پھر خود ہی ہاتھ گرا کر منہ بناتی کمرے میں آ گئی۔

کمرے میں آ کر اس نے اپنا بیگ تیار کیا، پھر شام کے لئے کپڑے نکال کر پریس کیئے۔ ٹھیک پانچ بجے وہ تیار ہو کر نورالہدیٰ کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ ان کی آواز پر وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ نورالہدیٰ بلیک ڈریس پینٹ پر بلیک ہی شرٹ پہنے گلے میں ایک میرون اور دوسری براؤن ڈوٹس والی ٹائی لٹکائے ڈریسنگ کے سامنے کھڑے تھے۔ اسے دیکھ کر بولے۔

''ملیحہ! ذرا بتانا تو دونوں میں سے کون سی ٹائی زیادہ سوٹ کرے گی؟''

بیگ وہیں سائیڈ میں رکھتے ہوئے وہ ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''آپ ہر بات میں میری رائے لینا ضروری کیوں سمجھتے ہیں؟''

انہوں نے دوبدو جواب دیا۔ ''اور تم ہر بات میں بحث کرنا ضروری کیوں سمجھتی ہو؟''

اس نے سر جھٹکا، پھر دو قدم آگے آ کر ایک نگاہ ان کے سینے پر ڈالی اور جا کر الماری میں سے کچھ ڈھونڈنے کے بعد ان کی طرف آ گئی۔ پھر ان کے گلے سے دونوں ٹائیاں نکال کر ہاتھ میں پکڑی ایش گرے کلر کی ٹائی ان کے گلے میں باندھنے لگی۔ غیر ارادی طور پر ہی نورالہدیٰ کی نگاہ اس پر ٹک گئی تھی۔ وہ اس وقت سفید رنگ کی جارجٹ کی شلوار پر شیفون کی قمیض پہنے سفید شیفون کا ہی دوپٹہ کندھوں پر پھیلائے کھڑی تھی۔ کانوں میں سفید موتیوں کے آویزے تھے۔ آنکھوں میں کاجل کی سی پتلی لکیر اور ہونٹوں پر نیچرل شیڈ کی لپ اسٹک لگا کر بال کمر پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ نورالہدیٰ اسے دیکھتے دیکھتے ایک پل کو سب کچھ فراموش کر بیٹھتے جیسے ابھی انہیں کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ ٹائی کی ناٹ لگا کر کالر صحیح کرتے ہوئے ملیحہ ان کی طرف دیکھ کر یوں ہی مسکرائی تو نورالہدیٰ فوراً سنبھلے اور مڑ کر آئینے میں ٹائی ٹھیک کرنے لگے۔ مگر آئینے میں بھی ان کی نگاہ ملیحہ کے عکس پر تھی۔

''تم سفید رنگ مت پہنا کرو۔''

ان کی آواز پر ملیحہ حیرت سے مڑ کر بولی۔ ''کیوں؟''

''اس رنگ میں تم اتنی پیاری لگتی ہو کہ ڈر لگتا ہے، کہیں تمہیں نظر نہ لگ جائے۔''

''ہادی بھائی!'' وہ ایسے بولی جیسے کہہ رہی ہو، کیا بے کار کی بات کر رہے ہیں؟

''ایک منٹ۔'' اسے رکنے کا کہہ کر نورالہدیٰ نے دراز سے کیمرا نکال کر آنکھوں پر لگا لیا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں؟''

نورالہدیٰ نے کیمرا نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ''تصویر کھینچ رہا ہوں۔ مگر مفت میں نہیں کھینچوں گا، بدلے میں ایک مسکراہٹ ملنی چاہیئے۔'' اور ملیحہ فوراً ہی مسکرا اٹھی۔ اس کی مسکراہٹ کو ہمیشہ کے لئے قید کر لیا۔

پھر بابا جان کے کمرے کی طرف آ گئے۔ وہ دروازے کی طرف ہی متوجہ تھے۔ نورالہدیٰ سے ایک قدم پیچھے اندر آتی ملیحہ نے انہیں دروازے کی طرف دیکھتے پایا تو گھبرا کر نورالہدیٰ کا ہاتھ تھام لیا۔

نورالہدیٰ نے اس کے ہاتھ کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا اور ہلکے سے جھٹکے سے اسے اپنے قریب کر لیا۔ اتنا کہ اس کا شانہ نورالہدیٰ کے بازو کو چھونے لگا تھا۔ یہ ساری کارروائی بڑے ہی غیر محسوس انداز میں ہوئی تھی۔ پھر بھی بابا جان کی عقابی نگاہوں سے چھپ نہ سکی۔ بیٹی اور بھتیجے کے اس اتحاد کو دیکھ کر ایک انوکھا خیال اچانک ہی ان کے ذہن میں آیا تھا۔ نورالہدیٰ، ملیحہ کو ساتھ لئے ان سے دو قدم کے فاصلے پر رک کر بولے۔

''ہم دونوں بس جا ہی رہے تھے۔ آپ کو اللہ حافظ کہنے آئے تھے۔'' وہ ابھی تک اسی خیال کے زیر اثر تھے، زیر لب مسکرا دیئے۔ نورالہدیٰ ان کی معنی خیز مسکراہٹ کا مطلب تو نہ سمجھے پر اسے ہی غنیمت خیال کرتے ہوئے بولے ''اللہ حافظ!'' کہہ کر پلٹ گئے۔ ملیحہ نے بھی جھٹ سے ''اللہ حافظ بابا جان!'' کہا اور ان کے ساتھ ہو لی۔

نورالہدیٰ کو دھیان بھی نہیں رہا تھا کہ کمرے سے نکلتے وقت بھی ملیحہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا اور بابا جان نے باہم تھامے ہوئے ان ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اپنے خیال کو فیصلے میں بدل دیا تھا۔

❁❁❁

کار گیٹ پر روک کر نورالہدیٰ نے ملیحہ سے کہا۔

''جاؤ۔'' تو اس نے کہا۔

''آپ اندر نہیں آئیں گے؟''

''اس وقت مجھے کہیں اور جانا ہے۔ اندر جاؤں گا تو دیر ہو جائے گی۔'' انہوں نے مجبوری بتا کر کہا۔ ملیحہ حیران نظروں سے ہادی کو دیکھتے ہوئے گیٹ کی طرف چل پڑی۔

تین منزلہ اس بڑے سے مکان میں ملیحہ کے دونوں ماموؤں کے خاندان آباد تھے۔ بڑے افتخار حسن کی تین بیٹیاں تھیں۔ عظمیٰ، صائمہ اور سمیرا۔ بڑی دونوں شادی شدہ تھیں۔ سمیرا، ملیحہ کی ہم عمر تھی اور اب اس کا نمبر تھا۔ چھوٹے ماموں منیر حسن کے سب سے بڑے بیٹے آفاق تھے جن کی سمیرا کے ساتھ شادی ہونی تھی۔ ان سے چھوٹی گوہر شادی شدہ تھیں، پھر صمد تھا جو ملیحہ اور سمیرا کا ہم عمر تھا اور اس سے چھوٹی ارم تھی جس نے ڈور بیل کی آواز پر گیٹ کھولا تھا۔ پھر ملیحہ کو دیکھ کر ''ہائے ملیحہ آپی! آپ۔'' کہہ کر اس سے لپٹ گئی پھر فوراً ہی الگ ہو کر اندر سب کو بتانے بھاگ گئی۔ ملیحہ نے گیٹ بند کیا اور بیگ اٹھا کر بڑا سا لان پار کر کے دالان تک پہنچی تو سب گھر والے اس کے استقبال کو آ پہنچے تھے۔ سب سے پہلے اس کی نظر خالہ پر پڑی۔

''السلام علیکم خالہ!'' وہ سلام کرتی ان کے گلے لگ گئی۔

''وعلیکم السلام بیٹی! جیتی رہو۔ اللہ عمر دراز کرے۔'' ساتھ لپٹائے وہ ملیحہ کو دعائیں دیتی بولیں۔ ''آج صبح ہی پہنچی ہوں۔ سوچ ہی رہی تھی کہ جنید جاگ جائے تو اس سے کہوں گی، مجھے ملیحہ سے ملا لائے۔ دیکھو ذرا کیسی قبولیت کی گھڑی تھی۔''

''آمنہ! کیا بچی کو دروازے پر روک کر کھڑی ہو؟ اندر تو لے آؤ۔'' یہ بڑی ممانی تھیں۔ ملیحہ نے انہیں بھی سلام کیا۔

''بیٹی! اندر آ جاؤ۔'' وہ سلام کا جواب دے کر اسے ساتھ لے کر اندر بڑے سے ہال میں لے آئیں جو سٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ چکی تو ممانی کو خیال آیا۔

''ملیحہ! کیا اکیلی آئی ہو؟''

''نہیں ممانی جان! ہادی بھائی چھوڑ گئے تھے۔''

''نورالہدیٰ؟'' انہوں نے تصدیق چاہی۔

''جی۔''

''تو دروازے سے کیوں جانے دیا؟ روک لیتیں۔''

''انہیں کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ کہہ رہے تھے پھر آئیں گے۔''

''نورالہدیٰ بھی جوان ہو گیا ہوگا۔ آخری بار جب میں نے دیکھا تھا تو سترہ اٹھارہ سال کا تھا۔'' آمنہ خالہ نے ہوائی تبصرہ کیا۔ چھوٹی ممانی بولیں۔

''ایسا ویسا؟ آپا! نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ فریال ہوتی آج تو بیٹے کا صدقہ نکالتی۔ آخر پالنے والی تو وہی تھی۔ اللہ جنت نصیب کرے، اس نے کبھی اپنے پرائے کا فرق نہیں کیا۔ تبھی تو نورالہدیٰ نے اس کے گھر سے رشتے جوڑ رکھے ہیں۔ لندن سے آتے ہی دوسرے دن ماموؤں کو سلام کرنے گھر آیا تھا۔'' پھر ملیحہ سے بولیں۔ ''بھائی صاحب کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔ آفاق بھائی نظر نہیں آ رہے۔''

''اپنے کسی دوست کی تلاش میں نکلے ہیں۔''

''اور سمیرا؟'' اس نے مزید پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہے۔ جب سے مایوں بٹھایا ہے، سارا وقت سوتی رہتی ہے۔ کہتی ہے فارغ بیٹھے اور کیا کروں؟''

''میں اسے دیکھتی ہوں۔'' وہ دروازے کے ساتھ موجود سیڑھیاں چڑھتی اوپر سمیرا کے کمرے میں آ گئی۔

''سنا تھا، شادی قریب ہو تو راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے پر یہاں تو دن میں بھی خواب خرگوش کے مزے لئے جا رہے ہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے ذرا سا چادر کو کھینچا جسے بھنا کر واپس تان لیا گیا۔

''گوہر کی بچی! تمہیں کہا نا، میں نہیں اُٹھوں گی۔۔ جو بکواس کرنی ہے، کر لو۔''

''ابھی شادی ہوئی بھی نہیں اور حواس اس قدر معطل ہیں کہ میری آواز بھی پہچانی نہیں جا رہی۔ شادی کے بعد تو شکل بھی نہیں پہچانو گی۔'' چادر تلے ٹھنکنے کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر ایک آنکھ نکال کر باہر جھانکا اور ملیحہ پر

نظر پڑتے ہی "یہ تم ہو؟" کہہ کر چادر پھینکتی وہ دیوانہ وار ملیحہ سے لپٹ گئی۔

"سمیرا! بس کرو۔ پسلیاں توڑو گی؟" ملیحہ نے بمشکل اسے خود سے الگ کیا۔ وہ الگ تو ہوگئی پر اسے زور کا ہاتھ مار کر بولی۔

"بدتمیز! جب ابو اور چاچو تمہیں لینے گئے تھے، تب کیوں نہیں آئیں؟"

"اب آ گئی ہوں نا۔" وہ متانت سے بولی

"اب بھی نہیں آتیں تو میں تمہیں جان سے مار دیتی۔"

اتنے میں ایک بچہ بھاگا بھاگا آیا اور بولا۔ "خالہ! مما کہہ رہی ہیں، آ کر چائے پی لیں۔" اور بول کر واپس بھاگ گیا۔

"چلو۔" ملیحہ نے اسے بھی ساتھ اٹھایا۔

"صرف تمہیں بلایا ہے۔ میرے تو باہر نکلنے پر پابندی ہے کہ خدانخواستہ آفاق صاحب کی نظر پڑ گئی تو ان کے ایمان کو شدید خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ ویسے سخت ناانصافی ہے۔ انہیں بھی کمرے میں بند کر دینا چاہئے۔ آخر ہم بھی صاحب ایمان ہیں۔" اس کے جلے کٹے انداز پر ہنستے ہوئے ملیحہ نے کہا۔

"تمہارے ایمان کا بھی خیال ہے۔ اسی لئے تو کمرے میں بٹھایا ہے۔"

"تو کیا فائدہ؟ میں کھڑکی میں سے انہیں آتے جاتے دیکھ لیتی ہوں۔"

"کیا؟" ملیحہ نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا تو وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔ "بہت بے شرم ہو۔" پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ "ابھی آ کر تمہیں دیکھتی ہوں۔"

چائے کے دوران ہی مغرب کا وقت ہوگیا۔ باقی سبھی لوگ نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ وہ نماز پڑھ کر دالان میں بچھے تخت پر آ کر بیٹھی۔ دونوں پاؤں سینڈل سے آزاد کر کے اوپر اٹھائے وہ فرصت سے بیٹھ گئی۔ آسمان کا رنگ گہرا ہونے لگا تھا۔ دور کہیں کچھ پرندے اپنے آشیانوں تک پہنچنے کی کوشش میں اُڑے جا رہے تھے۔ وہ فارغ بیٹھی ان پرندوں کو دیکھتی رہی۔ پھر یوں ہی بھٹکتی اس کی نظر تخت پر کچھ ہاتھ کے فاصلے پر رکھے دوپٹے پر پڑی جس پر کچھ دیر پہلے صائمہ لیس ٹانک رہی تھی۔ کرنے کو اور تو کچھ تھا نہیں، لیس اور دوپٹہ اٹھایا اور ٹانکنے لگی۔ گیٹ کا دروازہ کھول کر کوئی اندر آیا تھا۔

ملیحہ نے دھیان نہیں دیا۔ اتنی سی دیر میں ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ آمد و رفت بھی شادی کے ہنگاموں کا ہی ایک حصہ ہے۔ اندر آنے والا شام کے دھندلکے میں دالان کی روشنی میں تخت پر بیٹھی سوئی دھاگے میں اُلجھی لڑکی کو دیکھ کر پہلے تو آگے بڑھنے لگا، پھر کچھ شک سا ہوا تو اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"آپ؟" حیرت بھری اس آواز پر ملیحہ سمجھی تو نہیں، مخاطب وہ تھی۔ پھر بھی سر اٹھا کر دیکھا تو چاکلیٹ کلر کے شلوار قمیض میں ملبوس وجدان کو دیکھ کر حیرت کچھ اس طرح غالب آئی کہ احساس بھی نہیں ہوا اور سُوئی

دوپٹے میں سے گزارنے کے بجائے سیدھی بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں گھسا دی۔ ملیحہ کا تو انگوٹھے میں اُٹھتی ٹیسوں کی طرف دھیان بھی نہیں گیا تھا۔ وجدان نے اس کے انگوٹھے سے خون کے قطرے کو اُبھرتے دیکھا تو سر جھٹکتا اس کے پاس چلا آیا۔

"یہ آپ نے کیا، کیا؟" وہ اسے ملامت کرتا اس کے سامنے گھٹنا زمین پر ٹکاتا ہوا بیٹھا اور اس کا ہاتھ تھامنے کو ہاتھ بڑھایا تو ملیحہ نے کرنٹ کھا کر اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

وجدان نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"اسے تو لے سکتی ہیں؟"

ملیحہ نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد رومال لے لیا۔ رومال سے خون صاف کرتے ہوئے اس نے وجدان کو کہتے سنا۔ "آپ نے لائبریری آنا کیوں چھوڑ دیا؟"

ملیحہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "آپ کو کیسے پتہ ہے؟"

وہ کچھ بھی بولے بغیر مسکرایا تو ملیحہ نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔

"تو آپ روز وہاں جاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے دو مہینے سے آپ کیسے......" وہ بے ربط انداز میں بول رہی تھی۔ وجدان کی مسکراہٹ کچھ اور بھی گہری ہوگئی۔

مجھے یقین تو نہیں ہے مگر یہی سچ ہے
میں تیرے واسطے عمریں گزار سکتا ہوں
یہی نہیں کہ مجھے جیتنے کی خواہش ہے
میں تیرے واسطے خود کو بھی ہار سکتا ہوں

ملیحہ دم بہ خود سی بیٹھی تھی اور وجدان بھی جیسے ان پلوں کے سحر سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

"وجدان!" اس ایک پکار نے طلسم توڑ دیا۔ وہ دونوں ایک دم سے ہوش میں آ گئے۔ وجدان نے گردن گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔ گیٹ سے اندر آتا آفاق اسے دیکھ کر حیران ہوا۔

"تم یہاں ہو اور میں تمہیں سارے شہر میں تلاش کر رہا تھا۔" ملیحہ نے آفاق کو دیکھا اور پھر وجدان کو۔

سرِ شام ایک شخص ملیحہ کے سامنے گھٹنوں کے بل نیاز مندی سے بیٹھا تھا۔ یہ سچویشن کسی حد تک قابل اعتراض تو تھی۔ اس خیال سے وہ کچھ شرمندہ بھی تھی مگر وجدان کے چہرے پر اسے کسی قسم کی گھبراہٹ کے آثار نظر نہیں آئے۔ وہ اطمینان سے اٹھ کر آفاق سے گلے ملا جو شکوہ کر رہا تھا۔

"کہاں ہوتے ہو یار؟ نظر ہی نہیں آتے۔ پاپا بھی تمہاری گمشدگی سے کافی ناراض ہیں۔ صبح تو انہوں نے باقاعدہ حکم ہی دے ڈالا کہ تمہیں کہیں سے بھی برآمد کروں۔"

"کوئی خاص وجہ؟"

"کسی کیس کے سلسلے میں وہ تم سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔"

وجدان اُچھل پڑا۔"ایڈووکیٹ منیر حسن کو مشورے کی ضرورت ہے۔ وہ بھی میرے مشورے کی؟ کچھ ایسا کہو جسے میں مان بھی لوں۔"

"سیریسلی یار! پاپا تجھے بہت مانتے ہیں۔ اور جب سے میں نے ان کی لیگل فرم جوائن کرنے کی بجائے لیگل ایڈوائزر کی جاب کی ہے۔ تیرے نام سے مجھے طعنے بھی سننے پڑتے ہیں۔ چل اندر تو آ۔" آفاق اسے ساتھ لئے اندر چلا گیا۔

ملیحہ جہاں تھی وہیں بیٹھی رہ گئی۔ آفاق نے اسے مکمل طور پر نظرانداز کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ سامنے ہی بیٹھی تھی۔ اور یہ ممکن نہیں تھا کہ آفاق نے اسے نہ دیکھا ہو۔ مگر جس طرح اس نے ملیحہ کی ان دیکھی کی تھی، ملیحہ کو بہت عجیب لگا تھا۔

"ملیحہ! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ وہاں ہال میں سب ڈھولک کا پروگرام بنائے تمہارے انتظار میں ہیں۔ اُٹھو شاباش۔" صائمہ آ کر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بہت پیار سے بولی پھر اس کا ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ اٹھاتی اندر لے آئی۔ ہال کے ایک جانب بچھے قالین پر ملیحہ کی تمام کزنز اپنی ڈھولک لئے بیٹھی تھیں۔ ساتھ ہی سمیرا کو بھی بٹھا رکھا تھا جو ہاتھ بھر لمبے گھونگھٹ میں تھی اور پاس ہی صوفے پر وجدان براجمان تھا جو آفاق کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اپنے بازو سے لگی بیٹھی ارم کی چھوٹی سی پونی کو بار بار کھینچ رہا تھا اور وہ بار بار جھنجلا جاتی۔ ملیحہ ایک اچٹتی سی نگاہ اس طرف ڈال کر اپنے کزنز میں آ بیٹھی۔

❀❀❀

"یا اللہ! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟...... میں وجدان سے دور جانا چاہتی تھی اور وہ ایک بار پھر میرے سامنے آ گیا ہے۔ میں نے خود کو اس کی طرف جانے والے راستے پر بڑھنے سے روک لیا تھا پھر آپ کیوں اسے دوبارہ میرے راستے پر لے آئے ہیں؟...... یوں لگتا ہے کہ میں دائرے میں قید ہو گئی ہوں، جس بھی راستے پر قدم بڑھاؤں گی اس کے آخری سرے پر وجدان کو ہی کھڑا پاؤں گی۔"

ان سطروں کو رقم کر کے اس نے ڈائری بند کر کے احتیاط سے بیگ میں واپس رکھی اور لائٹ آف کر کے ڈبل بیڈ پر جا کر لیٹ گئی جس کے ایک سرے پر سمیرا بے خبر سو رہی تھی۔

ملیحہ نے دوبارہ وجدان کو اپنی طرف متوجہ نہیں پایا حالانکہ وہ اس کے آس پاس ہی تھا۔ ان تین دنوں میں ملیحہ کو بنا چاہے ہی اس کے بارے میں بہت کچھ پتہ چل چکا تھا۔ وہ اور آفاق کلاس فیلوز تھے۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد اس نے منیر حسن کا آفس جائن کر لیا تھا۔ گھر میں اسے گھر کے فرد کی حیثیت حاصل تھی اور سبھی لوگ اسے کافی پسند کرتے تھے۔ بڑے ماموں افتخار حسن نے تو وجدان کو بیٹا بنا رکھا تھا۔

مہندی کا انتظام چھت پر کیا گیا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی جو بھلی لگ رہی تھی۔ مہندی کی رسم سے فارغ

ہوکر سب لوگ دولہا دُلہن کے لیئے بنے اسٹیج پر چڑھ بیٹھے۔ جنہیں اسٹیج پر جگہ نہیں ملی، وہ اسٹیج کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بجائے اس کے سب ساتھ مل کر گانے گاتے، طے ہوا کہ ایک ایک شخص سے گانا گانے کی فرمائش کی جائے۔ اب وہاں جیسے میوزک کنسرٹ چل رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب اسٹیج کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ جاتے اور گانا گا کر اُٹھ جاتے۔ ملیحہ اسٹیج کے نیچے کرسی پر بیٹھی ٹی پنک کلر کے کپڑوں پر ہلکی سی شال لپیٹے ہوئے تھی۔ گوہر، وحید مراد کا ''کوکوکورینا'' گا کر اسٹیج سے اُتری اور سب تالیاں بجانے لگے کہ صمد نے آواز لگائی۔

''اب وجدان کی باری ہے۔''

سب نے صمد کی پیروی میں وجدان کا نام پکارنا شروع کیا۔ وجدان اپنی جگہ سے اٹھ کر سب کے بیچ میں آ کر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔

''میں گانا نہیں بلکہ ابن انشاء کی ایک نظم سناؤں گا۔''

''ارشاد، ارشاد'' کی آوازیں اُبھریں۔ جب شور تھما تو وجدان اپنی پُر اثر آواز میں گویا ہوا۔

''ہم گھوم چکے بستی بن میں
اِک آس کی پھانس لیئے من میں
کوئی ساجن ہو، کوئی پیارا ہو
کوئی دیپک ہو، کوئی تارا ہو
جب جیون رات اندھیری ہو
اِک بار کہو، تم میری ہو''

وجدان کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ ملیحہ کو نہیں دیکھ رہا تھا پر ملیحہ کو یوں لگا جیسے وہ اس بھرے مجمع میں خاص طور پر اسی سے مخاطب تھا۔ اس کے چہرے کے وجاہت بھرے نقوش کو ملیحہ پہلی بار دل کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور پہلی بار ہی اس نے جانا تھا کہ دل کی آنکھ سے دیکھنا کیسا لگتا ہے۔ وہ وجدان کی آواز کو روح کی گہرائی سے سن رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا، روح کی سماعتیں بہت محدود ہیں۔ اس ایک آواز کے سوا اسے اور کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

''جب ساون بادل چھائے ہوں
جب پھاگن پھول کھلائے ہوں
جب چندا روپ لٹاتا ہو
جب سورج دھوپ نہاتا ہو
یا شام نے بستی گھیری ہو

ایک بار کہو، تم میری ہو"

اس جملے کی بازگشت اس کے وجود میں دور دور تک پھیل گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی پر دوسرے ہی قدم پر ایک پکار نے زنجیر کیا تھا۔

"ہاں دل کا دامن پھیلا ہے
کیوں گوری کا من میلا ہے
ہم کب تک پریت کے دھوکے میں
تم کب تک دُور جھروکے میں
کب دید سے دل کو سیری ہو
اِک بار کہو تم میری ہو"

وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا جھگڑا سود خسارے کا
یہ کاج نہیں بنجارے کا
جب سونا روپا لے جائے
سب دنیا، دنیا لے جائے
تم ایک مجھے بہتیری ہو
اِک بار کہو تم میری ہو"

نظم ختم ہوئی اور وجدان نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو نظر سیدھی ملیحہ کے وجود سے ٹکرا گئی۔ بس ایک پل کے لئے وجدان کی آنکھوں میں اس کی پوری جان سمٹ آئی تھی مگر اگلے ہی پل سنبھل کر وہ اُٹھ گیا۔ ملیحہ اندھیرے میں کھڑی تھی اس لئے وجدان اس کے چہرے کو دیکھ نہیں سکا جہاں کشمکش نظر آ رہی تھی۔

"کیا جھگڑا سود خسارے کا، یہ کاج نہیں بنجارے کا۔" وہ زیرلب دہراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"مگر میرا دل تو اندیشوں سے بھرا ہے۔" وہ اُلجھ گئی تھی اور اُلجھن کبھی خود ہی سلجھ جاتی ہے۔ اس نے جانا نہ تھا مگر اب وہ بہت سے انجانے رازوں کو جاننے والی تھی۔

❁❁❁

مجنڈا اور بلیو کنٹراسٹ کے شرارہ سوٹ میں وہ اپنی کزنز کے ہمراہ دُلہن بنی سمیرا کو لئے اسٹیج تک آئی۔ اسے آفاق کے پہلو میں بٹھا کر اس کا دوپٹہ ٹھیک کر کے وہ سیدھی ہوئی اور اسٹیج سے اُترنے لگی کہ افتخار حسن نے اسے آواز دی۔

"ملیحہ!"

وہ فوراً پلٹی۔ ''جی ماموں جان!''

''بیٹا! فون تو کرو، بھائی صاحب ابھی تک نہیں آئے۔''

ان کی بات پر وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''ماموں جان! آپ تو جانتے ہیں نا، بابا جان کو۔ وہ کبھی بھی پُرہجوم جگہوں پر جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔''

وہ جانتے تھے، اسی لئے پھر اصرار نہیں کیا اور نورالہدیٰ کا پوچھنے لگے۔ ''نورالہدیٰ تو آئے گا نا؟''

''جی ماموں جان! صبح میری ہادی بھائی سے بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ آئیں گے۔ تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے۔''

وہ سر ہلا کر کسی اور طرف متوجہ ہو گئے تو ملیحہ بھی اپنا شرارہ سنبھال کر اسٹیج سے اُترتی وجدان کے برابر سے انجان بن کر گزر گئی۔

''ملیحہ!'' جب افتخار حسن نے ملیحہ کا نام پکارا تو وہ ملیحہ سے دو قدم ہی پیچھے تھا اور اپنے آپ ہی اس کے احساسات کو ایک نام مل گیا تھا۔ اس نے اس نام کو زیرلب دہرایا یوں کہ ہونٹ تو ہلے مگر آواز نہیں اُبھری۔ ملیحہ نے کوئی آواز تو نہیں سنی پر اسے احساس ہوا، کوئی اس کا نام لے رہا ہے۔ وہ بے ساختہ پلٹ کر بولی۔

''جی'' مگر وجدان کو دیکھ کر سٹپٹا گئی۔ اس کے سوالیہ انداز پر وجدان بولا۔

''سب کچھ تو کہہ چکا ہوں۔ اب اور کیا کہوں؟''

وہ گڑبڑا کر فوراً ہی پلٹ گئی۔ مگر جانے کیا ہوا، کچھ قدم چل کر ہی وہ اچانک پھر پلٹی اور فان کلر کے ڈنر سوٹ میں وجدان کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ملیحہ کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے اُلجھ گئیں۔ اور پہلی بار ایسا ہوا کہ وجدان کو دیکھ کر ملیحہ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ وہ ٹھٹک گئی۔ آگہی کا پل اس کی زندگی میں آ چکا تھا۔ اس نے بے یقینی سے وجدان مصطفیٰ کی طرف دیکھا۔ وجدان نے آنکھ کے اشارے سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ یوں ہی اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اپنے احساسات پر غور کرتے ہوئے الجھے انداز میں سر کو جھکا لیا تو سلکی بال کندھے سے پھسلتے ہوئے اس کے رخ کو ڈھک گئے۔ ایک ہاتھ سے بال ہٹاتے ہوئے اس نے پھر وجدان کو دیکھا جو بہت دلچسپی سے اس کے ہر ہر انداز کو نوٹ کر رہا تھا۔ اور پھر پہلی ہی بار وجدان نے اسے خود سے شرماتے دیکھا تھا۔ نظریں چراتے ہوئے رخ بدل کر وہ ہونٹوں میں مسکرائی پھر فوراً ہی پلٹ کر بھاگتے ہوئے ہال کے ایک جانب بنے ڈریسنگ روم میں جا چھپی۔

اس نے گو کچھ نہیں کہا تھا لیکن سامنے وہ شخص کھڑا تھا جس نے اسے حفظ کر لیا تھا۔ بھلا اسے اس حادثے کی خبر کیسے نہ ہوتی؟ وجدان نے کھل کر مسکراتے ہوئے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اس رب کا شکر ادا کرنے لگا جس نے آج اس کی محبت کو معتبر کر دیا تھا۔

❁❁❁

نورالہدیٰ وطن واپس لوٹے تو بہت دنوں تک فارغ نہیں رہ سکے۔ فوراً ہی گارمنٹس فیکٹری کے قیام کے سلسلے میں دوڑ دھوپ شروع کر دی اور ایک بھرپور دن گزار کر رات جب وہ لوٹتے تو تھکن سے جسم ٹوٹ رہا ہوتا۔ مگر یہ تھکن بس قصرِ فاروقی کی چوکھٹ تک ہی ان کا ساتھ دے پاتی۔ کیونکہ چوکھٹ کے اس پار ایک لڑکی ان کے انتظار میں نیند قربان کیے جاگ رہی ہوتی اور ان کو دیکھتے ہی وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر پاس چلی آتی اور سلام کرنے کے بعد ان سے کہتی۔

''آپ فریش ہو جائیں، میں کھانا لے کر آتی ہوں۔''

پھر جتنی دیر میں وہ فریش ہو کر کمرے میں آتے، وہ کھانا گرم کر کے ٹرے میں سجائے کمرے میں چلی آتی۔ نورالہدیٰ اسے دیکھتے ہی صوفے پر جا بیٹھتے۔ وہ کھانا شام میں کھا لیا کرتی تھی مگر اب اس نے اپنی بھوک کو تقسیم کر لیا تھا۔ تھوڑا سا کھانا وہ شام کو بابا جان کے ساتھ کھاتی اور تھوڑا سا کھانا رات میں نورالہدیٰ کا ساتھ دینے کو کھاتی۔ مگر آج دروازہ کھول کر اندر پیر رکھتے ہوئے انہوں نے خالی صوفے کو دیکھا تو وہیں رک گئے۔

''اک تم جو نہیں ہو تو لگتا ہے کچھ نہیں ہے۔'' انہوں نے اپنی سرگوشی سنی۔

''صاب! کھانا لگا دوں؟'' بہادر ایک دم سے کسی کونے سے نکل آیا۔

''رہنے دو یار! بھوک نہیں ہے۔'' بہت بے زاری سے بول کر وہ دروازے کے آگے بنے اسٹیپ پر بیٹھ گئے۔ بہادر سر ہلا کر واپس غائب ہو گیا تھا۔

نورالہدیٰ نے کوٹ ران پر رکھا۔ آستینیں کہنیوں تک پہلے سے ہی چڑھا رکھی تھیں۔ ٹائی کی ناٹ کھینچ کر ڈھیلی کرتے ہوئے انہوں نے گریبان کے بٹن بھی کھول دیئے۔ پھر کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور مسکرا اُٹھے۔ اس وقت انہیں شادی ہال میں ہونا چاہئے تھا۔ وہ جانتے تھے، ملیحہ اس وقت بے صبری سے ان کا انتظار کر رہی ہو گی۔ خود وہ بھی اسے ایک نظر دیکھ لینے کو بے چین تھے مگر پھر یہ خیال کہ وہ ان کی راہ دیکھتے ہوئے بس انہیں سوچ رہی ہو گی، کہیں زیادہ کیف آگیں تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے گدی مسلتے خود سے بولے۔

''کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک لڑکی مجھ جیسے شخص سے ایسی امیچور حرکتیں کروا لے گی۔'' خود پر مسکراتے ہوئے انہوں نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا کے جیب سے لائٹر نکال کر جلایا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے کچھ یاد کر کے ان کے ہاتھ ایک پل کو رکے، پھر ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکتے انہوں نے سگریٹ سلگا لیا۔

گلاس وال سے گزر کر ان کی نظریں لاؤنج کے اس صوفے پر ٹھہریں جس پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرتے ہوئے وہ پہلی رات سو گئی تھی۔ اور پھر آنے والی کئی راتیں نورالہدیٰ نے اسے اسی صوفے پر بیٹھے اپنے انتظار میں جاگتے پایا تھا۔ نورالہدیٰ نے ایک گہرا کش لے کر دھواں ہوا میں چھوڑا اور ملیحہ کو دیکھنے کی ان کی خواہش

عجیب سے ڈھنگ سے پوری ہوگئی۔ دھوئیں میں لپٹا اس کا ہر نقش بہت واضح تھا۔ بند آنکھوں کو ڈھکتے پپوٹوں پر بجی پلکوں کا سایہ، گالوں پر پڑ رہا تھا۔ ہونٹ نیم وا تھے۔ اُلجھے بالوں کی ایک لٹ اس کے گال کو چھو رہی تھی۔ گداز بانہوں میں کشن دبا رکھا تھا اور لمبا دوپٹہ ایک طرف سے ذرا سا شانے پر ٹکا تھا اور دوسری طرف سے پیروں کو چھوتا قالین پر بے ترتیبی سے بکھرا تھا۔ دھواں تحلیل ہونے لگا تو عکس بھی مٹنے لگا تھا۔ نورالہدیٰ نے ایک اور کش لے کر دھوئیں کی دیوار اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑی کر لی۔ اور وہ بے خبر حُسن پھر سے ان کی نظروں میں آٹھہرا۔

''محبت کا یہ کھیل بھی کتنا عجیب ہے کہ دُھندلے منظر زیادہ روشن، زیادہ صاف دکھائی دیتے ہیں۔'' ملیحہ کے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ آہستہ سے بڑبڑائے پھر اپنی ہی بات پر چونک گئے۔

''محبت۔'' انہوں نے دھیرے سے اس لفظ کو دہرایا اور سوچ میں پڑ گئے۔ وہ سوچتے رہے، سوچتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی انگلیوں میں دبا سگریٹ صفحۂ ہستی سے مٹتے ہوئے اپنے وجود کی تپش ان کی پوروں کو بخش کر انہیں ہوش میں لے آیا۔ بے ساختہ ہی ہاتھ جھٹکتے ہوئے ان کے ہونٹ دلکشی سے مسکرائے تھے۔

''تو نورالہدیٰ فاروقی!'' انہوں نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے خود سے کہا۔'' آج یہ اعتراف کر ہی لو کہ تمہیں محبت ہو چکی ہے۔''

کسی کے تصور سے ان کی آنکھیں جگمگائی تھیں۔ انہوں نے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھندلے منظر پھر سے روشن ہونے لگے تھے۔

❁❁❁

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ شادی کے ہنگامہ میں بری طرح تھک کر سوئی گوہر کو اس کے ڈیڑھ سال کے بیٹے نے بھوک سے مجبور ہو کر جگا ڈالا۔ اس کے رونے کی آواز پر پاس سوتا جنید بھی جاگ گیا۔ گوہر بچے کے لئے فیڈر بنانے اُٹھی اور میاں کو بیٹے کا خیال رکھنے کو کہہ کر کچن میں آ گئی۔ دودھ گرم کر کے فیڈر میں ڈالتی وہ کچن کی لائٹس آف کر کے کمرے میں جانے لگی تو اسے شک ہوا کہ کوئی ٹیرس پر ہے۔ وہ حیران ہوتی ٹیرس پر آئی تو اندھیرے کے باوجود ریلنگ کے پاس کھڑے وجود کو پہچان لیا۔

''ملیحہ! تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' ملیحہ نے پلٹ کر اسے دیکھا تو گوہر اس کے پاس آ گئی۔'' اور اتنی ٹھنڈ میں تم ٹیرس پر کیا کر رہی ہو؟''

''چاند کو دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اب چاند کو دیکھنا چھوڑو اور بستر پر جا کر خواب دیکھو۔ بہت رات ہو چکی ہے اور صبح جلدی اُٹھنا ہے۔'' ملیحہ نے جیسے خواب سے آگے کی بات سنی ہی نہیں۔

''مجھے خواب دیکھنے سے بہت ڈر لگتا ہے گوہر! کیونکہ ٹوٹ جاتے ہیں تو عمر بھر تکلیف دیتے ہیں۔ لیکن آج

میرا دل چاہ رہا ہے کہ کچھ خواب جاگتی آنکھوں سے سجا لوں۔ تم نے کبھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھے ہیں؟'' وہ اب گوہر سے پوچھ رہی تھی۔

''شادی سے پہلے دیکھا کرتی تھی۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''مگر اب تو بند آنکھوں میں بھی باپ بیٹے کے چہرے ہی نظر آتے ہیں۔'' پھر سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ ''اچھا میں چلتی ہوں۔ معیز کے لئے فیڈر بنانے آئی تھی۔ وہ جنید کو پریشان کر رہا ہوگا۔ اور تم بھی اب چاند اور خواب کی باتیں چھوڑو اور جا کر سو جاؤ۔ کل شام میں ولیمہ ہے اور پورا دن اتنی ہلچل مچے گی کہ آرام کا موقع نہیں ملے گا۔'' وہ اسے سونے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو ملیحہ نے مڑ کر نظریں پھر سے چاند کی طرف اُٹھائیں جس پر اس لمحے وجدان کی نظروں کا پہرہ تھا۔ جو لان سے چھت تک جاتی سیڑھیوں پر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا تھا۔ بار بار شام کا وہ منظر اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور ہونٹوں کی مسکراہٹ لمحہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

نورالہدیٰ، ملیحہ اور وجدان تینوں کی آنکھیں زندگی میں پہلی بار رت جگے سے آشنا ہو رہی تھیں اور تینوں ہی اس بات سے لاعلم تھے کہ اس ایک رات کا جاگنا انہیں ساری عمر جگائے گا۔

❀❀❀

آج نورالہدیٰ، ملیحہ کو لینے آنے والے تھے۔ وہ دو راتوں سے سو نہیں سکی تھی۔ صبح فجر کی نماز پڑھ کر سوئی تو دس بجے اُٹھی اور ناشتہ کر کے کمرے میں آتے ہی اپنا بیگ پیک کرنے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ کچھ گنگناتی جا رہی تھی۔ سمیرا اسے بلانے آئی تو دروازے میں ہی رک کر اسے دیکھنے لگی۔ ملیحہ کو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا تو اس نے خود ہی کھلے دروازے پر دستک دے کر اسے متوجہ کر لیا۔ ملیحہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''وہاں کیوں کھڑی ہو؟ اندر آ جاؤ۔''

سمیرا کمرے میں آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے؟ جب آئیں تو اُلجھی ہوئی سی تھیں۔ اب جا رہی ہو تو بہت خوش نظر آ رہی ہو۔''

''ہاں خوش تو ہوں۔'' وہ اِٹھلائی، پھر بولی۔ ''مگر تم میری چھوڑو، اپنی سناؤ۔ شادی کے بعد تو اور بھی نکھر گئی ہو۔'' لائٹ پرپل کلر کے ہلکی سی کڑھائی والے کپڑوں میں ملبوس مہندی لگے ہاتھوں کی کلائیوں میں بھر بھر کر چوڑیاں پہنے ہلکی سی جیولری میں دُلہناپے کا روپ لئے سمیرا کو دیکھ کر اس نے کہا۔ جواباً سمیرا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''میرا انکھار تو شادی کی وجہ سے ہے۔ مگر تم کیوں کھلی جا رہی ہو؟'' سمیرا نے کچھ فاصلے پر بیٹھی کپڑے تہہ کرتی ملیحہ کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا جس کے گالوں کی سرخیاں اور بھی گلابی ہو رہی تھیں۔ ملیحہ نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر جذب سے کہا۔

''محبت سے۔''

''کیا؟'' سمیرا اُچھل ہی تو پڑی۔ ملیحہ نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ اگر محبت ہونے سے پہلے مجھے پتہ چل جاتا کہ محبت اتنا خوب صورت احساس ہے تو کبھی پہروں محبت ہو جانے کے خیال سے خوف زدہ نہ رہتی۔ مگر اظہار تو اب بھی مشکل ہی لگتا ہے۔''

''مگر محبت ہوئی کس سے ہے؟ کیا نورالہدیٰ سے؟'' پوچھنے کے ساتھ ہی اس نے اندازہ بھی لگایا۔ اس کے غلط اندازے پر وہ ست ہو کر بولی۔

''ان سے محبت ہوئے تو زمانے بیت گئے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ کب ہوئی تھی۔'' مگر وجدان کا نام نہ لے سکی تو چپ ہو کر یوں ہی بیڈ شیٹ کی اَن دیکھی شکنیں دُور کرنے لگی۔

سمیرا نے اس کے لہجے کو سمجھا نہیں، اس کے لفظوں کو اپنے اندازے کی تصدیق سمجھ کر چھیڑنے کے سے انداز میں بولی۔

''لگتا ہے انہیں بھی تم سے محبت ہے۔ کل ولیمہ ہوا اور آج لینے آ پہنچے۔ ایک دن مزید تمہارے بغیر رہ نہیں سکے۔''

''ہادی بھائی آ گئے ہیں۔'' نورالہدیٰ کے آنے کا سن کر اس نے پھر اور کسی طرف دھیان ہی نہیں دیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نیچے بھاگی چلی آئی۔ اسے آتا دیکھ کر منیر حسن کی کسی بات کا جواب دیتے نورالہدیٰ نہ صرف چپ ہو گئے بلکہ بے دھیانی میں ہی کھڑے بھی ہو گئے۔ ملیحہ اسی تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔ اس کی رفتار دیکھ کر نورالہدیٰ کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھے آفاق کو خدشہ ہوا کہ وہ سیدھی ان کے گلے لگ جائے گی۔ نورالہدیٰ بھی اس کی تیزی پر بوکھلا گئے تھے پر ان سے دو قدم کے فاصلے پر ملیحہ نے اچانک ہی بریک لگا لئے۔ اپنی غیر ارادی حرکت پر وہ شرمندہ ہو گئی تھی اسی لئے کچھ بول بھی نہیں پائی۔ اور نورالہدیٰ نے اس کے بولنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا۔

''کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟ اور بابا جان کا کیا حال ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ اور بابا جان کا حال بھی بہتر ہے۔'' پھر اسے کھڑے دیکھ کر کہنے لگے۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' اور وہ فوراً بیٹھ گئی۔ نورالہدیٰ بھی واپس اپنی جگہ بیٹھتے بولے۔

''جی ماموں جان! آپ کیا کر رہے تھے؟'' اور ان کی بات چیت کا سلسلہ جہاں سے منقطع ہوا تھا، وہیں سے جڑ گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ اپنا بیگ لینے کمرے میں آئی تو ایک دم سے وجدان کا خیال آ گیا۔ اتنے دنوں سے تو وہ یہیں تھا۔ پر آج صبح سے نظر ہی نہیں آیا تھا۔ وہ بیگ لئے نیچے آ گئی نورالہدیٰ سب سے رخصت

لے کر اس کا بیگ اٹھائے آفاق کے ساتھ گیٹ سے نکل گئے۔ سب سے ملتی وہ سمیرا تک آئی۔ سمیرا پل بھر کو اس کے گلے لگ کر بولی۔

''اللہ حافظ!''

''ارے، یہ کیا طریقہ ہے؟'' ملیحہ اچنبھے سے بولی تو اس نے کہا۔

''طریقہ تو بالکل صحیح ہے۔ لیکن تمہیں اعتراض کیا ہے؟''

''ویسے تو میں جب بھی آتی تھی تو جاتے وقت تم کیسے روکتی تھیں۔ تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ، اچھا شام کو چلی جانا۔ اور آج کتنے آرام سے مجھے بھیج رہی ہو۔ ایک بار بھی نہیں روکا۔''

''کیونکہ میں جانتی ہوں آج میرے روکنے سے تم نہیں رُکو گی۔'' اس کے نروٹھے پن کے جواب میں سمیرا شوخی سے بولی پر وہ سادگی سے کہنے لگی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے آئے بہت دن ہو گئے۔ اب اور نہیں رک سکتی۔'' پھر اللہ حافظ کہہ کر گیٹ کی طرف جانے لگی۔ اسی وقت وجدان اندر آیا تھا۔ اس نے ملیحہ کو دیکھا پھر پیچھے کھڑے سب لوگوں کو۔

''آپ جا رہی ہیں؟'' پہلی بار وہ سب کی موجودگی میں اس سے براہِ راست مخاطب ہوا تھا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا۔

''ملیحہ! اب آ بھی جاؤ۔ نورالہدیٰ انتظار کر رہا ہے۔'' آفاق نے گیٹ سے اندر منہ کر کے کہا تو کچھ کہے بغیر وہ باہر نکل گئی۔

''میری خاطر جھوٹ بولتے بولتے مجھ سے بھی جھوٹ بولنا سیکھ گئے ہیں۔'' کار کی خاموشی میں ملیحہ کی خفگی بھری آواز سنائی دی تھی۔ وہ اس کی طرف مڑے اور کوئی وضاحت مانگے بغیر بولے۔

''آئی ایم سوری۔''

ملیحہ نے ان پر ایک خفا سی نگاہ ڈالی اور منہ پھیر لیا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے وہ پھر بولے۔

''ملیحہ! میں معافی مانگ رہا ہوں نا۔''

''معافی مانگنے کی نوبت ہی کیوں آئی؟'' وہ یوں ہی رخ موڑے بولی پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جانتے ہیں میں نے آپ کا کتنا انتظار کیا تھا؟''

''جانتا ہوں۔'' وہ ہلکے سے مسکرائے۔

''پھر آئے کیوں نہیں؟''

''کبھی کبھی یہ احساس بہت سکون دیتا ہے کہ کوئی آپ کے انتظار میں بے چین ہے۔'' ملیحہ نے سر جھکا کر دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہیں۔'' پھر اپنی بات کہہ کر منہ پھیرے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ نورالہدیٰ نے ڈیلنگ

بورڈ سے ایک انویلپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ ملیحہ نے ان کے ہاتھ کی طرف دیکھا، پھر انویلپ میں رکھا کاغذ نکال کر پڑھنے لگی۔ وہ جیسے جیسے پڑھتی گئی، اس کے چہرے پر جوش کے آثار نظر آنے لگے۔ آخر وہ ان کا بازو دبوچ کر زور سے بولی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا ہادی بھائی! جب مجھے پتہ چلا کہ آرٹس کونسل نئے مصوروں کے لئے ایگزی بیشن ارینج کرنا چاہتی ہے تو میں نے مذاق مذاق میں ہی اپلائی کر دیا۔ پر میرا اسلیکشن ہو گیا ہے۔''

''واقعی؟'' وہ بہت دل سے حیران ہوئے۔

''ہاں۔ اور پتہ ہے اس میں لکھا ہے کہ......'' وہ لیٹر میں سے کچھ پڑھتے ہوئے ایک دم ہی چپ ہو گئی۔ اسے خیال آیا کہ جب اس نے انویلپ میں سے لیٹر نکالا تھا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ وہ مشکوک سے انداز میں بولی۔

''ہادی بھائی! یہ انویلپ آپ نے کھولا تھا؟''

اب وہ مزید ایکٹنگ کا ارادہ چھوڑ کر ہنستے ہوئے بولے۔ ''سوری اگین۔''

''ہادی بھائی! میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی، اسی لئے آپ کو اور بابا جان کو نہیں بتایا تھا۔'' وہ بری طرح چڑ گئی۔ نورالہدیٰ کہنے لگے۔

''انویلپ پر ''آرٹس کونسل'' لکھا دیکھ کر میں ایکسائیٹڈ ہو گیا تھا مگر میں نے بابا جان کو نہیں بتایا۔ تم انہیں اپنا سرپرائز دے سکتی ہو۔''

''آپ مجھ سے کچھ مت کہیں۔ مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔'' اسے روٹھتے دیکھ کر انہوں نے سڑک پر ایک طرف گاڑی روک دی۔

''ملیحہ!'' انہوں نے آواز دی مگر وہ منہ موڑے بیٹھی رہی۔ ''اِدھر دیکھو۔'' انہوں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور کان پکڑ کر بولے۔ ''سوری۔'' لیکن وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ ان کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

''آئی ایم ریئلی سوری۔'' انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تو ملیحہ نے جھٹکے سے ان کے ہاتھوں کو الگ کر دیا۔

''آپ بہت برے ہیں۔''

''میں برا ہوں؟'' وہ یوں بولے جیسے ان کا برا ہونا ناممکنات میں سے ہو تو وہ ایک دم ہی ہنس پڑی۔

''نہیں۔ آپ بہت اچھے ہیں۔'' اس کے ہنستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر نورالہدیٰ ریلیکس ہو گئے۔

❁❁❁

کچھ دیر پہلے ہی نورالہدیٰ بابا جان اور ملیحہ کو اسٹڈی میں چھوڑ گئے تھے اور جاتے ہوئے دروازہ بھی بند کر گئے تھے۔

''آئیے بابا جان!.....اور ملیحہ! تم بھی آ جاؤ۔'' کچھ دیر بعد باہر آ کر وہ دونوں سے بولے۔ باہر آ کر انہوں

نے بابا جان سے کہا۔

''جائیے، آپ کے کمرے میں ایک سرپرائز گفٹ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔'' وہ اپنے کمرے میں جانے لگے تو ملیحہ بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟'' نورالہدیٰ نے فوراً اس کا بازو پکڑ کر روکا۔

''بابا جان کا گفٹ دیکھنے۔''

''بابا جان کا برتھ ڈے گفٹ ہے، پہلے انہیں دیکھنے دو۔ تم بعد میں دیکھ لینا۔''

''جی نہیں۔ مجھے ابھی دیکھنا ہے۔ ہاتھ چھوڑیں۔'' وہ ضد سے بولی۔

''کہا نا بعد میں دیکھنا۔'' وہ اڑ گئے۔ وہ اپنا بازو چھڑانے لگی۔

''چھوڑیں مجھے۔''

''تم آرام سے کھڑی رہو۔ بابا جان! آپ جائیے۔'' اسے خاموش کروا کر وہ آخر میں بابا جان سے بولے جو ان کے جھگڑے کی وجہ سے رک گئے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر کمرے میں گئے اور ملیحہ نے شور مچا دیا۔

''مجھے بھی دیکھنا ہے۔ ہاتھ چھوڑیں ہادی بھائی! برتھ ڈے تو یاد نہیں رہا۔ اب بڑے آئے ہیں برتھ ڈے گفٹ دینے والے۔'' بولنے کے ساتھ ہی وہ دوسرے ہاتھ سے ان کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر انہوں نے اس کا بازو نہیں چھوڑا تو اس نے اچانک ہی ان کے ہاتھ میں دانت گاڑ دیئے۔ نورالہدیٰ نے تڑپ کر اپنے ہاتھ کو جھٹکا مگر اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط ہی رکھی۔

''جنگلی بلی۔'' کہہ کر حساب بھی برابر کر دیا۔

''خود ہی ہوں گے جنگلی بلی...... بلکہ بلے۔'' سخت برا منایا گیا تھا۔ آخر نورالہدیٰ نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

''جاؤ۔'' اور وہ بھاگتی بابا جان کے کمرے میں گھس گئی۔ پر گھستے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

''یہ......'' اس نے ہاتھ سے آتش دان پر لگی اپنی بڑی سی فریم شدہ تصویر کی طرف اشارہ کیا تو اس کے پیچھے آتے نورالہدیٰ بولے۔

''یہی تو ہے بابا جان کا برتھ ڈے گفٹ۔''

''پر یہ تو میری تصویر ہے۔'' وہ اب بھی حیران تھی۔

''ہاں۔ اور مجھے بابا جان کے لئے اس سے بہتر کوئی تحفہ ملا ہی نہیں۔''

''اس کے مقابلے پر میں اور کوئی تحفہ قبول بھی نہیں کرتا۔'' بابا جان، نورالہدیٰ سے کہتے ملیحہ کے پاس آئے اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر کر بولے۔ ''اس تحفے کو پانے کے لئے میں نے سات سال راتوں کو جاگ کر دعائیں مانگی ہیں۔'' اور اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر وہ فوراً ہی اس جذباتی کیفیت سے باہر بھی آ گئے۔

''میں لان میں جا رہا ہوں۔ چائے وہیں لے آؤ۔'' وہ تو چلے گئے مگر ملیحہ اب بھی اسی کیفیت میں تھی۔ اس

نے یاد کرنا چاہا، آخری بار کب بابا جان نے اپنی بے ساختہ شفقت کا اظہار کیا تھا۔ سوال کچھ زیادہ ہی مشکل تھا، جواب ہی نہیں آیا۔ نورالہدیٰ نے اسے گم سم دیکھ کر ہلکے سے اس کے سر پر چپت لگائی۔

''کہاں گم ہو؟'' ملیحہ نے رخ بدلنے کے ساتھ ہی اپنا موڈ بھی بدل لیا۔ شوخی سے بولی۔

''میں سوچ رہی ہوں ہادی بھائی! کہ میری تصویر اچھی آئی ہے یا میں سچ مچ اتنی ہی خوبصورت ہوں۔''

نورالہدیٰ نے ایک نظر اسے دیکھا اور کہا۔ ''تمہاری تصویر بھی اچھی آئی ہے اور تم بھی بہت خوبصورت ہو۔''

''آپ بٹرنگ کچھ زیادہ ہی کر رہے ہیں۔'' وہ انہیں تیکھی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

''یہ سب چھوڑو اور بتاؤ تم اپنا سرپرائز کب دے رہی ہو؟''

''کبھی نہیں۔'' اس نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ نورالہدیٰ بھی اس کے پیچھے باہر آئے۔

''کبھی نہیں کیا مطلب ہے؟''

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ بابا جان بھی ایگزی بیشن میں آئیں مگر میں جانتی ہوں وہ نہیں آئیں گے۔ تو پھر بتانے کا بھی کیا فائدہ؟'' وہ رُکی نہیں اور یوں ہی چلتے ہوئے ان سے باتیں کرتی ہوئی کچن کی طرف آ گئی۔

''تم نے کیسے سوچ لیا کہ بابا جان نہیں آئیں گے؟''

''بس میں جانتی ہوں۔''

''بے کار اندازے مت لگاؤ۔'' انہوں نے اسے ڈانٹ دیا پھر اس کی صورت دیکھ کر پیار سے بولے۔

''پریشان کیوں ہوتی ہو؟ اگر انہوں نے منع بھی کر دیا تو میں انہیں منا لوں گا۔''

''آپ مناتے کہاں ہیں؟ آپ تو دھاندلی کرتے ہیں۔'' اس نے بچے کی طرح منہ بنایا تو وہ رُعب سے بولے۔

''میں جو بھی کروں، مگر تم آج ہی بابا جان کو ایگزی بیشن کے بارے میں بتاؤ گی۔ نہیں تو میں بتا دوں گا۔ بس ایک ہفتہ ہی رہ گیا ہے۔''

''ہادی بھائی! بابا منع کر دیں گے۔'' اس نے پھر وہی بات دہرائی تو نورالہدیٰ جھنجلا گئے۔

''ایک تو تمہاری سوئی کہیں بھی اٹک جاتی ہے۔ اب جاؤ ذرا چائے کا بندوبست کرو۔ اور چائے خود ہی بنانا۔ تمہارا چہیتا بہادر تو جوشاندہ سامنے رکھ دیتا ہے۔''

وہ ہونٹ کاٹتی کچن میں چلی گئی تو وہ بھی باہر لان میں آ گئے۔

''کچھ خاص خبر چھپی ہے؟'' چیئر پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے شام کا اخبار دیکھتے بابا جان سے پوچھا۔

''خود ہی دیکھ لو۔'' انہوں نے اخبار نورالہدیٰ کی طرف بڑھایا جسے پکڑنے کے لئے نورالہدیٰ نے ہاتھ بھی نہیں اٹھایا اور کہا۔

''ذرا دیر میں چائے آنے والی ہے اور ملیحہ کہتی ہے کھانے پینے کے وقت اخبار نہیں پڑھنا چاہئے، بھوک ختم

ہو جاتی ہے۔“

”بہت مانتے ہو اس کی۔“ اخبار والا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے وہ بولے تو نور الہدیٰ نے مسکرا کر سر جھکا دیا۔

”تمہیں ملیحہ کیسی لگتی ہے؟“ یہ سوال اس قدر اچانک تھا کہ نور الہدیٰ بھی گڑبڑا گئے اور بوکھلاہٹ میں کچھ بول ہی نہ سکے تو انہیں دیکھنے لگے۔

”میں نے پہلے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا مگر کچھ دن پہلے یہ خیال میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ تم دونوں کی شادی کر دی جائے۔“ بابا جان نے دھماکہ ہی کر دیا تھا۔ نور الہدیٰ تو پہلے گڑبڑائے ہوئے تھے، اب تو بالکل ہی سٹپٹا گئے۔ بابا جان رکے نہیں، کہنے لگے۔

”یوں تو شاید میں اس بارے میں کبھی سوچتا بھی نہیں مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ تم دونوں میں کافی اچھی انڈراسٹینڈنگ ہے اور دوستی بھی۔ پھر تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہتے ہو۔ لیکن میں تمہاری رائے بھی جاننا چاہتا ہوں۔“ نور الہدیٰ اب سنبھل چکے تھے مگر اپنی دوٹوک فطرت کے باوجود وہ بابا جان کے سامنے ملیحہ کے بارے میں ایسی بات کرنے سے ہچکچا گئے۔ بابا جان نے بھی ان کے گریز کو سمجھ لیا تھا۔

”میں تمہاری ہچکچاہٹ سمجھ سکتا ہوں۔ بے شک ملیحہ میری بیٹی ہے لیکن میں نے تمہیں بھی ہمیشہ اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے۔ اور بیٹا باپ کے سامنے اپنے دل کی ہر بات کہہ سکتا ہے۔ بولو! وڈیو لائیک ہر؟“

”آئی لو ہر۔“ بابا جان کی بات سے تقویت پا کر وہ اپنے فطری انداز میں بے جھجک بولے تھے۔ بابا جان حیران ہوئے بغیر مسکرا دیئے۔ مگر ان کی مسکراہٹ سے نروس ہوئے بغیر انہوں نے اگلے ہی پل کہا۔

”مگر اس کے باوجود میں نے ملیحہ سے شادی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔“ اب وہ کچھ حیران ہوئے تھے۔

”محبت کرتے ہو، پھر بھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا؟“

”ہاں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ملیحہ ایسا نہیں سوچتی۔“

”نہیں سوچتی مگر سوچ تو سکتی ہے۔“ وہ ایک پل کو خاموش ہو گئے پھر کہا۔

”وہ میرے اور اپنے موجودہ رشتے سے مطمئن ہے اور مجھے نہیں لگتا اسے اس رشتے میں کسی کمی یا گنجائش کا احساس ہوتا ہے۔“

”اسے احساس اس لئے نہیں ہوتا کیونکہ وہ بہت سادہ اور معصوم ہے۔ پھر کم عمر بھی ہے اور اسی لئے ان باتوں کی طرف اس کا کوئی دھیان نہیں۔ مگر بچی بھی نہیں ہے، دھیان دلایا جائے گا تو گنجائش بھی نکل آئے گی۔“ بابا جان چپ ہوئے تو نور الہدیٰ نے کہا۔

”ٹھیک ہے مگر پہلے آپ ملیحہ سے اس کی مرضی معلوم کر لیجئے۔ لیکن بابا جان! اگر وہ انکار کر دے تو پلیز اسے مجبور مت کیجئے گا۔“

بابا جان نے ان کی طرف گہری نظر ڈالی۔ ''وہ اگر نہ کر دے گی تو کیا تمہیں دکھ نہیں ہوگا؟''
انہوں نے بابا جان کو دیکھا اور ایک بے نام مسکراہٹ ان کے چہرے پر آ گئی۔
''دکھ تو ہوگا۔ مگر میں ملیحہ کی خوشی کی خاطر اپنا دکھ بھی سہہ سکتا ہوں۔'' وہ اپنی بات کہہ کر ابھی چپ ہی ہوئے تھے کہ ہاتھ کی پشت پر ایک ریشمی احساس نے انہیں چونکایا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو ملیحہ چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ رہی تھی اور جھکنے کی وجہ سے اس کا دوپٹہ کندھے سے پھسل کر ان کے ہاتھ پر آ گرا تھا۔
ملیحہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ان کے اور بابا جان کے بیچ کیا بات چل رہی تھی مگر اس نے نورالہدیٰ کا آخری جملہ سنا تھا اور جسے سن کر اس کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ دوبیڈ سنبھالتے ہوئے اس نے ایک کپ اٹھا کر بابا جان کی طرف بڑھایا مگر ٹھیک اسی وقت انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار اپنے اور ملیحہ کے بیچ تان دیا تھا۔ یہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کی ایک لاشعوری کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ملیحہ ان کے چہرے سے ان کی اور نورالہدیٰ کی بات چیت کا مفہوم اخذ کر لے۔ مگر ان کی لاشعوری حرکت ملیحہ کو تازیانے کی طرح لگی تھی۔ تحقیر کے شدید احساس نے اس کی حسیات ہی سلب کر لیں۔
نورالہدیٰ کو بھی بابا جان کا یہ انداز بہت برا لگا تھا۔
''بابا جان! وہ آپ کو کپ پکڑا رہی ہے۔'' انہوں نے بابا جان کو ملیحہ کی طرف زبردستی متوجہ کیا۔
''ٹیبل پر رکھ دو بیٹا!'' کہہ کر پھر سے اخبار میں گم ہو گئے۔ ملیحہ نے کپ ان کے سامنے رکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ مگر وہ چپ سی ہو گئی تھی۔ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے نورالہدیٰ اس سے یہاں وہاں کی بات کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے وہ واقعی بہل گئی تھی۔ پھر اسے یاد آیا، جو نورالہدیٰ نے اس سے کچن کے دروازے پر کہا تھا مگر شاید اب خود بھول چکے تھے۔ اس نے سوچا، بابا جان سے بات کرے یا نہ کرے؟ پھر بات کرنے کا سوچ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ بابا جان اس کے سامنے ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھے تھے۔ وہ گھوم کر ان کے پاس آئی اور گھاس پر گھٹنے ٹکا کر بیٹھتی ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگی۔
بابا جان نے اخبار سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔
''بابا جان! آرٹس کونسل نو آموز مصوروں کی پینٹنگز کی نمائش کروا رہی ہے۔ میں نے بھی اپنا نام دیا تھا اور پتہ ہے میرا اسلیکشن بھی ہو گیا ہے سترہ دسمبر سے تین دن کی نمائش ہے۔ آپ آئیں گے نا؟'' جوش میں بولتے اس نے آخری جملہ عاجزی سے ادا کیا تھا۔
''تم جانتی ہو کہ بھیڑ بھاڑ والی جگہوں پر جانا مجھے پسند نہیں ہے۔''
''مگر تھوڑی دیر کو تو آ سکتے ہیں نا۔ بابا جان! یہ میری پہلی ایگزیبیشن ہے اور اسی بہانے سے آپ میری پینٹنگز بھی دیکھ لیں گے۔ جانتے ہیں اس بار میں نے اسٹل لائف اور لینڈ اسکیپنگ کے علاوہ سی اسکیپس بھی بنائے ہیں اور کیلی گرافی تو میں نے پہلی بار ہی کی ہے۔ پچھلے مہینے میں، میں نے اتنے سارے نئے کینوس بنا

لیے ہیں اور آپ نے ابھی تک کوئی بھی نہیں دیکھا۔''

''اگر دکھانا مقصود ہے تو آج ایک نشست تمہارے کمرے میں رکھ لیتے ہیں۔ لیکن میں ایگزبیشن میں نہیں جاؤں گا۔ آرمی لائف کے دوران بھی پُر ہجوم جگہوں پر جانا مجھے پسند نہیں تھا اور اب تو میں ریٹائرڈ لائف گزارنے گھر تک ہی محدود ہو گیا ہوں۔ اینی وے، بیسٹ آف لک۔'' وہ اپنی بات کہہ کر اُٹھے اور اندر چلے گئے۔

ملیحہ کی آنکھوں میں کچھ چبھنے لگا تھا۔ ایسے میں اپنے ہاتھ کی پشت پر نورالہدیٰ کے مہربان ہاتھ کے لمس کو محسوس کر کے اسے لگا وہ رو پڑے گی اور وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ان کی طرف دیکھے بغیر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''آپ کو اسے منع نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ کچھ دیر بعد فریش ہو کر نورالہدیٰ کی تلاش میں باہر جانے کے لیے لاؤنج میں آئی تو اسٹڈی سے آتی ان کی آواز سن کر رک گئی۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

ملیحہ نے اسٹڈی میں جھانک کر دیکھا، بابا جان ٹیبل کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھے تھے اور نورالہدیٰ ٹیبل کے سامنے کھڑے ان سے اُلجھ رہے تھے۔

''آپ کو اندازہ ہے بابا جان! آپ نے ملیحہ کو کس قدر ہرٹ کیا ہے۔ وہ اچانک ہی کتنی چپ سی ہو گئی تھی۔ آپ کو تھوڑا سا خیال تو کرنا چاہیے۔ وہ بہت حساس طبیعت کی لڑکی ہے۔''

بابا جان کو ان کا جرح کرنا اچھا نہیں لگا تھا وہ قدرے سخت لہجے میں بولے۔

''تم ملیحہ کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساسیت کا مظاہرہ کر رہے ہو نورالہدیٰ! ورنہ ملیحہ تو اتنی حساس نہیں ہے۔ میں نے کبھی اسے جذباتیت کا مظاہرہ کرتے نہیں دیکھا۔ اور جسے تم اس کی ناراضی سمجھ رہے ہو، وہ چپ دراصل اس لیے تھی کہ ملیحہ میری بات اور میرے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی ہے اور اسے یہ بھی پتہ ہے کہ بحث مجھے پسند نہیں۔ اب تم یہاں سے جا سکتے ہو۔'' وہ کسی گنجائش کے بغیر بولے تھے۔ نورالہدیٰ باہر نکلے تو ملیحہ دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں جانے لگے تو ملیحہ نے پیچھے سے انہیں پکارا۔

''ہادی بھائی! آپ دوبارہ بابا جان سے اس بارے میں بات نہیں کریں گے۔''

''کیوں؟'' انہوں نے مڑ کر کہا تو وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''آپ نے سنا نہیں، میں بابا جان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔''

نورالہدیٰ کے لاشعور میں کوئی اسپارک ہوا تھا۔ وہ دو قدم اس کے قریب آ کر بولے۔

''بابا جان تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔''

''مگر پروا نہیں کرتے۔'' اپنے آپ ہی اس کے لہجے میں شکایت در آئی تو نورالہدیٰ نے اسے سمجھانا چاہا۔

''بھلا وہ تمہاری پروا کیوں نہیں کریں گے؟''

''میں نے ان سے یہ سوال کبھی نہیں پوچھا۔ اگر کبھی آپ کو موقع ملے تو میری طرف سے بابا جان سے پوچھ لیجئے گا۔''

''دیکھو تم......''

''بس ہادی بھائی!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں چپ کرا دیا۔''اب آپ اس بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ نہ مجھ سے اور نہ بابا جان سے۔''

وہ اس کی بات کا برا منائے بغیر اسے دیکھ کر ستائش سے بولے۔

''زبردست بھئی۔ آج لگا کہ تم بابا جان کی بیٹی ہو۔''

ملیحہ جانتی تھی کہ وہ اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر بھی ہلکے سے مسکرا دی۔

✿✿✿

نمائش سے پہلے ایک چھوٹی سی اختتامی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ملک کے نامور مصور مہمانِ خصوصی مدعو تھے۔ وہ تقریر کر چکے تو منتظمین میں سے کوئی صاحب مائیک پر آئے اور اختتامی الفاظ کے ساتھ تقریب ختم کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی سے ربن کاٹ کر نمائش کے باقاعدہ آغاز کرنے کی درخواست کی۔

نورالہدیٰ کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر بھی وہ ملیحہ کے ساتھ تھے۔ ہال میں شائقین کے علاوہ صحافیوں کی بھی بڑی تعداد موجود تھی جو مصوروں سے انٹرویو بھی لے رہے تھے۔ کچھ صحافیوں نے ملیحہ سے بھی چند سوالات کئے۔ وہ ان سے باتیں کر رہی تھی کہ نورالہدیٰ اس کے کان میں بولے۔

''ذرا سائیڈ میں آ کر بات سننا۔'' وہ ایک نسبتاً الگ تھلگ گوشے کی طرف آ گئے۔ ملیحہ بھی صحافیوں سے معذرت کرتی اس طرف آ گئی۔

''کہیے۔''

''ملیحہ! مجھے جانا ہو گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے فوراً ہی منع کر دیا۔

''ملیحہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ فیکٹری کی کنسٹرکشن کا کام شروع ہو چکا ہے اور مجھے روزانہ ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں دینے ہی پڑتے ہیں۔''

ملیحہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ نورالہدیٰ جائیں مگر ان کی مصروفیت کا بھی اسے اندازہ تھا اس لئے بادل نخواستہ اجازت دیتے ہوئے بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے مگر چار بجے تک آ جائیے گا۔ کہیں میں گھر جانے کے لئے آپ کا انتظار ہی کرتی رہ جاؤں۔''

''تین بجے ہی آ جاؤں گا۔'' وہ اجازت ملنے پر خوش ہو کر بولے پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔

''لیکن تم ناراض تو نہیں ہو۔'' اسے ہنسی آ گئی۔

''نہیں بابا! ناراض کیوں ہوں گی؟ کیا مجھے آپ کی مصروفیت کا علم نہیں؟ لیکن آپ میری ناراضی کے خیال سے اتنا پریشان کیوں ہو جاتے ہیں؟ کیا اسٹیمپ پیپر پر لکھ دوں کہ آپ سے کبھی ناراض نہیں ہوں گی۔''

''سوچ رہا ہوں لکھوا ہی لوں۔ کیا پتہ کسی دن تم ناراض ہی ہو جاؤ۔'' وہ بھی مذاق سے بولے پھر کہا۔ ''اچھا میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔''

وہ ملیحہ کا سر تھپک کر چلے گئے تو ملیحہ بھی اپنی بلیک ساڑھی کا پلّو ٹھیک کرتی کونے سے نکل آئی۔

کیمرے کا فلیش چمکا تھا۔ اب تک کئی صحافی ملیحہ کی تصویر کھینچ چکے تھے اس لئے اس نے دھیان نہیں دیا۔ فلیش پھر چمکا۔ تیسری بار، چوتھی بار۔ جب پانچویں بار فلیش چمکا تو ملیحہ نے چہرے پر آئے بال سمیٹتے ہوئے اس طرف دیکھا اور تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ روشنی کے بادل چھٹے تو ملیحہ، وجدان کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وجدان، کیمرے کا اسٹریپ گلے میں ڈال کر اس کے پاس آ گیا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔''

''کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ کہہ کر چپ ہو گئی تو وجدان کہنے لگا۔

''اخلاقاً تو آپ کو بھی میرا احوال دریافت کرنا چاہیے۔ پر چھوڑیئے، ان رسمی باتوں میں کیا رکھا ہے؟''

''صحیح کہہ رہے ہیں۔'' وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولی۔ وہ محظوظ ہو کر ہنستا اس کے پیچھے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھنے لگا۔

''ملیحہ!'' اس نے پہلی بار ملیحہ کو اس کے نام سے پکارا تھا۔

''جی۔'' وہ سحر زدہ سی اس کی چوڑی پشت کو دیکھ کر بولی۔ وجدان نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔

''یہ تصویر آپ نے بنائی ہے؟''

ملیحہ نے ایک نظر اس پینٹنگ کو دیکھا اور کہا۔ ''ہاں۔'' پھر پوچھنے لگی۔ ''کیسی ہے؟''

اس کے پوچھنے پر وجدان غور سے اس پینٹنگ کو دیکھنے لگا۔ پینٹنگ کیا تھی، لگتا تھا اس تین فٹ لمبے اور ڈیڑھ فٹ چوڑے فریم میں درد کی اذیت ناک کیفیت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ خشک زمین پر اُبھری لکیریں اس کی پیاس کی گواہ تھیں اور ایک سوکھا درخت جس کی خوب پھیلی بنجر شاخوں پر کوئی خشک پتا تک نہیں تھا، مردہ زمین کے سینے پر یوں گڑا تھا جیسے خود اپنے ہی حال پر نوحہ کناں ہو۔ دور تک پھیلا نیلا آسمان ایک دم صاف تھا جس پر سورج پیلے رنگ کے تھال کی مانند دہک رہا تھا۔ تاحدِ نگاہ پھیلی اس منظر کی ویرانی کو اور بھی گہرا کر رہا تھا۔ وہ اکلوتا ذی روح جو اس سوکھے درخت کی ''چھاؤں'' میں بیٹھا تھا، اس کے سادہ کپڑوں پر مسافتوں کی گرد جمی تھی۔ سر کے بال لمبے اور گرد آلود، بے ترتیب داڑھی جھاڑ کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ زمین پر پھیلا

ٹانگ کی ران پر تھا جبکہ دوسرا موڑ کر کھڑی کی ہوئی ٹانگ کے گھٹنے پر۔ سر پیچھے تنے سے ٹکا کر آنکھیں بند کیے وہ تپتی زمین پر اتنے سکون سے بیٹھا تھا جیسے صدیوں سے اسی حال میں ہو اور صدیاں اسی عالم میں گزار دے گا۔ اس کے چہرے کے مبہم نقوش سے کرب و اذیت کی عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی۔

ایک گہرا سانس بھر کر وجدان نے خود کو نامعلوم کیفیت سے آزاد کرتے ہوئے تصویر کا کیپشن پڑھا۔

''عشق آتش۔''

ایک سرد لہر وجدان نے اپنے وجود میں اُٹھتی محسوس کی۔ عشق کا یہ چہرہ اس کے لاشعور کو خوفزدہ کر گیا تھا۔

''پینٹنگ تو اچھی ہے لیکن آپ نے عشق کو اتنے دردناک انداز میں کیوں پینٹ کیا ہے؟'' اس نے آخر پوچھ ہی لیا، پتہ نہیں کیوں۔ لیکن اس پینٹنگ کو دیکھ کر وجدان کے دل و دماغ لرز گئے تھے۔

''عشق اوّل و آخر درد ہے۔''

''درد ہی کیوں؟'' ملیحہ کے جواب پر وجدان نے کہا۔ ''کسی کو چاہنے کا احساس زندگی کو روشنی سے بھر دیتا ہے جس کے ہر رنگ میں نئی اُمید چھپی رہتی ہے اور جہاں امید ہو وہاں درد کا کیا کام؟'' ملیحہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ ہوا تو نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

''وہ محبت ہے وجدان! جس کی روشنی سے امید کے رنگ پھوٹتے ہیں۔ عشق محبت کی انتہا ہے جس کی جستجو ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ وہ آگ ہے جو ہر بھٹی میں سلگائی نہیں جاتی۔ عشق حاصل نہیں۔ لاحاصل کا جنون ہے، خواہش ناتمام ہے۔ عشق کا جنم ہی جدائی کی کوکھ سے ہوتا ہے اور بھلا جدائی راحت دے سکتی ہے؟ جدائی تو درد دیتی ہے۔ اور جب یہ درد لہو بن کر جسم میں بہتا ہے تو پھر کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ عشق وہ آگ ہے جو جلائے تو راکھ نہیں کرتا، فنا کر دیتا ہے۔'' وجدان اس کی آواز میں کہیں کھو سا گیا تھا۔ اس کے لہجے میں آئی تپش کو محسوس کر کے چونکا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں؟'' ملیحہ نے اسے دیکھا اور رخ پھیر لیا۔ ''میں نے کبھی آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہا۔'' کچھ دیر بعد ملیحہ نے اس کی تھکی تھکی سی آواز سنی تو اس کی طرف دیکھا۔ وہ سر کو جھکائے دھیمے سے بول رہا تھا۔

''پر لگتا ہے اب میں آپ کو ڈسٹرب کرنے لگا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو بس ایک بار کہہ دیں۔ میں دوبارہ کبھی آپ کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کروں گا۔'' پھر وہ ذرا سا ہنسا۔ ''میں نے یوں بھی آپ سے ملنے کے لئے کبھی کوئی شعوری کوشش نہیں کی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ آفاق کی کزن ہو سکتی ہیں اور آج بھی آفاق اور ساجد زبردستی مجھے ساتھ لے آئے تھے اور آپ کو دیکھنے سے پہلے مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ آپ مجھے یہاں مل جائیں گی۔''

''آفاق بھائی یہاں؟'' حیران ہو کر اس نے اپنے آس پاس دیکھا مگر فوراً ہی وجدان کی آواز پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''مگر آپ کا انتظار میں نے ہر روز کیا۔ وہیں لائبریری کی سیڑھیوں پر۔ میں ہر صبح دعا کرتا کہ آج یہ انتظار ختم ہو جائے اور ہر شام سوچتا کہ آپ کا انتظار زندگی کی آخری سانس تک کروں گا۔ لیکن اگر آپ کو گوارا نہیں تو وعدہ کرتا ہوں کبھی ان راستوں پر پاؤں نہیں رکھوں گا جن پر آپ کو گزرنا ہو گا۔ اور سر راہ ملاقات کبھی ہوئی تو آپ کا راستہ نہیں روکوں گا۔''

وہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ملیحہ نے نگاہ چرا کر رخ بھی موڑ لیا۔ وجدان کو اچانک ہی شدید تھکن کا احساس ہوا تھا۔ وہ بوجھل سے انداز میں پلٹا اور جانے لگا۔

''آپ ایک بار اور لائبریری جا سکتے ہیں؟''

وجدان ٹھٹک کر رکا اور پھر ایڑی کے بل گھوم گیا۔ وہ اب بھی رخ موڑے فرش پر لگے ٹائلوں کو دیکھ رہی تھی۔ وجدان کو اپنی سماعتوں پر شبہ سا ہوا۔ ''کیا کہا آپ نے؟''

ملیحہ نے اسے دیکھا اور زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''کل صبح دس بجے۔''

اور وہ نہال ہو گیا۔

''میں سارا دن آپ کا انتظار کروں گا۔ آپ کو جب وقت ملے، آجائیے گا۔'' اس کی آنکھوں سے جھلکتے والہانہ پن سے سٹپٹا کر ملیحہ نے چہرہ موڑتے کونسل کے ملازمین کے یونیفارم پہنے ایک شخص کو اشارے سے پاس بلا کر پینٹنگ اُتارنے کو کہا پھر اس سے پینٹنگ لے کر ملیحہ نے وجدان کی طرف بڑھائی۔

''یہ لیجئے۔ میری طرف سے تحفہ ہے۔''

''عشق آتش۔'' ملیحہ کے ہاتھ سے پینٹنگ پکڑتے وجدان نے معنی خیزی سے کہا تو وہ حیا سے سرخ ہوتی اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

❁❁❁

چار بجے وہ نورالہدیٰ کے ساتھ قصرِ فاروقی کے لاؤنج میں داخل ہوئی تو بابا جان کے ساتھ ملک ناصر پہلے سے موجود تھے۔ نورالہدیٰ کو شطرنج کھیلنے کا تو کوئی شوق نہیں تھا مگر دیکھنے کا شوق ضرور تھا۔ وہ وہیں بیٹھ کر ان دونوں کو شطرنج کھیلتے دیکھنے لگے۔ ملیحہ البتہ سلام دعا کے بعد جلد ہی اٹھ گئی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے، کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر ننگے پاؤں کمرے میں چکر کاٹتے وہ ملک ناصر کے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ انتظار فضول ہے۔ ملک انکل رات کے کھانے کے بعد ہی جائیں گے۔ پھر بھی وہ ٹہلتی رہی۔

شام ڈھل چکی تھی جب ملیحہ کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''دروازہ کھلا ہے۔'' اس نے کہا پھر بہادر کو آتے دیکھ کر وہ بیڈ پر اُٹھ بیٹھی۔

''بی بی صاب! کھانا لگ گیا ہے۔''

''مجھے بھوک نہیں۔'' اس نے کہا اور پوچھا۔''اچھا سنو! ملک انکل چلے گئے ہیں یا ابھی بیٹھے ہیں؟''

''چلے کہاں جائیں گے جی؟ ابھی تو بیٹھے ہیں۔ کھانا کھائیں گے، پھر چائے پی کر جائیں گے۔ ویسے ایک بات بتائیں بی بی صاحب! یہ ملک صاب بالکل ہی ویلے ہیں؟''

وہ ہنس پڑی۔ پھر ہنسی روک کر سنجیدگی سے بولی۔''زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔'' وہ جانے لگا تو ملیحہ نے اسے روک کر کہا۔''اور سنو! جب انکل چلے جائیں تو مجھے بتا دینا۔''

وہ سر ہلا کر چلا گیا۔

عشاء کی نماز پڑھ کر وہ بیڈ پر آ بیٹھی۔ پھر اُٹھی اور بالکونی میں آ گئی۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی کہ دروازہ پھر بجا۔ اس بار بھی بہادر تھا۔ اس نے ملک ناصر کے جانے کا بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔'' اسے بھیج کر ملیحہ باتھ روم میں گئی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر کمرے میں آئی، بالوں کو سلجھا کر کلپ کیا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ بابا جان کے کمرے کے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے وہ ایک پل کو ہچکچائی پھر دوسرے ہی پل خود کو مضبوط کرتے اس نے دروازہ کھولا اور کمرے میں آ گئی۔

بابا جان آتش دان کے سامنے رکھی راکنگ چیئر پر آنکھیں بند کئے نیم دراز تھے۔ ملیحہ جانتی تھی، وہ سو نہیں رہے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی۔ وہ جب بھی کسی گہری سوچ میں ہوتے تو یوں ہی آنکھیں بند کر کے راکنگ چیئر پر نیم دراز ہو جاتے۔ ملیحہ ان کے سامنے کشن پر بیٹھ گئی۔

''بابا جان۔'' اپنے ہاتھ پر ملیحہ کے ہاتھ کا لمس اور پھر اس کی آواز سن کر بابا جان نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''بابا جان! وہ...... میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی تھی۔'' وہ اٹک کر بولی۔ بابا جان نے خوشگواریت سے کہا۔

''کمال ہے۔ میں بھی کچھ دنوں سے ایک بات تم سے کرنا چاہ رہا ہوں۔ پر سمجھ نہیں پاتا، کیسے کہوں؟''

''ایسی کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' بابا جان بولے۔''بات کرنے کی ہمت پہلے تم نے کی ہے، اس لئے پہلے تم بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟''

وہ سوچ کر آئی تھی، ہر حال میں ان سے بات کر کے رہے گی پر اب گڑبڑا گئی۔

''وہ..... بابا جان! میں......'' اتنا بول کر ہی وہ ہانپنے لگی تو بابا جان نے اپنے ہاتھ پر رکھا اس کا ہاتھ تھام کر حوصلہ دینے کے سے انداز میں کہا۔

''بولو ملیحہ! کیا بات ہے؟''

''بابا جان! میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہتی ہوں۔'' آخر اس نے کہہ ہی دیا۔

''کس سے؟'' وہ حیرت سے بولے۔ توقف کے بعد اس نے کہا۔

''وجدان مصطفیٰ سے۔'' بولنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے جھکے ہوئے سر کو کچھ اور جھکا لیا۔ بابا جان کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔

''یہ وجدان مصطفیٰ کون ہے؟ اور تم اسے کیسے جانتی ہو؟''

''میں اس سے لائبریری میں ملی تھی۔'' ملیحہ کی جھکی پلکیں، رُکا رُکا انداز۔ بابا جان نے بہت کچھ اخذ کر لیا تھا۔ غیر محسوس انداز میں ملیحہ کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے وہ پتھریلے لہجے میں بولے۔

''مجھے اس سے کیوں ملوانا چاہتی ہو؟''

وہ بولی تو آواز کچھ اور بھی دھیمی ہوگئی۔ ''بابا جان! میں اس سے......'' مگر ہزار کوشش کے بعد بھی ''محبت'' کا لفظ شرم نے زبان پر آنے نہیں دیا تو جملہ ہی بدلتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' اور آنکھیں میچے ان کے ردِعمل کا انتظار کرنے لگی۔ پھر ملیحہ نے ان کی آواز سنی۔

''جاؤ، جا کر سو جاؤ۔''

ملیحہ نے آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور خواہش کی، کاش کبھی نہ دیکھا ہوتا۔ ان کا چہرہ کسی چٹان کی طرح سخت اور بے جان تھا لیکن آنکھیں آگ اُگل رہی تھیں۔ بے دم سی پکار کی صورت اس کی زبان سے نکلا۔

''بابا جان!''

''جاؤ۔'' وہ کٹھور پن سے بولے۔ ملیحہ تڑپ اُٹھی۔

''بابا جان! میری بات تو سنیں۔'' اس نے بابا جان کا ہاتھ تھام کر کچھ کہنا چاہا پر بابا جان بے دردی سے اس کا ہاتھ جھٹک کر کاٹ دار آواز میں بولے۔

''میں ایک لفظ اور سننا نہیں چاہتا، نہ تمہاری صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔ چلی جاؤ یہاں سے۔''

ملیحہ کو لگا کسی نے اس کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہو۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھی۔

''بابا جان! آپ ایک بار اس سے مل تو لیں۔ وہ بہت اچھا ہے۔''

''ملیحہ! ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔''

ملیحہ نے زندگی میں پہلی بار ان کی پُر جلال آواز کی گونج سنی تھی۔ وہ جھٹکے سے اسے ہٹا کر کھڑے ہوئے۔ ملیحہ ان کے پاؤں پکڑ کر رو پڑی۔

''ایسا مت کریں بابا جان! مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ اسے بھول جاؤں۔'' ملیحہ کو لگ رہا تھا، آتش دان میں جلتی آگ نے اس کے بدن میں راستہ بنا لیا ہے اور اب اس کا اندر سوکھی لکڑی کی طرح جل رہا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے شان سے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر پڑتے شعلوں کے عکس نے

انہیں چٹان جیسی سختی دے رکھی تھی اور ان کے پیر پکڑ کر ان کے گھٹنے سے پیشانی ٹکا کے روتی ملیحہ خاک ہوتی جا رہی تھی۔

''تو مجھے بھول جاؤ۔'' وہ کتنے آرام سے کہہ رہے تھے۔ ملیحہ رونا بھول گئی۔ اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور سرگوشی جیسی آواز میں فریاد کی۔

''میں مر جاؤں گی بابا جان!''

''مر جاؤ گی تو تمہیں کندھوں پر اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے دفنا آؤں گا۔ لیکن اگر نافرمانی کرو گی تو مرتے دم تک تمہاری صورت نہیں دیکھوں گا۔'' اس کے رحم کی آخری اپیل بھی بے رحمی سے مسترد ہو گئی۔

ملیحہ کو اچانک ہی لگنے لگا کہ ہوا میں آکسیجن ختم ہو گئی ہے۔ آخر وہ اپنے نیم جان وجود کو سنبھالتے ہوئے اُٹھی اور شکستہ قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازے کو اپنے پیچھے بند کرتے وہ وہیں دروازے کے پاس گر سی گئی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے مگر وہ بے نیازی سے لب بھینچے ساکت بیٹھی تھی۔ رات گزر چکی تھی۔ اور فجر کی اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ ملیحہ سیدھی ہو کر بیٹھی اتنے غور سے اذان کے الفاظ سننے لگی جیسے پہلی بار سن رہی ہو۔

'ایک عدالت ایسی ہے جہاں سے میری رحم کی اپیل مسترد نہیں کی جائے گی۔' ایک امید نے اس کے مردہ جسم میں جان ڈالی دی تھی۔ وہ اُٹھی مگر لڑکھڑا گئی۔ ساری رات ایک ہی زاویے سے بیٹھے اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ وہ پھر اُٹھی۔ اس بار اس کے قدموں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ وضو کر کے وہ جائے نماز پر کھڑی ہو گئی۔ نماز تو وہ ہر روز پانچ بار پڑھا کرتی تھی مگر اتنے خشوع و خضوع کے ساتھ پہلی دفعہ پڑھ رہی تھی۔ وہ فرضوں کی دوسری رکعت میں تھی کہ دستک کے بعد کوئی دروازہ کھول کر کمرے میں آ گیا۔ نماز ختم کرتے ہوئے ملیحہ نے دائیں جانب سلام پھیر کر بائیں طرف گردن کو موڑ کر سلام پھیرا تو نظر سیاہ پٹیوں والی چپلوں میں مقید سرخ و سفید پیروں پر رک گئی۔

''آج سے تین دن بعد یعنی جمعہ کے روز تمہارا نورالہدیٰ کے ساتھ نکاح ہے۔ تمہیں جو بھی تیاری کرنی ہو، آج اور کل میں مکمل کر لینا۔ زیادہ بڑا فنکشن نہیں ہے۔ تمہارے ننھیال والے ہوں گے اور میرے کچھ دوست۔ شاید کچھ مہمان نورالہدیٰ کے بھی ہوں گے۔ تم جن کو بلانا چاہو، ان کے ناموں کی فہرست بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔''

'رات آزمائش اور صبح سزا لے کر آئی ہے۔' اس نے سوچا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ایک آنسو اس کے گال پر بہہ گیا۔ بابا جان ایک نظر اس کی خاموشی کو دیکھ کر کمرے سے باہر آ گئے۔ پھر سیڑھیاں اتر کر ہال کے دروازے سے باہر لان میں نکل آئے۔ نورالہدیٰ اپنی روٹین کے مطابق ٹریک سوٹ پہنے ایکسرسائز کے لئے

لان میں آئے تو بابا جان کو اس وقت وہاں دیکھ کر حیران سے ان کے پاس آ گئے۔

''کیا بات ہے بابا جان؟ آج صبح صبح لان میں نظر آ رہے ہیں۔ کیا آرمی لائف کا شیڈول دوبارہ سے شروع کرنے کا ارادہ ہے؟'' وہ خوش دلی سے مذاق کرتے ہوئے بولے مگر بابا جان کے چہرے پر کھنڈی سنجیدگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔

''میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں نورالہدیٰ! بلکہ یوں سمجھو، میں ایک فیصلہ کر چکا ہوں اور تمہیں اس کی اطلاع دے رہا ہوں۔''

''کہیے بابا جان!''

''میں نے تمہاری اور ملیحہ کی شادی طے کر دی ہے۔''

نورالہدیٰ آخر انسان ہی تو تھے جن کے سینے میں دل بھی تھا اور اس دل میں جذبات بھی۔ ملیحہ کی بے تکلفی اور بے ساختگی کے باوجود کبھی کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا، وہ ملیحہ کے لئے کبھی بھی ''خاص'' نہیں بن سکے مگر ملیحہ تو ان کے لئے خاص تھی۔ یہ سچ تھا کہ انہوں نے ملیحہ کو پانے کی خواہش کبھی نہیں کی تھی لیکن وہ بن مانگے انہیں مل رہی تھی۔ وہ خوش کیسے نہ ہوتے؟ مگر بابا جان کے سامنے خوشی کا اظہار کر نہیں سکے۔ لیکن جب انہوں نے کہا۔ ''جمعے کی شام تم دونوں کا نکاح کر دیا جائے گا اور ہفتے کو ولیمہ اس کے بعد میں چاہتا ہوں تم دونوں کچھ دنوں کے لئے لندن چلے جاؤ۔ وہاں گھوم پھر آنا۔'' تو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''جمعے کو...... یعنی صرف تین دن بعد؟...... بابا جان! اتنی جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''بات ضرورت کی نہیں، میرے فیصلے کی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ''اور میں اپنی اولاد سے اس بات کی توقع کرتا ہوں کہ وہ میرے فیصلوں کو مانے گی۔'' پھر کچھ نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ''سیدھی سی بات ہے نورالہدیٰ! لڑکا اور لڑکی گھر میں ہی ہیں اور کلمے کسی بھی وقت پڑھوائے جا سکتے ہیں تو پھر انتظار کس لئے؟''

''آپ ملیحہ کی مرضی معلوم کر چکے ہیں؟'' انہوں نے تذبذب سے پوچھا۔

''میں ابھی اسی کے پاس سے آ رہا ہوں۔'' یہ مبہم جملہ ان کے لئے زندگی کا واضح پیغام تھا۔ وہ بے اختیار بابا جان کے گلے لگ گئے۔

''بنا مانگے ہی زندگی نے آج وہ دیا ہے کہ ساری عمر شکر میں گزرے گی۔'' بولنے کے بعد انہیں دھیان آیا کہ کس سے کیا بول گئے ہیں۔ ان سے الگ ہو کر وہ خجالت سے سر کھجانے لگے تو بابا جان ایک مسکراتی نگاہ ان پر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔

انہوں نے بابا جان کو جاتے ہوئے دیکھا اور ایک گہری مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ انسان بہت جلد باز ہے۔ کبھی تو سمندر کی بے رحم موجوں کا مقابلہ کرتے اچانک کنارہ نظر میں آ جائے تو اسے نظر کا دھوکا سمجھ کر خود کو لہروں کے حوالے کر دیتا ہے اور یہ تحقیق بھی نہیں کرتا کہ وہ جہاں ڈوبا، وہاں ساحل تھا۔ اور کبھی صحرا

میں چمکتی ریت کو پانی سمجھ کر جھلستی ریت میں دوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ آبلہ پائی کا یہ سفر تشنگی کو بڑھا تو نہ دے گا۔ مگر ہر غلطی نظر انداز نہیں کی جاتی۔ کچھ غلطیوں پر سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ نورالہدیٰ کو بھی اس ایک مسکراہٹ کا خمیازہ تمام عمر ادا کرنا تھا۔

❁❁❁

آٹھ بجتے ہی ملیحہ نے سمیرا کو فون کر دیا اور چھوٹتے ہی کہا۔

''تم ابھی اور اسی وقت یہاں آ جاؤ۔''

''خیریت تو ہے؟......کیا ہوا؟'' وہ حیران تھی۔ ملیحہ جھنجلا گئی۔

''سوال مت کرو۔ بس فوراً گھر آ جاؤ۔''

''مگر ملیحہ! کچھ بتاؤ تو سہی۔''

''بتانے کے لئے ہی تو بلا رہی ہوں۔'' اس کی آواز میں نمی محسوس کر کے سمیرا پریشان ہو گئی تھی مگر خود کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں آ رہی ہوں۔ تم پریشان مت ہونا۔''

پندرہ منٹ بعد ہی سمیرا، ملیحہ کے کمرے میں تھی اور ملیحہ کی زبان سے سب حال سن کر وہ واقعی بوکھلا گئی۔

''تم نے تو کہا تھا تم نورالہدیٰ سے محبت کرتی ہو تو یہ وجدان بیچ میں کہاں سے آ گیا؟''

وہ عاجزی سے بولی۔

''وہ تو میں اب بھی کہوں گی کہ مجھے ہادی بھائی سے محبت ہے مگر اپنی زندگی میں صرف وجدان کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔''

سمیرا نے سر پکڑ لیا۔

''اپنے بابا جان کو تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ ان کی ضد مثالی ہے۔ وہ اپنا فیصلہ بدل لیں گے، ایسا تو سوچنا بھی فضول ہے۔ وہ کسی کے سمجھانے سے سمجھنے والے نہیں۔ لیکن اللہ کے واسطے تم تو کچھ سمجھ داری سے کام لو۔'' اس نے بیڈ پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی ملیحہ سے کہا۔ پھر اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ کر اسے سمجھانے لگی۔ ''دیکھو ملیحہ! سچ تو یہ ہے کہ نورالہدیٰ اور وجدان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ بلکہ غیر جانب داری سے اگر دیکھو تو نورالہدیٰ، وجدان سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا ہے۔ کس قدر زمین جائیداد کے مالک ہیں، شاید انہیں بھی ٹھیک سے اندازہ نہ ہو۔ اور کیا غضب کی پرسنالٹی ہے۔ میں نے ایسا خوب صورت مرد اپنی زندگی میں کوئی اور نہیں دیکھا۔ پھر وہ کوئی انجان تو نہیں ہیں ڈھائی تین مہینے سے تم دونوں ایک ساتھ، ایک چھت کے نیچے رہ رہے ہو۔ ان کی ہر اچھی بری عادت سے تم واقف ہو اور رخصت ہو کر بھی تمہیں کہیں اور نہیں جانا۔ شادی کے بعد بھی تم اپنے اسی گھر میں رہو گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نورالہدیٰ کو تمہاری بہت پروا

ہے۔میں نے خود دیکھا تھا، شادی کے بعد جب وہ تمہیں لینے آئے تھے تو اس طرح تمہارا خیال کر رہے تھے جیسے تم کانچ کی گڑیا ہو۔ اور وجدان کیا ہے، صرف ایل ایل بی ہی تو کیا ہے۔ ابھی تو اسے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ اسٹیٹس اچھا ہے۔ مگر نورالہدیٰ کی طرح کروڑوں کا مالک تو وہ نہیں۔ پرسنالٹی ٹھیک ٹھاک ہی ہے مگر نورالہدیٰ کی طرح ڈیشنگ نہیں۔ وجدان کہیں بھی نورالہدیٰ کے سامنے نہیں ٹکتا۔ اس میں ہے ہی کیا جو نورالہدیٰ کے سامنے ٹک پائے؟''

ملیحہ نے سمیرا کو دیکھا اور تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔

''اس میں کیا ہے سمیرا! مجھے نہیں معلوم۔ مگر جس پل وہ میرے ساتھ ہوتا ہے، لگتا ہے یہی زندگی ہے۔'' اس کے لہجے میں کوئی تو بات ایسی تھی کہ سمیرا نے گھبرا کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔

''ملیحہ! یہ بس کچھ دن کی تکلیف ہے، صبر سے جھیل لو۔ پھر دیکھنا، نورالہدیٰ کبھی تمہیں تکلیف ہونے نہیں دیں گے۔ وہ تمہیں خوش رکھیں گے۔'' وہ عاجزی سے بولی۔

''میں جانتی ہوں سمیرا! وہ مجھے خوش رکھیں گے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ہادی بھائی کے ساتھ خوش نہ رہوں۔ مگر زندہ نہیں رہوں گی۔''

''ملیحہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیوں تم پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟'' سمیرا نے اسے شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑ دیا اور ملیحہ ایک دم ہی پھوٹ کر رو پڑی۔ سمیرا نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''اس طرح خود کو تھکانے کا کیا فائدہ؟ سنبھالو خود کو۔ اور جو ہو رہا ہے، ہو جانے دو۔'' وہ اذیت سے بولی۔

''ہو تو جانے دوں۔ پر جب میں خود کو اس کے بغیر سوچتی ہوں تو میرا دم گھٹتا ہے۔''

''ملیحہ پلیز!'' سمیرا نے اسے روکنا چاہا پر وہ خواب ناک لہجے میں دھیرے دھیرے بولتی ہی رہی۔

''جانتی ہو جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو میری روح تک اس کے اختیار میں چلی جاتی ہے۔ اس کی زبان سے نکلا ہر لفظ میرے دل پر وحی کی طرح اُترتا ہے۔ میرا تو دھیان اس کی ذات سے نہیں ہٹتا، میری نظر کسی اور طرف کیسے جائے گی؟ وہ مجھے مجھ سے مانگتا تو میں انکار کر دیتی۔ پر اس نے مجھے مجھ سے چھین لیا ہے۔ میں تو خود اپنی بھی نہیں رہی، کسی اور کی کیسے ہو جاؤں؟ لیکن بابا نہیں سمجھتے۔ میں مر جاؤں گی سمیرا! میں سچ مچ مر جاؤں گی۔'' وہ تڑپ تڑپ کر رو دی۔ یوں کہ اسے گلے سے لگا کر چپ کراتی سمیرا خود بھی رو پڑی تھی۔ اس نے اپنے آنسو صاف کیے پھر اس کے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بیڈ سے اُٹھی اور ملیحہ کو بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اُٹھو اور چلو میرے ساتھ۔ مجھے پتہ ہے، محبت کرنا اور پھر چھوڑ دینا دونوں ہی باتیں تمہارے لئے آسان نہیں۔ میں، ابو اور چاچو کو سب بتا دیتی ہوں۔ ابو تو یوں بھی وجدان کو بیٹا مانتے ہیں۔ وہ ضرور پھوپھا جان کو منا لیں گے۔ اور بالفرض نہیں بھی منا سکے تو بھی تم پر ان کا بہت حق ہے۔ فریال پھپھو کی موت سے ہمارے تمہارے رشتے تو

نہیں مر جاتے نا۔"

مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں تھی اور اپنا ہاتھ چھڑاتے اس نے تاسف بھری نگاہ سمیرا پر ڈال کر کہا۔

"بابا جان نے اس لئے تو مجھے پال پوس کر بڑا نہیں کیا تھا کہ میں انہیں چھوڑ کر چلی جاؤں۔" پھر وہ قطعیت سے بولی۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ نہ کسی اور سے مدد مانگ کر بابا جان کو شرمندہ کروں گی۔ یہ باپ بیٹی کا معاملہ ہے۔ اگر میں خود انہیں مناسکی تو ٹھیک ورنہ جو وہ کہیں گے، وہی کروں گی۔ تم بس اتنا کر دو کہ بابا جان سے مجھے ساتھ لے جانے کی اجازت لے لو۔ میرا وجدان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے، بابا جان مجھے اکیلے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ جس طرح ایک رات میں انہوں نے میری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اب انہیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا۔" وہ آخر میں آزردہ سی ہوگئی تھی۔ سمیرا نے اُلجھ کر کہا۔

"تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"وجدان کو بابا جان کے سامنے لا کھڑا کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے بابا جان اگر ایک بار بھی اس سے مل لیں گے تو میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کچھ تو وجدان میں ایسا ہے کہ ایک بار جس سے مل لے، اس کے دل میں اُتر جاتا ہے۔" وہ بہت یقین سے کہہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں پھوپھا جان سے اجازت لے کر آتی ہوں۔ تب تک تم ذرا کپڑے بدل کر اپنا حلیہ ٹھیک کرلو۔" سمیرا نے کہا اور پھر اُٹھ کر بابا جان کے پاس آ گئی جو اس وقت اسٹڈی میں موجود تھے۔ حالانکہ وہ سوچ کر آئی تھی کہ اسے ان سے کیا کہنا ہے پھر بھی بری طرح گھبرا رہی تھی۔ بابا جان کی شخصیت ایسی تھی کہ سامنے والا خوامخواہ ہی نروس ہو جائے اور سمیرا کے پاس تو نروس ہونے کی وجہ بھی تھی۔

"السلام علیکم پھوپھا جان!" اس نے تھوک نگل کر سلام کیا۔ ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھے بابا جان نے اپنے سامنے کھلا زمینوں کے حساب کتاب کا رجسٹر بند کیا اور سمیرا کو اپنی زیرک نگاہوں کی گرفت میں لے کر بولے۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھو بیٹا!"

سمیرا ایک کرسی پر ٹک گئی تو انہوں نے کہا۔ "کیسی ہو؟ اور گھر میں سب خیریت ہے؟"

"جی پھوپھا جان! اللہ کا شکر ہے۔"

پھر انہوں نے تو اتنی صبح اس کی آمد پر کوئی سوال نہیں کیا تھا مگر وہ خود ہی بتانے لگی۔

"آٹھ بجے ملیحہ کا فون آ گیا تھا۔ کہنے لگی، جلدی سے گھر آ جاؤ۔ یہاں آ کر اس کی شادی کا پتہ چلا تو میں نے سوچا، آپ کو مبارکباد دے دوں۔"

"تمہیں بھی مبارک ہو۔"

"خیر مبارک۔ لیکن پھوپھا جان! شادی کی تیاری بھی تو کرنی ہے۔ دن بھی تو کتنے تھوڑے ہیں۔ ملیحہ نے

فون پر بتا دیا ہوتا تو میں امی اور چچی جان کو بھی ساتھ لے آتی۔ اب سوچ رہی ہوں کہ آج ہی اسے اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جاتی ہوں۔ کل امی آجائیں گی تو باقی کی شاپنگ ان کے ساتھ کرلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اسے گہری نظروں سے کھوج رہے تھے اور سمیرا کی ہتھیلیاں تک پسینے سے بھیگ گئیں۔

''تو میں ملیحہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں لے جاؤ۔ اور ڈرائیور کے ساتھ جانا۔ میں ابھی کسی سے کہہ کر گاڑی تیار کروا دیتا ہوں۔''

''جی پھوپھا جان!'' وہ سعادت مندی سے گردن ہلا کر اُٹھی اور جانے لگی۔

''سمیرا!'' بابا جان نے اسے آواز دی۔

''جی پھوپھا جان؟'' وہ ایک دم ڈر کر پلٹی۔

''خریداری کے لئے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے بیٹا!'' انہوں نے کہا پھر دراز میں سے ہزار ہزار کے نوٹوں کی دو موٹی گڈیاں نکال کر ٹیبل پر رکھ دیں۔ سمیرا نے آگے آکر وہ گڈیاں اٹھالیں۔

''پر خیال رہے، شام سات بجے سے پہلے تم دونوں گھر پہنچ جاؤ۔ شام کو ملیحہ اور نورالہدیٰ کی منگنی کی تقریب ہے۔ میں نے افتخار سے فون پر بات کرلی ہے۔ وہ سب لوگوں کو لے کر شام میں یہاں آجائے گا۔''

سمیرا کا جی چاہا، سامنے والی دیوار پر جا کر زور سے سر مارے۔ مگر ضبط سے مسکرا کر اللہ حافظ کہتی وہ مڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد بابا جان نے ریسیور اٹھایا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگے۔ ملیحہ کے کمرے میں آکر سمیرا نے سانس چھوڑتے ہوئے خود کو ریلیکس کیا، پھر ملیحہ کو دیکھا جس نے اس کے کہنے کے باوجود کپڑے نہیں بدلے تھے اور ابھی تک اس جارجٹ کی بلیک ساڑھی میں تھی۔ بس اتنا تھا کہ اس نے اوپر سے میرون شال اوڑھ لی تھی۔ البتہ منہ ہاتھ دھو کر بال بنا لئے تھے۔ سمیرا نے اسے ہی غنیمت سمجھا۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ چکیں تو سمیرا نے اسے اطلاع دی۔

''شام کو تمہاری منگنی ہے۔ پھوپھا جان سب رشتے داروں کو فون کر کے بتا چکے ہیں۔ مجھ سے بھی کہا ہے کہ شام سات بجے تک تمہیں لے کر گھر آجاؤں۔''

ملیحہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کار قصرِ فاروقی سے نکل کر مین روڈ پر آگئی تھی۔ اس روڈ پر آگے جا کر ایک ذیلی سڑک تھی۔ لائبریری اسی سڑک پر واقع تھی۔ مین روڈ پر آتے ہی وہ لوگ ٹریفک جام میں پھنس گئے۔ سمیرا نے ڈرائیور سے کہا۔

''ذرا جا کر معلوم تو کرو، ٹریفک کیوں رکا ہوا ہے؟''

ڈرائیور ''جی اچھا'' کہہ کر اتر گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ واپس آگیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے پلٹ کر کہا۔

''کچھ دیر لگ جائے گی۔ آگے کسی موٹر سائیکل سوار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ایمبولینس وغیرہ تو پہنچ گئی ہیں۔ زخمی کو ہسپتال بھیج کر پولیس اپنا باقی کا کام نمٹا کر راستہ کھول دے گی۔''

بار بار بے چینی سے پہلو بدلتی ملیحہ، سمیرا سے بولی۔ ''یہ ٹریفک تو جانے کب کھلے گا۔ لائبریری کا یہاں سے زیادہ فاصلہ بھی نہیں ہے۔ میں پیدل نکلتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' سمیرا نے اختلاف نہیں کیا۔ پھر ملیحہ نے ڈرائیور کی طرف رخ کیا۔

''تم سمیرا کو چھوڑ کر گھر واپس چلے جانا۔ میں خود ہی آ جاؤں گی۔'' اور کار سے اُتر کر گاڑیوں کے بیچ میں سے گزرتی فٹ پاتھ پر آ گئی۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے کچھ آگے جا کر اس نے ایک نظر سڑک پر ڈالی جہاں بہت سے لوگ بھیڑ کی شکل میں جمع تھے اور کسی شخص کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں چڑھایا جا رہا تھا۔ رش اس قدر تھا کہ ملیحہ صرف زخمی کے پیر ہی دیکھ سکی۔

لائبریری پہنچ کر ملیحہ نے اندر کا ایک چکر لگایا، پھر باہر آ گئی۔ اسے وجدان کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

'ابھی دس بجنے میں بھی تو آدھا گھنٹہ باقی ہے۔' اس نے خود کو تسلی دی اور وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ پر اس کا انتظار، انتظار ہی رہا۔ دس بجے تک تو ملیحہ اپنے اضطراب کو دباتی رہی لیکن دس بجتے ہی اس کی بے چینی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

''آپ کا انتظار میں نے ہر روز کیا ہے۔'' اس وقت تو یہ سن کر ملیحہ نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا مگر اب سمجھ آ رہا تھا، انتظار کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ گیٹ پر نظر جمائے اس کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا تو کہہ دیتی صدیاں بیت گئی ہیں۔ گیٹ پر کھڑا واچ مین اور آتے جاتے لوگ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے پھر وہ سب کچھ فراموش کیے بس وجدان کے آنے کی دعا مانگتی رہی۔ پانچ بجتے ہی وہ بے چین سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لائبریری کی دوسری جانب ایک جنرل اسٹور تھا۔ ملیحہ سڑک کراس کرتی اسٹور میں گھس گئی۔

''ہیلو!'' چوتھی بیل پر فون ریسیو کیا گیا۔

''صمد!'' آواز پہچان کر ملیحہ کے ہونٹ بے آواز ہلے۔ اس وقت وہ سمیرا کے علاوہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ''سمیرا کو بلا دیں۔'' اس نے جلدی سے کہا تو اسے ہولڈ کرنے کو کہا گیا۔

''ہیلو!'' کچھ دیر بعد ایئر پیس پر سمیرا کی آواز اُبھری۔

''سمیرا......!'' اتنا بولنے میں ہی ملیحہ کا گلا رندھ گیا تھا اور اس ڈر سے کہ وہ رو نہ پڑے، ملیحہ خاموش ہو گئی۔ سمیرا اس کی آواز پر حیران اور پھر خاموشی پر پریشان ہو اُٹھی۔

''ملیحہ! یہ تم ہو؟...... خاموش کیوں ہو گئیں؟...... پلیز بتاؤ سب ٹھیک تو ہے؟''

''کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' سمیرا دہل گئی۔

''ہوا کیا ہے؟'' ملیحہ نے اس کی بات کی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے وجدان کا ایڈریس چاہیے۔''

اب چپ ہونے کی باری سمیرا کی تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس کی آواز آئی۔

''وجدان نہیں آیا؟'' پھر اس نے کہا۔ ''تم ایسا کرو چاچو کے آفس فون کرو۔ وہیں ہوگا۔''

''تمہیں فون کرنے سے پہلے وہاں فون کیا تھا، پر وہ کئی مہینے سے آفس نہیں آ رہا۔''

''تو کورٹ میں ہوگا۔ تم نے معلوم کیا؟''

''جب وہ آفس چھوڑ چکا ہے تو کورٹ میں کیا کرے گا؟ ویسے بھی کورٹ چار بجے بند ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت پانچ بج رہے ہیں۔'' ملیحہ نے جھنجلا کر کہا تھا۔

''او سوری۔'' سمیرا کو احساس ہوا کہ اس کے سوال ملیحہ کو زِچ کر رہے ہیں تو فوراً سنبھل کر بولی۔ ''اچھا ایڈریس نوٹ کرو۔''

''ایک منٹ۔'' ملیحہ نے اپنے بیگ سے پین اور پاکٹ سائز ڈائری نکالی اور ایڈریس نوٹ کرتے ہی فون رکھ کر دکان دار کو پے منٹ کرتی وہ باہر آ گئی۔ سڑک کے کنارے ایک خالی ٹیکسی تھی۔ ملیحہ تیزی سے دروازہ کھول کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مسافر کے انتظار میں اسٹیئرنگ پر سر رکھے اونگھتے ڈرائیور نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''بی بی! کدھر جائیں گی؟''

ملیحہ نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ دیکھا اور بولی۔ ''پی ای سی ایچ ایس کالونی۔''

وہ یہاں تک آ تو گئی تھی، پر اب اس ڈبل اسٹوری بنگلے کے گیٹ کے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی کہ اگر گیٹ وجدان کے علاوہ کسی اور نے کھولا تو کیا کہہ کر اسے بلوائے گی۔

'جو ہوگا، دیکھا جائے گا' ملیحہ نے سر جھٹک کر نیم پلیٹ پڑھتے ہوئے ایڈریس کی تصدیق کی، پھر بیل بجا دی۔ دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی تھی، پھر گیٹ کھل گیا۔ سبز آنکھوں والی لڑکی کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ کسی اور کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی اور شاید اسی لئے اس نے بنا پوچھے دروازہ کھول دیا تھا اور اب ملیحہ کو دیکھ کر سٹپٹا گئی تھی۔

''آپ کون ہیں؟'' ملیحہ اس سوال پر گھبرا سی گئی، پھر اس نے ہاتھ میں دبی چٹ اس کی طرف بڑھائی۔

''یہ ایڈریس آپ کے گھر کا ہے؟''

لڑکی نے چٹ لے کر ایڈریس دیکھا، پھر اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''ایڈریس تو یہی ہے۔ پر آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''وجدان مصطفیٰ سے۔ کیا وہ گھر پر ہیں؟'' ملیحہ نے کوشش کی کہ اپنا لہجہ نارمل ہی رکھے۔ پر سوال ہی ایسا تھا جس پر لڑکی کا چونکنا لازم تھا۔

''آپ کون ہیں؟ اور وجدان سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟''

"میرا نام ملیحہ فاروقی ہے۔ پلیز آپ وجدان کو بلا دیجئے۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔"
اس لڑکی کی آنکھوں سے اچانک ہی تنفر جھلکنے لگا تھا۔ پھر وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔
"وجدان گھر پر نہیں ہے۔" اور جھٹکے سے گیٹ بند کرنے لگی تو ملیحہ نے ہاتھ رکھ کر اسے روکتے ہوئے پوچھا۔
"ایک منٹ، کیا آپ کو معلوم ہے وہ کہاں گئے ہیں اور کب تک آئیں گے؟"
"نہیں۔" وہ ایک لفظ بول کر ملیحہ کا چہرہ دیکھنے لگی جو بیگ سے پین نکال کر اس کاغذ کے پیچھے کچھ لکھنے لگی تھی۔
"وجدان جیسے گھر آئیں، ان سے کہیے گا، اس نمبر پر مجھ سے بات کر لیں۔" ملیحہ نے کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر گیٹ بند کر دیا۔ ملیحہ نے دیوار کا سہارا لیا، ورنہ گر پڑتی۔
'گھر پہ نہیں ہے۔ آفس میں بھی نہیں ہے۔ تو پھر کہاں چلا گیا؟ لائبریری کیوں نہیں آیا؟..... کہیں ایسا تو نہیں کہ بھول گیا ہو؟' خود کلامی کے جواب میں وجدان کی آواز اس کے کانوں میں گونج گئی۔
"جب سے آپ کو حفظ کیا ہے، خود کو بھول گیا ہوں۔'
ایک ٹیس سی اُٹھی تھی، جس کو دباتے وہ ٹیکسی میں آ بیٹھی۔
"آرٹس کونسل چلو۔" ملیحہ نے کل اپنی پینٹنگ "عشقِ آتش' وجدان کو گفٹ کر کے نمائش سے ہٹوائی تھی اور یہ بات وجدان کے علم میں بھی تھی۔ ملیحہ اس امید پر آرٹس کونسل آئی تھی کہ شاید وجدان پینٹنگ لینے وہاں آیا ہو۔ مگر وہ وہاں بھی نہیں ملا۔
ملیحہ نے اپنے فون نمبر کے ساتھ وجدان کے نام میسج چھوڑا اور نمائش والے پورشن میں آ گئی۔ اس امید پر ایک ایک شخص کا چہرہ دیکھتی رہی کہ شاید وہ وجدان ہو گا۔ مگر اس کی نگاہیں نامراد لوٹ آئیں۔ ڈرائیور کو واپس لائبریری چلنے کا کہتے ہوئے اس نے رسٹ واچ پر نظر دوڑائی تو پونے چھ ہو رہے تھے۔ اسے گھر سے نکلے آٹھ گھنٹے سے زیادہ بیت چکے تھے۔
"کیا آپ اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک پل مجھے نہیں دے سکتیں؟" اس وقت وجدان کے لہجے میں جتنی التجائیں تھیں، اس سے زیادہ اس وقت ملیحہ کے چہرے پر رقم تھیں۔
لائبریری پہنچ کر ملیحہ نے ہال کا ایک چکر لگایا۔ وجدان کو نہ پا کر وہ کچھ سوچتے ہوئے واچ مین کے پاس آئی۔
"خان صاحب! آپ سے کسی کے بارے میں پوچھنا ہے۔"
"پوچھو۔" خان صاحب کی اجازت کے بعد مزید بولی۔
"چوبیس، پچیس سال کا سانولے رنگ کا لڑکا ہے۔ قد تقریباً چھ فٹ، آنکھوں اور بالوں کا رنگ سیاہ ہے اور اکثر یہاں آتا ہے۔ کیا صبح یہاں آیا تھا؟"
"آپ وکیل صاحب کا تو نئیں پوچھتا ہے؟" خاندان صاحب نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

ملیحہ فوراً بولی۔ ''ہاں، ہاں۔ میں ان ہی کا پوچھ رہی ہوں۔''

''دو تین مہینے سے روز آتا اے۔ پر آج نئیں آیا۔''

''آپ کو یقین ہے وہ نہیں آئے؟'' ملیحہ کی بات پر وہ ہنسنے لگے۔

''کیا بات کرتا اے جی! صبح سے ام ایدر بیٹھا اے۔ آتا تو ام کو دِکھتا نئیں؟'' وہ اتنے یقین سے کہہ رہا تھا کہ ملیحہ کو اس کی بات ماننا پڑی۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے سیڑھیوں تک آ گئی۔

''میں سارا دن آپ کا انتظار کروں گا۔'' ایک سرگوشی کہیں آس پاس سنائی دی تو ملیحہ نے تڑپ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اس کا ضبط ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے سیڑھیوں پر بیٹھ کر سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

ساڑھے چھ بجے جب ملیحہ نے قصر فاروقی میں قدم رکھا، وہ اپنا یقین ہار چکی تھی۔ اور اس ہار کا چہرہ ڈرائنگ روم میں موجود کوئی شخص نہ دیکھ لے، اس لئے وہ پچھلی طرف ہال کے دروازے سے اندر آئی۔

''بہادر! میرے لئے کوئی فون تو نہیں آیا تھا؟'' پاس سے گزرتے بہادر کو روک کر اس نے پوچھا۔

''نہیں بی بی صاب! پر آپ کہاں چلی گئی تھیں؟ وہ بھی آج کے دن؟''

ملیحہ کی آخری امید بھی ختم ہو گئی۔ وہ بہادر کو جواب دیئے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ٹھنڈے یخ پانی سے منہ دھوتے ہوئے اس نے آنسوؤں کے ہر نشان کو بے دردی سے رگڑ ڈالا۔ پھر تولیے سے چہرہ خشک کرتی ہوئی ڈریسنگ روم میں آ گئی۔ الماری کے دونوں پٹ کھولے، وہ باری باری ہر سوٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر بہت سوچ کر اس نے پیچ کلر کے ڈریس کو نکالا تو نظر اس کے پیچھے لٹکتے سوٹ پر ٹھہر گئی۔ پنک کلر کے چوڑی دار پاجامے پر سفید قمیض تھی، جس پر پنک رنگ کے موتیوں سے گلے اور قمیض کی ہاف سلیوز پر نفیس کام بنا ہوا تھا۔ پنک اینڈ وائٹ کنٹراسٹ دوپٹے کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

''تم سفید رنگ مت پہنا کرو۔ اس رنگ میں اتنی پیاری لگتی ہو کہ ڈر لگتا ہے، نظر نہ لگ جائے۔''

''نظر تو لگ چکی، نورالہدیٰ! اب کس بات کا ڈر؟'' اس نے سوچا اور وہی سوٹ باہر نکال لیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہونٹوں پر پنک کلر کی لپ اسٹک کی تہہ جمالی۔ ملیحہ زندگی میں پہلی بار اتنے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ دونوں کلائیوں میں بھر بھر کر وائٹ اور پنک چوڑیاں ڈال کر اس نے کانوں میں چاندی کے آویزے پہنے، پھر بیڈ پر آ بیٹھی۔ جھک کر سینڈل پاؤں میں ڈال کر اس نے بیڈ سے دوپٹہ اٹھا کے شانوں پر پھیلایا، کھلے بالوں کو ایک ہاتھ سے سنوارتے ہوئے اس کی نظر آئینے میں نظر آتے اپنے ہی عکس پر پڑی تھی۔

''آج کی تاریخ میں میرے لئے روشنی، رنگ اور اُمید تینوں ختم ہو چکے ہیں۔ لیکن نورالہدیٰ فاروقی! انہیں آپ کی زندگی میں ہمیشہ رہنا چاہیے۔'' اس نے کہا تھا اور کمرے سے نکل گئی۔

ڈرائنگ روم کے دروازے پر قدم رکھتے ہی ملیحہ کی نظر بلیک پینٹ پر میرون شرٹ پہنے نورالہدیٰ پر پڑی تھی۔ اسی پل نورالہدیٰ نے بھی دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ نورالہدیٰ کی آنکھوں کی وہ چمک ملیحہ کے لئے

تھی۔ اس نے پلکیں جھکا لیں۔ باقی لوگ بھی ملیحہ کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ پل بھر میں اس کی کزنز نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ مگر سمیرا اُٹھ نہیں سکی۔ کسی معجزے کی اُمید کرتے کرتے ملیحہ کو دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ معجزے اب نہیں ہوتے۔ وہ سمجھ گئی کہ ملیحہ، وجدان سے نہیں مل سکی۔

''حد کرتی ہو بیٹا! آج کے دن شاپنگ پر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اب دیکھو ذرا، سب آئے بیٹھے ہیں۔ اور تو اور دُولہا بھی موجود ہے۔ پر دُلہن شادی کی شاپنگ کرنے گئی ہوئی ہے۔'' بڑی ممانی نے اسے دیکھ کر کہا تو ملک ناصر اس کے کچھ بولنے سے پہلے بول پڑے۔

''چھوڑیئے بھابی! اب باتوں میں مزید وقت کیا گنوانا۔ آؤ بیٹی! رسم کر لی جائے۔'' آخر میں وہ ملیحہ سے بولے تھے۔ ملیحہ نے قدم بڑھایا تو سمیرا ایک دم اس کے کان کے پاس آ کر بولی۔

''انکار کر دو۔ ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے۔''

''کس برتے پر؟'' ملیحہ نے اس کی طرف دیکھ کر زہر میں بجھی سرگوشی کی اور آگے بڑھ گئی۔ کسی نے اسے بازو سے پکڑ کر نورالہدیٰ کے پہلو میں بٹھا دیا تھا۔ پھر بابا جان کی اجازت سے نورالہدیٰ نے اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنا دی۔

کھانے کے بعد جب مہمان رخصت ہونے لگے تو ملیحہ، سمیرا کے گلے لگ کر عاجزی سے بولی۔

''آج رک جاؤ سمیرا!''

سمیرا ہامی بھر لیتی، پھر اس نے آفاق کو دیکھا جو اشارے سے منع کر رہا تھا تو وہ مجبور ہو گئی۔

''آج تو نہیں رک سکتی، مگر کل میں صبح سے ہی آ جاؤں گی۔'' اس نے ملیحہ کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔'' پھر ملیحہ کا گال چوم کر وہ گاڑی میں جا بیٹھی۔

پورچ میں اب صرف وہ، بابا جان اور نورالہدیٰ رہ گئے تھے۔ ملیحہ ان دونوں کی طرف دیکھے بنا ہی پلٹ کر اندر چلی گئی تھی۔ وہ ہال میں آئی تو اپنے کمرے کی سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے کھلے دروازے سے لان میں آ گئی۔ ننگے پاؤں چہل قدمی کرتے ہوئے ملیحہ کے پیروں کے نیچے بھیگی گھاس کا نرم قالین بچھا تھا۔ لیکن ملیحہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پاؤں سلگتے انگاروں پر ہوں۔ اس احساس کے باوجود اس نے ٹہلنا بند نہیں کیا۔ برداشت کے راستوں پر ایک ایسا موڑ آتا ہے جہاں پہنچ کر درد بہت بے درد ہو جاتا ہے اور اسی انتہا پر پہنچ کر صبر کی چادر اوڑھے انسان ایسی کیفیت سے گزرتا ہے جہاں سوال قرار کا نہیں، بے قراری کا ہو جاتا ہے۔ پھر جتنا درد بڑھتا ہے، اتنا سکون ملتا ہے۔ ملیحہ بھی خود اذیتی کی اسی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ چکر کاٹ کر بار بار پلٹتے ہوئے وہ ایک بار پلٹی تو سامنے نورالہدیٰ تھے۔

''اچھی خاصی ٹھنڈ ہے اور تم یوں ننگے پاؤں گیلی گھاس پر چل رہی ہو۔ کوئی شال وغیرہ بھی نہیں لی۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔'' سہانی شام تھی اور محبوب نظروں کے سامنے۔ نورالہدیٰ کو شاید کچھ اور کہنا چاہیے تھا پر وہ اسے

ٹوٹے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک بے معنی ''جی'' بول کر ملیحہ ان کے برابر سے گزرتی سیڑھیوں پر بیٹھ کر سینڈل پہنے لگی۔ سینڈل پہن کر اس نے اندر کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ نورالہدیٰ نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

''تم خوش ہو؟''

دوسری سیڑھی پر رکھا ملیحہ کا پاؤں اپنی جگہ جم گیا۔ وہ سنبھلی، پھر پلٹ کر انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ خوش ہیں؟''

نورالہدیٰ نے آنکھیں بند کر کے ہوا میں پھیلی تازگی کو سانس کے ساتھ اپنے اندر اُتارتے ہوئے کہا۔

''بہت۔''

''تو سمجھیں میں بھی خوش ہوں۔'' وہ قصداً مسکرائی۔ نورالہدیٰ نے اس کی طرف دیکھا اور پاس چلے آئے۔

''میں جانتا ہوں تمہیں احساس بھی نہیں ہوگا کہ میں پہلی ہی نظر میں اپنا ہر احساس تمہارے نام کر چکا ہوں۔''

ملیحہ کے لئے یہ سچ مچ انکشاف تھا۔ مگر اس کے اعصاب پہلے ہی اس قدر لوٹ چکے تھے کہ وہ حیران بھی نہ ہوسکی۔ بس انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

''ہاں ملیحہ! یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سچ ہے کہ میرا دل جب بھی دھڑکتا ہے تو شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور یہ محبت مجھے زندگی کی طرح عزیز ہے۔ لیکن ایک چیز ہے جو مجھے اپنی زندگی سے اور اپنی محبت سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ جانتی ہو وہ چیز کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔ ملیحہ اب بھی خاموش کھڑی بس انہیں دیکھتی ہی رہی۔

''تمہاری مسکراہٹ۔ اس دن یاد ہے جب میں اور بابا جان وہاں لان میں بیٹھے تھے۔'' انہوں نے لان چیئرز کی طرف اشارہ کیا، جن کی سفیدی اندھیرے میں چمک رہی تھی۔ ملیحہ نے یوں ہی سر گھما کر دیکھا وہ کہہ رہے تھے۔

''انہوں نے مجھ سے پوچھا، ملیحہ سے شادی کرو گے؟ تو میں نے ان سے کہا تھا۔ I Love her۔ لیکن میں ملیحہ سے شادی صرف اس صورت میں کروں گا اگر ملیحہ کو اعتراض نہ ہو۔'' ملیحہ کو کچھ دن پہلے کا وہ منظر یاد آ گیا اور نورالہدیٰ کا جملہ بھی۔

''میں ملیحہ کی خوشی کی خاطر اپنا دکھ بھی سہہ سکتا ہوں۔''

وہ غائب دماغ کھڑی تھی کہ اچانک ہی نورالہدیٰ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ملیحہ نے ان کی طرف دیکھا، وہ اس کے بائیں ہاتھ کو تھام کر اس کی انگلی میں پڑی انگوٹھی کے ڈائمنڈ کو انگوٹھے سے ذرا چھو کر بول رہے تھے۔

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مگر تم میرے ساتھ اپنی زندگی گزارنے والی ہو اور اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔ اگر تمہارا ذہن مجھے اس رشتے کے ساتھ قبول کر سکے تو ٹھیک ہے اور اگر نہ کر سکے تو زبردستی نہیں ہے۔''

وہ بولتے ہوئے ایک پل کو چپ سے ہو گئے، پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر بولے۔ ''تم جب چاہو، میرا ساتھ چھوڑ

جا سکتی ہو۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا ہادی بھائی!" فوراً ہی اس کی زبان سے نکلا تھا اور فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا اور سنبھل کر بولی۔ "رشتے جب بنائے جاتے ہیں نورالہدیٰ! تو انہیں نبھایا کرتے ہیں، توڑا نہیں کرتے۔"

نورالہدیٰ کو ایک دم ہی اپنا آپ ہلکا پھلکا لگنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے اس پل کا انتظار کرنے کی اجازت ہے، جب تم ایک نئے رشتے سے میری زندگی میں قدم رکھو گی۔" ان کی نگاہوں سے جھلکتی وارفتگی ملیحہ سہہ نہیں پائی اور اچانک ہی مڑ کر اندر آئی اور سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ نورالہدیٰ اس انداز کو اس کی ادا سمجھ کر مسکرانے لگے تھے۔

"سائنس کہتی ہے کائنات میں موجود ہر شے کی بنیادی اکائی ہے۔ ہمارے جسم کو ہی دیکھ لیا جائے۔ لاکھوں، کروڑوں خلیوں سے بنا ہمارا جسم ایک خلیے سے شروع ہوتا ہے۔ مادے کی شروعات ایٹم سے ہوتی ہے، یہاں تک کہ اربوں، کھربوں میل پر پھیلی اس کائنات کو اگر ریورس پراسس میں ڈال دیا جائے تو یہ پوری کائنات محض ایک نقطے میں سمٹ جائے گی۔ مجھے سائنس کے اس نظریے پر کوئی اعتراض نہیں، مگر میری زندگی میں یہ قانون کمزور پڑنے لگتا ہے، کیونکہ میری زندگی کی بنیادی اکائی نہیں، بلکہ ایک تکون ہے۔ ایک ایسی تکون جس کے ہر زاویے کی پیمائش ساٹھ ڈگری ہے۔ یعنی ہر زاویے کی پیمائش برابر ہے اور کسی بھی طرح ان تینوں زاویوں میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ اس تکون کے ایک سرے پر بابا جان کھڑے ہیں، بابا جان کا اور میرا رشتہ شیشے اور پتھر کا رہا ہے۔ شیشہ اپنی جگہ قائم رہے، اس کے لئے پتھر سے فاصلہ ضروری ہے، اسی لئے میں ان کے پاس جانے سے ہمیشہ گھبراتی رہی کہ کہیں چوٹ نہ کھا بیٹھوں۔ میرا ڈر کیسا سچا تھا۔

تکون کے دوسرے سرے پر نورالہدیٰ ہیں۔ ہادی بھائی نے میری زندگی کے ہر خلا کو بھر دیا۔ بنا مانگے انہوں نے مجھے وہ سب کچھ دے دیا جو مجھے کبھی کسی سے نہیں ملا تھا۔ انہوں نے مجھے چاہا بھی تو اپنے لئے نہیں بلکہ میرے لئے چاہا۔ ایک دم خالص اور بے غرض محبت۔ اور بدلے میں بھی کبھی کچھ نہیں مانگا۔ لیکن اگر وہ نہیں مانگیں گے تو کیا میں دوں گی نہیں؟ .... تکون کے تیسرے کونے میں کھڑا تیسرا شخص وجدان مصطفیٰ ہے۔ وجدان مصطفیٰ میری ذات کا آئینہ، میرے یقین کا چہرہ۔ مگر آج اس چہرے کے نقوش دھندلا رہے ہیں۔ اب سوال پانے اور کھونے کا نہیں، اب سوال میرے اعتبار کا ہے۔ بابا جان، نورالہدیٰ اور وجدان ایک تکون کے تین کونوں پر کھڑے تین لوگ۔ وہ تین لوگ جنہیں میں نے ٹوٹ کر چاہا اور ان میں سے کوئی ایک بھی اگر میری زندگی کے منظر نامے سے ہٹا تو اس آدھی ادھوری زندگی کو جینا مشکل ہو جائے گا۔ مگر میں یہ بھی جان چکی ہوں کہ یہ تینوں کبھی ایک ساتھ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ بابا جان، نورالہدیٰ اور وجدان، وہ تین لوگ جنہیں میں نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ محبت کی اور میری زندگی کے سب سے کٹھن موڑ پر وہ تینوں ہی مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ مجھے کسی کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ میرا ساتھ کون دے گا؟"

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ملیحہ نے ڈائری لکھنا چھوڑ کر آواز لگائی۔

''دروازہ کھلا ہے۔ آجاؤ۔''

اس آواز کے ساتھ ہی بہادر کمرے میں آیا تھا۔

''کہو کیا بات ہے؟'' ملیحہ نے پوچھا۔

''بی بی صاب! آپ کے لیے فون آیا ہے۔'' ملیحہ کی نگاہوں میں زمان و مکان گھوم گئے تھے۔

یہاں تک پہنچ کر ڈائری خاموش ہوگئی تھی۔

تانیہ نے فوراً اگلا صفحہ پلٹ کر دیکھا اور پھر باقی کے سارے ورق پلٹ کر دیکھ لیے۔ ہر ورق سادہ تھا۔ تانیہ نے کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھا، جس پر روشنی دھیرے دھیرے بکھرتی جا رہی تھی۔ پوری رات ڈائری پڑھنے سے اب اس کی آنکھیں بری طرح دُکھ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے سیدھی لیٹ گئی۔ پچھلی رات انکشافات کی رات تھی۔ وہ گہرے سانس لیتی خود کو اس اعصاب شکن کیفیت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ داستان ایک عجیب موڑ پر آ کر رک گئی تھی۔ تانیہ سوچنے لگی، آگے کیا ہوا ہوگا؟

'اُس رات وہ ٹیلی فون کس کا تھا؟..... کیا وجدان کا؟..... اس نے کیا کہا ہوگا؟ اور اگر رات کو آنے والا فون وجدان کا تھا تو جب دن بھر ملیحہ اسے ڈھونڈتی رہی تو وہ کیوں نہیں ملا؟ وہ اس دن لائبریری کیوں نہیں آیا تھا؟ اور فون پر کہیں اس نے یہ تو نہیں کہہ دیا ہوگا کہ میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔ اللہ حافظ، وغیرہ وغیرہ؟..... نہیں' اس نے فوراً ہی اپنے قیاس کو رد کر دیا۔ 'اگر ایسا ہوتا تو ملیحہ، پاپا سے شادی کر لیتی اور پاپا سے شادی کے بعد تو اسے قصرِ فاروقی میں ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ تو کہیں نہیں ہے۔ کوئی اس کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتا۔ .... کیا وجدان نے فون پر اپنے نہ آنے کی وجہ بتا کر معذرت کر لی تھی اور اس کے بعد ملیحہ نے دادا جان کے سامنے شادی سے انکار کر دیا ہوگا؟..... مگر دادا جان تو فیصلہ واپس نہیں لینے والے تھے۔ تو پھر یہ ہوسکتا ہے کہ ملیحہ نے ان کی مرضی کے بغیر وجدان سے شادی کر لی ہو۔ لیکن ایسا ہونا بھی مشکل ہے۔ ملیحہ نے کہا تھا وہ اپنے بابا جان کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔' اپنے دوسرے قیاس کو بھی رد کرتے ہوئے اس نے سوچا اور الجھن بھی ہوگئی۔

'لیکن اگر یہ نہیں ہوا تھا، وہ نہیں ہوا تھا تو آخر ہوا کیا تھا؟..... ملیحہ اچانک ہی کہاں گم ہوگئی؟ اس نے آخر کیا، کیا تھا جو اس کا ذکر خود اس کے ہی گھر میں بین ہوگیا اور برسوں گزر جانے کے بعد بھی نہ تو اس نے کبھی قصرِ فاروقی میں قدم رکھا اور نہ کبھی کسی کی زبان پر اس کا نام ہی آیا..... اور..... پاپا اور دادا جان کے درمیان موجود خلیج کی شروعات کب اور کہاں سے ہوئی؟ منگنی کی رات تک تو سب ٹھیک تھا۔ پھر کیوں پاپا، دادا جان سے متنفر ہوگئے؟' وہ اُلجھتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔

'کیا مشکل ہے؟..... میں نے تو سوچا تھا، ملیحہ کی ڈائری قصرِ فاروقی کے رازوں پر سے پردہ اٹھا دے گی۔

پراس نے تو اور بھی کئی معموں کو جنم دے دیا ہے۔ کتنی عجیب سی بات ہے، پاپا جو ماما سے اتنی محبت کرتے ہیں، ماما سے پہلے کسی اور کو چاہ چکے ہیں۔ مگر پاپا کی محبت تو مکمل ہونے جا رہی تھی، ادھوری کیسے رہ گئی؟...... کہانی کی ہر کڑی بیچ سے غائب ہو گئی ہے۔ اور ایسا کوئی نہیں جو بتا سکے کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا؟' اُس نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے خود کو ریلیکس کیا اور ایک نئے رخ پر سوچنے لگی۔

'اُس کہانی کے چار ہی بنیادی کردار ہیں، جو کہ سچ پر سے پردہ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر دو کردار تو زباں بندی کے عہد پر کارفرما ہیں۔ تیسرا کردار منظر سے ہی غائب ہے۔ اور چوتھا کردار...... اوں' اچانک ہی کوئی خیال آیا تھا۔ 'وجدان مصطفیٰ۔ یہ شخص میرے لئے یقیناً اجنبی ہے۔ مگر یہ نام نہیں۔ جسٹس وجدان مصطفیٰ۔ یہ محض میرا اندازہ ہے، مگر تصدیق تو کرنی پڑے گی۔ اے ایس پی شایان مصطفیٰ! میں نے سوچا تھا، تم سے دوبارہ کبھی نہیں ملوں گی۔ لیکن اگر مجھے وجدان مصطفیٰ سے ملنا ہے تو تم سے ایک آخری ملاقات ناگزیر ہو گئی ہے۔' اس نے دل میں کہا۔

دادا جان شام کو آنے والے تھے لیکن تانیہ رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ وہ ڈائری اٹھا کر دادا جان کے کمرے میں آ گئی اور احتیاط سے ڈائری واپس اسی جگہ رکھ دی جہاں سے کل اس نے اٹھائی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی۔ وہ آفس جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اس نے محسوس کیا تھا، آج کل پاپا اُس پر کچھ زیادہ ہی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تانیہ سے تو کچھ نہیں کہا تھا، مگر ان کی نظریں اب ہر وقت تانیہ کو کھوجتی رہتی تھیں۔ اور تانیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی طرف سے کچھ ایسا ہو کہ وہ چونک جائیں۔ آدھے گھنٹے میں تیار ہو کر وہ ڈائننگ ٹیبل پر چلی آئی۔

''گڈ مارننگ ماما!...... گڈ مارننگ پاپا!'' روز کی طرح ہی آج بھی دوپٹہ اور فائلز اُس نے بازو میں دبوچے ہوئے تھے۔ بیگ سمیت باقی سب کچھ ساتھ والی چیئر پر ڈھیر کرتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل بھی یونہی کرسی پر ڈال دیا۔ نظر کا چشمہ پھسل کر ناک کی نوک پر آ ٹکا تھا جسے نورالہدیٰ نے ہاتھ مار کر صحیح کرتے ہوئے جواباً اُسے گڈ مارننگ کہا تھا۔ اور پھر سے اخبار کے صفحے اُلٹنے لگے تھے۔ مریم نے کچن کی طرف آواز لگائی۔

''بہادر! تانیہ کے لئے ناشتہ لے آؤ۔''

تانیہ ناشتہ کر رہی تھی کہ نورالہدیٰ نے اخبار سائیڈ میں ڈالتے ہوئے مریم سے جوس کے لئے کہا۔

''پاپا! ویسے آپ کی یہ عادت کافی الگ سی ہے۔'' تانیہ چور نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''کون سی عادت؟'' وہ سمجھے نہیں۔

''یہی، لوگ چائے کے ساتھ اخبار پڑھنا پسند کرتے ہیں اور آپ اخبار پڑھ کر جوس پیتے ہیں۔''

''یہ عادت میری نہیں، کسی اور کی تھی۔'' اُن کے منہ سے یہ اعتراف سن کر تانیہ کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ نورالہدیٰ اتنے آرام سے یہ بات کہہ دیں گے۔ جبکہ اس اعتراف کے پیچھے ایک پردہ

نشیں کا نام چھپا ہے۔

''آپ نے کیوں اپنا لی؟...... یہ عادت کس کی تھی؟'' اس نے جان بوجھ کر نہیں پوچھا کہ جواب آنے کی توقع نہیں تھی۔ نورالہدیٰ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''کچھ لوگ ہوتے ہیں، جن کی ہر چیز اپنا لینے کو دل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ عادتیں بھی۔''

''پاپا! آپ نے کبھی اسموکنگ کی ہے؟'' کچھ دیر خاموشی سے ناشتہ کرنے کے بعد اس نے پھر پوچھا۔ اس بار نورالہدیٰ نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ تانیہ تھوڑا سا گڑبڑا گئی۔ اپنی پُرتجسس فطرت پر غصہ بھی آیا۔ مگر اب تو سوال کر چکی تھی۔ انجان سی بن کر آملیٹ کو پلیٹ میں نچاتی رہی۔

''تم یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''ایسے ہی۔'' اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ''ہم عادتوں پر بات کر رہے ہیں۔ اور اکثر مردوں کو سگریٹ پینے کی عادت ہوتی ہے۔ بس اسی لئے پوچھ رہی ہوں۔''

''لیکن نورالہدیٰ کو کبھی بھی سگریٹ پینے کی عادت نہیں رہی۔'' مریم نے کہا تو نورالہدیٰ بولے۔

''نہیں مریم! میں اسموکنگ کیا کرتا تھا۔''

''تم اسموکنگ کرتے تھے؟'' وہ حیران ہوئیں۔ ''لیکن میں نے تو کبھی تمہارے ہاتھ میں سگریٹ نہیں دیکھا۔''

''شادی سے کافی عرصہ پہلے میں نے اسموکنگ چھوڑ دی تھی۔ ورنہ لندن میں رہتے ہوئے اور پھر پاکستان آنے کے بعد بھی میں کچھ عرصے تک چین اسموکر ہوا کرتا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، تم شادی سے پہلے کافی الگ تھے۔ اور شادی کے بعد تم نے بہت سی عادتیں بدل لیں۔'' وہ دونوں آپس میں بات کر رہے تھے۔

تانیہ ناشتہ کر چکی تھی۔ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُس کی نظر ٹیبل پر نورالہدیٰ کے سامنے رکھے اُن کے والٹ پر پڑی۔ وہ ڈائری میں لکھی ہر بات کی تصدیق کر لینا چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر والٹ اٹھا لیا اور پھر بڑے سرسری سے انداز میں نورالہدیٰ کا شناختی کارڈ نکال کر دیکھنے لگی۔

نام، نورالہدیٰ فاروقی...... والد کا نام، مظہر فاروقی۔

'اتنے سامنے کی بات نہ جانے میں نے پہلے کبھی کیوں نوٹ نہیں کی۔' اس نے سوچا اور کارڈ واپس والٹ میں ڈال کر والٹ، ٹیبل پر رکھ دیا اور نارمل سے انداز میں چائے پینے لگی۔

نورالہدیٰ اُس کی حرکت کو نوٹ کر چکے تھے مگر مطلب اخذ نہیں کر سکے۔ اس لئے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ وہ اپنا جوس ختم کر چکے تھے۔ ٹیبل سے والٹ اور دوسری چیزیں اُٹھا کر جانے لگے تو تانیہ بولی۔

''پاپا! آج میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ میری گاڑی میں کام نکل آیا ہے۔ آج ڈرائیور، مکینک کے پاس لے جائے گا۔''

"مگر میں پہلے فیکٹری جاؤں گا۔"

"مجھے آفس چھوڑ کر چلے جایئے گا نا پلیز۔" آخر میں اُس نے پلیز کو لمبا کھینچا۔ وہ ہنس کر بولے۔

"ٹھیک ہے۔ چلو پھر۔"

"آپ گاڑی میں چل کر بیٹھیں۔ میں بس دو منٹ میں آتی ہوں۔" وہ بول کر جلدی جلدی چائے پینے لگی۔

"باپ کو ڈرائیور بنا دو۔" نورالہدیٰ نے اس کے سر پر دھپ لگائی اور جانے لگے۔

"سنو، شام میں جلدی گھر آ جانا۔" مریم نے یاد آنے پر پکار کر کہا۔ نورالہدیٰ مسکراتے ہوئے پلٹے اور کرسی پر کہنی ٹکا کر جھکتے ہوئے انہیں گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں بولے۔

"کیا بات ہے؟ آج بڑے عرصے بعد شام میں جلدی گھر آنے کی فرمائش کی ہے۔"

تانیہ کو اُن کے انداز پر ایک دم سے ہنسی آ گئی۔ اس نے فوراً چائے کا کپ منہ سے دور کیا۔ ورنہ چائے اس کے کپڑوں پر چھلک جاتی۔ مریم کو نورالہدیٰ کی آنکھوں سے زیادہ تانیہ کی ہنسی نے بلش کر دیا تھا۔

"بچوں کا تو خیال کر لیا کرو۔" وہ آنکھیں نکال کر بولیں۔

"بچے اب بڑے ہو چکے ہیں۔" ان پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ مریم زِچ ہو کر بولیں۔

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" وہ جیسے اصل مسئلے کو سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے گاڑی کی چابی تانیہ کو پکڑا کر کہا۔

"کپ چھوڑو۔ چائے آفس میں پی لینا۔ اور اب تم جا کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں دو منٹ میں آتا ہوں۔"

"نورالہدیٰ! میں تمہارا کیا کروں؟" بے اختیار مریم کی زبان سے نکلا اور ہونٹ دبا کر ہنسی روکتی ہوئی تانیہ چابی پکڑ کر کپ رکھتی اپنا ساز و سامان اُٹھا کر باہر بھاگ گئی۔ دو منٹ بعد جب نورالہدیٰ، کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھے تو اُن کی مسکراہٹ دیکھ کر تانیہ بھی مسکرانے لگی۔ نورالہدیٰ نے اسے مسکراتے دیکھا تو ذرا رُعب سے بولے۔

"تم ہنس کیوں رہی ہو؟"

وہ بھی ان کی بیٹی تھی۔ جھجکے بغیر بولی۔ "پاپا! آپ نے کبھی نوٹ کیا، ماما شرماتے ہوئے بہت خوبصورت لگتی ہیں۔" اُسے مرعوب نہ ہوتے دیکھ کر نورالہدیٰ نے بھی رعب ڈالنے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور ہنس کر بولے۔

"ہاں۔ مگر وہ شرماتی بہت کم ہے۔" خاص طور پر کل رات ڈائری پڑھ لینے کے بعد تانیہ کو نورالہدیٰ کی مریم سے محبت کو دیکھ کر مطمئن بلکہ خوش ہونا چاہئے تھا۔ مگر نہ جانے کیوں گاڑی اسٹارٹ کرتے نورالہدیٰ کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ دیکھ کر وہ اچانک آزردہ سی ہو گئی تھی۔

'کیا پاپا کو ملیحہ ذرا بھی یاد نہیں؟' اُس نے دُکھ سے سوچا تھا۔

شام کو اُس کی واپسی ہوئی تو خلافِ معمول نورالہدیٰ بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان دونوں کے پہنچنے سے پہلے

اظہر فاروقی واپس آ چکے تھے اور اب فریش ہو کر لاؤنج میں سب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان سے مل کر تانیہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ پھر فریش ہو کر چینج کرنے کے بعد لاؤنج میں آئی تو نورالہدیٰ بھی چینج کر کے وہاں آ بیٹھے تھے۔ اور اب وہ، مریم اور بابا جان تانیہ کی شادی کا ٹاپک لے کر بیٹھے تھے۔ تانیہ کسی ردِعمل کے بغیر چپ چاپ دادا جان کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُس کے دونوں بھائی بھی وہاں تھے۔ مگر ظاہر ہے، اس ٹاپک میں اُن کے بولنے کی گنجائش کہاں تھی۔ وہ دونوں آرام سے الگ تھلگ بیٹھے ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

''تم دونوں نے انصر کے ماں باپ سے کوئی بات نہیں کی؟'' بابا جان پوچھ رہے تھے۔

نورالہدیٰ نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ مگر شاید وہ اور انتظار نہیں کرنا چاہتے۔ آج تیمور میرے آفس آیا تھا اور ہم سب کو اپنے گھر ڈنر پر بلایا ہے۔''

''کل شام عروسہ آئی تھی۔ اُس نے مجھ سے بھی ڈنر کے لئے کہا تھا۔ صبح میں تم سے یہی کہنے والی تھی۔ لیکن تم تو......'' مریم نے بات ادھوری چھوڑی۔ نورالہدیٰ صبح کی بات کو یاد کر کے مسکرائے۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولے۔

''ڈنر کے لئے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ لوگ شادی کی بات بھی ضرور کریں گے۔''

''بالکل!'' مریم نے تائید کی۔ ''اب آپ دونوں طے کریں کہ اس بات کا جواب کیا دیا جائے؟''

نورالہدیٰ سے پہلے ہی بابا جان ٹوک کر بولے۔ ''ہم دونوں یہ بات کیسے طے کر سکتے ہیں؟ یہ تو تانیہ فیصلہ کرے گی کہ اُسے انصر سے شادی کرنی بھی ہے یا نہیں۔''

تانیہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اسے بابا جان کے الفاظ پر کبھی بھی حیرت نہیں ہوتی اگر وہ ملیحہ کی ڈائری نہ پڑھ چکی ہوتی۔ مگر اب وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''بولو تانیہ! تم کیا چاہتی ہو؟'' نورالہدیٰ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''میں کیا چاہتی ہوں؟'' وہ ان کے الفاظ پر کھوسی گئی۔ ''بھلا میں کیا چاہ سکتی ہوں؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''پھر بھی بیٹا! تم نے کچھ تو سوچا ہو گا۔'' وہ اصرار کر رہے تھے۔

تانیہ چپ سی ہو گئی۔ بابا جان نے بھی اسے چپ دیکھ کر ٹوکا۔ ''بولو تانیہ!......جواب دو۔''

''اب وہ کیا جواب دے گی؟ آپ نے کیا سنا نہیں، خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔'' مریم اس کی خاموشی کو اس کا اقرار سمجھ کر مطمئن سی ہو کر بولیں تو بابا جان کی روح تک کسی خیال سے کانپ گئی تھی۔

''خاموشی صرف رضامندی نہیں ہوتی مریم! کبھی کبھی خاموشی جبراً بھی ہوتی ہے۔'' اپنے ساتھ لگا کر تانیہ کی پیشانی چومتے انہوں نے مزید کہا۔

''تانیہ جواب دے گی اور اپنی زندگی کا فیصلہ وہ اپنے الفاظ میں کرے گی۔ اس کی واضح رضامندی کے بغیر تم عروسہ یا تیمور سے کوئی بات مت کرنا۔ بڑوں کے فیصلے، بچوں کی زندگی سے بڑے نہیں ہوتے۔'' وہ

تلخیت سے بولنے تانیہ کے لئے نا قابل برداشت ہو رہے تھے۔ تانیہ نے ہمیشہ اپنے لئے انہیں پُرشفقت پایا تھا۔ مگر اب وہ جانتی تھی کہ خود اپنی بیٹی کے لئے ان کے دل میں کوئی نرمی نہیں تھی۔

'آخر میں ان کی لگتی ہی کیا ہوں؟' اس نے سوچا۔ 'صرف بھتیجے کی بیٹی؟...... اور میری خاموشی کا بھی کتنا خیال ہے۔ لیکن وہ جوان کی بیٹی تھی، ان کے پیروں پر سر رکھ کر روتے ہوئے فریاد کرتی رہی اور ان کا دل نہیں پسیجا۔ کیا دوغلا معیار ہے۔'

کوفت زدہ انداز میں سوچتے ہوئے وہ ان سے الگ ہو کر دور ہو بیٹھی۔ اسے ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ ملیحہ کے حق پر قبضہ جما کر بیٹھی ہے۔ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات تو قابو میں رکھے مگر آنکھوں سے ناگواری جھلک رہی تھی۔ کسی اور نے تو اس کی بیزاری کو محسوس نہیں کیا تھا مگر نورالہدیٰ نہ صرف محسوس کر چکے تھے بلکہ حیران بھی تھے۔ تانیہ کو تو بابا جان کے ساتھ بیٹھنا بھی دوبھر لگ رہا تھا۔ وہ اُٹھی اور اپنے کمرے میں جانے لگی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں اسپارک ہوا تھا۔ وہ رُکی اور مڑتے ہوئے نورالہدیٰ کو دیکھنے لگی۔

آج اسے سمجھ آ گیا تھا کہ کیوں بابا جان کی تانیہ کے لئے محبت نورالہدیٰ کے لئے نا قابل برداشت تھی۔

'میں جان گئی ہوں بابا! آپ ملیحہ کو نہیں بھلا سکے۔ آپ آج بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ آج بھی اس کی تکلیف آپ کو بے چین کئے ہوئے ہے۔' صبح اس خیال نے اسے افسردہ کر دیا تھا کہ نورالہدیٰ کو ملیحہ یاد نہیں۔ اور اب اس تصور نے اسے بے چین کر دیا کہ نورالہدیٰ، ملیحہ کو نہیں بھولے تھے۔

'ادھوری محبت کی یاد کس قدر درد دیتی ہے، یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے؟' اس نے کرب سے سوچا تھا۔

❀❀❀

شایان اپنے فادر کی وجہ سے آج کل کراچی میں ہی تھا اور تانیہ اُسے نظر انداز کر رہی تھی۔ اسی لئے وہ دوبارہ وجدان مصطفیٰ کی عیادت کے لئے ہسپتال نہیں گئی۔ لیکن وہ فائزہ سے اُن کی خیریت دریافت کرتی رہتی تھی۔ پھر فائزہ سے ہی اسے پتہ چلا کہ وجدان اب گھر جا چکے ہیں۔ انہیں میجر اٹیک ہوا تھا۔ تانیہ نے سوچا، وہ کچھ دن مزید ریسٹ کر لیں تو ان سے ملنے چلی جائے گی۔ ان کے ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے دو ہفتے بعد شام میں تانیہ ان سے ملنے ان کے گھر جا پہنچی۔ ڈائری میں جو ایڈریس وجدان کے گھر کا لکھا تھا، وہ پی ای سی ایچ ایس کالونی کے کسی بنگلے کا تھا۔ جبکہ تانیہ اس وقت گلشن اقبال میں تھی۔ پہلے تو تانیہ نے بھی ان دو الگ پتوں والی بات کو محسوس کیا تھا۔ پھر اس نے سوچا، ایک بار جا کر معلوم کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔

گاڑی گیٹ کے باہر پارک کر کے اس نے سرمئی گیٹ والے بنگلے کی بیل بجا دی۔ واچ مین نے چھوٹا دروازہ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا اور پوچھا۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''میں شایان کی دوست ہوں۔ کیا وہ گھر پر ہے؟''

''جی نہیں۔''

'گڈ۔' تانیہ نے دل میں کہا۔

''وجدان مصطفیٰ تو ہوں گے؟''

''جی۔ وہ تو ہیں۔''

''تو پھر ان سے جا کر کہو، میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

وہ جی اچھا کہہ کر چلا گیا تو تانیہ سوچنے لگی۔ 'یہاں تک تو آ گئی ہوں، لیکن یہ کیسے پہچانوں گی کہ یہ وجدان مصطفیٰ وہی وجدان مصطفیٰ ہیں یا نہیں؟..... خیر، دیکھا جائے گا۔' اس نے سر جھٹک کر واچ مین کو دیکھا جو اسے اندر آنے کو کہہ رہا تھا۔

تانیہ گیٹ سے اندر آئی اور پھر ملازم نما کسی لڑکے کی رہنمائی میں لان کے بیچ بنی روش پر چلتی گھر کے اندر

پہنچ گئی۔ اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا تکلف نہیں کیا گیا بلکہ ملازم اسے لاؤنج میں لے آیا۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی تانیہ کی نظر سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ پر گئی تھی۔ وہ سیدھی اس پینٹنگ کی طرف آ گئی۔ خشک زمین، بنجر درخت، آگ اُگلتا سورج اور وہ درویش منش۔ خوشی سے بے قابو ہوتی تانیہ نے کیپشن پڑھا۔ ''عشق آتش۔''

'یہ وہی پینٹنگ ہے...... اوہ میرے خدا! اس کا مطلب ہے، میرا اندازہ ٹھیک تھا۔'

ملازم اُسے چھوڑ کر جا چکا تھا اور وہ بچوں کی طرح خوش ہوتی لاؤنج کے صوفے پر آ بیٹھی۔ لیکن اسے فوراً ہی اُٹھ جانا پڑا۔ پینٹنگ دیکھنے کے چکر میں اس نے اور کسی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ مگر اب اس کی نظر لاؤنج کی دیوار پر ہی لگی تصویر پر پڑی تھی۔ وہ چونکتی ہوئی دیوار کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے جیسے یقین کرنے کے لئے فریم کے شیشوں کو انگلیوں سے چھوا تھا۔ 'یہ سو فیصد ملیحہ فاروقی کی تصویر ہے۔' اس نے کہتے ہوئے غور سے اس تصویر کو دیکھا۔ کالی ساڑھی میں ملبوس ملیحہ ایک ہاتھ کھلے بالوں میں اُلجھائے بے نیازی سے سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

'اوہ...... تو وجدان مصطفیٰ نے آخر آپ سے وہ سب کروا ہی لیا جو آپ کبھی کرنا نہیں چاہتی تھیں۔' اُس نے دل میں کہا۔

''السلام علیکم!'' بھاری مگر پُرکشش مردانہ آواز پر تانیہ نے گھوم کر دیکھا۔

اچھی خاصی ڈسٹرکٹ پرسنالٹی تھی۔ سیاہ بالوں میں سفیدی نے گھل کر ان کا رنگ سرمئی کر دیا تھا۔ سیاہ آنکھوں کی چمک، جس نے کبھی ملیحہ کی آنکھوں کو خیرہ کیا تھا، اب بجھ چکی تھیں۔ مگر ان کی کشش تانیہ نے اتنے فاصلے کے باوجود محسوس کی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے آرام دہ شلوار قمیض میں ان کے دراز سراپے کی وجاہت کم تو ہوئی تھی لیکن ابھی تک ڈھلی نہیں تھی۔

'ملیحہ نے اگر ان کی خاطر سب کچھ تیاگ دیا تو اس کی کوئی غلطی نہیں۔ یہ آج بھی اس قابل ہیں کہ ان کی خاطر تخت و تاج چھوڑ دیئے جائیں۔ تو جوانی میں تو عالم ہی کچھ اور ہو گا۔' وہ انہیں دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

وجدان اس کی محویت کو محسوس کر کے ہلکا سا مسکرائے اور کہا۔

''بیٹا! اگر تمہارا تھیسس مکمل ہو چکا ہو تو بیٹھ جاؤ۔''

'آواز واقعی پُرکشش ہے۔' وہ وجدان کی بات پر شرمندہ ہوتے ہوئے بھی سوچنے سے باز نہیں آئی۔

وہ صوفے پر بیٹھ چکی تو وجدان بھی اس کے مقابل بیٹھ گئے۔

''سوری انکل!'' اس نے بات شروع کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اصل میں، میں حیران ہو رہی تھی، آپ میں اور شایان میں ذرا بھی مماثلت نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ بھی آپ کی ہی طرح بلیک ہے۔ مگر وہ آپ سے کافی الگ دِکھتا ہے۔''

وہ مسکرائے اور پوچھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''تانیہ۔'' اس نے جان بوجھ کر اپنے نام کا دوسرا حصہ نہیں بتایا۔
''تانیہ بیٹے! چہروں میں شباہت تلاش کرنا تو بس نظروں کا ایک مشغلہ ہی ہے۔ اب دیکھو! تم میں تو کوئی شباہت نہیں۔ پھر بھی تمہیں دیکھ کر کوئی یاد آ گیا تھا۔''
''ملیحہ فاروقی؟'' اس کا انداز جتاتا ہوا تھا۔ وجدان بھی محسوس کیے بنا نہ رہ سکے۔
''کیا کہا؟''
''ملیحہ فاروقی؟'' اس بار اس کا انداز نارمل ہی تھا۔ ''یہ ملیحہ فاروقی ہیں نا؟'' اس نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''شایان کی مدر اور آپ کی مسز۔''
''ہاں۔ یہ ملیحہ ہی ہیں۔'' انہوں نے آہستہ آواز میں کہا۔ ''مگر تم نے کیسے پہچانا؟''
''میں نے شایان کے پاس ان کی تصویر دیکھی تھی۔'' اب وہ اطمینان سے جھوٹ بول رہی تھی۔
''تم شایان سے ملنے آئی ہو گی؟''
''ایکچولی تو میں آپ سے ہی ملنے آئی تھی۔ سوچا آپ کی طبیعت کے ساتھ آپ کے دل کا حال بھی معلوم کر لوں۔''
''دل کا حال کیا بتاؤں؟...... زمانے بیت گئے۔ اب تو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ سینے میں دل ہے بھی یا نہیں۔'' وہ بہت لائٹ سے انداز میں بات کر رہے تھے۔ مگر تانیہ کو ان کے ہر انداز میں غیر معمولی پن محسوس ہو رہا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک ٹھہراؤ سا تھا۔ بالکل ایسا، جیسے طوفان گزر جانے کے بعد ساحل بہت خاموش، بہت شانت لگنے لگتا ہے۔
ملازم ٹی ٹرالی گھسیٹتا ہوا اندر آیا تھا۔ وجدان نے ٹرالی اپنے سامنے رکوا کر ملازم کو جانے کا اشارہ کیا اور خود چائے بنانے کے لئے پیالیاں سیدھی کرنے لگے۔
''چائے میں بناؤں گی انکل!'' تانیہ نے کہا اور اٹھ کر ان کے پاس سنگل صوفے پر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔ وجدان خاموشی سے اسے چائے بناتے دیکھنے لگے۔ چائے بنا کر تانیہ نے ایک کپ ان کو تھمایا اور دوسرا اپنے ہاتھ میں لے کر صوفے پر پیچھے ہو کر بیٹھتی گھونٹ بھر کر بولی۔
''آنٹی بھی کیا شایان کے ساتھ گئی ہیں؟...... مجھے آئے کافی دیر ہو چکی ہے مگر وہ نظر نہیں آ رہیں۔''
''شایان نے تمہیں بتایا نہیں؟'' ان کے استفسار پر حیران ہوتی تانیہ نے کہا۔
''کیا نہیں بتایا؟''
وجدان ایک پل کو رکے، پھر اسے دیکھ کر بولے۔ ''ملیحہ کا انتقال ہو چکا ہے۔''
''کیا......؟'' ایک دم اس کے منہ سے نکلا تھا۔ حیرت کے شدید جھٹکے سے چائے کپ سے چھلک کر اس کے کپڑوں پر گر گئی تھی۔ اس نے فوراً کپ سائیڈ میں رکھا اور کپڑے جھاڑنے لگی۔ وجدان نے کچھ ٹشو پیپر

نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''ان سے صاف کرلو۔''

تانیہ نے ٹشو پیپر پکڑ تو لئے مگر کپڑے صاف کرنے کا اسے ہوش ہی نہیں رہا۔

'یہ کیا ہو گیا؟......وہ کیوں مر گئی؟......میں تو اس سے ملنے کی خواہش میں یہاں تک آئی تھی۔ ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا' وہ سکتے کے عالم میں تھی جیسے کسی بے حد عزیز ہستی کی موت کی خبر ملی ہو۔ تانیہ کو خود بھی یہ محسوس کر کے حیرت ہوئی کہ اسے اس خبر پر صدمہ ہوا تھا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دبائے رکھا تھا ورنہ شاید وہ رو ہی پڑتی۔ اسے خود بھی نہیں پتہ تھا کہ ملیحہ اس کے اتنے قریب آ چکی تھی۔ اس کا دھواں دھواں سا چہرہ دیکھ کر وجدان فکرمند سے ہو گئے تھے۔

''کنٹرول یور سیلف بیٹا!'' انہوں نے کہا اور اٹھ کر اس کے پاس آ گئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ریلیکس کرنے لگے۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا، تم اتنی حساس ہو۔'' وہ نرمی سے اس کا سر تھپک رہے تھے۔ تانیہ نے بھی خود کو ریلیکس کرنے کے لئے گہرے گہرے سانس لئے پھر وجدان کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''بیٹھ جائیے انکل! میں اب ٹھیک ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

بیٹھنے کے بجائے وجدان نے ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا۔ تانیہ نے گلاس تو تھام لیا مگر ہونٹوں تک لے جانے کی زحمت نہیں کی۔ وجدان واپس اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تھے۔ تانیہ نے پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور کہا۔

''آئی ایم سوری انکل! میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔''

''پریشان تو کیا ہے تم نے۔ پر اس میں سوری کہنے والی کیا بات ہے؟''

''بات تو ہے۔ انجانے میں ہی سہی، پر میں نے آپ کو آپ کا دکھ یاد دلا دیا۔''

''دکھ اور زندگی کا ساتھ بہت گہرا ہے تانیہ! جتنا بھی بچ کر چلو، یہ سامنے آ ہی جاتے ہیں۔ بھلا انہیں کوئی بھول کیسے سکتا ہے؟'' تانیہ نے دیکھا وہ ہاتھ پھیلا کر جانے اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں کیا ڈھونڈنے لگے تھے۔

''انکل!'' اس نے وجدان کو پکارا۔ وجدان نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ملیحہ آنٹی کی ڈیتھ کو کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟''

''ستائیس سال۔'' اپنے ہاتھ کو سمیٹ کر مٹھی بناتے اپنے ماتھے سے ٹکا کر بولتے ہوئے وہ ایک پل کو بے چین ہوئے تھے۔

'ستائیس سال گزر گئے' تانیہ نے دل میں کہا۔ پھر زبان سے بولی۔

''شایان تو اس وقت بہت چھوٹا ہو گا۔''

''ہوں۔'' وہ اپنے آپ سے چونکے پھر اس کے لفظوں پر دھیان دے کر کہا۔ ''شایان کی پیدائش اور ملیحہ کی

وفات ایک ہی دن ہوئی تھی۔'' تانیہ کو سچ مچ اپنے سامنے بیٹھے شخص پر ترس آنے لگا تھا۔

''انکل! اب میں چلتی ہوں۔'' وہ گلاس رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ آئی تو انکشافات سننے کے لئے تھی پر جو انکشاف سنا تھا، اس نے تانیہ کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وجدان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسے باہر تک چھوڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں باہر نکلے ہی تھے کہ ایک گاڑی پورچ میں آ کر رُکی اور شایان ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اُترتا حیرت سے بولا۔

''تانیہ! تم کب آئیں؟''

''کافی دیر ہو گئی۔ مگر اب چلوں گی۔ اللہ حافظ!'' وہ کہیں روک نہ لے، اس خیال سے جلدی سے بول کر وہ تیزی سے چلتی گیٹ سے باہر آ گئی اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ کسی طرف دیکھے بنا سیدھی نکل گئی۔

شایان گاڑی کا دراوزہ کھولے ابھی تک گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وجدان بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ پاس آ کر انہوں نے شایان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کیا۔

''کیا بات ہے برخوردار؟''

شایان نے چونک کر انہیں دیکھا اور یوں ہی ہنس دیا۔ پھر پوچھنے لگا۔

''آپ کو تانیہ کیسی لگی؟''

''ہوں!'' وہ سوچنے لگے۔ ''اچھی ہے۔ مگر کچھ جذباتی سی ہے۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے؟ کون سا میرا بیٹا جذباتیت میں کسی سے پیچھے ہے۔''

''ابو!'' ان کے ہنسنے پر جزبز ہوتے ہوئے اس نے کار کا دروازہ بند کیا پھر وجدان کے شانوں پر بازو پھیلائے اندر آ گیا۔ انہیں ان کے بیڈ روم میں چھوڑ کر وہ چینج کرنے کے لئے اپنے روم میں جانے لگا تو وجدان نے اسے روکا۔

''میرے پاس آ کر بیٹھو۔''

وہ نزدیک ہی کارپٹ پر بیٹھ گیا اور سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ کچھ دیر تک وجدان کچھ بولے بنا ہی اس کے بال سہلاتے رہے، پھر اسے مخاطب کر کے کہا۔

''شایان! مجھے واقعی لگتا ہے، تمہیں اب شادی کر لینی چاہیے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' اس نے وجدان کی گود سے سر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو کوئی لڑکی بھی پسند کی ہے یا یہ کام مجھے کرنا ہو گا؟''

''لڑکی تو پسند کی ہے ابو!''

''اور وہ لڑکی کون ہے؟'' بول کر وجدان اس کے منہ سے تانیہ کا نام سننے کا انتظار کرنے لگے۔ شایان ان کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''ابو! میں فائزہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں'' شایان نے کہا اور خاموشی سے کمرے سے باہر آ گیا۔ وجدان اسے جاتا ہوا دیکھنے لگے۔

❀❀❀

سب گھر والے لان میں تھے۔ تانیہ نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور خود بھی اس طرف آ گئی جہاں نورالہدیٰ کے سوا سب موجود تھے۔ وہ بیٹھ چکی تو مریم نے پوچھا۔

''چائے منگواؤں تمہارے لئے؟''

''رہنے دیں ماما! موڈ نہیں ہے۔'' اس نے تھکے تھکے سے انداز میں منع کر دیا اور بابا جان کو دیکھنے لگی۔

'کیا کروں؟..... کیا دادا جان کو بتا دوں کہ جس بیٹی کو سزا دینے کے لئے برسوں سے اس کا نام ان کی زبان پر نہیں آیا، وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ جسے محبت کرنے کے جرم میں گھر سے نکالا تھا، وہ ان کے دل سے تو نہ نکل پائی پر دنیا چھوڑ گئی۔ لیکن کیا واقعی یہ نہیں جانتے کہ ان کی بیٹی مر چکی ہے؟' اس نے سوچا۔

'ہاں، یہ نہیں جانتے ہوں گے۔ اگر جانتے تو ملیحہ کی سزا ختم ہو چکی ہوتی۔ قصرِ فاروقی میں اس کے نام کی فاتحہ پڑھی جاتی۔ اور ملیحہ کی ڈائری کو سینے سے لگانے کے بجائے دادا جان، ملیحہ کی زندہ نشانی شایان کو سینے سے لگا لیتے۔ پر یہ کیسی انا ہے کہ بیٹی کی ڈائری کو سینے سے لگا کر اس کی تصویر کو گھنٹوں دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اسے یاد تو کر سکتے ہیں پر اس کی خبر نہیں لے سکتے۔ ستائیس سال میں ایک بار پلٹ کر نہیں دیکھا کہ وہ زندہ ہے کہ مر چکی۔ اور پاپا......' اس کے دل میں ٹیس اُٹھی۔ 'پاپا سے کیسے کہوں گی کہ جس کی محبت کا بوجھ قرض کی طرح اٹھا رکھا ہے، وہ تو اپنا فرض بھی نہیں نبھا سکی۔ وجدان کی خاطر سب کچھ چھوڑنے والی آخر اسے بھی چھوڑ گئی اور اپنے بیٹے کو بھی۔' اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ چینج کرنے کا کہہ کر اُٹھی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

❀❀❀

فائزہ ابھی آفس سے آئی تھی اور آتے ہی بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ سستی سے لیٹی وہ سوچ رہی تھی کہ اُٹھ کر چینج کر لے۔ پر تھکن ایسی تھی کہ اُٹھنا مشکل لگ رہا تھا۔ تبھی ہارن کی آواز سنائی دی۔ فائزہ اس ہارن کو پہچانتی تھی۔ وہ چھلانگ لگا کر بستر سے اُٹھی اور کھڑکی سے نیچے پورچ میں جھانک کر دیکھا، پھر زور سے چلّائی۔

''وجدان انکل۔''

گاڑی سے اُترتے وجدان نے آواز کی سمت دیکھا تو فائزہ نے ہاتھ ہلایا اور پہلے سے بھی زیادہ اونچی آواز میں بولی۔

''میں نیچے آ رہی ہوں۔'' پھر چپل پہنے بغیر ہی بھاگتی باہر آ گئی۔

''کیا ہو رہا ہے بھئی؟'' وجدان اس کی تیز رفتاری پر بولے۔ وہ ان کے شانے سے لگ گئی۔

''ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد آپ پہلی بار گھر آئے ہیں۔ میں نے سوچا، سب سے پہلے میں آپ کو ویلکم کروں۔ لیکن آپ خود ڈرائیو کر کے آئے ہیں؟ شایان کدھر ہے؟ اسے احساس نہیں ہے کہ ابھی آپ کو ڈرائیونگ نہیں کرنی چاہیئے۔'' وہ لڑاکا عورتوں کی طرح دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بول رہی تھی۔ وجدان اُس کے اس اسٹائل پر مسکرا کر کہنے لگے۔

''شایان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ صبح سکھر جا چکا ہے؟''

''کیا؟'' وہ صدمے سے چلائی۔ ''وہ بتائے بغیر چلا گیا؟...... آ لینے دیں۔ ایسی خبر لوں گی کہ یاد رکھے گا۔ سچ میں بہت ماروں گی۔ اور آپ بیچ میں نہیں بولیں گے۔''

''بالکل نہیں بولوں گا۔'' وہ اسے دلچسپی سے دیکھ کر کہہ رہے تھے۔ ''اندر چلیں؟''

''اوہو۔'' اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ''میں تو بھول ہی گئی۔ آیئے انکل! اندر آجایئے۔''

وہ فائزہ کے ساتھ اندر آئے اور سیدھے اس کی نانی کے رُوم میں چلے آئے۔

وجدان کو دیکھ کر بستر پر لیٹی بزرگ خاتون اُٹھنے لگیں تو وجدان نے آگے بڑھ کر اُنہیں سہارا دیتے ہوئے تکیہ اونچا کر کے آرام سے بٹھا دیا۔

''خالہ! آپ بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتیں۔'' وجدان خفا ہو رہے تھے۔ وہ پلکیں جھپکاتیں کمزور سی آواز میں بولیں۔

''ہمارا کیا پوچھتے ہو بیٹا! ہماری تو اب عمر ہو چلی ہے۔ پر تم کیا اپنے دل کو روگ لگا بیٹھے ہو؟''

''روگ تو پرانا ہے خالہ! رنگ اب دکھا رہا ہے۔ اور عمر تو میری بھی ڈھل چکی ہے۔ اب اور کتنا جیوں گا! ستائیس سال گزار لئے۔ اب اور جیا بھی نہیں جاتا۔'' وجدان کی آنکھوں میں نمی جھلکی تھی جسے پلکیں جھپک کر وجدان نے ہمیشہ کی طرح اپنے اندر اُتار لیا۔

''دل جلانے کی باتیں نہ کرو وجدان!'' وہ دہل گئیں۔ ''آج تک ملیحہ کا زخم تازہ ہے۔ گود کھلائی بچی کیسی بھری عمر میں قبر کی ہوگئی۔ ہم تو ہاتھ ملتے رہ گئے۔'' ان کی بوڑھی آنکھیں چھلک پڑیں تو وجدان نے ان کے گرد بازو لپیٹ کر اپنے ساتھ سمیٹ لیا۔

فائزہ کے پاپا، وجدان کے آنے کا سن کر کمرے میں آئے تھے۔ آگے کا منظر دیکھ کر دروازے میں ہی رُک گئے۔ کونے میں چپ چاپ کھڑی فائزہ نے انہیں دیکھا تو آہستہ سے بتایا۔

''نانی اماں، ملیحہ آنٹی کو یاد کر کے رو رہی ہیں۔''

انہوں نے ہونٹ بھینچ لئے اور وجدان کی طرف دیکھا جنہوں نے اسی پل نظریں اٹھائی تھیں۔ ان آنکھوں میں قیامت کے آثار تھے۔ وجدان دھیرے سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ فائزہ چلتی ہوئی بیڈ پر آ بیٹھی اور انہیں چپ کراتے ہوئے گھونٹ گھونٹ پانی ان کے حلق میں اُتارنے لگی۔ اس کے پاپا اس کے برابر بیڈ پر بیٹھے اور

نرمی سے اس کی نانی کو مخاطب کر کے بولے۔
"وجدان کا خیال تو کر لیا کریں تائی جان! مہینہ بھر پہلے ہی تو اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ پھر ذرا سوچئے، ہمارا آج بھی یہ حال ہے تو اس کا کیا ہوگا؟ ملیحہ کا سب سے نازک رشتہ تو اسی سے تھا۔"
"اس لئے تو وجدان کو دیکھ کر وہ اور بھی یاد آ جاتی ہے۔ اتنی معصوم بچی کیسے کیسے عذابوں سے گزاری گئی۔"
اب وہ ان سے کیا کہتے۔ ان کا ہاتھ تھپک کر وہ فائزہ سے بولے۔ "انہیں دوا دے کر سلا دو۔" اور خود اُٹھ کر باہر آ گئے۔ وجدان انہیں دالان میں ہی مل گئے تھے۔ ستون سے کمر لگا کر کھڑے وہ خالی آنکھوں سے سامنے بچھے تخت کو دیکھ رہے تھے۔ اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس کر کے وہ چونکے اور مڑ کر دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا۔
"آؤ آفاق!....." پھر قصداً مسکرا کر بولے۔ "خالہ ٹھیک ہیں۔"
"تم ٹھیک ہو؟" آفاق ان کا چہرہ دیکھ کر بولے تو انہوں نے نظریں چرا کر آہستہ سے کہا۔
"اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔" پھر سر جھٹک کر خود کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔ "آفاق یار! تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"
"ہاں کہو۔" وہ بولے۔
"یہاں نہیں۔ کمرے میں چلتے ہیں۔ اور تم سمیرا بھابی کو وہیں لے آؤ۔"
"ایسی کیا بات ہے؟"
"بتا دوں گا۔ پہلے کمرے میں تو چلو۔" وجدان نے کہا تو آفاق انہیں اپنے رُوم میں لے آئے اور آتے ہوئے سمیرا کو بھی کمرے میں آنے کا کہہ دیا۔
سمیرا کمرے میں آئیں تو وہ دونوں صوفوں پر بیٹھے تھے۔ ان پر نظر ڈال کر وہ بھی وہیں آ کر آفاق کے ساتھ بیٹھ گئیں۔
"ہاں اب بولو۔" آفاق، وجدان سے بولے۔
وجدان نے ایک نظر ان کے چہروں کو دیکھا اور پھر کہنے لگے۔
"بات یوں تو بہت سیدھی سی ہے۔ شایان جوان ہو چکا ہے اور مجھے لگتا ہے، اب اسے شادی کر لینی چاہئے۔ ویسے عام طور پر ماؤں کو بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے کا شوق ہوتا ہے۔ پر شایان کی ماں تو ہے نہیں، اس لئے یہ کام بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔"
"شکر ہے وجدان! تمہیں خیال تو آیا۔" سمیرا ہنس کر بولیں۔ "تم بتاؤ کوئی لڑکی دیکھی ہے یا میں کچھ مدد کروں؟"
"ایک لڑکی نظر میں تو ہے۔"

''کون ہے؟'' سمیرا کے پوچھنے پر وہ کچھ توقف کے بعد جھجکتے ہوئے بولے۔
''فائزہ۔''
دونوں میاں بیوی نے فوراً ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر فوری طور پر کچھ بول نہیں پائے۔
''تم یہ مت سمجھنا آفاق! کہ میں تم سے فائزہ کا رشتہ مانگ رہا ہوں۔ میں بس تم سے مشورہ مانگ رہا ہوں کہ اتنی بڑی بات مجھے اپنی زبان پر لانی بھی چاہئے یا نہیں۔ وہ تو شایان نے ہی فائزہ کا نام لے لیا، ورنہ میں تو فائزہ کو اپنی بہو بنانے کے بارے میں کبھی سوچتا بھی نہیں۔''
آفاق حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل چکے تھے، انہیں دیکھ کر بولے۔ ''کیوں وجدان! میری بیٹی میں کوئی کمی ہے؟''
وجدان کے ساتھ سمیرا نے بھی چونک کر انہیں دیکھا۔ وجدان نے کہا۔
''میرا یہ مطلب نہیں تھا آفاق! فائزہ ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ مگر شایان کو فائزہ کے حوالے سے قبول کرنا شاید تمہارے لئے مشکل ہو۔''
''شایان تمہارا اور ملیحہ کا بیٹا ہے، اس حوالے کے بعد انکار کی کوئی گنجائش نہیں بچتی۔ مگر فائزہ سے پوچھنا ہو گا۔ اگر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوا تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''
وجدان نے ممنونیت سے انہیں دیکھ کر کہا۔ ''تم نے مجھے میرے بیٹے کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ بلکہ میری زندگی میں وہ کون سا مقام ہے، جہاں تم نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ یاد نہیں آتا آفاق! میں نے وہ کون سی نیکی کی تھی جو اللہ نے مجھے تم جیسا دوست دیا ہے۔''
''میں نے کبھی تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ بس دوستی نبھائی ہے۔ اور اب ایک لفظ اور مت کہنا۔'' آفاق نے انہیں ڈپٹ کر کہا تو وہ ہلکا سا مسکرا دیئے۔
فائزہ کو جب اس پرپوزل کے بارے میں پتہ چلا اور ساتھ ہی سمیرا نے یہ بھی بتایا کہ شایان نے خود اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی ہے تو وہ چپ سی ہوگئی۔ ان کے پوچھنے پر بس اتنا ہی کہا۔
''میں سوچ کر بتاؤں گی۔''
شایان کے لئے فائزہ کی خاموشی حیران کن تھی۔ جب سے وجدان نے فون پر اسے بتایا تھا کہ وہ آفاق اور سمیرا سے رشتے کی بات کر چکے ہیں، اسے فائزہ کی طرف سے کسی دھماکے کا انتظار تھا۔ مگر وہاں بدستور خاموشی تھی۔ حالات کا جائزہ لینے کے لئے اس نے سمیرا سے بھی فون پر بات کی تھی۔ پر انہوں نے پرپوزل کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی۔ اور براہِ راست فائزہ سے بات کرنے کی اسے ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اسے پتہ تھا، وہ اس پر چڑھائی کر دے گی۔

❁❁❁

ڈی آئی جی آفس میں اُسے میٹنگ کے لئے کال کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی میٹنگ کے بعد وہ اپنے آفس میں آیا اور سیٹ پر بیٹھ کر اپنا موبائل آن کیا، جو اس نے میٹنگ کے دوران بند کر رکھا تھا۔

فائزہ کی طرف سے 14 مس کال الرٹ تھے۔ وہ اپنی سیٹ پر ریلیکس ہو کر بیٹھا تھا، چونک کر سیدھا ہوتے دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ آخر فائزہ نے اتنی بار اسے کال کرنے کی کوشش کیوں کی ہو گی۔

پھر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو موبائل پر اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پہلی ہی بیل پر اس کی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ شایان کے ہیلو بولنے سے پہلے ہی فائزہ کی تیز مگر رندھی ہوئی آواز فون پر سنائی دی۔

''شایان! تم فوراً کراچی آ جاؤ۔''

''کیوں، کیا ہوا؟'' وہ پریشان ہو کر بولا۔

''بس تم گھر آ جاؤ شایان!...... جتنی جلدی ہو سکے آ جاؤ۔'' اس کے مستقل رونے پر شایان کو اچانک ہی وجدان کا خیال آیا۔ اسی خیال سے خوف زدہ ہو کر وہ تیزی سے بولا۔

''فائزہ! ابو ٹھیک ہیں؟''

''ہاں۔'' اب کے وہ خود پر قابو پا کر بولی۔ ''انکل خیریت سے ہیں۔ مگر تانیہ....'' اتنا بول کر وہ رونے لگی۔

''تانیہ کو کیا ہوا؟''

''شایان! تانیہ نے خودکشی کر لی۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' اس کی آواز پھٹ پڑی۔

''اس کی حالت بہت خراب ہے شایان! اس نے اپنی دونوں کلائیاں کاٹ لی ہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں، اس کی حالت بہت سیریس ہے۔ وہ مر جائے گی شایان......! تانیہ مر جائے گی۔ بس تم فوراً آ جاؤ۔'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ لائن کٹ گئی۔ شایان کے حواس گم ہو چکے تھے۔

''اُس نے اپنی کلائیاں کاٹ لیں۔'' شایان کے کانوں میں فائزہ کی آواز اُبھری۔ اور اسے لگا، کوئی تیز دھار چیز اس کی شہ رگ پر پھر گئی ہو۔ ''اُس کی حالت بہت خراب ہے۔''

شایان کی خود کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔

''وہ مر جائے گی......تانیہ مر جائے گی۔''

''نہیں۔'' شایان کے اندر کوئی کچھ بلاسٹ ہوا تھا۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور آندھی طوفان کی رفتار سے باہر دوڑا۔

پولیس اسٹیشن میں موجود لوگوں نے حیرت سے اے ایس پی شایان مصطفیٰ کو دیوانوں کی طرح بھاگتے ہوئے دیکھا۔ کچھ نے اسے آوازیں بھی دیں مگر اس کی تیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جیپ میں بیٹھ کر اس نے

انجن اسٹارٹ کیا اور ایکسلریٹر کو پوری طرح دباتے ہوئے جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔
''سر جی!.....سر جی! کی آوازیں لگاتار اس کے پیچھے آرہی تھیں۔ سامنے سے آتا کانسٹیبل عین وقت پر چھلانگ لگا کر سائیڈ میں ہو گیا، ورنہ شایان کی جیپ اسے روندتے ہوئے گزر جاتی۔
شایان سے بات کرتے کرتے فائزہ نے بیچ میں خود ہی لائن ڈس کنکٹ کر دی اور اب وہ حساب لگا رہی تھی۔ سکھر سے کراچی تک کی ڈرائیو ڈھائی سے تین گھنٹے کی ہے۔ مگر شایان زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں کراچی پہنچ جائے گا۔ آدھا گھنٹہ مزید لگے گا گھر آنے میں۔ یعنی میرے پاس دو گھنٹے ایکسٹرا ہیں، اس کے بعد کام شروع ہو جائے گا۔'
پھر وہ آرام سے بیڈ پر اوندھی لیٹ کر میگزین پڑھنے لگی جو وہ شایان کا فون آنے سے پہلے پڑھ رہی تھی۔ جب دو گھنٹے گزر چکے تو وہ بیڈ سے اُٹھی اور نیچے کچن میں آگئی جہاں سمیرا رات کے کھانے کے لئے ملازم کو ہدایت دے رہی تھی۔
''ممی!'' اس نے بیچ میں انہیں مخاطب کیا۔ انداز ایسا تھا جیسے سخت فکر مند ہو۔
''کیا ہوا؟'' سمیرا اس کی آواز پر مڑیں، پھر اس کی شکل دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔
''ممی! ابھی وجدان انکل کا فون آیا ہے، ان کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ کہہ رہے تھے سینے میں درد ہے۔ آپ پلیز جلدی جا کر معلوم کریں۔ کہیں ان کی حالت زیادہ خراب تو نہیں۔''
''اچانک کیا ہو گیا اسے؟ ابھی کل تو آفاق اسے اپنے ساتھ چیک اپ کے لئے لے کر گئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، سب ٹھیک ہے۔'' وہ واقعی فکر مند ہو گئی تھیں۔
''ہارٹ پیشنٹ کا کیا پتہ، کبھی بھی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ ممی! پلیز آپ جائیے نا انکل کے پاس۔ مجھے بہت فکر ہو رہی ہے۔''
''ہاں جاتی ہوں۔ جواد سے کہو گاڑی نکالے۔'' وہ تیز تیز بولتی کچن سے باہر آکر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ فائزہ فوراً اپنے بھائی کے پاس آکر بولی۔
''اُٹھ جائیں جواد بھائی! ممی کہہ رہی ہیں، گاڑی نکالیں۔ انہیں وجدان انکل کے گھر جانا ہے۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔''
جواد جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟''
''انکل کا فون آیا تھا۔ مگر آپ دیر مت کریں۔ جلدی سے گاڑی نکالیں۔''
جواد سر ہلاتا فوراً اُٹھ کر اپنی چپلیں تلاش کرنے لگا اور کپڑے بدلے بنا ہی ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر، ٹی شرٹ میں گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ فائزہ، سمیرا کے کمرے میں آئی۔ وہ چادر اوڑھ کر تیار کھڑی تھیں۔
''جواد اُٹھ گیا؟'' فائزہ کو دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"بھائی گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اتنا سن کر ہی وہ باہر نکلیں۔ پیچھے آتی فائزہ معصومیت سے بولی۔

"ممی! میں بھی چلوں؟"

"نہیں۔" اس کی توقع کے مطابق انہوں نے منع کر دیا۔ "امی اکیلی ہو جائیں گی اور تمہاری چچی بھی میکے گئی ہوئی ہیں، ورنہ وہ سنبھالتیں۔ انہیں کھانا کھلا کر ٹائم سے دوا دے دینا۔ اور تم نے اپنے پاپا کو فون کیا ہے؟" چلتے چلتے رک کر انہوں نے پوچھا تو فائزہ گڑبڑا گئی۔

"پاپا کو فون کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت سے کیا مطلب؟" وہ خفا ہوئیں اور کوریڈور میں رکھا ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر آفاق کو فون ملا دیا۔

"آفاق! آپ فوراً وجدان کی طرف آ جائیں، اس کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ نہیں...... اس کا فون آیا تھا، فائزہ سے بات ہوئی...... ہاں، میں بھی جا رہی ہوں...... اچھا ٹھیک ہے۔"

فائزہ اپنا سر پکڑ کر کھڑی تھی۔ سمیرا نے آفاق سے بات کر کے فون رکھا تو اس نے فوراً انہیں پکڑ کر باہر دھکیلا کہ کہیں وہ کسی اور کو بھی فون نہ کر دیں۔ انہیں بھیج کر فائزہ نے تانیہ کا نمبر ملایا اور اس کے فون اُٹھانے کا انتظار کرنے لگی۔

"فائزہ! کیسی ہو؟" اس کا نمبر فلش ہوتا دیکھ کر تانیہ نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اچھا سنو! تم فوراً گھر آ جاؤ۔"

"کیوں، خیریت؟"

"ایک سرپرائز ہے۔"

"میں اس وقت پورچ میں ہی کھڑی ہوں۔ بس فریش ہو کر آ جاتی ہوں۔"

"فریش یہاں آ کر ہو جانا۔ دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس فوراً چلی آؤ۔"

"اچھا بابا! آ رہی ہوں۔" تانیہ نے کہا۔ وہ پورچ میں گاڑی روک کر دروازہ کھولے اس سے بات کر رہی تھی۔ فون بند کر کے وہ واپس گاڑی میں بیٹھی اور ریورس کر کے گیٹ سے باہر لے گئی۔

مریم لان میں ہی تھیں۔ اسے پورچ میں کھڑے فون پر بات کرتے دیکھ کر وہ اس طرف آئیں مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ گاڑی میں بیٹھ کر گیٹ سے باہر جا چکی تھی۔

جس وقت وہ فائزہ کے گھر پہنچی، رات کے نو بج رہے تھے۔ فائزہ گاڑی کی آواز پر باہر آ گئی۔ پھر تانیہ کو ساتھ لئے وہ اندر سٹنگ روم میں آ بیٹھی۔

"ہاں کہو، کیا سرپرائز ہے؟" تانیہ کاؤچ پر بیٹھنے کے بعد بولی۔

"شایان نے مجھے پرپوز کیا ہے۔" فائزہ نے بازو لپیٹ کر اسے دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ تانیہ کچھ

دیر تک بول نہیں پائی۔

''مبارک ہو'' جب کہا تو اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔

''اوشٹ اپ۔'' فائزہ ایک دم ہی پھٹ پڑی۔ ''یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم دونوں نے؟ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور تم اس سے محبت کرتی ہو، مگر شادی کسی اور سے کرو گے؟''

''شایان نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی۔'' وہ آزردہ سی ہو گئی۔

''رئیلی؟'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ تانیہ کو برا لگا۔

''ہاں۔ شایان نے کبھی نہیں کہا کہ اُسے مجھ سے محبت ہے۔''

''تم سے نہیں کہا ہو گا، مگر میرے سامنے اس نے سینکڑوں بار اعتراف کیا ہے کہ وہ تمہیں چاہتا ہے۔'' وہ تپ کر بولی۔ تانیہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اب وہ ٹہل ٹہل کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے زور زور سے بول رہی تھی۔

''اچھی بھلی لو اسٹوری ہے۔ مگر نہیں، ٹریجڈی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ نہ بنے کوئی اور ظالم سماج، یہ کام خود بھی تو کیا جا سکتا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لنگڑی لولی قسم کی مجبوریاں برآمد کر کے سوگ منایا جا رہا ہے۔''

''تم اتنا اُلجھ کیوں رہی ہو؟ اگر تمہیں کچھ شک ہے تو انکار کر دو۔''

''وہ تو میں کر ہی دوں گی۔ تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر تم اقرار کیوں نہیں کرتیں؟''

''جب شایان نے ہی کبھی کچھ نہیں کہا تو میں کیوں کہتی؟'' اسے بھی غصہ آ گیا۔

''فنٹاسٹک۔'' وہ اور بھی بھڑک گئی۔ ''محبت کرنے سے پہلے کیا اس کی اجازت لی تھی جواب تمہیں اس کی طرف سے گارنٹی چاہئے؟ کمال ہو گیا۔ اکیسویں صدی کی بولڈ لیڈی، محبت کے معاملے میں اٹھارہویں صدی کی دوشیزہ ثابت ہو رہی ہیں۔''

جیپ رکنے کی آواز سن کر وہ چپ ہوئی، پھر بولی۔

''آ گئے مجنوں صاحب لیلیٰ لیلیٰ پکارتے۔ آج تو آمنا سامنا ہو کر رہے گا۔ جتنی بار دل چاہے I love you کہلوا لینا۔''

''شایان آیا ہے؟'' تانیہ سٹپٹا گئی۔ فائزہ کے جواب سے پہلے ہی فل یونیفارم میں ملبوس وحشت زدہ چہرہ لئے شایان کھلے دروازے سے اندر چلا آیا۔ فائزہ سٹنگ روم کے طور پر استعمال ہونے والے ہال کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ جبکہ تانیہ ایک سائیڈ میں ہو کر کاؤچ پر بیٹھی تھی، اسی لئے شایان کی اس پر نظر نہ پڑ سکی۔ وہ سیدھا فائزہ کے پاس چلا آیا۔

''تانیہ کیسی ہے؟......کون سے ہسپتال میں لے کر گئے ہیں؟''

فائزہ چڑی ہوئی تو پہلے ہی تھی، بھڑک کر بولی۔

"مرگئی تانیہ۔" پھر شایان کے فق ہوتے چہرے کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس نے ایک انتہائی بات کہہ دی تھی تو فوراً ہی کہا۔ "ارے کچھ نہیں ہوا تانیہ کو۔ وہ دیکھو، ٹھیک ٹھاک بیٹھی ہے۔"

شایان نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا جس طرف فائزہ نے اشارہ کیا تھا اور پھر تیزی سے تانیہ کی طرف آیا۔ اس کے سامنے کارپٹ پر بیٹھ گیا اور بے تابی سے اس کی دونوں کلائیاں اپنے ہاتھوں میں تھام کر ٹٹولتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" پھر اس کی کلائیاں چھوڑ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر کے بولا۔ "یہ کیا حرکت تھی؟ کوئی ایسے بھی کرتا ہے؟" تانیہ نے کب شایان کے ایسے انداز دیکھے تھے، وہ تو اتنی بری طرح سے بوکھلا گئی کہ کچھ بولنے کا خیال تک نہیں آیا۔ یوں بھی وہ سارے ڈرامے سے لاعلم ہی تھی۔ بس ایک ٹک شایان کو دیکھتی رہی۔ فائزہ نے کہا۔

"تانیہ نے کوئی خودکشی نہیں کی۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔"

ذرا سا سر موڑ کر شایان نے فائزہ کو دیکھا۔ "جھوٹ بولا تھا؟......لیکن کیوں؟" اس کے اعصاب اس قدر ٹوٹے ہوئے تھے کہ اسے غصہ بھی نہیں آیا۔

"تمہیں یہاں بلانے کے لئے۔"

"صرف اس لئے تم نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بولا۔" اب اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی آنچ آنے لگی تھی۔ "تمہیں اندازہ بھی ہے، تمہارے جھوٹ نے میری کیا حالت کی ہوگی؟ تانیہ کو کچھ ہو گیا تو......اس سے آگے کا سوچ کر دل چاہ رہا تھا کہ جیپ سامنے سے آتے کسی ٹرک سے ٹکرا دوں۔ ہر سیکنڈ کے ساتھ لگ رہا تھا، روح جسم کا ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے۔ تانیہ نے خودکشی کر لی ہے۔ اتنی بڑی بات تم نے ایسے ہی بول دی۔ مذاق ہے یہ تمہارے لئے؟" آخر میں اس کی آواز دھاڑ کی مانند گونج گئی۔ تانیہ بھی ایک پل کو سہم سی گئی تھی، مگر فائزہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تیز ہو کر بولی۔

"چلو میرے لئے مذاق ہی سہی، مگر تمہیں کیا؟ تانیہ میری دوست ہے۔ تمہاری کیا لگتی ہے؟ کیوں جان نکل رہی تھی تمہاری؟ کیوں دیوانوں کی طرح دوڑے چلے آئے؟ تانیہ جیے یا مرے، تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے۔" وہ طیش میں آ کر بولا۔

"اچھا؟" فائزہ اس کا مذاق اُڑانے کے انداز میں ہنسی۔ "اب یہ بھی بتا دو کہ فرق کیوں پڑتا ہے؟" تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ فائزہ کے مقابل کھڑا وہ اسے گھورنے لگا تو فائزہ کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

"میں جانتی ہوں، تم کبھی نہیں بتاؤ گے۔"

شایان نظریں چراتا اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

"میں اکثر سوچتی ہوں پر سمجھ نہیں پاتی کہ کیا بزدل لوگ ہی محبت کرتے ہیں یا محبت کرنے والا ہر شخص

بزدل بن جاتا ہے؟'' اب وہ جان بوجھ کر اسے اُکسا رہی تھی۔ وار کارگر تھا۔ شایان بولا تو اس کے لہجے میں آگ سی تپش تھی۔

''میں بزدل نہیں ہوں۔''

''اچھا، تو ہمت والے ہو۔'' وہ بدستور اس کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ بچے کی طرح شایان کو پچکارتے ہوئے بولی۔ ''تو پھر بول کر دکھاؤ کہ تمہیں تانیہ سے محبت ہے۔ چلو شاباش! بولو۔ اب بولو بھی۔'' وہ دونوں اس پر جھگڑ رہے تھے اور تانیہ بس منہ اٹھائے تماشائیوں کی طرح ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ فائزہ کے الفاظ پر اس کی نگاہیں شایان کی طرف اُٹھ گئیں۔ شایان ایڑی پر گھومتا فائزہ کے سامنے آ گیا، پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھڑکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں تانیہ سے محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت کہ اس کی خاطر سو بار جان سے گزر جاؤں گا۔'' آنکھیں میچ کر سانس باہر چھوڑتی تانیہ نے آج جانا تھا، کبھی کبھی لفظ بھی زندگی بن جاتے ہیں۔ مگر اگلے لمحے لفظوں نے ہی اس کی روح کھینچ لی۔ ''مگر میں تانیہ سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''کیوں؟...... کیونکہ یہ نورالہدیٰ فاروقی کی بیٹی ہے؟'' تانیہ نے اپنے پاپا کے حوالے پر حیران ہو کر فائزہ کو دیکھا۔

''نہیں۔'' شایان نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ یہ اظہر فاروقی کی پوتی ہے۔''

فائزہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ''اگر یہ بات اتنی ہی اہم تھی تو محبت کرنے سے پہلے اس کا شجرۂ نسب معلوم کر لیا ہوتا۔'' پھر وہ تانیہ کی طرف مڑی۔ ''سنا تم نے۔ یہ وجہ تھی تم سے گریز کرنے کی۔ بلکہ تم کہاں جانتی ہو گی، میں بتاتی ہوں۔ تم ملیحہ فاروقی کو جانتی ہو۔ اظہر فاروقی کی اکلوتی بیٹی تھی وہ۔ اور تمہارے پاپا کی کزن۔ لیکن ان کا ایک اور تعارف بھی ہے۔ وہ شایان کی ماں تھیں۔ پتہ نہیں، تم جانتی بھی ہو یا نہیں، مگر ان کی اور وجدان انکل کی لو میرج تھی۔ اور اظہر فاروقی اس شادی کے خلاف تھے۔ جب وہ کسی طرح نہیں مانے تو آنٹی نے گھر چھوڑ دیا۔ اور بس کہانی ختم۔''

''نہیں فائزہ! کہانی تو اس موڑ سے شروع ہوئی تھی۔'' شایان نے دُکھی لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میری ماں کی زندگی کے اذیت بھرے لمحوں کی کہانی۔ وہ اپنے بابا جان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اور اُنہیں لگتا تھا، وہ بھی اُن سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔ اور ایک دن وہ اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر اس رشتے کو قبول کر لیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ان کی انا نے امی کو توڑ کر رکھ دیا۔ مگر نانا جان نہیں جھکے۔ اور امی یہ سہہ نہیں پائیں۔ جانتی ہو تانیہ! صرف بیس برس کی عمر میں میری ماں مر گئی..... صرف بیس برس کی عمر میں۔''

تانیہ کے لئے یہ خبر نئی نہیں تھی لیکن شایان کے لہجے کا کرب محسوس کئے بنا نہ رہ سکی اور سر جھکا لیا۔

''کون ذمے دار ہے؟ میں نے اپنی ماں کو کھو دیا، کس کا قصور ہے؟ اور ابو......'' اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

"مجھے وہ کبھی زندہ نہیں لگے۔ پانے اور کھونے میں اہم وہ نہیں ہوتا جو پایا ہو۔ جو کھو دیا ہو، اُس کا درد زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ میں تمہیں درد نہیں دے سکتا تانیہ! امی نے ایک رشتے کو پا کر ایک رشتے کو کھو دیا تھا۔ پر اس رشتے کو کھو دینے کا ملال زندگی بھر نہیں گیا۔ اور تم ایک شایان مصطفیٰ کو پانے کے لئے کتنے رشتوں کو کھو دو گی اور کھو کر کیا جی پاؤ گی؟"

تانیہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور شایان کو اپنا جواب مل گیا۔ فائزہ کو تانیہ کے آنسو دیکھ کر دکھ ہوا تھا۔

"تم غلطی پر ہو شایان! تانیہ کو کچھ کھونا نہیں پڑے گا۔ سبھی کہتے ہیں، نورالہدیٰ فاروقی بہت مہربان شخص ہیں۔ گھنی چھاؤں کی طرح ان کے دل میں ہر کسی کا درد سما جاتا ہے۔ وہ اتنے کیئرنگ ہیں کہ کسی تھرڈ پرسن کے لئے بھی آؤٹ آف داوے جا سکتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی بیٹی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔"

"لیکن اظہر فاروقی اُن کی کمزوری ہیں۔ اور اُن کی سوفٹ نیچر ہی انہیں کبھی نانا جان سے بغاوت کرنے نہیں دے گی۔ اور نانا جان مجھے کبھی قبول نہیں کریں گے۔"

"تمہیں ریجیکٹ کر کے آخر وہ کسے ریجیکٹ کریں گے؟......اپنی ہی بیٹی کو؟" فائزہ نے دلیل دی۔

"وہ اپنی بیٹی کو ریجیکٹ کر چکے ہیں۔" شایان نے اس کی دلیل رد کر دی۔ فائزہ کچھ بول نہ پائی۔

تانیہ بے حس نگاہوں سے کارپٹ کو گھورتی ان دونوں کی باتیں سنتی جا رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ آج صرف سننے کے لئے ہی یہاں آئی تھی۔ اس نے کہیں بھی کچھ بولنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر شایان کی اگلی ہی بات نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا۔ شایان نے کہا تھا۔

"نانا جان صرف انا پرست اور سخت مزاج ہی نہیں ہیں، وہ ضدی اور گھمنڈی بھی ہیں۔ امی نے ابو سے شادی کر کے ان کا گھمنڈ توڑا تھا۔ اور نانا جان کبھی اس بات کو نہیں بھولیں گے۔ مجھے قبول کرنا ان کے لئے ہار ماننے جیسا ہے۔ انہوں نے وجدان مصطفیٰ سے ہار نہیں مانی، مجھ سے کیسے ہار مان لیں گے؟ بیٹی کی موت ان کی ضد نہ توڑ سکی۔ تانیہ ان کی ضد کے آگے کیسے ٹھہر پائے گی؟"

"اُن کی ضد ٹوٹ چکی ہے شایان! میں نے اُنہیں آنٹی کو یاد کر کے روتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں مانتی ہوں، دادا جان اپنی ضد پر اڑ گئے تھے۔ پر آنٹی نے بھی تو ضد نہیں چھوڑی۔ پھر کون، کس سے شکایت کرے؟ مانا وہ غصے میں تھے اور غصے میں انہوں نے آنٹی کو اپنی زندگی اور گھر سے بے دخل بھی کر دیا۔ تو کیا باپ کو اپنی اولاد سے ناراض ہونے کا بھی حق نہیں؟ اور آخر کتنے عرصے تک ناراض رہتے؟ وہ ایک دن تو مان ہی جاتے۔ چلو مانا، آنٹی کو زندگی نے مہلت نہیں دی۔ پر انکل کو تو انہیں منانے آنا چاہئے تھا۔ آنٹی آخر ان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اور یہ سن کر وہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں، دادا جان کا غصہ اپنے آپ ہی ختم ہو جاتا۔ اور وہ انکل کو اور تمہیں اپنے خاندان کا فرد مان لیتے۔" وہ خود کو بابا جان کی طرف داری کرنے سے روک نہیں پائی تو ان کی حمایت میں بول پڑی۔ شایان چپ کر کے اس کی بات سنتا رہا۔ پھر جب وہ چپ ہوئی تو کہا۔

''اپنی غلط فہمی دُور کرلو۔ نانا جان، امی کے جنازے میں شامل تھے۔''
''کیا.....؟'' تانیہ سچ مچ حیران ہوگئی۔
''نہ ہی کبھی یہ سوچنا کہ وہ اپنی ضد چھوڑ چکے ہیں۔ ان کے آنسو کس احساس میں بہہ جاتے ہیں، میں نہیں جانتا۔ لیکن اگر واقعی ایسا ہوا ہوتا تو وہ ابو کو نہ سہی کم از کم مجھے قبول کر لیتے۔ مگر ستائیس سال میں وہ ایک بار بھی مجھ سے نہیں ملے۔ ایسے میں تم کیا کہو گی؟''
''آئی ایم شاکڈ۔'' وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔ شایان ایک بار پھر اس کے پاس آ بیٹھا۔ کارپٹ پر بیٹھ کر اس نے تانیہ کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔
''تانیہ! میں نے تمہیں خود سے بڑھ کر چاہا ہے۔ پھر بھی مجھ میں حوصلہ ہے کہ تمہیں کھو دوں۔ لیکن تم کھو جاؤ گی تو میں سہہ نہیں پاؤں گا۔''
''شایان.....!'' تانیہ نے اس کا نام لے کر کچھ کہنا چاہا پر گلا رُندھ گیا تو وہ چپ ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ اُسے تکلیف میں دیکھ کر شایان نے دھیرے سے سرگوشی کی۔
''آئی ایم سوری۔''
تانیہ کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں میں بہنے لگے تھے۔ شایان نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر کے اُس کے آنسو پونچھے تو وہ شایان کے ہاتھ تھام کر اور بھی شدت سے رو پڑی اور روتے روتے اس نے اپنا سر شایان کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ اس کے شانے سے لگی تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ اور شایان لب بھینچے ساکت تھا۔
''وہ شخص جسے آپ کبھی تکلیف نہ دینا چاہیں، پھر آپ کے ہاتھوں تکلیف اٹھا کر آپ کے ہی شانے پر سر رکھ کر روئے تو آپ کیا کریں گے؟'' فائزہ بھی افسردہ سی کھڑی تھی کہ ہال کے دروازے پر سایوں کو محسوس کر کے اُس نے دروازے کی جانب دیکھا۔ وجدان کے ساتھ آفاق، سمیرا اور صمد حیران کھڑے شایان سے لگ کر روتی تانیہ کو دیکھ رہے تھے۔
''پاپا.....!'' فائزہ کی آواز پر شایان نے یونہی بیٹھے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا۔ تانیہ نے بھی اس کے شانے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر وہ اُٹھی اور آنسو پونچھتی باہر نکل گئی۔ شایان بھی تانیہ کے جاتے ہی اُٹھ کر چلا گیا۔
''یہ سب کیا تھا؟'' شایان کے چلے جانے کے بعد سمیرا نے فائزہ سے پوچھا جو پہلے تو ان کو دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی مگر اب اُسے ان کی آمد غنیمت لگ رہی تھی۔ خود پر قابو پا کر وہ بولی۔
''آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میں سب بتاتی ہوں۔''

❁❁❁

تانیہ کا یوں گیٹ سے لوٹ جانا مریم کو اچنبھے میں ڈال رہا تھا۔ وہ اندر آ کر بابا جان کے کمرے میں چلی آئیں۔

''عجیب سی بات ہے بابا جان! ابھی تانیہ آئی تھی۔ گاڑی سے نکلی بھی، پھر کچھ سیکنڈ فون پر بات کر کے وہ واپس گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔''

''کوئی ضروری کام نکل آیا ہوگا۔'' بابا جان نے کتاب بند کر کے چشمے میں سے انہیں دیکھا۔

''بتا کر جانے میں کیا حرج تھا؟ اب میں بیٹھی پریشان ہوتی رہوں گی۔'' وہ بولیں تو بابا جان مسکرا دیئے۔

''تو بیٹا! مت پریشان ہونا۔'' انہوں نے سنا ہی نہیں۔

''ایسا کرتی ہوں، اُسے فون کر لیتی ہوں۔'' وہ بول کر اُٹھیں اور کمرے میں رکھے ٹیلی فون سیٹ سے ہی نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ کچھ دیر ریسیور کان سے لگا کر انہوں نے واپس رکھتے ہوئے کہا۔''فون بند ہے۔''

''آجائے گی تھوڑی دیر میں۔ پریشان کیوں ہو رہی ہو؟'' وہ رسان سے بولے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ناچار وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئیں۔ مگر جب تانیہ کو گئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تو وہ اپنی پریشانی چھپا نہیں پائیں۔ اس بیچ وہ تانیہ کا موبائل بھی ٹرائی کرتی رہیں۔ پر کنٹیکٹ نہیں ہو سکا تو انہوں نے نورالہدیٰ کو فون کر دیا۔

''بے کار میں پریشان ہو رہی ہو۔ آجائے گی۔ بچی نہیں ہے۔ پھر جہاں بھی گئی ہے، خود اپنی مرضی سے گئی ہے۔''

''پر اُس کا موبائل کیوں بند ہے؟''

''اچھا دیکھو، میں گھر آ رہا ہوں۔ اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پریشان مت ہونا۔'' پھر وہ کچھ دیر میں ہی گھر آ گئے تھے۔

ابھی تک کسی نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ نورالہدیٰ چینج کر کے آئے اور کھانا لگوا دیا۔ کھانا کھا کر انہوں نے بچوں کو سونے کے لئے بھیجا کہ انہیں صبح کالج جانا تھا۔ بابا جان کو انہوں نے کمرے میں جانے کو کہا، نہ وہ خود ہی گئے۔ اور اب یہ تینوں لاؤنج میں تانیہ کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجنے تک بابا جان بھی ٹھیک ٹھاک پریشان ہو گئے تھے۔ پریشان تو اب نورالہدیٰ بھی تھے مگر چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ لیکن ان کا اضطراب بھی اب محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بار بار تانیہ کا نمبر ٹرائی کر رہے تھے۔ بارہ بجے کے قریب اُس کی کار پورچ میں آ کر رکی تو مریم ایک دم ہی باہر جانے کو کھڑی ہو گئیں۔ خود نورالہدیٰ کی بھی جان میں جان آئی تھی۔ مگر وہ متانت سے بولے۔

''نارملی بی ہیو کرنا۔ دیر سویر ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں۔''

مریم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تانیہ لاؤنج میں آئی تو اس کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کر نورالہدیٰ اور بابا جان بھی پریشان ہوئے۔ اپنی جگہوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کے چہرے دیکھ کر تانیہ کی نظر گھڑی پر گئی اور وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

''آئی ایم سوری۔ مجھے دیر ہوگئی۔''

''وہ تو کوئی بات نہیں۔ مگر موبائل تو آن رکھنا چاہئے تھا۔'' بابا جان نرمی سے اس کی غلطی کی نشاندہی کر رہے تھے۔

''موبائل آف تو نہیں ہے۔'' بولتے ہوئے اس نے اپنا موبائل چیک کیا اور بولی۔ ''اوہو...... بیٹری ڈاؤن ہے۔''

''تم کچھ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔'' مریم اپنی فکرمندی چھپا نہیں پائیں۔ تانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پاس آ کے اُس کا گال تھپک کر بولیں۔ ''جاؤ، جا کر سو جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

تانیہ روئی تو نہیں۔ مگر ماں کو پاس دیکھ کر اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ آہستہ سے ان کے گلے لگی۔ مریم نے گھبرا کر نورالہدیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اُلجھے ہوئے لگ رہے تھے۔

''تانیہ! کیا ہوا بیٹا؟ پریشان ہو؟..... ماما کو بتاؤ بچے!'' وہ پیار سے اس کی پیٹھ تھپک کر اسے ریلیکس کر رہی تھیں۔ پر وہ چپ ہی رہی تو وہ پریشانی سے کہنے لگیں۔ ''تانیہ بیٹا! کچھ بولو۔ دیکھو، پاپا بھی پریشان ہو رہے ہیں۔ اور دادا جان بھی فکرمند ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

تانیہ نے اپنے پاپا کی طرف دیکھا اور پھر دادا کی طرف۔ واقعی سب پریشان ہو گئے تھے۔ وہ مریم سے الگ ہو کر ان سے بولی۔

''میں ٹھیک ہوں ماما! آپ سب ٹینس نہ ہوں۔''

''کیسے نہ ہوں جب تم ٹینس ہو......''

''ماما!'' تانیہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔ ''انصر اچھا لڑکا ہے۔ آپ اسے ہاں کہہ دیں۔''

''تم خوش ہو؟'' وہ اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں تو تانیہ قصداً ذرا سا مسکرا کر کہنے لگی۔

''آف کورس ماما! اپنی مرضی سے شادی پر راضی ہوئی ہوں۔ کسی نے زبردستی تو نہیں کی۔ پھر خوش کیوں نہیں ہوں گی؟...... اچھا، میں سونے جا رہی ہوں۔ اب صبح بات ہوگی۔'' اپنی بات کہہ کر وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

لاؤنج میں کھڑے تینوں شخص اپنی اپنی سوچ کی گرفت میں تھے۔ نورالہدیٰ نے اپنا قدم اٹھایا تو بابا جان اُن کا ارادہ بھانپ کر بولے۔

''اس وقت تانیہ کو اکیلا چھوڑ دو نورالہدیٰ! فی الحال وہ کچھ نہیں بتائے گی۔''

نورالہدیٰ ان کی طرف دیکھ کر زہرخند لہجے میں بولے۔ ''میں اپنی بیٹی کو اس کے دکھوں کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ جیسے آپ نے اپنی بیٹی کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔''

ملیحہ کے ذکر پر مریم کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ مگر مصلحتاً وہ کچھ بولے بغیر پلٹ کر اپنے کمرے میں

چلی گئی۔ نورالہدیٰ نے ایک نظر جاتی ہوئی مریم کو دیکھا۔ پھر خود بھی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ لاؤنج میں تنہا رہ گئے بابا جان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

'ملیحہ کی موت کے لئے نورالہدیٰ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا' اُن کے گال بھیگتے جا رہے تھے۔

نورالہدیٰ نے تانیہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں وہ دوسری طرف کروٹ لئے بیڈ پر لیٹی تھی۔ آہستہ سے دروازہ بند کرتے بیڈ پر بیٹھ کر وہ کچھ بھی بولے بِنا اس کے بالوں میں اُنگلیاں چلانے لگے۔ تانیہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بے حس لیٹی رہی۔ پھر اس سے رہا نہیں گیا تو ایک دم سے پاپا! کہتی پلٹ کر ان سے لپٹ گئی۔

''پاپا کی جان!'' اس کے گرد بازو پھیلاتے نورالہدیٰ نے تانیہ کو اپنے پُرشفقت حصار میں لے لیا۔

''اس کا نام شایان ہے۔ میں اس سے پہلی بار فائزہ کے گھر پر ملی تھی۔ پھر وہ کچھ دن بعد یونیورسٹی آیا تھا'' ان کے سینے پر سر رکھے آنسوؤں کے بیچ اٹک اٹک کر بتانے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے اسے تھپکتے نورالہدیٰ ہر سیکنڈ کے ساتھ ایک انچ خوف کی دلدل میں دھنستے جا رہے تھے۔

وجدان اور ملیحہ کا ذکر کیے بغیر تانیہ نے اپنے تین سالوں کا ہر پل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اپنی سوچوں سے اُبھر کر نورالہدیٰ نے اپنے سینے پر سر رکھ کر سوتی تانیہ کو دیکھا۔ نہ جانے وہ کب سو گئی تھی۔ نورالہدیٰ کو یاد آیا، وہ بچپن میں بھی اکثر کہانی سنتے ہوئے ان کے سینے پر سر رکھ کر سو جایا کرتی تھی۔ مگر آج وہ کہانی سنا کر سوئی تھی۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان دیکھتے ہوئے انہوں نے کہانی کے آخری جملوں کو یاد کیا۔

''وہ کہتا ہے، مجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس کے پیرنٹس کا کوئی پرابلم ہے۔ پر آپ فکر مت کریں پاپا! میں اسے بھول جاؤں گی۔''

'بھول جانا آسان نہیں ہوتا' اس کے چہرے سے بال سمیٹ کر ماتھا چومتے ہوئے نورالہدیٰ نے سوچا تھا۔

❁❁❁

فائزہ کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ پھر اب بولنے کو بچا بھی کیا تھا۔ سب کچھ تو کہہ چکی تھی۔ ایک نگاہ سب کے چہروں پر ڈال کر وہ کسی کے کہے بِنا ہی وہاں سے چلی گئی۔

''کس نے سوچا تھا، راکھ میں آگ لگ جائے گی۔'' خاموشی کو توڑتے ہوئے صمد نے وجدان سے پوچھا۔ ''اب تم کیا کرو گے؟''

دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں آپس میں پھنسائے بیٹھے وجدان فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ ''میں ہادی بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟'' آفاق برس پڑے۔ ''اس ملاقات کا کیا نتیجہ نکلے گا، جانتے ہو؟ شایان کی

بات بالکل ٹھیک ہے۔ گڑے مردے نہ ہی اُکھاڑے جائیں تو بہتر ہے۔ اس معاملے کو یہیں ختم کر دو۔ اگر معاملے کو ہوا دو گے تو بڑے طوفان کھڑے ہونے کا خطرہ ہے۔"

"اگر طوفان میری زندگی سے نہیں ٹلتے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

"کم از کم خود سے طوفانوں کو دعوت مت دو۔ پھر تمہیں نورالہدیٰ سے بات کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے، جب شایان اور تانیہ خود ہی اپنی محبت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔" سمیرا نے اُلجھ کر کہا۔

"ایسے فیصلے اذیت کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ اور میں شایان کو تکلیف سے گزرتا نہیں دیکھ سکتا۔ آخری سانس بھی اذیت سے لینے کی گارنٹی دے کر قسمت نے شایان کو مجھے سونپا تھا۔ وہ میرے جینے کی آخری وجہ ہے۔"

آفاق نے ترحم سے انہیں دیکھا۔ "اور جس دن تم نے قصرِ فاروقی میں قدم رکھا، پھوپھا جان تم سے تمہارے جینے کی آخری وجہ بھی چھین لیں گے۔"

"تو کیا کروں؟ اپنے بیٹے کی زندگی گروی رکھ کر اپنی سانسیں اُدھار مانگ لوں؟ مجھے یہ سودا منظور نہیں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولے پھر کہا۔ "ملیحہ کہا کرتی تھی، محبت بوجھ نہیں ہوتی، پھر بھی جھکا دیتی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں، اس کی بات میں کتنا سچ ہے۔"

❁❁❁

شایان اپنے گھر کے پورچ میں پولیس جیپ روک کر اُترا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ شرٹ کے نیچے جسم کا وہ حصہ جہاں اس نے تانیہ کے آنسوؤں کی نمی محسوس کی تھی، اب بھٹی کی طرح سلگ رہا تھا۔ شرٹ، پینٹ سے باہر کھینچ کر اس نے گریبان کے بٹن کھول دیئے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے شانے کو مسلنے لگا۔ مگر سانس کی آمدورفت بدستور مشکل ہی رہی۔ اندرونی کشمکش جنون کا روپ دھار چکی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کا مُکا بنا کر ایک دھاڑ کے ساتھ سامنے دیوار پر دے مارا۔ اب وہ پاگلوں کی طرح چلّاتے ہوئے دیوار پر مُکے برسا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ زخمی ہو چکے تھے اور ان سے خون بہنے لگا تھا۔ پھر بھی وہ رُکا نہیں۔

اُس کے توانا بازوؤں کی طاقت سے دیوار کا پینٹ تک اُکھڑ چکا تھا۔ مگر دیوانگی تھی کہ کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ اب اس نے کمرے میں رکھی چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر پھینکنا شروع کیا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا، پوری دنیا کو تہس نہس کر دے۔ کرسیوں کو اس نے اپنی ٹھوکر سے اُلٹ کر رکھ دیا۔ بیڈ پر سے تکیے اور چادر ہوا میں اُچھال دیئے۔ سائیڈ ٹیبل سے لیمپ اُٹھا کر دیوار پر مارنے کا ارادہ تھا کہ اُس کے تار میں اُلجھ کر ساتھ رکھا فریم ٹیبل پر اُلٹ گیا۔

"امی......!" لیمپ چھوڑ کر اس نے ملیحہ کی تصویر والا فریم دونوں ہاتھوں میں کسی قیمتی مگر نازک شے کی طرح احتیاط سے پکڑ لیا اور اپنی آستین سے فریم کے شیشے کو صاف کر کے چومنے کے بعد سینے سے لگاتا کمرے کے وسط میں آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ دیوانگی، آنسوؤں میں ڈھل گئی تھی۔ تصویر پر ہاتھ پھیرتا ہوا وہ سرگوشیوں میں

کہہ رہا تھا۔ ’’کتنے آرام سے آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اپنے وجود کے حصے سے کوئی ایسے بے نیاز ہوتا ہے؟ زندگی کے ہر پل میں، میں نے آپ کی کمی محسوس کی ہے۔ کہتے ہیں، اولاد تکلیف میں ہو تو ماں قبر میں بھی بے چین ہو جاتی ہے۔ آج میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی تکلیف سے گزر رہا ہوں۔ کیا آپ چین سے ہیں؟ کیسی ماں ہیں؟ کبھی مجھے گود میں نہیں لیا، کبھی مجھے لوری نہیں سنائی۔ میں ٹھوکر کھا کر گرتا تو کبھی آپ کے ہاتھ مجھے تھامنے کو نہیں بڑھے۔ ترس گیا ہوں آپ کے احساس کو۔ پر کیا آج بھی مجھے آپ کی آغوش نہیں ملے گی؟..... امی! میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ کیسے میری تکلیف پر چپ رہ سکتی ہیں؟ آج تو آ جائیں۔ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ اپنی ماں کے گلے لگ سکوں؟‘‘ ملیحہ کی تصویر کو سینے میں بھینچ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

’’I am missing you ammi..... اب تک اپنی زندگی آپ کے بغیر ہی جیتا آیا ہوں، پر آج آپ کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔ ایک بار تو آ کر مجھے سینے سے لگا لیں۔ امی پلیز، مائیں قیامت کے دن اپنی اولاد کو دودھ کی بہتی دھاریں بخشیں گی، میں کیا روزِ حشر بھی خالی دامن لے کر آپ کے پاس آؤں گا؟ کچھ تو میرے پاس بھی ہو امی!..... امی! پلیز امی! اللہ کے لئے۔‘‘ وہ ستائیس سال کا بھرپور جوان، ماں کو پکارتا چھوٹے بچے کی طرح مچل مچل کر اونچی آواز میں رو رہا تھا۔

تبھی اس کے دل میں دبی شدید خواہش نے واہمے کا روپ دھار لیا۔ کھلی کھڑکی سے آتی ہوا نے اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو سمیٹا تھا، مگر شایان کو اس ہوا پر نرم انگلیوں کے لمس کا گمان ہوا تھا۔ پھر اسے محسوس ہوا تھا کہ انہی اُنگلیوں نے اس کے چہرے پر سے نمی کو سمیٹا۔ اس نے سختی سے بھینچی اپنی آنکھوں کو دھیرے سے کھول دیا۔ آنکھوں کی دھندلاہٹ نے ایک پیکر کو تراشا تھا۔

’’امی!‘‘ اس کی آواز میں اتنا سکون تھا جیسے بھیڑ میں بچھڑے بچے کو اچانک ہی ماں نظر آ جائے۔ ملیحہ نے جھک کر اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔ ستائیس سال میں پہلی بار اس نے ممتا کا لمس محسوس کیا تھا۔ اسے لگا اس کے جلتے تپتے وجود میں کسی نے پانی کے چھینٹے ڈال دیئے ہوں۔ اس نے بے خود ہو کر ملیحہ کی آغوش میں سر رکھ دیا۔ اس کے جنون کو قرار آنے لگا اور ایک سکون سا اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا اور وہ دھیرے دھیرے آنکھیں موند گیا۔

گھر پہنچتے ہی وجدان سیدھے شایان کے کمرے میں آئے تھے۔ کمرے میں پھیلی ابتری پر نظر ڈال کر شایان کے پاس آ بیٹھے جو کارپٹ پر بے ترتیبی سے لیٹا بے سدھ سو رہا تھا اور ملیحہ کی تصویر اس کے دائیں گال کے نیچے دبی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی پشت پر جمے خون کو دیکھ کر وجدان کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔

’’ماں پر گیا ہے۔‘‘ اس کی دیوانگی بھری جذباتیت پر وجدان ہمیشہ یہی جملہ دہراتے تھے۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آئے اور الماری سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر کچن میں آ گئے۔ اسٹیل کے برتن میں تھوڑا سا پانی گرم کیا، پھر اسے ہولڈر سے پکڑ کر واپس شایان کے پاس آ گئے اور نیم گرم پانی میں ڈیٹول ملا کر روئی بھگو بھگو

کر اس کے ہاتھوں پر سے زخم صاف کرنے کے بعد فرسٹ ایڈ باکس سے مرہم نکال کر لگایا، پھر دونوں ہاتھوں پر باری باری پٹی لپیٹ دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اُٹھے اور تکیہ تلاش کر کے شایان کے سرہانے دوزانو ہو کر بیٹھے اور آہستہ سے اس کا سر اپنی گود میں لے کر ملیحہ کی تصویر اس کے گال کے نیچے سے نکالی اور تکیہ رکھ کر اس کا سر تکیہ پر ڈال دیا۔ پھر وہیں بیٹھے شایان کے بالوں میں اُنگلیاں چلانے لگے۔ آج وجدان کو بھی بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔

❁❁❁

اگلے دن تانیہ دن چڑھے سوتی رہی۔ کیونکہ چھٹی کا دن تھا۔ اس لئے کسی نے جگایا بھی نہیں۔ بارہ بجے اُٹھی تو ناشتے میں صرف چائے کا کپ ہی لیا اور بعد میں سب کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ کسی بھی طرح کے سوال جواب سے بچنے کے لئے وہ سارا وقت عمیر اور عذیر کے ساتھ رہی اور کھانے کے بعد خود ہی کرکٹ کھیلنے کا پروگرام بنا لیا۔ عذیر بیٹنگ کر رہا تھا۔ نورالہدیٰ بالنگ کرا رہے تھے۔ تانیہ اور عمیر فیلڈرز تھے اور بابا جان امپائر۔ مریم اسٹینڈ میں بیٹھے شائقین کی طرح نعرے لگا رہی تھیں۔

''شاباش!...... چھکا لگاؤ اس بال پر۔ جب تک نورالہدیٰ خود بے ہوش ہو کر نہ گر پڑے، وکٹ نہیں چھوڑنا۔'' باؤلنگ کے لئے بھاگتے نورالہدیٰ رُکے اور ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''او بیوی! اللہ کا خوف کرو شوہر کا بہت حق ہوتا ہے۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولیں۔ ''میں صرف بیوی ہی نہیں، ماں بھی ہوں۔ اور ماں کے لئے اولاد سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا، یہاں تک کہ بچوں کا باپ بھی نہیں۔ کم آن عذیر! آج ذرا اپنے باپ کے چھکے تو چھڑاؤ۔''

''اُداس مت ہوں پاپا!'' نورالہدیٰ کی اُتری شکل دیکھ کر تانیہ ان سے بولی۔ ''بیوی نہ سہی پر بیٹی آپ کے ساتھ ہے۔''

''تھینک یو سویٹ ہارٹ!'' وہ مظلومیت سے بولے۔

''Mention not..... بس آپ جلدی سے عذیر کو آؤٹ کر دیں۔ پھر میں بیٹنگ کروں گی۔''

عمیر گھور کر بولا۔ ''دیکھا پاپا! یہ لالچی خاتون آخر آپ کا ساتھ کیوں دے رہی ہے۔''

''اِدھر آؤ تمہیں بتاتی ہوں۔'' وہ ناک پر عینک صحیح کر کے عمیر پر جھپٹی۔

''جس کو مار کٹائی کرنی ہے، شوق سے کرلے۔ پر یاد رکھنا! کسی کو ایکسٹرا ٹائم نہیں ملے گا۔''

''او کے او کے۔'' بابا جان کی وارننگ پر سب اپنی پوزیشن پر واپس چلے گئے۔ نورالہدیٰ فاسٹ بالر تھے۔ لمبے رن اپ کے ساتھ انہوں نے بال پھینکی، جسے عذیر نے لان سے باہر بھیج دی۔

''اینڈ دیٹس اے سکس۔'' امپائر نے کمنٹری کی اور مریم تالیاں بجانے لگیں۔ بال کے پیچھے بھاگتی تانیہ نے سفید شلوار قمیض میں وجدان کو واچ مین کے ساتھ گیٹ پر دیکھا تو ٹھٹک کر رک گئی۔ پھر فوراً اس نے پلٹ

کر نورالہدیٰ اور بابا جان کی طرف دیکھا، وہ لوگ بھی وجدان کو دیکھ چکے تھے۔ نورالہدیٰ نے واچ مین کو آواز لگا کر کہا۔

''آنے دو۔''

وجدان اجازت ملتے ہی اس طرف آ گئے۔ تانیہ کو انہوں نے قصداً نظرانداز کر دیا تھا۔ نورالہدیٰ بھی کچھ قدم آگے بڑھ آئے۔

''السلام علیکم!'' وجدان نے اپنائیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا، جسے تھامتے ہوئے نورالہدیٰ کے چہرے پر ویسی ہی اجنبیت تھی، جیسی بابا جان کے چہرے پر تھی۔

''وعلیکم السلام۔''

''کیسے ہیں ہادی بھائی؟''

''یہ ہادی کون ہے؟'' عذیر نے آنکھیں نچا کر عمیر سے پوچھا۔ اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کر دیا، مگر نورالہدیٰ چونک گئے تھے۔ انہوں نے غور سے وجدان کے چہرے کو دیکھا اور پوچھا۔

''آپ ہیں کون؟'' انہوں نے دھیرے سے کہا۔

''میرا نام وجدان مصطفیٰ ہے۔''

نورالہدیٰ اور بابا جان ٹھٹک گئے جسے محسوس کر کے بھی وہ بولے۔

''شاید آپ کو یاد نہ ہو، پر میں آپ سے ایک بار پہلے مل چکا ہوں اور آج ہماری دوسری ملاقات ہے۔''

نورالہدیٰ نے غور سے انہیں دیکھا۔ ''اگر تم وجدان مصطفیٰ ہو تو یہ ہماری دوسری نہیں بلکہ تیسری ملاقات ہے اور یہ ماننا میرے لئے مشکل ہے کہ تم اس دوسری ملاقات کو کبھی بھول پاؤ گے۔'' نورالہدیٰ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''بہت سی یادیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسان بھلا نہیں پاتا۔ مگر انہیں بھول جانے کی خواہش تو کر سکتا ہے۔'' انہوں نے زیرلب کہا، پھر نورالہدیٰ سے بولے۔ ''میں جانتا ہوں، ہادی بھائی! مجھ سے ملنا آپ اور بابا جان کے لئے کچھ ایسا خوشگوار بھی نہیں۔ بلکہ شاید بابا جان تو میری صورت بھی نہ دیکھنا چاہتے ہوں۔ لیکن آپ دونوں سے ملاقات بہت ضروری ہو گئی تھی۔''

نورالہدیٰ انہیں دیکھتے رہے، پھر توقف کے بعد کہا۔ ''آؤ اندر چل کر بات کرتے ہیں۔'' وہ مسکرائے، پھر بابا جان کی طرف مڑے جو انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ''یہ ملاقات آپ کے بغیر ادھوری ہے بابا جان!''

وہ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔

''آج تو اسے موقع دیں بابا جان! کہ یہ اپنی بات کہہ سکے۔'' انہیں خاموش دیکھ کر نورالہدیٰ نے یاسیت بھرے انداز میں اصرار کیا تھا۔ بابا جان کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ وجدان کے چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے وہ

آگے بڑھے۔ پھر وہ تینوں ساتھ ساتھ چلتے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔

''ماما! آپ انہیں جانتی ہیں؟'' تانیہ نے مریم کو کریدا۔

''نہیں۔''

''اور آپ نے سنا ماما! وہ پاپا کو ہادی بھائی کہہ رہے تھے۔'' عذیر نے پوائنٹ آؤٹ کیا تو مریم بھی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

''میں نے کسی کو نورالہدیٰ کے لئے یہ نام استعمال کرتے نہیں سنا۔ شاید پرانے ملنے والے ہوں گے۔'' انہوں نے قیاس لگایا۔

''اینی وے، میں بہادر کو چائے کا کہہ دوں۔'' تانیہ نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا اور چلتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ ''بہادر! ایک زبردست سی چائے اور کچھ اسنیکس اندر ڈرائنگ روم میں لے جاؤ۔ ایک خاص مہمان آیا ہے۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' کہہ کر بہادر چائے کے انتظامات کرنے لگا۔ کچن کے دروازے تک آ کر تانیہ کو ایک خیال آیا تو وہ واپس پلٹی اور کچن ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھتی بہادر سے بولی۔ ''پوچھو گے نہیں کون آیا ہے؟''

''کون آیا ہے تانیہ بی بی؟'' تانیہ کی فرمائش پر اس نے پوچھا۔ وہ اس کے ردِعمل کو سوچ کر شرارت سے بولی۔

''ملیحہ فاروقی کے شوہر آئے ہیں۔''

''کیا......؟'' بہادر نے بڑا سا منہ کھول کر اسے دیکھا۔

''سچ کہہ رہی ہوں۔ اور تمہاری ملیحہ بی بی کا ایک بیٹا بھی ہے۔'' وہ بہادر کی حیرت سے حظ اُٹھا کر بولی۔ بہادر کا کھلا منہ کچھ اور کھل گیا۔

''ملیحہ بی بی کا بیٹا؟''

''ہوں۔'' تانیہ نے سر ہلا کر اس کی شکل دیکھی جو منہ پر دونوں ہاتھ رکھے تانیہ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

''آپ بی بی صاحب کے بارے میں ہی بات کر رہی ہیں نا؟ کرنل صاب کی بیٹی کے بارے میں؟''

''ہاں۔ میں تمہاری بی بی صاب کے بارے میں ہی بات کر رہی ہوں۔ ملیحہ فاروقی کے بارے میں۔ کیا بھول گئے انہیں؟''

وہ ایک دم ہی افسردہ ہو گیا تھا۔ ''وہ ایسی نہیں تھیں کہ کوئی انہیں بھول جاتا۔ پر یہاں تو کسی نے انہیں یاد ہی نہیں رکھا۔'' پھر اس نے تانیہ کی طرف دیکھ کر اچنبھے سے کہا۔ ''لیکن آپ نے یہ ابھی کیا بات کہی؟ بی بی صاب کا تو کوئی بیٹا نہیں ہے۔ اور ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔''

وہ ہنسی۔ ”نہیں بہادر! ملیحہ فاروقی کی شادی ہوئی تھی اور ان کا ایک بیٹا بھی ہے جو اے ایس پی ہے۔ جانتے ہو، اے ایس پی، پولیس کا بڑا افسر ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہوگا تانیہ بی بی! مگر وہ پولیس والا، بی بی صاب کا بیٹا ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ اڑیل پن سے بولا۔

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“

”کیونکہ بی بی صاب مر گئی تھیں۔“

تانیہ کتنی ہی دیر ہنستی رہی، پھر کہا۔ ”ٹھیک ہے، وہ مر گئی تھیں۔ مگر مرنے سے پہلے لوگ شادی بھی کرتے ہیں اور ان کے بچے بھی ہوتے ہیں۔“

”مگر تانیہ بی بی! ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔“ وہ اب بھی اڑا ہوا تھا۔ تانیہ چھوٹے بچے کی طرح اُسے سمجھانے لگی۔

”دیکھو جب وہ یہاں سے گئی تھیں، تو اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی، مگر یہاں سے جانے کے بعد انہوں نے وجدان مصطفیٰ سے شادی کر لی تھی۔ پھر ان کا بیٹا پیدا ہوا اور وہ مر گئیں۔“

وہ اُلجھ کر بولا۔ ”مگر بی بی صاب کہیں نہیں گئی تھیں۔ اسی گھر میں ان کی موت ہوئی تھی اور اسی گھر سے اُن کا جنازہ اُٹھا تھا۔“

”کیا.....؟“ اب کے تانیہ حیران رہ گئی۔

”جی تانیہ بی بی!...... بی بی صاب کنواری مر گئی تھیں۔ ان کی شادی تو کبھی ہوئی ہی نہیں تھی۔“

تانیہ کے سر میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ وہ آہستہ سے ٹیبل سے اُتر گئی اور بہادر کہتا جا رہا تھا۔

”پتہ نہیں تانیہ بی بی! آپ کو کسی نے کیا بتایا ہے، لیکن ہمیں اس بارے میں بات کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ وہ تو آپ نے مرنے والی کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دی تھی تو ہم بھی بول پڑے، پر آپ آگے ہم سے کچھ نہ پوچھیے گا۔ اور آگے رکھا بھی کیا ہے، وہ بے چاری مر گئیں اور ساری باتیں ختم ہو گئیں۔ بڑی نیک لڑکی تھیں۔ اللہ جنت نصیب کرے۔“

’باتیں ختم نہیں ہوئیں۔‘ اس نے دل میں کہا۔ ’باتیں تو شروع ہوئی ہیں۔ جب ملیحہ نے دادا جان کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کی تو اسے گم نام کیوں کر دیا گیا؟......اس کی موت کن حالات میں ہوئی؟ اور کیوں اُسے پُراسرار بنایا جا رہا ہے؟ اور سب سے اہم چیز یہ بات کیوں مشہور کی گئی کہ وہ وجدان مصطفیٰ کی بیوی تھی؟ اور ان کی اصل بیوی اور شایان کی ماں کون ہے؟ اور اس کی شخصیت کو کیوں چھپایا گیا؟ اور کیوں شایان کو بھی یہ یقین دلایا گیا کہ وہ ملیحہ کا بیٹا ہے؟‘ سوال ہر طرف بکھرے تھے پر جواب کہیں نہیں تھا۔

وہ لاؤنج میں آئی اور ڈرائنگ روم کے گلاس ڈور سے اندر دیکھنے لگی، جہاں سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ دادا جان صوفے پر بیٹھے بار بار پہلو بدل رہے تھے اور نور الہدیٰ، وجدان کے ساتھ بیٹھے ان کے کندھے پر بازو

پھیلائے دھیرے دھیرے بولتے وجدان کی بات بڑے دھیان سے سن رہے تھے۔ وہ پہلے ہی جانتی تھی کہ نورالہدیٰ اور بابا جان کبھی ملیحہ کے بارے میں زبان نہیں کھولیں گے، اب اس نے وجدان کا نام بھی اس فہرست میں شامل کرلیا تھا۔

'نہ جانے اب یہ تینوں اندر بیٹھے کون سا اسکرین پلے لکھ رہے ہیں؟ وہ تین لوگ جنہیں ملیحہ نے سب سے زیادہ چاہا تھا، اس کے بارے میں سچ بتانے کو تیار نہیں۔ پتہ نہیں اس کی ذات پر جھوٹ کے پردے کیوں ڈالے گئے؟ کوئی ہے تو اسے بیٹی ماننے کو تیار نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ وہ اس کے بچے کی ماں تھی۔ کیا گورکھ دھندا ہے؟' وہ چلتی ہوئی صوفے پر آ بیٹھی۔

'کہانی کے چار بنیادی کرداروں میں سے ایک موت کی آغوش میں چلا گیا اور باقی تین جو بھی بولیں گے، وہ سچ نہیں ہوگا۔ مگر شاید کہانی کا کوئی ثانوی کردار سچ بولنے پر آمادہ ہو جائے، جیسے..... جیسے سمیرا۔ آف کورس!' اس نے اپنے خیال کی تائید کی۔

'سمیرا کو ضرور پتہ ہوگا کہ ملیحہ کی موت کیوں اور کیسے ہوئی؟ اگر یہ پتہ چل جائے تو باقی کی اُلجھنیں بھی سلجھ جائیں گی۔ لیکن سمیرا کو میں کہاں ڈھونڈوں گی؟ میں نے تو کبھی ملیحہ کے ننھیال میں سے کسی شخص کو قصرِ فاروقی میں آتا جاتا نہیں دیکھا۔ تو پھر سمیرا سے میں کیسے ملوں گی؟' وہ سوچنے لگی۔

'میری ممی، شایان کی مدر کی کزن ہیں۔' تانیہ کو اچانک فائزہ کی بات یاد آئی اور اُچھل کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ 'او مائی گاڈ!...... فائزہ اور شایان کی مائیں آپس میں کزنز تھیں۔ شایان کی ماں کی حیثیت سے تو سب ملیحہ کو ہی جانتے ہیں اور فائزہ کی ماں ہیں سمیرا آنٹی۔ اور فائزہ آفاق یعنی سمیرا آفاق..... اِٹس ریئلی امیزنگ!' وہ ہنسنے لگی۔

'میں تین سال سے اس گھر میں جا رہی ہوں، جس کے رہنے والوں کا رشتہ قصرِ فاروقی سے برسوں پہلے ختم ہو چکا ہے۔ اور جواد کی انگیج منٹ والے دن آفاق انکل، پاپا کے نام پر چونکے بھی تو تھے۔ شک کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اور اب آگے کی کہانی، سمیرا آنٹی سنائیں گی۔' وہ جوش میں چلتی اپنے کمرے سے گاڑی کی چابی اٹھا کر پورچ میں آ گئی۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ فائزہ کے گھر پر تھی۔

فائزہ نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

''تم......؟''

''ہاں میں۔ لیکن تم اس قدر حیران کیوں ہو؟''

''تمہیں پتہ ہے، رات تمہارے جانے کے بعد کیا ہوا؟'' فائزہ اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''میں شروع سے ہی چاہتی تھی کہ تمہاری اور شایان کی شادی ہو جائے اور شایان کو تمہارے پاپا کا نام سن کر ہی اوٹ پٹانگ قسم کے خوف ستانے لگے تھے اور کل میں نے شایان کو جھوٹ بول کر اسی لئے بلوایا تھا کہ تم دونوں آنے

سامنے بیٹھ کر بات کرو گے تو شاید اس کے دماغ سے خوف نکل جائے۔ پھر تم بھی اس کی بات مان گئیں تو آخری حل یہ ہی بچا تھا کہ میں وجدان انکل کو سب بتا دوں۔ اور میں نے انہیں سب بتا دیا۔''

''اچھا تو اس لئے وہ پاپا اور دادا جان سے ملنے گھر آ پہنچے۔ میں بھی حیران تھی کہ اتنے سالوں میں تو وہ کبھی دادا جان سے ملنے نہیں آئے تو آج کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''کیا؟...... وجدان انکل تمہارے گھر آئے تھے؟'' فائزہ پوچھنے لگی۔

''آئے تھے نہیں، اس وقت بھی وہ قصرِ فاروقی میں موجود ہیں۔''

''بہت بد اخلاق ہو۔ اتنے برسوں بعد وہ تم لوگوں سے ملنے آئے اور تم انہیں چھوڑ کر یہاں چلی آئیں۔'' فائزہ نے اسے سرزنش کی۔

''ان کی پاپا اور دادا جان کے ساتھ خفیہ میٹنگ چل رہی ہے، اس لئے میری اس بد اخلاقی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اچھا سنو! میں آج خاص طور پر آنٹی سے ملنے آئی ہوں۔ انہیں کمرے میں بلا لو۔'' وہ اپنے مطلب کی بات پر آ گئی۔

''خیریت؟'' فائزہ نے پوچھا۔

''ہاں بس تم اُنہیں بلا لو۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ کہہ کر اُٹھی اور رُوم سے چلی گئی۔

''فائزہ بتا رہی تھی، تم خاص طور پر مجھ سے ملنے آئی ہو۔'' بیڈ پر بیٹھنے کے بعد وہ محتاط انداز میں بولیں۔

''جی آنٹی! آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''کہو۔''

''ایک منٹ۔'' ان کی اجازت پا کر اس نے فائزہ کی طرف رخ کیا۔ ''فائزہ! ہمیں کچھ دیر کے لئے اکیلا چھوڑ سکتی ہو؟''

''ہاں کیوں نہیں۔'' وہ حیران تو ہوئی، مگر فوراً ہی جانے کو کھڑی بھی ہو گئی۔ ''میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنا خیال رکھنا، جب تک میں کمرے کا دروازہ کھول نہ دوں، کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے۔''

''جیسا تم کہو۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گئی اور جاتے جاتے دروازہ بھی بند کر گئی۔

''جی تو شروع کریں۔'' اس نے سمیرا کی طرف دیکھ کر کہا۔ تانیہ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ مضطرب سی تھیں۔

''مجھے جانتی ہیں۔'' انہیں خاموش دیکھ کر تانیہ نے سوال کیا۔ سمیرا اس کے لہجے سے سمجھ گئیں کہ اس سوال کا مطلب کیا تھا اور کہا۔

''تم نورالہدیٰ کی بیٹی ہو۔''

''اور آپ افتخار حسن کی بیٹی ہیں۔'' تانیہ نے ان کے چپ ہوتے ہی کہا۔ ''میرا مطلب ہے، ملیحہ کے ماموں افتخار حسن کی بیٹی۔''

''تمہیں فائزہ نے بتایا ہوگا۔'' انہوں نے فوراً قیاس لگایا۔

''نہیں، مجھے ملیحہ نے بتایا ہے۔'' سمیرا نے اس طرح اسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو مگر بحث نہیں کی۔

''میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں، مگر اب لگ رہا ہے مجھے اس روّیے پر ایک بار پھر غور کرلینا چاہیئے۔'' وہ دانستہ بدلحاظ ہوئی۔

''اور اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' وہ ناگواری سے گویا ہوئیں۔

''آپ کو شرم نہیں آتی۔'' تانیہ ایک دم سے بھڑک اُٹھی۔ ''جو لڑکی آپ کو اپنی بہن کی طرح سمجھتی تھی، آپ اُس پر بہتان لگاتی ہیں کہ وہ اپنے گھر سے بھاگ گئی تھیں۔''

''میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ملیحہ گھر سے بھاگی تھی۔'' وہ بل کھا کر بولیں۔

''تو پھر ملیحہ اور وجدان کی شادی کیونکر ہوئی؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''ملیحہ کا اپنے بابا جان کے ساتھ اس ایشو پر جھگڑا ہو گیا تھا، پھر بات بڑھ گئی اور ان حالات میں اسے گھر چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔ بعد میں ابو اور چاچو نے دونوں میں صلح کی کوشش بھی کی، مگر پھوپھا جان نے کہہ دیا کہ ملیحہ ان کے لئے مر چکی ہے۔ اس کے بعد سب کو یہی مناسب لگا کہ ملیحہ کی شادی وجدان سے کر دی جائے۔ وہ وجدان کے ساتھ بھاگی نہیں تھی، اسے باقاعدہ رخصت کیا گیا تھا۔'' وہ غصے سے چبا چبا کر بولیں۔ تانیہ نے سکون سے ان کی بات ختم ہونے کا انتظار کیا، پھر کہا۔

''ان کا انتقال کس طرح ہوا؟''

وہ ایک پل کو رُکیں اور کہا۔ ''شایان کی پیدائش پر ملیحہ کی وفات ہوگئی تھی۔''

''مگر کس طرح؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔ سمیرا زِچ ہو گئیں۔

''بچے پیدا کرتے وقت اکثر عورتیں مر جاتی ہیں۔ اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟''

''حیران ہونے کی بات تو ہے نا۔'' ان کی بات پر غور کرتے ہوئے وہ اُٹھی اور ان کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے دونوں بازو لپیٹ کر کہا۔

''اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟'' سمیرا اچنبھے سے بولیں تو تانیہ اپنے الفاظ پر زور دے کر بولی۔

''اگر ایک ایسی عورت بچہ پیدا کرتے ہوئے مر جائے، جس کے ہاں کبھی بچہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا تو کچھ حیرت تو ہوگی۔''

اس بار سمیرا کچھ بول نہیں پائیں۔

"ملیحہ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔" اس نے بڑے سکون سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک ایسی لڑکی جو مر چکی ہے، اس کے بارے میں اتنا بڑا جھوٹ کہ وہ کسی کی بیوی اور کسی کے بچے کی ماں تھی، بولتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آئی؟" وہ چپ ہوئی، پھر طنزیہ ہنسی کے ساتھ بولی۔ "لیکن آپ کیا کسی مرے ہوئے کا لحاظ کریں گی؟ جب آپ نے زندہ لوگوں کا لحاظ نہیں کیا۔ شایان کے ساتھ کیا، کیا آپ لوگوں نے۔ جسے وہ ماں سمجھتا ہے، وہ اس کی ماں نہیں ہے، اگر پتہ چل جائے اسے تو اس کی کیا حالت ہو۔ اور وہ بدنصیب ماں جس نے اسے پیدا کیا ہے، اس پر کتنا ظلم کیا ہے آپ سب نے۔ اور آج میری زندگی آپ لوگوں کی وجہ سے ہی برباد ہو رہی ہے، یہ سوچ کر وہ ملیحہ فاروقی کا بیٹا ہے، شایان مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اور میں سچ جان کر بھی اسے بتا نہیں سکتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں وہ کبھی نہیں سہہ پائے گا کہ جس باپ سے وہ اتنی محبت کرتا ہے، اسی نے اس کی ماں کی شناخت کے حوالے سے اسے دھوکا دیا۔" وہ رُکی اور شکایتی نگاہوں سے سمیرا کو دیکھنے لگی، جن کی آنکھوں سے اب آنسو گرنے لگے تھے۔

"دادا جان، پاپا، وجدان اور آپ، ملیحہ نے ہر ایک سے محبت کی اور اس کے مرنے کے بعد آپ سب نے اس کے ساتھ کیا، کیا؟ پاپا اور دادا جان یوں اس کے ذکر سے لاتعلق ہو گئے جیسے وہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور وجدان جو ملیحہ کے لئے یقین کا چہرہ تھا، اس کے چہرے کو دھوکا بنا کر اپنے بیٹے کے سامنے پیش کرتے رہے۔ اور آپ نے وجدان کو ایسا کرنے دیا۔ کس قدر بدنصیب تھی وہ، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ساتھ یہ سب ہو جائے گا۔" سمیرا کے آنسو اور بھی شدت سے بہنے لگے۔ مگر تانیہ اس پر ترس کھائے بغیر بولتی رہی۔

"جھوٹ کا یہ محل کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بتائیں، میری اور شایان کی زندگیوں کو برباد کرنے کا آپ کے پاس کیا جواز ہے۔ جواب دیں...... یا دینے کے لئے آپ کے پاس کوئی جواب بھی نہیں ہے؟" استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اس کی آواز مزید تیز ہو گئی۔

"آج تو آنسو بہا رہی ہیں، مگر جب ملیحہ کی موت کا تماشا بنا رہی تھیں اس وقت آپ کے آنسو کہاں تھے؟"

"میں نے ملیحہ کی موت کو تماشا نہیں بنایا۔" وہ چلا اُٹھیں۔ "ہاں، وہ بدنصیب تھی۔ مگر کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب ہو جائے گا۔" پھر وہ آنسو پونچھے بغیر ہولے سے بولنے لگیں۔ "مجھے آج بھی یقین نہیں آتا کہ ملیحہ مر چکی ہے۔ کس نے سوچا تھا وہ اس طرح مر جائے گی۔ جیتے جی کبھی نہیں ستایا اور مر کر سب کے لئے عمر بھر کا عذاب بن گئی۔" انہوں نے تانیہ کی طرف دیکھا۔ "یہ کوئی پریوں کی داستان نہیں، جسے سننے کے شوق میں تم یہاں چلی آئیں۔"

"جانتی ہوں، یہ پریوں کی داستان نہیں ہے۔ مگر پری کی داستان تو ہے، جو جادو نگری میں کھو گئی۔" ان کے پاس بیٹھتے ہوئے تانیہ نے اس بار رسان سے کہا تھا۔ سمیرا بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگیں اور دھیرے

دھیرے ماضی کے پردے ہٹانے لگیں۔

آفاق چونک تو تبھی گیا تھا، جب اس نے شام کے پس منظر میں ملیحہ اور وجدان کو ایک دُوجے میں کھوئے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر اس نے خود کو کسی بھی طرح قیاس آرائی سے محفوظ رکھا۔ وہ ملیحہ اور وجدان دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ملیحہ سلجھی ہوئی، سمجھ دار لڑکی تھی اور وجدان بھی سلجھے مزاج کا شخص تھا جو اپنے کام سے کام رکھنا پسند کرتا تھا۔ آفاق نے اسے کبھی لڑکیوں میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا تھا، ان دونوں سے ہی کسی نادانی کی امید رکھنا فضول تھا۔ بعد کے دنوں میں آفاق نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے بے نیازی برتتے ہی دیکھا مگر اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ پوری جان سے ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہیں۔ پھر وہ لمحوں کی بے اختیاریاں بھی آفاق سے چھپی نہ رہ سکیں۔ لیکن وہ مستقل انہیں اپنا وہم سمجھ کر جھٹکتا رہا۔ مگر جس دن نورالہدیٰ ملیحہ کو لینے آئے تھے، آفاق نے گیٹ سے اندر آتے ہوئے دونوں کو ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔

آفاق اسے باہر گاڑی تک چھوڑ کر واپس آیا تو بھی وجدان وہیں کھڑا تھا۔

''کہاں کھو گئے؟''

وجدان نے اپنے خیال سے اُبھر کر آفاق کو دیکھا۔

''میں نہیں کھویا، دل کھو گیا ہے۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟'' آفاق سنجیدہ ہوا۔ وجدان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں، مذاق کر رہا ہوں۔ اور اب اندر چلو۔ یہاں تو بہت دھوپ ہے۔'' وجدان بات بدل گیا تھا، لیکن آفاق کو یقین ہو گیا کہ ان دو سلجھے ہوئے لوگوں کے درمیان کوئی اُلجھا ہوا سا تعلق ضرور ہے۔ وہ وجدان سے اس بارے میں کھل کر بات کرنا چاہتا تھا، مگر اس روز موقع نہیں مل سکا اور اگلے دن آفاق اور سمیرا ہنی مون کے لئے شمالی علاقہ جات چلے گئے۔ پھر دس دن بعد ان کی واپسی ہوئی۔ دوسرے ہی دن وہ وجدان سے ملنے اپنے پاپا کے آفس گیا تھا۔ مگر وہ وہاں ملا ہی نہیں تو واپس آ گیا۔

''آج آفس آئے تھے؟'' رات کو ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے دوران منیر حسن نے آفاق سے پوچھا۔

''وجدان سے ملنے گیا تھا......''

''اور جناب وہاں تھے نہیں۔'' اس کی بات کاٹ کر منیر حسن نے اس کی بات پوری کی۔ آفاق خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ کیا کہتا؟ وہ تو وجدان کے لئے بے حد پریشان تھا۔

اگلے دن آفس سے واپسی پر اس کے گھر چلا گیا، مگر وہ گھر پر نہیں تھا۔ آفاق اس کے نام میسج چھوڑ آیا، لیکن وجدان ہنوز لاپتہ ہی رہا۔

آج 17 دسمبر تھا اور آفاق جانتا تھا کہ آج ملیحہ کی ایگزبیشن ہے۔ وہ کچھ دن پہلے ہی پاس لے آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ملیحہ کو سرپرائز دے گا۔

آفس سے فارغ ہو کر سیدھے آرٹس کونسل جانے کے بجائے آفاق ڈیلی نیوز پیپر کے آفس آ گیا۔

''آرٹس کونسل میں زبردست ایگزیبشن لگی ہے، چلو گے؟'' وہ اپنے رپورٹر دوست ساجد کی ڈیسک پر آ کر بولا۔

''چلو گے؟'' وہ اچنبھے سے بول کر ہنسا۔

''میں تو لیٹ ہو گیا ہوں یار! میرا اسسٹنٹ رپورٹر اس وقت آرٹس کونسل میں بیٹھا مجھے دعائیں دے رہا ہو گا۔ شام کے اخبار میں نمائش کی کور رپورٹ چھاپنی ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا، ڈائریکٹ رہیں پہنچ جائے، میں بھی سیدھا وہیں آؤں گا۔ لیکن ایڈیٹر صاحب نے بلوا لیا۔ اب وہ میری جان چھوڑیں تو میں جاؤں۔''

''کتنی دیر لگے گی؟''

''بس یہ رپورٹ فائنل کر دوں، پھر چلتے ہیں۔'' اس نے کہا اور رپورٹ میں گم ہو گیا۔

آفاق ایک کرسی پر بیٹھ کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ ساجد نے جلدی ہی اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ وہ رپورٹ ایڈیٹر کے ٹیبل پر رکھ کر واپس آیا تو آفاق اسے دیکھ کر اُٹھتا ہوا بولا۔

''ویسے وجدان بھی اگر ہوتا تو مزا آ جاتا۔''

''ہاں یار! ہماری تکڑی پوری ہو جاتی۔'' ساجد بھی بولا۔ ''چل پھر اسے بھی اُٹھا لیتے ہیں۔''

''پر اُٹھانا کہاں سے ہے؟ یہ بھی تو پتہ ہو۔'' آفاق کے جواب میں وہ بولا۔

''لائبریری سے۔''

''آفاق حیران ہوا۔ ''لائبریری سے؟''

''آ، تجھے راستے میں بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور آفاق کو ساتھ لے کر چل پڑا۔

''یہ لائبریری کا کیا چکر ہے؟'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے آفاق نے ساجد سے پوچھا۔

''چکر لائبریری کا نہیں، لڑکی کا ہے۔''

''وجدان اور لڑکی کا چکر......امپوسبل۔'' آفاق حیران ہوا۔ ''وہ تو لڑکیوں کو بھاؤ تک نہیں دیتا۔''

''اور لڑکیاں ہمیں بھاؤ نہیں دیتیں۔ پر دیکھ لو! تمہاری شادی بھی ہو گئی اور میری منگنی بھی۔ بھائی! یہ جو دنیا ہے نا، اتفاقات کا مجموعہ ہے۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سورج مغرب سے نکل سکتا ہے، دیا آندھی میں جل سکتا ہے، پانی میں آگ لگ سکتی ہے اور......وجدان کو محبت ہو سکتی ہے۔''

''تُو مجھے آج بتا رہا ہے۔'' اس کی ساری بکواس کے جواب میں آفاق بگڑ کر بولا۔

''مجھے بھی کچھ دنوں پہلے ہی پتہ چلا ہے۔ وہ بھی اتفاقاً۔'' اس نے بدک کر صفائی میں کہا تو آفاق بولا۔

''ٹریلر تو دکھا دیا، فلم بھی دکھا دو۔''

''یار! کوئی اتنی لمبی چوڑی بات نہیں ہے۔ دو، تین مہینے پہلے میں اور وجدان لائبریری میں گئے تھے۔ وہاں

وہ بار بار ایک لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ لڑکی تھوڑی سی خوب صورت تو تھی، پر سچ بات ہے مجھے تو ایسی خاص نہیں لگی کہ وجدان جیسا گہرا بندہ اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی متاثر ہو جائے۔ پھر وہ لڑکی اُٹھ کر چلی گئی۔ ہم لوگ بھی اپنے کام سے فارغ ہو کر اُٹھ گئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ بلکہ اس کے بعد سے جو اسے لاپتہ رہنے کی بیماری ہوگئی ہے تو مجھے شک بھی نہیں ہوا کہ یہ اس لڑکی کے چکر میں لائبریری جاتا ہوگا۔ وہ تو پرسوں میں وہاں گیا تو اسے وہاں دیکھا، پھر خود ہی میرے پوچھنے پر بتانے لگا کہ صبح سے شام تک لائبریری میں رہتا ہوں۔ لائبریری بند ہونے کے بعد سڑکیں ناپتا ہوں۔ پھر جب نیند آنے لگتی ہے تو گھر چلا جاتا ہوں۔ بس اسی بات پر مجھے شک ہوا۔ اس سے پوچھا تو ہنسنے لگا...... لیکن تردید بھی نہیں کی۔'' وہ آخری جملے پر سوچتا ہوا بولا۔

''ہوں۔'' آفاق گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بار بار اس شام کا منظر گھوم رہا تھا جس میں تخت پر بیٹھی ملیحہ کھوئے سے انداز میں اپنے سامنے بیٹھے وجدان کو دیکھ رہی تھی، جس کے انداز میں بھرپور وارفتگی تھی۔ آفاق کی پیشانی پر لکیریں سی اُبھر آئیں۔ وجدان لائبریری کی پتھریلی سیڑھیوں پر بیٹھا کتاب کے ورق اُلٹ رہا تھا جب آفاق اور ساجد اس کے سر پر آ پہنچے۔

''اگر علم کے سمندر میں یوں ہی غوطے پہ غوطہ لگاتے رہے تو کسی دن ڈوب جاؤ گے۔'' آفاق نے ہاتھ مار کر کتاب بند کر دی۔ ''اُٹھ، ہم تجھے لینے آئے ہیں۔''

''مگر میں نہیں جا سکتا۔'' اس نے فوراً انکار کر دیا۔

''کیوں؟''

جواب میں وجدان گریز کے کچھ پلوں کے بعد بولا۔ ''میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔''

اُس کی بات سن کر ساجد بولا۔ ''جس کے انتظار میں تُو تین مہینے سے دھول پھانک رہا ہے، وہ آج بھی نہیں آئے گی۔''

''میں نے کبھی بھی اس کے آنے کی شرط اپنے انتظار کے سامنے نہیں رکھی۔

''تو تم مانتے ہو کہ تم اس لڑکی کے انتظار میں یہاں آئے ہو۔'' ساجد اچانک ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''نہ ماننے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟'' وہ آہستہ سے بولا۔

''وجدان! مجھے تم سے اس پاگل پن کی اُمید نہیں تھی۔'' آفاق چڑ سا گیا۔ ''جس لڑکی کی تم نے صرف شکل ہی دیکھی ہے، اس کے لئے تم خود کو اس طرح برباد کر رہے ہو، کیا یہ دیوانگی نہیں ہے؟''

''ہے تو۔'' وہ مسکرایا۔

''اور دیوانے کو صرف اپنی دیوانگی سے مطلب ہوتا ہے۔''

''ایک دن کے ناغے سے تیری دیوانگی میں کوئی فرق نہیں پڑ جائے گا۔ نہ وہ آ کر تیری غیر حاضری نوٹ کرنے والی ہے۔ اب اُٹھ جا۔'' ساجد نے کہا پھر اس کے نہیں، نہیں کرنے کے باوجود وہ دونوں اُسے گھسیٹے

ہوئے گاڑی میں لے آئے۔ وہ آیا تو بے دلی سے تھا، مگر نمائش میں ملیحہ کو دیکھ کر وہ اس اتفاق پر حیران رہ گیا۔ آفاق نہ جانے کدھر تھا اور اس کے ساتھ کھڑا ساجد کسی سے انٹرویو لے رہا تھا۔ وجدان اپنے آپ ہی اس کی طرف چل پڑا۔ اس کے ہاتھ میں ساجد کا کیمرہ تھا۔ بنا سوچے ہی غیر ارادی طور پر اس نے ملیحہ کی کئی تصویریں کھینچ لیں۔ اپنے چہرے پر فلیش کی روشنی محسوس کر کے ملیحہ اس طرف متوجہ ہوئی تو وجدان کو دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئی۔

وہ دونوں ہر طرف سے بے گانہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ تبھی آفاق اس طرف چلا آیا۔ رنگ تو اس نے ملیحہ کے چہرے پر بھی دیکھے تھے، مگر وجدان کی آنکھوں کی چمک نے اسے واقعی اُلجھا دیا تھا۔ ملیحہ پلٹ چکی تھی۔ آفاق چلتا ہوا وجدان کے پاس آ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گمبھیر لہجے میں بولا۔

”وہ میری بہن ہے۔“

وجدان نے اس کی طرف دیکھا جو جاتی ہوئی ملیحہ کو دیکھ رہا تھا۔

”اور میں، تمہاری بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص واضح انداز میں بے دھڑک بولا تھا۔ آفاق اسے دیکھتا رہا، پھر اس کے شانے سے ہاتھ ہٹا کر بولا۔

”باہر چل کر بات کرتے ہیں۔“

”میں نے ملیحہ کو پہلی بار لائبریری میں دیکھا تھا۔“ وہ گھاس پر آفاق کے مقابل دونوں ہاتھ پیچھے ٹکائے دُور آسمان کی وسعت میں کھویا کہہ رہا تھا۔ ”میں وہاں ساجد کا انتظار کر رہا تھا کہ ملیحہ کو آتے دیکھا۔ پہلی غیر ارادی نظر کے بعد میں نے ان پر سے نگاہ ہٹالی تھی۔ پر نظر ہٹانے کے بعد میرا دل چاہا، ایک بار اور ان کی طرف دیکھوں۔ اپنی یہ خواہش مجھے بھی عجیب لگی تھی۔ میں ان پر سے توجہ ہٹانے کے لئے کتاب پڑھنے لگا اور تھوڑی دیر میں ہی ساجد بھی آ گیا تھا۔ مگر میں ملیحہ سے اپنی توجہ ہٹا نہیں پایا۔ وہ ایسی جگہ بیٹھی تھیں کہ ہر بار صفحہ اُلٹتے وقت میری نظر ان کے چہرے پر ٹھہر جاتی۔ اتنے فاصلے اور اونچائی پر ہونے کے باوجود مجھے ان کا ہر نقش بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں ان کی پلکوں کا اُٹھ کر گرنا محسوس کر رہا تھا۔ ان کی گردن کی ہر حرکت کے ساتھ ان کے گلے میں پڑی باریک چین پر پڑتے بل بہت واضح نظر آ رہے تھے۔ ان کے بال بار بار ان کے چہرے پر آ جاتے اور وہ انہیں اپنے چہرے سے ہٹانے کے لئے ہاتھ سے سمیٹ کر پیچھے کرتیں تو ایسے میں ان کی کلائی میں پڑی چند چوڑیاں کھنک جاتیں۔ میں اس کھنک کو سن رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ بالکل میرے سامنے بیٹھی ہیں۔“

وہ رُکا اور پھر مسکرا کر گویا ہوا۔

”پھر ایسا لگا کہ وہ ڈسٹرب ہو رہی ہیں۔ وہ ایک دم سے کتاب پر سے نگاہ ہٹا کر اردگرد دیکھتیں اور پھر دوبارہ سر جھکا کر کتاب پڑھنے لگتیں۔ مگر کچھ دیر بعد وہ پھر سے اپنے آس پاس دیکھنے لگتیں۔ شاید انہوں نے

میری نظروں کو محسوس کرلیا تھا۔'' وہ مسکرایا، پھر مسکراہٹ روک کر بولا۔

''کچھ دیر بعد وہ اُٹھیں اور چلی گئیں۔ ایسا لگا، کوئی خواب ختم ہو گیا ہو۔ مگر خواب کا اثر باقی تھا۔ اگلے دن مجھے لائبریری میں کوئی کام نہیں تھا مگر پھر بھی لائبریری آ گیا۔ مجھے خود بھی اپنی اس حرکت کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ لیکن ملیحہ کو دیکھ کر کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ پھر وہ چلی گئیں تو میں بھی اُٹھ گیا، مگر اس روز ان کے جانے سے خواب ٹوٹا نہیں تھا۔ مستقل ہو گیا تھا۔ تیسرے دن پھر میں وہیں بالکونی میں آ کر بیٹھ گیا، مگر وہ نہیں آئیں تو میں پریشان ہو گیا۔ اگر وہ نہ آئیں تو..... وہ دو دن سے آ رہی تھیں۔ لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ آج بھی آتیں۔ اس خیال کے باوجود میں وہاں سے ہلا نہیں۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد وہ آ ہی گئیں، مگر میری نظروں نے انہیں کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ اُٹھ کر جانے لگیں۔ انتظار کے ان چند گھنٹوں نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اب میں ان کے بغیر جی نہیں سکتا۔ میں بھی ان کے پیچھے باہر آ گیا اور سیڑھیوں پر انہیں آواز دے کر روک لیا۔ انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور میں نے ان کی آنکھوں میں۔''

بولتے بولتے ہی یک دم وجدان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

''نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ اگر کچھ بچا بھی تھا تو ان آنکھوں میں ڈوب گیا۔ میں نے ان سے کہا، آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' اتنا کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا اور ہنسی کے بیچ کہنے لگا۔ ''بہت غصہ آ گیا تھا انہیں۔ اتنا غصہ کہ مجھے ڈانٹ بھی نہیں سکیں۔ پر میں نے ان سے کہہ دیا کہ اپنے سوال کے جواب کے لئے میں قیامت تک ان کا انتظار کروں گا۔ تیسرے دن وہ آئیں تو، مگر میرے انتظار کے لئے نہیں، کتاب واپس کرنے۔ لیکن اتنا بھی غنیمت تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنے پر راضی ہو گئیں۔ مجھے نہیں پتہ محبت کا اظہار کیسے کرتے ہیں، مجھے صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دوں، مجھے واقعی محبت کا اظہار کرنا نہیں آیا۔ اس دن کے بعد ملیحہ پھر وہاں نہیں آئیں۔'' وہ اب گردن گرائے گھاس کو دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔

''دو مہینے ہر روز صبح سے شام تک میں ان سیڑھیوں پر بیٹھا دعا کرتا کہ جواب دینے نہ سہی، مگر وہ اپنا چہرہ دکھانے ہی آ جائیں۔ وہ تو نہیں آئیں، مگر میں ان کی جھلک دیکھنے ان کے پاس پہنچ جاؤں گا، ایسا تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اس شام تمہارے گھر میں ملیحہ کو دیکھ کر مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا۔ پتہ ہے ان کا انتظار کرتے کرتے اکثر میں خود سے اُلجھ پڑتا۔ میں ان کی خاطر مٹتا جا رہا ہوں اور انہیں احساس ہی نہیں ہے۔ مگر اس روز محسوس ہوا، وہ اتنی بھی بے نیاز نہیں۔'' بولتے بولتے اس نے نظر اٹھا کر آفاق کو دیکھا۔

''لیکن یہ احساس میرے لئے کافی نہیں ہے آفاق! میں زندگی کا ہر پل ان کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں۔ مجھے وہ حق چاہیے کہ انہیں اپنا کہہ سکوں۔' وہ چپ ہوا اور یوں ہی ہاتھ آگے کر کے جھاڑنے لگا۔ آفاق نے اسے دیکھا اور پوچھا۔

''ملیحہ نے کبھی اس بارے میں تم سے بات کی ہے؟''

"ایک بار ان کی آنکھوں میں اپنا عکس تو دیکھا تھا، لیکن ان کی زبان سے اب تک وہ الفاظ نہیں نکلے جو میں سننا چاہتا ہوں۔" وہ رُکا، پھر سنجیدگی سے بتانے لگا۔ کل انہوں نے مجھے لائبریری بلایا ہے۔"

"تم ملیحہ کے ساتھ سیریس ہو نا؟" وجدان نے نظر اٹھا کر آفاق کو دیکھا۔

"تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"بات اعتبار کی نہیں ہے وجدان!" آفاق اس پر سے نظر ہٹاتا آہستہ سے بولا۔ "ملیحہ بہت سادہ سی لڑکی ہے۔ مصلحتوں اور سمجھوتوں کو نہیں جانتی۔ جانتی ہے تو صرف اتنا کہ پیار کرنا ہے تو کرنا ہے، وہ بھی پوری ایمانداری کے ساتھ۔ کہیں کوئی احساس بچا کر نہیں رکھتی۔ پاگل ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ گہری محبت کے زخم بھی گہرے ہوتے ہیں۔ مگر حساس بھی ہے، خراش لگ جائے تو تڑپ اُٹھتی ہے، کہیں زخم لگ گیا تو جھیلنا مشکل ہے۔ خیال رکھنا وجدان! اُسے کبھی چوٹ نہ لگے۔"

"آئی پرامس۔ خود پر جھیل لوں گا، لیکن ملیحہ کو تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔" اس نے پورے دل سے وعدہ کیا۔ آفاق یقین کرنے والی مسکراہٹ کے ساتھ اُٹھا، اسے بھی اپنے ساتھ اُٹھنے کو کہا۔

"چلو اندر چلتے ہیں۔ میں ابھی ملیحہ سے بھی نہیں ملا۔"

"تم جاؤ۔ میں تو اب گھر جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ملیحہ کی موجودگی میں، میں خود کو روک نہیں پاتا۔ اور تمہارے ہوتے یہ سب مناسب نہیں لگتا۔" اس کے سنجیدگی سے بولنے پر آفاق نے مصنوعی خفگی سے وجدان کو گھورا۔

"ابھی جو اتنا بکواس کر رہے تھے، تب خیال نہیں آیا کہ کچھ سنسر کر لے۔ اور اب اندر جاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔" اور وجدان نے فوراً ہی اس کی غلط فہمی دور کر دی۔

"میں ملیحہ کے خیال سے کہہ رہا ہوں، اس سچویشن میں کوئی بھی بہن، بھائی کی موجودگی سے سٹپٹا جائے گی۔ اللہ حافظ!" وہ جانے لگا تو آفاق نے کہا۔

"بھائی! ساجد کا کیمرہ تو دے دے۔ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟"

"ارے یار! بھول گیا۔" اپنے سر پر ہاتھ مار کر گلے سے کیمرہ نکال کے اس نے آفاق کو پکڑایا اور ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔

✿✿✿

وہ ایک خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کیا ہوا لاؤنج تھا، جس میں رات کے کھانے کے بعد سب لوگ بیٹھے چائے کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے۔ ڈبل صوفے پر مصطفیٰ عظیم اپنے بڑے بیٹے مزمل کے ساتھ بیٹھے تھے، جبکہ ان کے مقابل سنگل صوفے پر عائشہ بیگم بیٹھی تھیں۔ سامنے مزمل مصطفیٰ کی بیوی انیقہ تھی اور وجدان ان کی باتوں

سے الگ تھلگ کارپٹ پر اپنے ایک سال کے بھتیجے کو گود میں لئے اس کے ساتھ بظاہر کھیل رہا تھا۔ مگر اندر اندر وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا، بات کیسے شروع کرے۔ پھر اس نے اچانک ہی دھماکہ کر دیا۔ کسی کو خاص طور مخاطب کیئے بغیر اس نے اچانک کہا تھا۔

”میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

وہاں بیٹھے ہر شخص کو یہ سن کر یقیناً خوشی ہی ہوئی تھی، مگر اُس کا جملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ کوئی ردِعمل ہی نہیں آیا۔ مصطفیٰ عظیم حیرت سے سنبھل کر بولے۔

”ہمارے لئے تو یہ خوشی کی خبر ہے، مگر تم نے جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس کے بعد یقیناً لڑکی اور اس کے گھر والوں کے لئے یہ سال کی سب سے بری خبر ہو گی۔“

”ابو! آئی ایم سیریس۔“ ان کے مذاق پر وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”even I am serious son“ انہوں نے ایک دم سنجیدہ ہو کر کہا۔

”میں نے کبھی بھی اپنے بیٹوں سے لاپروائی اور غیر ذمہ داری کی امید نہیں کی تھی۔ اور تم سے even beyond my thoughts.“

”خود مجھے وجدان سے ایسی حرکتوں کی اُمید نہیں تھی، مگر اب اسے لیکچر مت دیں۔ مجھے اس کی لاپروائی کی وجہ سمجھ آ گئی ہے۔“ عائشہ مصطفیٰ نے اپنے شوہر کو بیٹے کی کلاس لیتے دیکھ کر ٹوکا، پھر معنی خیزی سے بولیں۔

”غلطی وجدان کی نہیں ہے مصطفیٰ صاحب! بلکہ میری اور آپ کی ہے۔ بیٹا جوان ہو گیا ہے اور اسے خود بولنا پڑا کہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ یہ بات ہمارے سوچنے کی تھی۔“

”بالکل امی! یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ وجدان بے شک ذمہ دار لڑکا ہے، پر کوئی ہو تو جس کے لئے ذمہ داری اُٹھائے جائے۔ کیوں مزمل! آپ کا کیا خیال ہے؟“ انیقہ نے شوخی سے بولتے ہوئے اپنے شوہر سے رائے مانگی۔

”شریف آدمی کبھی بیوی سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ اور یہاں تو اختلاف کی گنجائش بھی نہیں۔“

”تو پھر طے ہو گیا، اگلے ہفتہ میں ہی ہم سب جا کر انیقہ کے ماں باپ سے شہلا کا ہاتھ مانگ لیں گے۔“

”ایک منٹ امی!“ چپ بیٹھا وجدان، شہلا کے نام پر ایک دم بولا۔ ”میں شہلا سے شادی نہیں کر سکتا۔“

سب سے زیادہ انیقہ کو یہ بات ناگوار گزری تھی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر وجدان نے کہا۔

”سوری بھابی! شہلا واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”جب اچھی ہے تو انکار کی وجہ؟“ مصطفیٰ عظیم نے کسی قدر ناگواری سے پوچھا۔

”میں ملیحہ فاروقی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ ایک سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر وجدان نے جواب دیا۔ ہر کوئی چپ رہ گیا تھا۔ انیقہ کو لگا کہ اس لمبی خاموشی کی وجہ اس کی وہاں موجودگی ہے۔ اس خیال سے وہ اُٹھی اور

وجدان کے پاس آ کر بچے کو اس سے لے کر وہاں سے چلی گئی۔

"آج کی بات نہیں ہے وجدان! مزمل کی شادی کے کچھ ہی مہینوں بعد انیقہ کے اخلاق کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا، وقت آنے پر شہلا کو بہو بنا کر لاؤں گی۔"

"مگر میں آپ کی سوچ میں کبھی شامل نہیں رہا۔ اور میں تو حیران ہوں، آپ نے نہ صرف سوچ لیا، بلکہ بھابی سے بھی بات کر لی اور مجھے آج پتہ چل رہا ہے۔" وجدان کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔

"ہمیں بھی تو آج پتہ چل رہا ہے۔" وہ خفگی سے بولیں۔ پھر خیال آنے پر بولیں۔ "اور تمہیں کہاں مل گئی وہ؟.....کیا نام ہے، خیر جو بھی ہو۔" انہوں نے ملیحہ کا نام یاد کرنا چاہا، پھر کسی کے یاد دلانے سے پہلے ہی ارادہ بدل دیا۔

"ان کا نام ملیحہ فاروقی ہے۔" وجدان کو ان کا انداز اچھا نہیں لگا تھا، اسی لئے ملیحہ کا نام بتا کر کہا۔ "اور میں ان سے لائبریری میں ملا تھا۔"

"اور یہ سب کب سے چل رہا ہے؟" مصطفیٰ اعظیم نے بیٹے کو دیکھ کر پوچھا۔

"تین مہینے ہونے والے ہیں۔" عائشہ بیگم کو ایک دم سے دھیان آیا۔

"اچھا، تو اتنے مہینے سے تم جو سارے کام دھندے چھوڑ کر نہ جانے کہاں پھرتے رہتے ہو تو اس کی وجہ یہ لڑکی ہے۔"

"جی۔" اس کا لہجہ اب بھی متوازن تھا۔

"بہرحال، تمہاری شادی شہلا سے ہی ہو گی۔" انہوں نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"مگر میں ملیحہ سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

عائشہ بیگم نے سنا تو بھڑک گئیں۔

"ہاں، اب یہی سننا باقی رہ گیا تھا۔ ٹھیک ہے۔ خود ہی سارے فیصلے کرو۔ ہمیں تمہارے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق ہی کیا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے امی!" وہ ان کی ناراضی پر پریشان سا ہو گیا، پھر ان کے برابر بیٹھ کر اپنا بازو ان کے گرد لپیٹتے ہوئے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ "آپ ان سے ملیں گی تو وہ آپ کو بہت اچھی لگیں گی۔"

"میں شہلا سے کئی بار مل چکی ہوں اور وہ مجھے پسند ہے۔"

"اب آپ ضد کر رہی ہیں۔" وجدان نے تھک کر کہا۔

"تو تم کیا کر رہے ہو؟" وہ بولیں۔

"محبت۔" اس نے ایک لفظ کہہ کر بات پوری کر دی اور اُٹھ کر چلا گیا۔

"سنا آپ نے مصطفیٰ اعظیم! آپ کا بیٹا کیا کہہ کر گیا ہے؟" اپنے شوہر کو چپ دیکھ کر وہ بولیں۔ وہ کچھ سوچ

رہے تھے، ان کی طرف چونک کر دیکھا اور توقف کے بعد کہا۔

''مجھے لگتا ہے عائشہ! تمہیں بیٹے کی بات مان لینی چاہئے۔''

''ایسے کیسے مان لوں؟'' وہ بدکیں۔

''کیا حرج ہے؟'' وہ ان کے بدکنے پر بولے۔ ''اس گھر میں شہلا بہو بن کر آئے یا ملیحہ، ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن وجدان کو فرق پڑے گا۔ آخر زندگی تو اسے گزارنی ہے۔''

''اور انیقہ، کیا اسے بھی فرق نہیں پڑے گا؟ اس کی چھوٹی بہن دیورانی بن کر اس گھر میں آنے والی تھی۔ اب کوئی اور آئے گی تو کیا اسے برا نہیں لگے گا؟ میرے کہنے پر وہ اپنے ماں باپ سے بھی بات کر چکی ہے۔'' اب تک چپ مزمل ان کی بات پر پریشان ہو کر بولا۔ ''امی! آپ کو بات اس حد تک بڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟ چلیں انیقہ تو میری بیوی ہے، لیکن اس کی فیملی کے سامنے مجھے کس قدر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''کسی چیز کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے کہہ دیا، شہلا ہی اس گھر میں آئے گی۔''

''تم نے تو کہہ دیا، لیکن جو ابھی وجدان کہہ کر گیا ہے، اس کا کیا؟...... بہو کیا سوچے گی، اس کی پرواہ؟ بیٹے کا خیال نہیں۔'' وہ واضح ملامت کر رہے تھے۔ عائشہ اس الزام پر اُچھل پڑیں۔

''خیال کیوں نہیں ہے؟ ماں ہوں اس کی، بہت سوچ سمجھ کر شہلا کا انتخاب کیا تھا کہ وجدان کے مزاج میں سنجیدگی ہے اور شہلا بھی کم گو اور دھیمے مزاج کی لڑکی ہے، پھر پڑھی لکھی اور خوب صورت بھی ہے۔ آپ خود جانتے ہیں، بتائیں ذرا، ہے کوئی کمی اس میں؟''

''کمی بے شک کوئی نہیں، پر اس کا کیا حل کہ وجدان کو ملیحہ پسند ہے؟''

''بس مصطفیٰ صاحب! آپ مجھ سے اس بارے میں کوئی بات نہ کریں۔ سمجھانا ہے تو بیٹے کو سمجھائیں کہ ماں کی بات مان لے۔ دشمن نہیں ہوں اس کی۔'' وہ ناراضی سے کہہ کر اُٹھیں اور چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد مصطفیٰ عظیم، مزمل کو مخاطب کر کے بولے۔

''ایسا لگتا ہے مزمل! وجدان واقعی اُس لڑکی میں انٹرسٹڈ ہے۔''

''میرے خیال سے تو ہے، ورنہ اس کے بارے میں بات کیوں کرتا؟ اور مجھ سے زیادہ تو وہ آپ سے قریب ہے۔ آپ بتائیں، وہ اس لڑکی میں کس حد تک انوالو ہوگا؟''

''وجدان جیسے شخص کے لئے حد کا لفظ استعمال کرنا ہی بے کار ہے۔'' اپنی رائے دے کر مزمل مصطفیٰ نے ان کی رائے مانگی تو وہ اُلجھے سے انداز میں بولے تھے۔

''پھر امی کو کیسے منائیں گے؟'' مزمل نے فکر مندی سے کہا تو مصطفیٰ صاحب کہنے لگے۔

''مان جائے گی۔ ویسے اس کا ردِعمل فطری ہے۔ اور دھچکا تو مجھے بھی لگا تھا، لیکن پھر میں نے محسوس کیا

وجدان، ملیحہ سے ڈیپلی انوالو ہے تو خود کو سمجھا لیا کہ زندگی تو اس کی ہے، اگر ملیحہ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے تو ہمیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔'' پھر مزمل کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''میری بیوی کو چھوڑو، یہ بتاؤ اپنی بیوی کو کیسے ہینڈل کرو گے؟''

''مجھے نہیں لگتا، انیقہ اس بارے میں مجھ سے کوئی بحث کرے گی۔ اس نے خود سنا ہے کہ وجدان کسی اور لڑکی میں انٹرسٹڈ ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے، اب وہ خود بھی وجدان کی شادی، شہلا سے نہیں ہونے دے گی۔''

''ہوں۔'' مصطفیٰ عظیم اس کی بات پر سر ہلانے لگے، پھر مزمل اپنے کمرے میں اُٹھ کر چلا گیا اور مصطفیٰ عظیم، وجدان کے کمرے میں آ گئے۔ تکیہ اونچا کر کے بیڈ پر نیم دراز یک ٹک سامنے دیوار کو دیکھتا ہوا وہ اتنی گہری سوچ میں تھا کہ ان کے آنے کو محسوس بھی نہیں کیا۔ مصطفیٰ عظیم اسے دیکھ کر مسکرائے اور چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''غم منایا جا رہا ہے۔'' وجدان نے ذرا سا چونک کر انہیں دیکھا اور سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر گہری نظروں سے وجدان کا چہرہ دیکھنے لگے۔ ''بہت پیار کرتے ہو؟''

وجدان سر کو جھکا کر یوں ہی مسکرانے لگا تو وہ اس کے کندھوں پر بازو پھیلا کر بے تکلفی سے بولے۔ ''کم آن سن! ہم دونوں ہمیشہ سے اچھے دوست ہیں۔'' انہوں نے اس کی تائید مانگی تو اثبات میں سر ہلا کر وہ دھیرے سے بولا۔

''بہت سے بھی زیادہ۔''

اسے پھر چپ ہوتا دیکھ کر وہ کہنے لگے۔ ''میری ہونے والی بہو کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟''

وجدان سمجھ رہا تھا کہ وہ اس طرح کی باتیں کر کے اس کا موڈ بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس لئے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''کیا بتاؤں؟''

وہ سوچتے ہوئے بولے۔ ''جو بھی تم جانتے ہو۔ اچھا چلو یہ بتاؤ، دیکھنے میں کیسی ہے؟''

وہ ذرا سا مسکرا کر بولا۔ ''اچھی ہیں۔''

''بس؟'' مصطفیٰ عظیم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''یہی سوال اگر میں تمہاری عمر کے کسی دوسرے لڑکے سے کرتا تو وہ کہتا۔ ستارہ سی آنکھیں ہیں، پنکھڑیوں جیسے ہونٹ ہیں، گھٹاؤں جیسی زلفیں ہیں، ایسا حُسن میں نے اور کہیں نہیں دیکھا ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ اور تم...... بس اچھی ہیں۔''

وجدان اُن کے اسٹائل پر ہنسنے لگا۔ وہ چپ ہوئے تو ان کو دیکھ کر کہنے لگا۔

''ستارہ سی آنکھیں۔'' اس نے کہا اور ملیحہ کی آنکھوں کو یاد کرنے لگا۔ ''پتہ نہیں، ان کی آنکھیں ستارہ سی ہیں یا نہیں، پر جس طرف اُٹھ جاتی ہیں، وہاں روشنی ہو جاتی ہے۔ ہونٹوں پر بھی کبھی دھیان نہیں دیا، لیکن ان کی

مسکراہٹ سچ میں بہت پیاری ہے۔اور زلفیں شاید گھٹاؤں جیسی ہی ہوں، کبھی نوٹ نہیں کیا۔ ہاں مگر جب
کے بال ہوا سے لہراتے ہیں تو لگتا ہے، گھٹا برس رہی ہے۔ میں کبھی کبھی حیران ہو جاتا ہوں، کوئی اتنا
کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کا حُسن آس پاس کی ہر چیز کو حسین بنا دے۔'' پھر وہ اچانک ہی بولتے ہوئے چپ
گیا۔ مصطفیٰ عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''امی بہت ناراض ہیں نا؟''

''یہ مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ پہلے ناراض ہو جاتی ہیں، پھر مان بھی جاتی ہیں۔تمہاری ماں بھی مان جا
گی، فکر مت کرو۔'' اس کے بال بکھیرتے ہوئے انہوں نے ایسے کہا، جیسے وجدان چھوٹا بچہ ہو۔ پھر گلے
اُس کی پیٹھ تھپکی۔''آرام سے سو جاؤ۔ میں عائشہ کو سمجھا لوں گا۔تم ٹینشن مت لینا۔''

خود سے الگ کر کے انہوں نے وجدان کا ماتھا چوما، پھر جب تک وہ کمبل لے کر لیٹ نہیں گیا، وہ
کھڑے رہے۔ اس کے بعد لائٹ آف کر کے چلے گئے۔ مگر وجدان کوشش کے باوجود آنکھیں بند نہیں کر
حالانکہ مصطفیٰ عظیم سے بات کر کے وہ ہلکا سا ہو گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ ہر قیمت پر عائشہ مصطفیٰ کو راضی
لیں گے۔ انہیں وجدان سے ایسی ہی محبت تھی۔ مگر کوئی چیز پھر بھی اسے بے چین کر رہی تھی۔

شاید وہ نمکین پانی تھا جو ملیحہ کی آنکھوں سے بہہ کر گالوں سے پھسلتا گود میں رکھے اس کے ہاتھوں کی
ت پر بے آواز گر رہا تھا۔ وجدان اُٹھ بیٹھا اور اندھیرے میں اپنے ساتھ ہاتھ پھیلا کر ایک ہاتھ سے
رے ہاتھ کی پشت کو چھوا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کسی نے گرم سیال اس کے ہاتھوں پر انڈیل دیا ہو۔ مگر بابا
ن کا تو جسم ہی ایندھن بن گیا تھا۔ وہ بھلا کب ملیحہ کو اس گستاخی کی اجازت دے سکتے تھے؟ اس کے سامنے
ہر بھی ضبط کرتے رہے تھے، مگر اب غیض وغضب ان کے ہر انداز سے جھلک رہا تھا۔ تیز تیز راکنگ چیئر کو
گے پیچھے جھلاتے وہ مستقل اپنے اُبال کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پر اس کوشش کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں
رہا تھا۔ پھر وہ اُٹھ کر بیڈ تک آئے اور اپنے سب سے قریبی دوست ملک ناصر کو فون کرنے لگے۔
''ہیلو!'' کی آواز سنتے ہی بابا جان نے کہا۔
''ملک! میں آ رہا ہوں۔'' اور ان کی بات سننے سے پہلے فون رکھ دیا۔
''ملیحہ کے بارے میں آج تک جو بھی جانا، جو بھی سمجھا، جو بھی سوچا سب غلط، ایک ہی پل میں میری بیٹی
رے لئے اجنبی ہوگئی۔ میں سمجھتا تھا، ملیحہ میری مزاج آشنا ہے۔ وہ کبھی میری رضا کو فراموش نہیں کرے گی۔
ری راہ پر چلنا تو کیا، اس کے پیر میرے نقش قدم سے ہٹ کر کہیں نہیں پڑ سکتے۔ مجھ سے اختلاف وہ کبھی کر
نہیں سکتی، اور اس نے ہمیشہ ایسا ہی کیا۔ اس نے خود کو میرے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔ میں جو چاہتا، اس کے
ئے فیصلے کرتا اور ملیحہ بھی ان فیصلوں کو مانتی، بلا چوں چرا کئے۔ میرے ہر لفظ کو اس نے حکم کا درجہ دیا۔ ''نہیں''
لفظ میں نے اس کی زبان سے کبھی سنا ہی نہیں۔ بچے ضد کرتے ہیں، مگر اس نے تو کبھی فرمائش بھی نہیں کی۔
انے جو بھی دیا، اس نے قبول کر لیا۔ کبھی پسند ناپسند کا راگ نہیں الاپا۔ اور مجھے یقین ہو گیا، میری بیٹی میری
ند کے سانچے میں ڈھلی ہے۔'' ملک ناصر کے سامنے ان کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے اپنی بھڑاس
التے ہوئے وہ ذرا دیر کو تھمے، پھر دُکھ سے بولے۔
''مگر آج پتہ چلا، میرا یقین جھوٹا تھا۔ میری اجازت کے بغیر اس نے اپنے لئے ایک ایسی راہ کو پسند کیا جو
ے پسند نہیں۔ آج اس نے اختلاف کی جرأت کی ہے اور ایک فیصلہ بھی جسے وہ چاہتی ہے، میں مان لوں؟

جھک جاؤں اس کے سامنے۔'' وہ آتشی لہجے میں پھٹ پڑے، پھر اچانک ہی ان کا لہجہ سست ہو گیا۔

''مجھے لگتا تھا، ملیحہ سے زیادہ سعادت مند اور فرماں بردار بیٹی دنیا میں دوسری نہیں ہو گی۔ اور مجھ جیسا قسمت باپ بھی اور نہیں ہو گا۔ مگر مجھ سے زیادہ بدقسمت باپ اور کون ہو گا جو بیس سال بعد جانے کہ ابھی تک جو وہ اپنی بیٹی کو سمجھتا آیا تھا، وہ وہ نہیں ہے۔ کیا تم اس باپ کی تکلیف کو سمجھ سکتے ہو، جو اپنی ہی بیٹی ایسا ہو؟ میری بیٹی سعادت مند نہیں ہے، اور کون جانے فرماں بردار بھی ہو گی یا نہیں۔''

وہ چپ ہوئے تو ملک ناصر سمجھانے کے انداز میں بولے۔ ''میں اب بھی یہی کہوں گا اظہر! کہ تم بہت قسمت ہو جو تمہیں ملیحہ جیسی بیٹی ملی، جسے دیکھ کر ہمیشہ میرے دل میں یہ حسرت جاگتی ہے کہ کاش وہ میرے پیدا ہوئی ہوتی۔ وہ غلط نہیں ہو سکتی، مگر غلطی کر سکتی ہے۔ اگر تمہیں لگتا ہے کہ اس سے غلطی ہوئی ہے تو سمجھا کر صحیح راستے پر لے آؤ۔ لیکن ایک چیز مجھے بھی کھٹک رہی ہے۔'' انہوں نے بابا جان کو دیکھا اور ''نورالہدیٰ کو محبت کرنے کی اجازت دیتے ہو تو ملیحہ کو یہ اجازت کیوں نہیں ہے؟''

''کیونکہ میں ملیحہ کے لئے نورالہدیٰ کا انتخاب کر چکا ہوں۔ اسے محبت کرنے کی اجازت ہے، مگر نورالہدیٰ سے محبت کرنے کی۔ اور کسی سے نہیں۔ نورالہدیٰ کی کیا بات کرتے ہو؟ اس نے اس سے محبت جسے میں نے اس کے لئے پسند کیا۔ اس کی محبت میرے فیصلے پر تصدیق کی مہر ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کبھی بھی اس کی محبت کی پروا نہ کرتا۔ ماں باپ کی تابعداری اولاد پر فرض ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اولاد کا فرض صرف نورالہدیٰ نے نبھایا ہے۔'' ان کا انداز ملیحہ سے لاتعلقی والا تھا۔ ملک ناصر نے تاسف بھری نظر سے انہیں دیکھا۔

''بیٹی سے اس قدر بھی بدگمان نہ ہو جاؤ مظہر! کہ ظلم ہو جائے۔ یہی سوچ کر ملیحہ نے پہلی بار تم سے کچھ کہا ہے۔ ایک بار وجدان سے مل تو لو، پھر جو چاہے فیصلہ کر لینا۔''

''فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا ہے ملک!'' وہ مستحکم آواز میں بولے۔ ''ملیحہ کی شادی، نورالہدیٰ سے ہی ہو گی میں نے اب تک سوچا بھی نہیں تھا کہ کب...... مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اسی جمعے کو ملیحہ اور نورالہدیٰ کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ اور وہ لڑکا، دعا کرنا ملک! وہ لڑکا کبھی میرے سامنے نہ آئے، ورنہ میں اُسے جان سے مار دوں گا۔ اصل قصوروار تو وہی ہے، جو میری معصوم بچی کی سادگی کا فائدہ اٹھا رہا ہے، اسے ورغلا کر اپنی راہ میں لانا چاہتا ہے۔ ورنہ ملیحہ نے کبھی نوکروں تک سے ایک کے بعد دوسری بات نہیں کی۔ اور آج وہ مجھ سے بحث کر رہی تھی۔ ملیحہ ناسمجھ ہے، لوگوں کو پرکھ نہیں سکتی۔ اور وہ ملیحہ کی اس کمزوری کو اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ خوب جانتا ہوں، ان راہ چلتے لڑکوں کو اور ان کی سو کالڈ محبتوں کو، لڑکیاں ان کے لئے کھلونا ہوتی ہیں۔ لیکن اظہر فاروقی کی بیٹی کھلونا نہیں ہے۔ جن ہاتھوں نے اس سے کھیلنے کی جرأت کی، وہ جسم سے الگ ہو جائیں گے۔''

ملک ناصر نے سانس بھر کر بابا جان کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"جب سب کچھ طے کر چکے ہو تو یہ غصہ کس لئے ہے؟"

ان کی بات سن کر بابا جان کے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ سر کو ذرا سا جھکا کر کنپٹی مسلتے ہوئے انہوں نے سست لہجے میں کہا۔

"مجھے ملیحہ پر اتنا غصہ نہیں آ رہا، جتنا اپنے آپ پر۔ جس بیٹی سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی، آج کتنی سفا کی سے اسے کہہ دیا کہ مر جاؤ گی تو دفنا دوں گا۔ اتنی بڑی بات پتہ نہیں کیسے میرے منہ سے نکل گئی۔ ملیحہ بھی حیران رہ گئی ہو گی۔ بھلا کب اس نے میرے سخت لہجے کو سنا ہے؟ کبھی اس نے نوبت بھی تو نہیں آنے دی ہے۔ پتہ ہے، وہ رو رہی تھی۔" وہ لب بھینچ کر چپ ہوئے، پھر کہنے لگے۔ "بس ایک بار میں نے ملیحہ کو روتے دیکھا تھا، جس دن فریال کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ماں کی لاش سے لپٹ کر اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ میرا دل بہت چاہا کہ اس کے پاس جاؤں، آنسو پونچھ کر اسے گلے سے لگا کر کہوں، ماں مری ہے، مگر باپ تو زندہ ہے۔ اس طرح رو کر باپ کو تکلیف نہ دو۔ مگر کیسے اسے رونے سے منع کرتا؟ اس کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو کمرے میں بند ہو گیا، تا کہ اس کی روتی آنکھیں نظر نہ آئیں۔ اس کی بین کرتی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچے۔ اور اس وقت تک کمرے میں رہا، جب تک وہ روتے روتے تھک کر سو نہیں گئی۔" وہ رُکے، پھر دکھ سے بولے۔

"اور آج میں نے خود اُسے رُلایا ہے۔ آج بھی میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس کے پاس جاؤں، اسے چپ کراؤں۔ مگر آج بھی مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کے آنسو دیکھ سکوں۔" ملک ناصر کو ان کے الفاظ اور ان کے بکھرے بکھرے انداز پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ فریال کے بعد ملک ناصر ہی وہ دوسرے شخص تھے جو اس راز سے واقف تھے کہ باہر سے سخت نظر آنے والے اظہر فاروقی اندر سے بہت نرم تھے اور انہیں بھی اپنی نرمی کا احساس نہیں تھا۔

قصرِ فاروقی پہنچ کر بھی بابا جان ایک پل کے لئے چین سے نہیں بیٹھ سکے۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم تھے۔ باقی رات انہیں اپنے فیصلے کو مضبوط کرنے میں لگی۔ فجر کی نماز پڑھ کر وہ کمرے سے باہر آئے اور دھیرے دھیرے ملیحہ کے کمرے کو جاتی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دروازہ کھول کر انہوں نے نماز پڑھتی ملیحہ کی پشت کو دیکھا۔ وہ وہیں رک کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ملیحہ نے سلام پھیرا اور وہ کہنے لگے۔

"آج سے تین دن بعد یعنی جمعہ کے روز تمہارا نورالہدیٰ کے ساتھ نکاح ہے۔ تمہیں جو بھی تیاری کرنی ہو، آج اور کل میں مکمل کر لینا۔ بڑا فنکشن نہیں ہے۔ بس تمہارے ننھیال والے اور میرے کچھ دوست ہوں گے۔ شاید کچھ مہمان نورالہدیٰ کے بھی ہوں۔ تم جن کو بلانا چاہو، ان کے ناموں کی فہرست بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔"

اپنی بات کہہ کر انہوں نے ملیحہ کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی پر وہ آدھا چہرہ ہی دیکھ پائے۔ مگر وہ آدھا چہرہ پوری رات کی کہانی سنا رہا تھا۔ بابا جان کے اندر کشمکش چھڑ گئی تھی، مگر وہ اب بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن انہیں احساس تھا کہ وہ کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔ اسی لئے جب نورالہدیٰ سے بات کر کے اسٹڈی میں آئے تو خود اپنے فرار کی راہیں روکنے کے لئے عزیزوں، رشتے داروں کو فون کر کے ملیحہ اور نورالہدیٰ کی شادی کی اطلاع دے کر شام میں منگنی کے لئے دعوت دے ڈالی۔

افتخار حسن اس اطلاع پر حیرت سے مبارکباد دیتے ہوئے بولے۔ ''مبارک ہو بھائی صاحب! ویسے یہ خبر غیر متوقع تو نہیں ہے، لیکن کافی اچانک ہے۔''

''آپ کو بھی مبارک ہو۔ اور شام میں سب گھر والوں کو لے کر آ جایئے گا۔ منگنی کی چھوٹی سی تقریب ہے۔'' بابا جان نے دانستہ ان کی اگلی بات ان سنی کر دی تھی۔

''ضرور۔'' افتخار حسن نے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے ملیحہ کا فون آیا تھا، لیکن اس نے نہ شادی کے بارے میں بتایا، نہ منگنی کے بارے میں۔''

بابا جان چونکے۔ ''ملیحہ کا فون آیا تھا؟''

''ہاں۔ سمیرا سے بات ہوئی تھی۔ اس نے سمیرا کو فوراً بلوایا تھا، مگر شادی کے بارے میں یقیناً نہیں بتایا۔ ورنہ سمیرا ضرور ذکر کرتی۔ ابھی تک آپ کی طرف پہنچی نہیں؟'' آخر میں انہوں نے پوچھا۔

''راستے میں ہوگی۔ اچھا افتخار! میں فون رکھتا ہوں۔ باقی سب کو بھی اطلاع دینی ہے۔''

''جی بھائی صاحب! اللہ حافظ۔''

فون رکھ کر بابا جان سوچنے لگے کہ ملیحہ نے سمیرا کو کیوں بلوایا ہوگا۔ پھر جب سمیرا ان کے پاس آئی اور ان سے ملیحہ کو ساتھ شاپنگ پر لے جانے کی اجازت مانگی تو وہ فوراً ہی سمجھ گئے کہ ملیحہ نے سمیرا کو کیوں بلوایا تھا۔ انہوں نے سمیرا کو اجازت دے دی اور سمیرا کے جاتے ہی انہوں نے ریسیور اُٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے ملک ناصر نے فون اٹھا کر کہا۔

''ملک! تم ابھی آ سکتے ہو؟'' ان کی آواز سن کر بابا جان نے کہا۔

''ہاں، لیکن کیا بات ہے؟''

''فون پر نہیں بتا سکتا۔ تم آ جاؤ، پھر بات ہوگی۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ بہادر ان کی چائے لے کر آیا تو وہ ہنوز سوچ میں ڈوبے تھے۔ وہ کپ رکھ کر پلٹنے لگا تو بابا جان نے اسے روک کر کہا۔

''بہادر! ڈرائیور آ جائے تو اُسے میرے پاس بھیجنا۔''

''جی کرنل صاب!'' وہ سر ہلا کر چلا گیا۔ ملک ناصر چند منٹوں بعد قصرِ فاروقی میں تھے۔ انہوں نے لاؤنج میں سے گزرتے بہادر سے اظہر فاروقی کا پوچھا اور اسٹڈی میں آ گئے۔ بابا جان کے مقابل میز کے دوسری

طرف رکھی کرسی پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''اب بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''ملیحہ، وجدان سے ملنے گئی ہے۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولے تھے۔ ملک ناصر کچھ دیر خاموش رہے، پھر پوچھا۔

''تمہیں بتا کر گئی ہے؟''

''نہیں۔ بس میرا اندازہ ہے۔''

''غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''ہاں ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا کوئی چانس نہیں۔'' ابھی وہ بول ہی رہے تھے کہ ڈرائیور آ گیا۔

''ملیحہ کو لے کر آئے ہو؟''

''نہیں کرنل صاحب! بی بی، لائبریری کے پاس اُتر گئی تھیں اور کہا تھا کہ سمیرا بی بی کو ان کے گھر چھوڑ کر واپس آ جاؤں۔''

بابا جان ''ہوں'' کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ملک ناصر نے ڈرائیور سے کہا۔ ''تم جاؤ۔''

وہ چلا گیا تو بابا جان نے ہلکی آواز میں کہا۔ ''میری بیٹی نافرمان بھی ہو گئی ہے، لیکن میں اسے خود سے بغاوت نہیں کرنے دوں گا۔''

''تو کیا کرو گے؟'' ملک ناصر سرسراتے لہجے میں بولے۔

''وجدان کو قبول کر لوں گا۔''

ملک ناصر کے لئے یہ جملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ حیرت سے بول بھی نہ سکے اور بابا جان رُکے بغیر بول رہے تھے۔

''ملیحہ میری جان ہے۔ اور کوئی کتنی دیر اپنی جان پر عذاب برداشت کر سکتا ہے؟ اسے تکلیف پہنچا کر ایک رات کاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ ساری عمر اس احساس کے ساتھ کیسے گزار پاؤں گا کہ وہ میری وجہ سے دکھ میں ہے۔ کل وہ بار بار مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وجدان سے مل لوں۔ اگر آج وہ وجدان سے ملی تو اسے میرے پاس ضرور لائے گی۔ اور وہ لڑکا اگر ملیحہ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کا ہاتھ مانگنے میرے پاس آ جائے تو میں بخوشی ملیحہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں گا۔''

''اور نور الہدیٰ؟'' ملک ناصر نے مبہم سا سوال کیا۔

''وہ پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ ملیحہ کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہیں کرے گا۔ اور اگر اسے پتہ چل جائے کہ ملیحہ، وجدان سے شادی کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے وہ ہی ان دونوں کی وکالت کرے گا۔ اسے واقعی ملیحہ کا بہت خیال ہے۔ بلکہ وہ بدمعاش تو ملیحہ کی خاطر مجھ سے جھوٹ بولنے سے بھی نہیں چوکتا۔'' کچھ یاد کر

کے وہ مسکرانے لگے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی بھاری بوجھ ان کے سر سے سرک گیا ہو۔

❀❀❀

وجدان کی صبح بھاری سر کے ساتھ ہوئی تھی۔ رات نیند بھی بہت دیر سے آئی تھی، اس لئے آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ روز وہ آٹھ بجے لائبریری کے گیٹ پر ہوتا تھا۔ آج گھڑی میں نو بجتے دیکھ کر وہ اُچھل کر بستر سے اٹھ گیا اور چکراتے سر کی پرواکئے بغیر پندرہ منٹ میں تیار ہو کر بائیک کی چابی پکڑے وہ نیچے تھا۔ عائشہ ابھی اس سے ناراض تھیں، پر اسے خالی پیٹ گھر سے باہر جاتا دیکھا تو بول پڑیں۔

''جہاں جانا ہے، ناشتہ کر کے جاؤ۔''

وجدان نے لاؤنج میں رک کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف دیکھا۔

''امی! مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''دیر آفس کے لئے نہیں ہو رہی، جو ناشتے کے لئے پانچ منٹ نہ رُک سکو۔ سب جانتی ہوں، اسی لڑکی کے پیچھے جا رہے ہو۔'' ان سے تو کچھ بولنا فضول تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کے پاس آ کر آفس کے لئے تیار ناشتہ کرتے مصطفیٰ اعظیم سے کہا۔

''ابو! بس آج کا دن ہے۔ کل سے میں واپس فرم جوائن کر لوں گا۔''

''آج کیا معجزہ ہونے والا ہے؟'' عائشہ نے طنز کیا تو مصطفیٰ اعظیم ٹوک کر بولے۔

''بس کرو عائشہ!'' پھر وجدان کی طرف رخ کیا۔ ''بیٹے! ناشتہ کر لو۔''

''سوری ابو! میں بہت جلدی میں ہوں۔'' پھر اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے بائیک اُڑائے جا رہا تھا۔ مگر اس کے خیال کی رو اس سے بھی تیز بہہ رہی تھی۔ کبھی اس کا دھیان ملیحہ کی طرف مڑ جاتا، کبھی امی کی طرف۔ ان کا رویہ وجدان کو پریشان کر رہا تھا۔ مین روڈ پر آگے جا کر ایک کٹ تھا، جس سے سیدھے ہاتھ پر مڑ کر سامنے ہی لائبریری والی گلی تھی۔ وجدان کو اس کٹ سے مڑ جانا تھا۔ مگر اپنے خیالات میں اُلجھے اسے ذرا آگے جا کر دھیان آیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اگلے کٹ سے مڑ جاتا، اس نے موڑ مڑنے کے لئے بائیک کا ہینڈل پوری طرح سے گھما دیا۔ رفتار کافی تیز تھی۔ بائیک لہرائی اور سلپ ہو گئی۔ وجدان سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

پل بھر میں وہاں لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ کوئی ایمبولینس بلوانے کی بات کر رہا تھا اور کوئی پولیس کو اطلاع کرنے پر زور دے رہا تھا۔ پھر ایک بھلے مانس نے ایک ساتھ دونوں کام کئے۔ اس ہجوم سے کوئی بھی وجدان کے قریب جانے کو تیار نہیں تھا۔ بس ایک شخص نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کی نبض چیک کی اور ''زندہ ہے'' کی خوشخبری سنا کر پیچھے ہٹ گیا۔ لوگوں کی نظریں اس کے بے ہوش چہرے پر تھیں۔ یہاں سے ہٹتیں تو بائیک پر ٹھہر جاتیں، جس کا اگلا وِیل مڑ چکا تھا۔ مگر اسی ہجوم میں شامل ایک فقیر کی نظریں بائیک سے آگے فٹ پاتھ

کے پاس پڑے اس چھوٹے سے بیگ پر تھیں جس میں وجدان کے شناختی کارڈ اور لائسنس کے علاوہ کچھ رقم بھی موجود تھی اور جو کچھ دیر پہلے وجدان کی کمر سے بندھا تھا۔ مگر گرنے کے دوران بکل ٹوٹ جانے کی وجہ سے کھل کر الگ جا پڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا فٹ پاتھ تک آیا، پھر نظریں بچا کر وہ بیگ اٹھا کے اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔

''کوئی اندھے فقیر کی مدد کرتا جائے بابا!'' کی صدا لگاتا، لاٹھی ٹیکتا ہوا اپنی راہ ہو لیا۔ کچھ دیر میں ہی پولیس موبائل کے ساتھ ایمبولینس آ گئی۔ جو تھوڑا بہت ٹریفک چل رہا تھا، وہ بھی رک گیا۔ ملیحہ کی کار بھی اس ٹریفک جام میں پھنس گئی تھی۔ آخر اس نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا اور کار سے اُتر گئی۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نظر جائے حادثہ پر ڈالی، جہاں وجدان کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں چڑھایا جا رہا تھا۔ مگر ہجوم کی وجہ سے ملیحہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔

ایمبولینس کو بھیج کر پولیس نے وہاں موجود کچھ لوگوں کے بیان ریکارڈ کیے۔ پھر وقوعہ کا جائزہ لے کر بائیک موبائل میں ڈال کر چلے گئے اور ٹریفک بحال ہو گیا۔

لائبریری کی سیڑھیوں پر بیٹھی لمحہ گنتی ملیحہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چند کلومیٹر کے فاصلے پر بے ہوش وجدان کے دماغ کا ایکسرے لیا جا رہا تھا۔

❁❁❁

سمیرا نے ہال میں قدم رکھا تو سب گھر والوں کو وہاں جمع دیکھا۔ افتخار حسن اور منیر حسن بھی ابھی تک گھر میں موجود تھے۔

''آپ تو آفس چلے گئے تھے۔'' وہ آفاق کو دیکھ کر حیرت سے بولی جو اسے قصرِ فاروقی ڈراپ کر کے آفس چلا گیا تھا۔

''ہاں۔ مگر امی نے فون کر کے ملیحہ کی شادی اور شام میں انگیج منٹ کا بتایا تو رہ نہیں سکا اور اصل صورتِ حال جاننے کے لئے چلا آیا۔''

''پر تمہاری تو ملیحہ سے بات ہو چکی تھی۔ تو تم نے بتایا کیوں نہیں؟'' چچی، سمیرا سے بولیں۔

''ملیحہ نے فون پر بتایا ہی کہاں تھا چچی جان! وہ تو جا کر پتہ چلا۔''

''لیکن واپس کیوں آ گئیں؟ دوپہر کے بعد ہم بھی وہاں جانے والے ہیں۔ تم وہیں ملیحہ کے پاس رہ جاتیں۔ ایسے وقت میں وہ اکیلی ہے۔'' اب اس کی امی نے کہا تو سمیرا بولی۔

''وہ گھر پر نہیں ہے، شاپنگ کے لئے گئی ہے۔ آج اور کل کا دن ہی تو ہے، پرسوں تو مہندی ہے۔ کہا تو اس نے مجھے بھی تھا پر پوچھ کر نہیں گئی تھی۔ یوں بھی اتنی صبح شاپنگ کے خیال سے ہی مجھے چکر آ گئے تھے۔''

''پوچھنے کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، فون پر بتا دیتیں، کافی ہوتا۔'' منیر حسن نے کہا۔

''لیکن سمجھ نہیں آ رہا، پھوپھا جان نے ملیحہ کی شادی اتنی جلد بازی میں کیوں طے کی؟'' صمد نے وہ سوال پوچھا تھا جو آفاق کو پریشان کر رہا تھا اور جس کا جواب سوچ کر سمیرا ایک بار پھر پریشان ہو اُٹھی۔

''ہمارے لئے یہ اطلاع اچانک ہے۔ مگر بھائی صاحب نے تو پہلے سے ہی طے کر رکھا ہوگا۔ پھر جب وقت قریب آیا تو اعلان کر دیا۔'' اپنے پاپا کی بات پر آفاق کی گردن دھیرے دھیرے نفی میں ہلنے لگی۔ اسے پتہ نہیں کیوں یقین تھا کہ ملیحہ نے اپنے بابا جان سے بات کر لی ہوگی اور اب یہ شادی اسی کا ری ایکشن ہے۔ مگر اس نے خود کو بولنے سے باز ہی رکھا۔ صمد نے البتہ اختلاف کیا۔

''اگر ایسا ہوتا تو ملیحہ ضرور اس بات کا ذکر کرتی کہ درون خانہ اس کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں۔'' سمیرا کی امی بولیں۔

''جب بھائی صاحب نے ہی منہ سے بھاپ نہیں نکالی تو ملیحہ خود سے کیا کہتی؟ میرا تو خیال ہے، نورالہدیٰ کے پاکستان واپس آتے ہی سب معاملہ فٹ ہو گیا ہوگا۔ پھر تم نے دیکھا نہیں تھا، جب نورالہدیٰ، ملیحہ کو لینے آیا تھا، کیسے بھٹک بھٹک کر اس کا دھیان ملیحہ کی طرف جا رہا تھا۔ اب تایا زاد، چچا زاد، بہن، بھائی تو ہمارے گھر میں بھی ساتھ رہتے آئے ہیں، پر ایسی یگانگت تو کبھی نہیں دیکھی۔ ہاں رشتہ اگر منگیتر کا ہوتا تو ایسا ہوا کرتا ہے۔'' ان کے تجزیے سے کسی کو بھی اختلاف نہیں تھا۔ اسی لئے سب ''ہاں'' میں سر ہلانے لگے۔ آفاق لاتعلق سا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وجدان کو فون کر کے ساری صورتِ حال کے بارے میں بتائے۔ پر گھڑی میں دس بجے دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔ اسے معلوم تھا کہ دس بجے وجدان کو ملیحہ سے لائبریری میں ملنا تھا اس لئے اس وقت اس کا گھر پر ملنا مشکل تھا۔ وہ آفس جانے کے ارادے سے کھڑا ہوا۔

''میں آفس جا رہا ہوں۔'' اس نے سوچا، سمیرا اسے باہر تک حسبِ معمول چھوڑنے آئے گی تو اس سے بات کر کے اندازہ لگائے گا کہ اسے ملیحہ نے اپنے اور وجدان کے بارے میں کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ پر وہ اعصابی طور پر تھک چکی تھی۔ سمیرا نے اسے بیٹھے بیٹھے ہی ''اللہ حافظ'' کہہ دیا۔ آفاق نے سوچا اسے باہر آنے کو کہے۔ پھر خیال آیا، ملیحہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ واقعہ وجدان کے گوش گزار کر ہی دے گی جس کے بعد وجدان یقیناً اس سے کنٹیکٹ کرے گا۔ تو پھر سمیرا سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ممکن ہے ملیحہ نے اسے نہ بتایا ہو اور آفاق کی باتوں سے وہ مشکوک ہو جائے۔ سمیرا سے بات کرنے کا خیال ترک کر کے وہ آفس کے لئے نکل گیا مگر آفس میں بھی وہ اُلجھا ہی رہا۔ ہر بار جب اس کے ڈیسک پر رکھا فون بجتا تو وہ یہ سوچ کر فون اٹھاتا کہ شاید وجدان کا فون ہو۔ آخر تین گھنٹے بعد اس نے وجدان کے گھر فون ملا دیا جسے انیقہ نے ریسیو کیا تھا۔

''بھابی! السلام علیکم۔ آفاق بات کر رہا ہوں۔ وجدان گھر پر ہے؟''

''وعلیکم السلام۔ اور آج کل آپ کے دوست کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اتنا تو آپ بھی جانتے ہیں۔''

"مطلب وہ گھر پر نہیں ہے۔"

"صحیح سمجھے۔"

"اچھا....." آفاق نے اچھا کو لمبا کھینچا۔ "بھابی! اگر وہ گھر آئے یا اس کا فون ہی آجائے تو اس سے کہیے گا فوراً مجھ سے بات کرے۔ یوں سمجھیں ایمر جنسی ہے۔"

"ٹھیک ہے، اسے بتا دوں گی۔ اللہ حافظ!" فون رکھ کر وہ پلٹی تو عائشہ مصطفیٰ نے پوچھا۔

"کس کا فون تھا؟"

"آفاق کا۔ کہہ رہے تھے، وجدان سے ضروری کام ہے۔ گھر آئے تو اس سے کہیں کہ مجھ سے بات کرلے۔"

"ایسا کیا ضروری کام پڑ گیا؟" وہ اچنبھے سے بولیں۔

"ہوگا کوئی کام۔ میں نے پوچھا نہیں۔" انیقہ نے شانے اچکا دیئے۔

✿✿✿

وجدان کے ایکسرے کلیئر تھے۔ اسے کوئی گہری چوٹ نہیں آئی تھی۔ مگر اب تک وہ بے ہوش تھا۔ اس کے پاس سے ایسی کوئی چیز نہیں مل سکی، جس سے اس کی شناخت ہو پاتی۔ جائے حادثہ سے بھی پولیس کو ایسی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی۔ اب ایک ہی طریقہ تھا کہ بائیک کے رجسٹریشن نمبر کے ذریعے اس کا اتا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی۔

یہ 18 دسمبر 1981ء کا سرد دن تھا۔ آج کا کمپیوٹرائزڈ دور نہیں تھا۔ اُس وقت ریکارڈ ہاتھ سے تیار کیے جاتے تھے۔ اور اگر کہیں کوئی فائل نکالنی ہوتی تو گھنٹوں اسٹور روم میں فائلوں کے انبار کے ساتھ سر کھپانا پڑتا۔ وجدان کی شناخت بھی ایسا ہی سر درد ثابت ہونے والی تھی، جس میں گھنٹوں لگ جاتے۔

✿✿✿

آفاق سب کام چھوڑ کر بس وجدان کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر تھک کر اس نے خود وجدان سے ملنے کا فیصلہ کیا اور آفس سے اُٹھ گیا۔ لائبریری کے گیٹ سے دُور کار روک کر بیٹھا آفاق سوچ رہا تھا کہ اسے وجدان یہاں ملے گا یا نہیں۔ وہ ملیحہ سے دس بجے ملنے والا تھا اور اب پانچ بج رہے تھے۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ دونوں اب تک لائبریری میں ہوتے، پھر اس کے ساتھ ملیحہ بھی ہوتی...... ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ملیحہ کو لائبریری سے نکل کر سڑک کراس کر کے جنرل اسٹور میں جاتے دیکھا۔ آفاق کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں۔ کچھ دیر بعد ملیحہ اسٹور سے نکل کر باہر آئی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

"وجدان کہاں رہ گیا؟" آفاق، ملیحہ کی پریشانی بھانپ چکا تھا، اس نے زیر لب کہا تھا پھر وہ کار سے اُتر کر اسی اسٹور میں آیا، جہاں سے کچھ دیر پہلے ملیحہ نے فون کیا تھا اور اپنے پاپا کے آفس کا نمبر ملا دیا۔

"پاپا! وجدان، آفس میں ہے؟"

''کیا بات ہے، آج ہر کوئی اسے میرے آفس میں کیوں فون کر رہا ہے؟ ابھی دو منٹ پہلے کسی لڑکی کا فون بھی آیا تھا۔ وجدان کا پوچھ رہی تھی۔ اب تم بھی اس کا پوچھ رہے ہو۔ چکر کیا ہے؟''

''کوئی چکر نہیں ہے پاپا! اچھا میں فون رکھتا ہوں۔'' پھر اللہ حافظ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

'میرا شک ٹھیک نکلا۔ وجدان، ملیحہ سے ملنے نہیں آیا۔ پر کیوں؟' آفاق پیشانی مسلتے ہوئے سوچنے لگا۔ پھر آرٹس کونسل میں اس کو تلاش کرنے کے بعد وہ ساجد کی طرف آ گیا۔

''یار ساجد! وجدان کا کوئی پتہ ہے؟''

''وہ وہیں لائبریری میں ہوگا۔'' ساجد نے لاپروائی سے کہا۔

''وہ وہاں نہیں ہے۔ بلکہ کہیں بھی نہیں ہے۔'' آفاق نے کہا پھر پریشانی سے بولا۔ ''ساجد! اس کا ملنا خود اس کے لئے بہت ضروری ہے۔ کہیں سے بھی اسے ڈھونڈنا ہوگا۔''

''سب ٹھیک تو ہے؟'' اس کے انداز پر وہ پریشان ہو گیا۔ آفاق لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔ ساجد اس کا دوست سہی، پر وہ اس کے سامنے ملیحہ کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔ ساجد بھی اس کی خاموشی سے سمجھ گیا کہ کوئی ایسی بات ہے جو آفاق اسے بتانا نہیں چاہتا تو اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا اور اس کے ساتھ اُٹھ آیا۔

❁❁❁

خوش قسمتی سے اس نئے ماڈل کی بائیک، جسے خریدے ہوئے بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، کی فائل توقع سے کم وقت میں اسٹور روم سے برآمد ہو گئی۔ بائیک کی رجسٹریشن مزمل مصطفیٰ کے نام پر تھی۔ فائل میں مزمل کی تصویر بھی موجود تھی۔ تصویر میں نظر آ رہا چہرہ، زخمی کے چہرے سے تھوڑی مشابہت تو رکھتا تھا مگر پھر بھی کافی الگ تھا۔ رجسٹریشن فائل سے زخمی کی شناخت تو نہیں ہو سکی، پر اس امید پر کہ مزمل مصطفیٰ اس نوجوان کی شناخت کر سکے، ایس ایچ او نے کاغذات سے ملنے والے اس کے آفس کے نمبر پر اسے فون کیا اور حادثے کی اطلاع دے دی۔ مزمل ایک پل میں سمجھ گیا کہ زخمی نوجوان کون ہوگا۔ بائیک کی رجسٹریشن تو مزمل کے نام پر تھی مگر اس کا استعمال صرف وجدان ہی کیا کرتا تھا۔ فون پر بتائے گئے حلیے کو پہچان کر بھی مزمل نے خود جا کر تصدیق کرنا ضروری سمجھا اور اپنے گھر والوں کو حادثے کی اطلاع کئے بغیر ہسپتال آ گیا۔ جس کا نام اسے ایس ایچ او نے بتایا تھا۔ جنرل وارڈ کے بیڈ پر وجدان کو دیکھ کر مزمل سکتے میں رہ گیا۔

اس نے فوراً ڈاکٹر سے اس کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

''ہی اِز فائن۔ بائیک سے گرنے کی وجہ سے دونوں گھٹنے چھل گئے ہیں اور بائیں پنڈلی پر بھی کچھ چوٹیں آئی ہیں۔ مگر وہ سب معمولی ہیں۔ ہیلمٹ نہ ہونے کی وجہ سے سر پر چوٹ آئی ہے مگر وہ زیادہ گہری نہیں۔ لیکن ان کی بے ہوشی اسی چوٹ کی وجہ سے ہے۔''

''کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟'' وہ فکرمندی سے بولا۔

"بالکل نہیں۔ ہوش میں آتے ہی ان کا ہلکا پھلکا چیک اپ ہوگا۔ اس کے بعد یہ گھر جا سکتے ہیں۔"

"اور اسے ہوش کب تک آئے گا؟"

"آپ کے بھائی کو دو تین گھنٹے میں ہوش آ جائے گا۔ مگر میں نے آپ سے کہا نا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

ہر طرف سے مطمئن ہو کر مزمل نے اسے روم میں شفٹ کرنے کا بندوبست کیا۔ اب اسے مصطفیٰ عظیم کو اطلاع کرنی تھی۔ اسے فون پر ایسی پریشان کن خبر دینا مناسب نہیں لگا تو ان کے آفس آ گیا۔

"ابو! میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

"کیوں؟" وہ حیران ہوئے۔ مزمل ہچکچایا، پھر سوچا بتانا تو پڑے گا۔

"وجدان کا چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" مزمل نے کوشش کی تھی کہ خبر سناتے وقت وہ ریلیکس رہے مگر مصطفیٰ عظیم پھر بھی پریشان ہو گئے۔

"ابو پلیز! پریشان مت ہوں۔ وہ ٹھیک ہے۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیے۔" مزمل نے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ اس کے ہاتھ ہٹا کر بولے۔

"مجھے اس کے پاس لے چلو مزمل!"

"لے جانے ہی آیا ہوں۔ مگر آپ بیٹھ تو جائیں۔" اس بار مزمل نے انہیں زبردستی بٹھا دیا، پھر پانی کا گلاس ان کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "آپ خود کو ریلیکس کریں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تب تک میں گھر پر اطلاع کرتا ہوں۔" وہ پانی کا گلاس پکڑے ٹکر ٹکر اسے دیکھتے رہے۔ مزمل نے پھر ان سے کچھ نہیں کہا اور گھر پر فون کرنے لگا۔ بیل جانے کی آواز سن کر وہ دعا کرنے لگا کہ فون انیقہ ہی اٹھائے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

"انیقہ! مجھے تم سے خاص بات کرنی ہے۔ اس لئے پہلے تو تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" انیقہ جو فون سننے سے پہلے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ مزمل کی آواز سن کر گھبراہٹ میں کھڑی ہو گئی۔ مزمل نے نرمی سے ٹوکا۔

"دیکھو! اگر تم اس طرح کرو گی تو میں بات کیسے کروں گا؟"

انیقہ کو لگا وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس نے اپنے حواس قابو میں کر کے کہا۔

"ہاں اب بتائیں کیا بات ہے؟"

"وجدان کا معمولی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"ایکسیڈنٹ؟" وہ خود کو پریشان ہونے سے روک نہیں پائی۔

"ہاں۔ مگر چھوٹا سا۔ وہ ہسپتال میں ہے۔ لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسے صرف معمولی چوٹیں ہی آئی ہیں۔ میں ابو کو لے کر کچھ دیر بعد گھر آ جاؤں گا۔ تم امی کو حادثے کا بتا کر ذہنی طور پر تیار کر لو۔ ورنہ ہسپتال

ہیں وجدان کو دیکھ کر وہ پریشان ہو جائیں گی۔ ٹھیک۔ ہے؟''

''جی۔'' اس نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

عائشہ مصطفیٰ نے ایکسیڈنٹ کا نام سن کر ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے۔ انیقہ کو انہیں سنبھالنے میں کافی دقت ہوئی۔ پھر بہادر انہیں پکڑا کر ان کے بیٹھنے کے لئے کرسی اندر سے لاکر پورچ میں رکھی، اس کے بعد بیٹے کو تیار کر کے ان کی گود میں دیا اور بھاگ بھاگ کر گھر کے دروازے لاک کرنے لگی۔ تبھی بیل بجی تھی۔ انیقہ نے بے ساختہ ہی دوڑ کر گیٹ کھول دیا۔ اس کا خیال تھا کہ گیٹ پر مزمل ہو گا۔ پر وہاں تو کوئی لڑکی تھی۔ اس لڑکی نے کاغذ پر لکھا ایڈریس اس کی طرف بڑھا کر تصدیق چاہی۔ تصدیق کرتے ہوئے انیقہ نے پوچھا۔

''ایڈریس تو یہی ہے۔ پر آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''وجدان مصطفیٰ سے۔''

انیقہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آج تک تو کوئی لڑکی وجدان کا پوچھنے نہیں آئی۔ پھر یہ کون تھی؟ انیقہ نے غور سے اس خوش شکل لڑکی کو دیکھا جس نے کالی ساڑھی پر میرون شال سلیقے سے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ ''آپ کون ہیں؟ اور وجدان سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟''

''میرا نام ملیحہ فاروقی ہے۔''

اور اتنا سن کر ہی انیقہ کے اندر اُبال اُٹھنے لگے۔ 'تو یہ ہے ملیحہ فاروقی، جس کی وجہ سے وجدان میری بہن کو ریجیکٹ کر رہا ہے۔ ہے ہی کیا اس میں؟ ہر لحاظ سے ایک عام سی لڑکی ہے۔' اس نے تنفر زدہ آنکھیں ملیحہ کے چہرے پر گاڑ دیں جہاں بدحواسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ منت بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''پلیز وجدان کو بلا دیجئے۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''وہ گھر پر نہیں ہے۔'' انیقہ نے کہہ کر گیٹ بند کرنا چاہا پر ملیحہ نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا اور گیٹ پر ہاتھ رکھ کر روکتے ہوئے بولی۔

''آپ کو معلوم ہے وہ کہاں گئے ہیں اور کب تک آئیں گے؟''

''نہیں۔'' جانے وہ کون سا جذبہ تھا کہ انیقہ نے اسے بے خبر رکھنا چاہا۔ حالانکہ وہ دیکھ سکتی تھی کہ ملیحہ بہت پریشان ہے۔ شاید یہ ملیحہ کو وجدان سے نہ ملنے دینے کی لاشعوری کوشش تھی۔ ملیحہ نے اپنا نمبر اسی چٹ کے پیچھے لکھ کر انیقہ کو دیا اور کہا۔

''وجدان جیسے ہی گھر آئیں، ان سے کہیں، اس نمبر پر مجھ سے بات کر لیں۔''

انیقہ نے چٹ لے کر گیٹ بند کر دیا۔ بیل کی آواز سن کر عائشہ بھی پوتے کو اٹھائے گیٹ کی طرف بڑھی تھیں پر انیقہ کو بات کرتے دیکھ کر سمجھ گئیں کہ مزمل نہیں آیا اور وہیں رُک کر انیقہ کو دیکھنے لگیں۔ گیٹ بند کر کے وہ واپس مڑی تو انہوں نے پوچھا۔

"کون تھا؟"

"کوئی لڑکی تھی۔ غلط پتے پر آ گئی تھی۔" تنفر سے کہہ کر اس نے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ہوا
ما اُچھال دیئے۔

❁❁❁

وجدان ابھی تک بے ہوش تھا۔ عائشہ اس کے ماتھے سے بال سمیٹ کر سر پر بندھی پٹی کو ہلکے ہاتھ سے چھو
رنفکرمندی سے بولیں۔

"اسے ہوش کیوں نہیں آیا؟"

"امی! سر پر چوٹ لگی ہے۔ کچھ تو اثر ہو گا۔ ویسے میری ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی، وہ کہہ رہے تھے،
بدان شاک کی وجہ سے بے ہوش ہے۔ سر پر چوٹ لگنے سے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ اس میں پریشان ہونے
لی کوئی بات نہیں۔ پھر ایکسرے بھی تو کلیئر ہیں۔" مزمل نے رسان سے انہیں سمجھایا۔

ساجد اور آفاق، وجدان کو پورے شہر میں ڈھونڈنے کے بعد اس امید پر کہ شاید وہ گھر چلا گیا ہو، اس کے
ھر آ گئے۔ آفاق گاڑی میں بیٹھا رہا۔ ساجد اتر کر گیٹ تک آیا۔ بیل بجاتے ہوئے اس کی نظر گیٹ سے
ہولتے تالے پر پڑی۔ آنکھوں میں تفکر لئے وہ گاڑی میں آ بیٹھا۔ آفاق نے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"گیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔"

آفاق چپ سا ہو گیا۔ پھر ساجد نے ہی پوچھا۔

"اب کہاں چلنا ہے؟"

آفاق نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا، پھر کہا۔

"سات بجنے والے ہیں۔ اب اور وقت نہیں بچا۔" اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔ ساجد نے اُلجھ کر اسے
یکھا لیکن کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

"تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟"

"آفس ہی ڈراپ کر دو۔ وہاں سے گاڑی لے کر گھر جاؤں گا۔ نہیں تو صبح پیدل آفس جانا پڑے گا۔"
ساجد اپنی عادت کے مطابق لائٹ سے موڈ میں بولا تھا۔

اسے آفس چھوڑ کر آفاق نے کار اپنے گھر کی طرف موڑ دی۔

❁❁❁

نورالہدیٰ کو آج پتہ چلا تھا کہ غم جاناں کے ساتھ غم روزگار کا کمبی نیشن کتنا برا لگتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ملیحہ
کے لئے کچھ سوچنے سے خود کو باز رکھا تھا۔ پر آج انہیں ملیحہ کے سوا کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ یوں بھی

خوش باش انسان تھے پر آج ان کی خوشی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ محبت کو پا لینے کا نشہ بھی کیسا سحر انگیز ہوتا ہے اور یہ سحر پوری طرح سے انہیں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ سرِ شام ہی گھر لوٹ آئے۔ بابا جان اور ملک ناصر، لاؤنج میں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ پر آج شطرنج کی بساط نہیں بچھی تھی۔ نورالہدیٰ اس تبدیلی کو نوٹ کئے بغیر بابا جان کے پاس آ گئے۔

''لیجئے بابا جان! حسبِ وعدہ سات بجنے سے پہلے میں گھر پر ہوں۔''

''لیکن ملیحہ گھر پر نہیں ہے۔'' بے ساختہ بابا جان کے منہ سے نکلا تو وہ سرسری سے انداز میں پوچھنے لگے۔

''کہاں گئی؟''

بابا جان نے ذرا توقف کیا، پھر کہا۔ ''شادی کی شاپنگ کے لئے۔''

''ابھی تک آئی نہیں؟'' پھر دھیان آنے پر پوچھنے لگے۔ ''اور گئی کس کے ساتھ ہے؟''

''اکیلی ہی گئی ہے۔ اور کچھ دیر میں آ جائے گی۔''

''اچھا، میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ پھر ساتھ میں چائے پئیں گے۔'' نورالہدیٰ نے کہا، پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''تم نے اسے بتایا کیوں نہیں اظہر!'' ملک ناصر نے نورالہدیٰ کے جانے کے بعد بابا جان سے کہا۔

''بتانے کے لئے کیا رکھا ہے ملک! صبح سے شام ہو گئی ہے اور ملیحہ ابھی تک گھر نہیں آئی۔''

''ہو سکتا ہے ابھی تک ملیحہ کی وجدان سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔'' ملک ناصر نے خوش گمانی کی تو بابا جان بولے۔

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے، اس نے ملیحہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہو۔'' پھر اپنے ہی قیاس پر پریشان سے ہو گئے۔ ''ملک! دعا کرو، میری بیٹی کا دل نہ ٹوٹے۔''

مگر سات بجے اہتمام سے تیار ہوئی ملیحہ کو ڈرائنگ روم میں آتا دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ان کی دعا رائیگاں گئی تھی۔ بابا جان تو کچھ بھی بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ البتہ ملک ناصر فوراً اس کی مدد کو آئے۔

''چھوڑیئے بھابی! اب باتوں میں مزید وقت کیا گنوانا۔ آؤ بیٹی کی رسم کر لی جائے۔''

سب رسم کے خیال سے ایکسائیٹڈ ہو گئے اور کسی کو پھر اس طرف دھیان نہیں آیا۔ ملیحہ سے کہہ کر وہ بابا جان کے پاس آئے جو ماتھے پر شکنیں لئے ملیحہ کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''چلو اظہر!''

''اس نے میری بیٹی کو دھوکا دیا ہے۔'' بابا جان نے آتشیں لہجے میں گھٹی ہوئی آواز کے ساتھ کہا تو ملک ناصر نرمی سے ٹوک کر احساس دلانے لگے۔

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ آؤ بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دو۔''

جھکا

پھر نورالہدیٰ نے بابا جان سے اجازت لے کر ملیحہ کے بائیں ہاتھ کی اُنگلی میں ڈائمنڈ رِنگ پہنا دی۔ پلکیں جھکا کر بیٹھی ملیحہ کو دیکھ کر بابا جان نے دل ہی دل میں دعا دی۔

"یااللہ! جو دکھ میری بیٹی نے جھیل لیا، اس کی شکایت نہیں کی۔ مگر آئندہ ملیحہ کی زندگی میں کوئی غم نہ آئے۔"

❁❁❁

سات بجے کہیں جا کر وجدان کو ہوش آیا تو وہ آنکھیں کھول کر چھت کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گردن ہلا کر دائیں بائیں دیکھا۔ اپنے گھر والوں کو اپنے پاس دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"تم ہاسپٹل میں ہو۔" مصطفیٰ عظیم اس کے پاس آ کر بولے مگر اسے فوری طور پر کچھ یاد نہیں آیا تو حیرت سے بولا۔ "ہاسپٹل میں؟"

"ہاں، تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔"

"ایکسیڈنٹ؟" وجدان کو سب یاد آ گیا۔ یہ بھی کہ وہ ملیحہ سے ملنے جا رہا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیڈ سے کھڑا ہو گیا مگر چکر آ گئے اور ساتھ ہی سر میں ٹیس بھی اُٹھی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر وہ واپس بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"آرام سے بیٹا!" عائشہ نے قریب آ کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"کیا ٹائم ہو رہا ہے؟" وجدان کے پوچھنے پر مزمل نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"شام کے سات بج رہے ہیں۔"

"کیا؟" اسے یقین ہی نہیں آیا۔ پھر وہ چکراتے سر اور درد کرتے گھٹنوں کی پروا نہ کرتے ہوئے بیڈ سے اُٹھ کر مزمل کے پاس آ کر بولا۔

"مزمل بھائی! اپنی گاڑی کی چابی دیں۔ مجھے جانا ہے۔"

"کہاں جا رہے ہو؟ ابھی تو ہوش آیا ہے۔ تمہارا چیک اپ ہونا باقی ہے۔" عائشہ مصطفیٰ پریشان ہو گئیں۔

"تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے وجدان! چیک اپ سے پہلے تم کہیں نہیں جا سکتے۔ پھر تم نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔"

"ابو پلیز! یہاں میرا دم رُک رہا ہے اور آپ کو کھانے کی پڑی ہے۔" اس کے لہجے کی بے قراری محسوس کر کے مصطفیٰ عظیم خاموش ہو گئے اور وہ پھر سے مزمل سے بولا۔

"بھائی! چابی دیں۔"

مزمل سمجھ گیا تھا کہ وہ رُکے گا نہیں، اس لئے نرمی سے بولے۔ "دیکھو، تم اس حالت میں ڈرائیو نہیں کر سکتے۔ جہاں جانا ہے، میں تمہیں لے جاتا ہوں۔ بتاؤ کہاں جانا ہے؟"

وجدان اس سوال پر اُلجھ گیا۔ سات بجے لائبریری بند ہو جاتی تھی اور ایگزیبیشن بھی اس وقت تک ختم ہو چکی ہو گی۔ پھر ملیحہ سے ملنے کی کیا صورت ہو؟ سوچتے سوچتے اس کی نظر انیقہ پر پڑی تو یوں ہی پوچھنے لگا۔

''بھابی! میرے لئے کوئی فون آیا تھا؟ یا گھر پر میرا کوئی پوچھنے آیا ہو؟''

انیقہ اندر ہی اندر گھبرا گئی مگر اس کے بولنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور عائشہ نے کہا۔ ''ہاں، آفاق کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا، ضروری کام ہے۔ تم اسے فون کر لو۔'' وجدان کو پتہ نہیں کیوں لگا کہ آفاق، ملیحہ کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا ہو گا۔ وہ تیزی سے بولا۔

''مزمل بھائی! مجھے آفاق کے گھر لے چلیں۔''

''ٹھیک ہے۔ چلو۔'' وجدان کو سہارا دے کر ساتھ لے جاتے مزمل سے مصطفیٰ عظیم متفکر ہو کر بولے۔

''اس کا خیال رکھنا۔''

''جی ابو!'' اس نے کہا اور وجدان کے ساتھ باہر نکل آیا جو لڑکھڑاہٹ کے باوجود سیدھا چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آفاق کے گھر پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

''اب کیا کرو گے؟'' مزمل نے پوچھا۔ ''دیکھو ساری فیملی کہیں گئی ہوئی ہے اور واپسی میں یقیناً دیر ہو جائے گی تو چوکیدار کی طرح گیٹ پر بیٹھے رہنے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھا لیں۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' آخر میں وہ بے چارگی سے بولا تو وجدان ہنس پڑا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن بل آپ دیں گے۔''

''وکیلوں کی نظر دوسروں کی جیب پر کیوں ہوتی ہے؟''

''کیونکہ دوسروں کی جیب سے ہی وکیلوں کی جیب میں مال آتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو مزمل نے کہا۔

''پیٹ باتوں سے بھر لیں گے تو کھائیں گے کیا؟ چلو!'' اور دونوں بھائی پاس کے ہی ہوٹل میں کھانا کھانے چل پڑے۔

✿✿✿

کھانے کے بعد افتخار حسن نے رخصت کی اجازت چاہی تو ملیحہ، سمیرا سے مل کر منت سے بولی۔

''آج رک جاؤ سمیرا!''

صبح تو آفاق نے سمیرا سے بات کرنے کو ٹال دیا تھا مگر اس وقت اسے سمیرا سے بات کرنے کی بہت جلدی تھی اس لئے ملیحہ کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اشارے سے سمیرا کو منع کر دیا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر سمیرا نے ملیحہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی معذرت کر لی۔

''آج تو نہیں رک سکتی۔ مگر کل میں صبح سے ہی آ جاؤں گی۔'' پھر اسے اپنا خیال رکھنے کا کہہ کر گاڑی میں

جا بیٹھی۔ آفاق بھی بابا جان کو اللہ حافظ کہہ کر نورالہدیٰ سے گلے ملنے کے بعد گاڑی میں آ گیا۔

"تم ملیحہ اور وجدان کے بارے میں کیا جانتی ہو؟" گاڑی میں وہ دونوں ہی تھے، اسی بات کا فائدہ اٹھا کر ڈرائیونگ کرتے آفاق نے چپ بیٹھی سمیرا سے اچانک ہی پوچھا۔ وہ براہِ راست سوال پر گڑبڑائی، پھر اسے سچ بولنا بہتر لگا۔

"سب کچھ۔ مگر ایک بات نہیں جانتی کہ وعدہ کرنے کے بعد وجدان لائبریری کیوں نہیں آیا۔"

"یہ تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا پھر پوچھا۔ "یہ شادی کا کیا معاملہ ہے؟"

"ملیحہ کی شادی نہیں ہو رہی آفاق! اسے زندہ دیوار میں چنوایا جا رہا ہے۔ کل رات اس نے پھوپھا جان سے وجدان کے لئے بات کی تھی اور وہ بھڑک گئے۔ پھر صبح اسے نکاح کی خبر دے دی۔"

"یعنی میرا شک صحیح تھا۔ لیکن نورالہدیٰ اس شادی کے لئے کیسے راضی ہو گیا، وہ بھی فوراً؟"

"پھوپھا جان کو جانتے نہیں ہیں کہ کوئی تیس مار خان بھی ان کے سامنے دم نہ مارے۔ نورالہدیٰ کیا چیز ہے۔ پھر ملیحہ میں کس چیز کی کمی ہے جو وہ انکار کرتا؟" بےزار سے لہجے میں کہہ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

جب یہ قافلہ اپنی منزل پر پہنچا تو وجدان کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گئے جو سر پر پٹی لپیٹے کار کے بونٹ پر چڑھ کر بیٹھا تھا اور مزمل اس کے سامنے کھڑا جوتے کی ٹوہ سے زمین کھرچ رہا تھا۔ کسی نے بھی گاڑی گیٹ سے اندر جانے کا انتظار نہیں کیا اور دروازے کھول کر وہیں اُتر گئے۔ سمیرا کی امی اس کی پٹی اور چہرے پر خراشوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"یہ سب کیا ہے وجدان! تمہیں چوٹ کیسے لگی؟"

"کچھ نہیں خالہ! بس بائیک سلپ ہو گئی تھی۔"

"مگر یہ ہوا کیسے؟" افتخار حسن بھی اس طرف چلے آئے۔

"آپ اندر تو چلیں۔ پھر بتاتا ہوں۔" کہتے ہوئے اس نے کار میں بیٹھے آفاق کو دیکھا جو کار گیٹ کے اندر لے گیا۔ پورچ میں کار روک کر وہ باہر آ گیا۔

"وجدان! اندر آ جاؤ۔ باہر بہت ٹھنڈ ہے۔ مزمل بھائی! آپ بھی آ جائیں۔"

پھر سب آگے پیچھے اندر چلے گئے۔ آفاق کی آنکھوں کا غیر معمولی تاثر دیکھ کر وجدان ٹھٹک گیا تھا۔ پر یہ بھی جانتا تھا کہ حادثے کی تفصیل جانے بغیر کوئی چین سے نہیں بیٹھے گا۔ ہال میں سب کے بیچ بیٹھ کر وہ حادثے کے بارے میں سب بتا چکا تو آفاق نے اسے مخاطب کیا۔

"وجدان! میرے کمرے میں آ جاؤ۔ ضروری بات کرنی ہے۔"

وجدان، آفاق کے ساتھ اُٹھ گیا تو ان کے پیچھے سمیرا بھی وہاں سے چلی آئی۔

"تمہارا ایکسیڈنٹ آج نہیں ہونا چاہئے تھا وجدان!" کمرے میں آتے ہی آفاق نے اسے دیکھ کر

متاسف لہجے میں کہا تو وجدان اس کے انداز پر چونک کر بولا۔

''ہوا کیا ہے؟''

''ہم ملیحہ کی انگیج منٹ اٹینڈ کر کے آ رہے ہیں۔اور تین دن بعد اس کی شادی ہے۔''

وجدان کے سر پر بم پھٹا تھا۔سمیرا کمرے میں آئی تو اسے دیکھ کر آفاق نے کہا۔

''باہر سے فون لے آؤ اور آتے ہوئے دروازہ بند کر لینا۔''

سمیرا اُلٹے پیروں مڑ گئی اور کاریڈور میں رکھا فون اٹھا کر کمرے میں لے آئی۔ وہ دونوں الگ الگ پر بیٹھے تھے جن کے بیچ میں ٹیبل رکھا تھا۔سمیرا نے فون ٹیبل پر رکھا پھر دروازہ بند کرتی وہ آفاق کے برابر اور کسی کے کہے بنا ہی ریسیور اٹھا کر ملیحہ کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

❁❁❁

ملیحہ پر بے حسی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ روانی سے قلم چلاتے ہوئے دل کے اندر دبے راز ڈائری پر لکھ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ بیڈ پر بیٹھی سر جھکا کر لکھتی ملیحہ نے ہاتھ روک کر دروازے کی طرف د

''دروازہ کھلا ہے۔آ جاؤ۔'' اس کی آواز پر بہادر نے دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔''کہو، کیا بات ہے؟''

''بی بی صاب! آپ کے لئے فون آیا ہے۔''

ملیحہ کی نظروں میں کائنات گھوم گئی تھی۔''کس کا؟'' دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے پوچھا۔

''سمیرا بی بی کا۔'' اور ملیحہ نے بے دردی سے نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ ڈالا۔

''اسے کہو میں صبح بات کروں گی۔'' بول کر وہ پھر سے ڈائری میں کچھ لکھنے لگی۔ پھر خود ہی کچھ سو ڈائری بند کر کے تکیے کے نیچے رکھی اور باہر آ گئی۔

سیڑھیوں کے اختتام پر ریلنگ کے ساتھ آبنوس کا اونچا اسٹول رکھا تھا، جس پر فون رکھا رہتا تھا۔ بہا ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ ملیحہ نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر کہا۔

''تم جاؤ۔'' پھر فون پر ہیلو کہا۔

''تمہیں معلوم ہے، آج وجدان کیوں نہیں آیا تھا؟''

ملیحہ بھلا کیا کہہ سکتی تھی۔سمیرا نے اس کے بولنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔

''وجدان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔'' ملیحہ کو ریلنگ تھامنا پڑی ورنہ وہ گر جاتی۔ پھر ریلنگ کے سہا دھیرے دھیرے آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

''وہ صبح لائبریری ہی آ رہا تھا کہ موڑ کاٹتے ہوئے بائیک سلپ ہو گئی۔تمہیں یاد ہے، صبح جب ہم جام میں پھنس گئے تھے اور ڈرائیور نے بتایا تھا کہ کسی موٹر سائیکل والے کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ وجدان

''وہ ٹھیک تو ہے؟'' ملیحہ کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"شکر ہے۔" ملیحہ نے بے ساختہ شکر ادا کیا تو سمیرا پوچھنے لگی۔

"اب تمہارا کیا فیصلہ ہوگا؟"

"میرا فیصلہ۔" اس نے گم سم سی سرگوشی کی۔ تبھی وجدان نے سمیرا کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا مگر ملیحہ کو بولتا سُن کر چپ ہی رہا جو کہہ رہی تھی۔

"فیصلہ کرنے کا اختیار کبھی بھی میرے پاس نہیں رہا۔ میرے فیصلے کا کیا پوچھتی ہو؟ فیصلہ تو ہو بھی چکا۔ اب تو بس عمل کرنا باقی ہے۔ اور میرے پاس کوئی راہِ فرار نہیں۔ اگر کوئی تھی بھی تو اب نہیں رہی۔ جانتی ہو، ہادی بھائی نے مجھ سے کیا کہا؟" اس کی آنکھیں یکدم ڈبڈبا گئیں۔ وجدان سناٹوں میں گھرا اس کی آواز سن رہا تھا۔ ملیحہ نم آواز میں بولی۔

"انہوں نے کہا، وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں بھی ہادی بھائی سے محبت کرتی ہوں اور اس محبت کے ساتھ میں نے ایک دعا بھی کی تھی کہ میری خوشی کی خاطر اپنا دکھ سہنے کا حوصلہ رکھنے والے کو کبھی دکھ نہ ملے۔ اگر میں ابھی جا کر ان سے کہوں کہ مجھے وجدان مصطفیٰ کا ساتھ بخش دیں تو وہ زمانے سے لڑ جائیں گے۔ مگر میں اس شخص کا ساتھ چھوڑنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں جو مجھے ساتھ چھوڑ کر جانے کی اجازت دے رہا ہو۔"

حوصلہ تو وجدان میں بھی نہیں تھا کہ ملیحہ کو اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنا ہاتھ تھامنے کو کہے جس کا ساتھ چھوڑنے کی طاقت ملیحہ میں نہیں۔ بے اختیاری، بے بسی نہیں ہوتی بلکہ بے بسی تو یہ ہے کہ انسان کی بے اختیاری اس کے اختیار کی پابند ہو جائے۔ ملیحہ کی بے بسی وجدان کو بے بس کر رہی تھی جو سست آواز میں کہہ رہی تھی۔

"محبت بوجھ نہیں ہوتی، پھر بھی جھکا دیتی ہے۔ میں جھکتی جا رہی ہوں۔ ہادی بھائی نے میرے کاندھوں پر محبت کا بوجھ اتنا بڑھا دیا ہے کہ میری پیشانی زمین سے جا لگی ہے۔ میں نظر نہیں اُٹھا پا رہی، سر کیسے اُٹھاؤں؟ اور وجدان۔" اُس کی آواز میں درد گھل گیا۔

"جب ملا تھا تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ شخص میرے دل کا در بن جائے گا۔" وجدان کے اپنے دل میں درد اٹھا تھا، جسے محسوس کیے بغیر وہ کہے جا رہی تھی۔ "اگر چوبیس گھنٹے پہلے کوئی مجھ سے پوچھتا، تم وجدان سے محبت کرتی ہو؟ تو میں کہتی ہاں، میں وجدان سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن اگر اس وقت کوئی مجھ سے یہ سوال پوچھے گا تو کہوں گی، میں وجدان سے محبت نہیں کرتی۔"

وجدان کو لگا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔

"مجھے وجدان سے عشق ہے۔" وجان کو لگا، وہ اب کبھی سانس نہیں لے پائے گا۔ اس نے اس بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا کہ خون رِسنے لگا۔ ادھر ملیحہ کی آواز میں سسکیاں گھل گئی تھیں۔

"پر وہ چیز جو میں زندگی میں کبھی نہیں سیکھ پائی، محبتوں کو کیٹگرائز کرنا ہے۔ میں کبھی جان نہیں پائی، کیسے کسی

کی محبت کو سب سے اوپر والے خانے میں رکھتے ہیں اور کیسے دوسری محبت کو نیچے والے خانے میں۔ مجھے بس محبت کرنا آتا ہے۔ اور میں نے بابا جان سے، ہادی بھائی سے اور وجدان سے محبت کی، مگر جب نبھانے کی باری آئی تو کوئی ایک محبت بھی ڈھنگ سے نبھا نہیں پائی۔'' اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ کھنچے ہوئے چہرے کے ساتھ وجدان کی گرفت ریسیور پر سخت ہوتی جا رہی تھی۔ بے بس سی آواز اُبھری۔

''کاش میری زندگی میں ایک معجزہ ہو جائے۔ میں آنکھیں بند کر کے کھولوں تو سامنے وجدان ہو۔'' اس نے اصل میں آنکھیں بند کر کے کھولیں، پھر غیر مرئی نقطے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں اسے وہ سب کہہ دیتی جو میرے دل میں ہے کہ اس کے بغیر میں مر جاؤں گی، وہ میری زندگی کا حاصل ہے۔ بہت چاہا ہے اسے۔ اتنا کہ اب اس چاہت سے دستبردار نہیں ہوا جاتا، اس سے الگ ہونے کا خیال میرے جسم سے روح کھینچ رہا ہے۔ کاش! وہ کہیں سے آ جائے۔ ایک بار سہی۔ آخری بار سہی۔ میں اسے جی بھر کے دیکھ تو لوں۔ اب ایک عمر اس کے بغیر گزارنی ہے، کوئی تو سہارا ہو۔ اس نے ایک بار کہا تھا، آپ اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک پل مجھے نہیں دے سکتیں۔ آج کوئی جا کر اس سے پوچھے، اپنی پوری زندگی میں سے ایک پل مجھے نہیں دے گا۔ ایک پل۔ صرف ایک پل مجھے دے دے گے۔ ایک بار مجھ سے ملنے آ جائے۔ بس ایک بار۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے ریسیور تھامے تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے فریاد کرتی جا رہی تھی۔ وجدان کا پورا وجود اس بارش میں بھیگ گیا۔

''ملیحہ!'' اس نے بے چین ہو کر اسے پکارا۔ ملیحہ ایک دم چپ ہو گئی۔ وہ دم سادھے بیٹھی تھی۔ وجدان کی آواز پہچاننے میں اسے ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگی۔ کچھ دیر پہلے وہ کہہ رہی تھی کہ وجدان کہیں سے آ جائے اور اب جب وہ اس کی آواز سن رہا تھا تو ملیحہ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد چپ چاپ ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

آفاق، وجدان کے تناؤ بھرے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو لب بھینچے خاموش بیٹھا تھا۔ نہ جانے ملیحہ کیا کہہ رہی تھی کہ ریسیور پر اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ ضبط کی کوشش میں اس کی آنکھیں دہکنے لگیں۔ پھر ایک دم ہی اس نے بے قراری سے ملیحہ کا نام لیا اور کچھ پلوں کی خاموشی کے بعد جب ملیحہ نے لائن ڈس کنکٹ کر دی تو وجدان نے فون رکھ دیا۔

''ملیحہ کیا کہہ رہی تھی؟'' آفاق نے پوچھا تو وہ تھکے تھکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''ملیحہ اتنا حق تو رکھتی ہیں کہ مجھے سُولی پر لٹکا کر سانس لینے کی سزا سنا دیں۔'' پھر اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے آفاق کو دیکھا۔ ''آفاق! میں ملیحہ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

❀❀❀

ملیحہ نے فون رکھا اور ریلنگ کا سہارا لے کر آہستہ سے اُٹھی، اوپر کمرے میں آ گئی اور چلتے ہوئے اس نے بالکونی کا دروازہ کھول دیا۔ پھر سست قدموں کے ساتھ وہ جھولے میں آ بیٹھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں جن

کے زور سے چائمز لے میں بج رہے تھے۔ سردی کی شدت نے پل بھر میں ملیحہ کے گال گلابی کر دیئے تھے اور ہاتھ پیر برف کی مانند ٹھنڈے۔ مگر اس کی ہر حس جیسے مر چکی تھی۔ وہ وہیں پاؤں اوپر رکھ کر لیٹ گئی۔ ملیحہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے چودھویں کا چاند پسند تھا۔ ملیحہ نے چاند کو دیکھ کر اندازہ لگایا، ابھی چودہ تاریخ میں کچھ دن باقی تھے۔

'کیا میں بس چاندنی کا انتظار ہی کرتی رہ جاؤں گی؟..... کڑی دھوپ میری زندگی کا سایہ کب تک بنی رہے گی؟' اس نے تھک کر سوچا پھر بہت دل سے دعا کی۔

"یا اللہ! مجھے اس آزمائش سے نکال دے۔ انتخاب میرے بس کی بات نہیں۔" اس کی وہ رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی اور وہ پلک تک جھپک نہ پائی۔

فجر کی اذان کے ساتھ اس کے بے جان جسم میں حرکت ہوئی اور وہ اُٹھ بیٹھی۔ نماز پڑھ چکی تو اس کے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے مگر دعا نہیں کر سکی۔ ہاتھ اٹھاتے ہی جو دعا اس کے لب پر آنے کو مچلی تھی، وہ نورالہدیٰ کے لئے بد دعا تھی۔ اور ملیحہ کبھی نورالہدیٰ کو بد دعا نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے دعا کے لئے اُٹھے ہاتھ گرا دیئے اور جائے نماز سے اُٹھ گئی۔ ملیحہ کو پانی حلق سے اُتارنا مشکل ہو گیا تھا، نوالے کیا نگلتی۔ لیکن بابا جان اور نورالہدیٰ ناشتے پر آئے تو نورالہدیٰ اس کی غیر موجودگی کو محسوس کر کے بولے۔

"ملیحہ ناشتہ نہیں کرے گی؟...... اُٹھ تو گئی ہو گی۔ دیر تک سونے کی اسے عادت نہیں ہے۔"

بابا جان نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ناشتے کے لئے منع کر چکی ہے بلکہ کہا۔ "ملیحہ اپنے کمرے میں ناشتہ کرے گی۔" اس جھوٹ کی وجہ بھی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سن کر کہ ملیحہ نے ناشتہ کرنے سے منع کر دیا ہے، نورالہدیٰ سیدھے اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور پھر شاید اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کچھ اخذ بھی کر لیں اور اب ملیحہ کا مستقبل ان کے ہاتھ میں تھا۔ بابا جان نہیں چاہتے تھے، ملیحہ کی طرف سے ان کے دل میں کبھی بال نہ آئے۔ وہ ایک باپ کی طرح اپنی بیٹی کی نادانی پر پردہ ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔

ملیحہ کے لئے نورالہدیٰ کا دل بہت کشادہ تھا مگر بابا جان جانتے تھے، بیوی کے لئے اکثر مردوں کا دل تنگ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے بابا جان نہیں چاہتے تھے کہ وہ مشکوک ہوں۔ لیکن نورالہدیٰ کے لئے یہ تبدیلی بھی حیران کن تھی۔

"کمرے میں کیوں؟"

بابا جان قصداً مسکرا کر بولے۔ "بھئی ہمارے ہاں جب شادی کی تاریخ طے ہو جاتی ہے تو لڑکی کا لڑکے سے پردہ کرا دیا جاتا ہے۔ اب شادی تک ملیحہ تمہارے سامنے نہیں آسکتی۔"

"اوکے!" نورالہدیٰ زیر لب مسکرائے۔

ناشتے سے فارغ ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ملیحہ کی خالہ اور ممانیاں اس کی کزنز کے ساتھ آ گئیں۔ بابا

جان نے خوش دلی سے انہیں ویلکم کرتے ہوئے ملیحہ کی خالہ سے کہا۔

''فریال ہوتی تو ملیحہ کی شادی بہت دھوم دھام سے کرتی۔ اب تمہیں سب انتظام کرنا ہے۔ میں توان معاملات میں بالکل اناڑی ہوں۔''

''فکر مت کریں بھائی صاحب! ملیحہ میری اپنی بیٹی ہے۔ میں اور بھابھیاں مل کر سب سنبھال لیں گے۔'' آمنہ نے خلوص سے یقین دلایا۔

''ان شاء اللہ کہیں کوئی کسر نہیں رہے گی بھائی صاحب!'' بڑی ممانی نے کہا۔ پھر واقعی انہوں نے سب انتظامات خوش اسلوبی سے سنبھال لئے۔

لان کافی کشادہ تھا۔ صرف چوڑائی ہی پانچ سو گز تھی اور بیس ہزار گز پر بنے قصرِ فاروقی کے گرد دائرہ کی شکل میں چاروں طرف پھیلا تھا اور مہمانوں کی تعداد محدود تھی۔ افتخار حسن اور منیر حسن کے خاندان اور آمنہ کی فیملی کے علاوہ گنے چنے کچھ خاص لوگ ہی تھے، اس لئے ڈیسائڈ ہوا کہ فنکشن قصرِ فاروقی میں ہی ارینج کیا جائے گا۔

مہندی کا دن آ گیا مگر ملیحہ کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے احساسات پر برف جم چکی تھی۔ شام ڈھل چکی تھی اور قصرِ فاروقی جگمگاتی روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ پیلے کاٹن کے سلور گوٹا لگے شلوار قمیض میں ملیحہ کے کانوں میں موتیوں کے بالے جھول رہے تھے۔ دونوں کلائیوں میں بھر بھر کر پہنی کانچ کی چوڑیوں کے آگے موتیے اور گلاب کے مہکتے گجرے اس کی دودھیا کلائیوں میں سجے تھے۔ اس کے لمبے بالوں کو موتیے کی لڑیوں سے گوندھ کر چوٹی کی شکل میں سنوارا گیا تھا۔ کاٹن کا پیلا دوپٹہ اس نے سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ لڑکیاں اسے اپنی ہمراہی میں لئے کمرے سے باہر آئیں جو دو دن سے اس کی مستقل قیام گاہ بنا ہوا تھا اور سیڑھیاں اُتر کر ہال کے باہر والے دروازے سے ہوتی لان میں آ گئیں۔ ملیحہ کو نورالہدیٰ کے برابر میں بٹھا دیا گیا۔ لڑکوں نے ابٹن کا کھیل شروع کر دیا۔ مگر لڑکیوں کو اپنے کپڑے بہت عزیز تھے۔ وہ اس کھیل میں شامل نہیں ہوئیں اور گانے گاتی رہیں۔ سارے لڑکے سفید کاٹن کے شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے جن کا حال اب بے حال ہو چکا تھا۔ وہ اپنے چہرے ہی رنگنے میں لگے رہے۔ کسی کو ملیحہ کے برابر بیٹھے اس تماشے کو دیکھ کر ہنستے نورالہدیٰ کا خیال ہی نہیں آیا۔ خود کو بچاتے جنید کی نظر ان پر پڑی تو وہ چلّایا۔

''بھائیو! اسے کہتے ہیں بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔ تم سب اپنا ستیاناس کئے جاؤ۔ ادھر نورالہدیٰ آرام سے ہونے والی بیگم کی بغل میں بیٹھا دانت نکال رہا ہے۔''

پھر تو سب ہی مٹھیوں میں اُبٹن بھرے نورالہدیٰ کی طرف دوڑے۔ نورالہدیٰ نے جو اس جم غفیر کو اپنی طرف آتا دیکھا تو محاورتاً نہیں حقیقتاً ملیحہ کے سر کے اوپر سے چھلانگ لگا کر پیچھے کی طرف دوڑے۔ مگر صمد نے انہیں جا لیا۔ پھر سب انہیں گھسیٹتے ہوئے بیچ ہال میں لے آئے۔ اب نورالہدیٰ گھاس پر دراز تھے اور ہر طرف سے ان پر اُبٹن تھوپا جا رہا تھا۔ وہ چلّانے لگے۔

"بس کرو یار! کل میری شادی ہے۔ کیوں شکل بگاڑ رہے ہو؟ بڑا نازک دل ہے تمہاری بھابی کا۔ بے چاری ڈر جائے گی۔"

مگر کوئی بھی انہیں چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ گھونگھٹ میں لاتعلق بیٹھی ملیحہ نے نورالہدیٰ کی آواز سنی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ واقعی نورالہدیٰ کے چہرے پر اتنا اُبٹن ملا گیا تھا کہ لڑکوں کے شکنجے میں ملیحہ کو انہیں پہچاننے میں دقت ہوئی۔ اور جب پہچان لیا تو بے ساختہ ذرا سا مسکرائی۔ تین دن بعد ملیحہ نے سمیرا کے بے جان چہرے پر کچھ دیکھا تھا اور وہ بھی مسکراہٹ۔ اسے اپنا سانس بحال ہوتا محسوس ہوا۔

'جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اور زہر، زہر کا علاج ہوتا ہے، خدا کرے نورالہدیٰ کی محبت وجدان کی محبت کے زخم کا مرہم بن جائے آمین!' اس نے دل میں دعا کی۔ سر اُٹھانے کی وجہ سے ریشمی آنچل، ملیحہ کی پیشانی سے پیچھے کو سرک گیا تھا۔ پل بھر کے لئے نورالہدیٰ کی نظر اس پر پڑی تھی۔ تین دن بعد اس کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ وہ اسے دیکھتے رہ گئے۔ ملیحہ اب بھی غائب دماغی کی حالت میں تھی۔ اسے چہرہ چھپانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اُلٹا ان کی حالت پر مسکرا دی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر تو نورالہدیٰ اندر تک شانت ہو گئے تھے۔ پھر ہنستے ہوئے زور سے بولے۔

"اب اور تو میری درگت نہ بناؤ۔ وہ دیکھو میری دُلہن ہنس رہی ہے۔" ان کے "میری دُلہن" کہنے پر ایک دم سے ملیحہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس نے سر کو جھکا کر چہرہ چھپاتے ہوئے سمیرا سے گھونگھٹ ٹھیک کرنے کو کہا۔ نورالہدیٰ کو اس کا گریز بھی اچھا لگا تھا۔

'آج گھونگھٹ گرا لو۔ کل تو میں ہی گھونگھٹ اُٹھاؤں گا۔' انہوں نے ملیحہ کے ڈھکے چھپے وجود کو دیکھ کر دل میں محظوظ سی سرگوشی کی۔

✿✿✿

سمیرا تکیہ گود میں لئے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ ایک بجنے والا تھا اور نیند کا دُور دُور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ یوں بھی آج کل وہ اور ملیحہ جاگنے کا شغل ہی کیا کرتی تھیں۔ دونوں چپ چاپ بیڈ کے دور دراز کونوں پر لیٹی چھت کو اندھیرے میں گھورتی رہتیں۔ ملیحہ باتھ روم سے باہر آئی تو ہاتھوں اور پیروں پر لگی مہندی دھل چکی تھی۔ سمیرا نے دیکھا تو ملامت کرنے لگی۔

"مہندی ابھی کیوں دھو دی؟ صبح دھوتیں تو رنگ نکھر جاتا۔"

"رنگ تو اب بھی نکھرا ہوا ہے۔" اس نے ہاتھ سمیرا کے آگے کئے، جن پر مہندی کا رنگ بہت گہرا تھا۔ سمیرا نے اس کے ہاتھ پکڑ کر دیکھے پھر مسکرا کر بولی۔

"نورالہدیٰ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔" اس کے عام سے لہجے میں ناز مفقود تھا۔ سمیرا نے اسے دیکھا۔

"تمہیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہے کہ جس شخص سے تمہاری شادی ہو رہی ہے، وہ اس دنیا میں سب سے زیادہ تمہیں چاہتا ہے؟"

"خوشی کیوں نہیں ہو گی؟ ہر لڑکی چاہتی ہے کہ شوہر کی من چاہی ہو۔" اب بھی اس کے لہجے میں کوئی غیر معمولی پن نہیں آیا تھا۔ پھر بات بدلنے کو بولی۔ "چائے پیو گی؟ اپنے لئے بنانے جا رہی ہوں۔"

"تم اور چائے؟" سمیرا حیران ہو کر بولی۔

"ہاں۔" ملیحہ نے آرام سے کہا۔ "اصل میں نورالہدیٰ کو چائے بہت پسند ہے۔"

"تم کچھ زیادہ ہی ان کی پسند ناپسند کا دھیان نہیں رکھنے لگیں؟" سمیرا تیکھے لہجے میں بولی۔

"جب ان کی خاطر اپنی پسند ہی چھوڑ دی تو ان کی پسند اپنانے میں کیا حرج ہے؟" اس نے وجدان کا نام نہیں لیا تھا پھر بھی سمیرا سمجھ گئی، وہ وجدان کی بات کر رہی ہے۔ اب اس نے یہی عادت اپنا لی تھی کہ کہیں بے اختیاری میں وجدان کا ذکر زبان سے سرزد ہو بھی جاتا تو بھی اس کا نام نہیں لیتی تھی۔

منگنی والے دن کے بعد سمیرا نے اس کی زبان سے وجدان کا نام نہیں سنا تھا۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی، پھر سانس بھر کر کہا۔

"تم بیٹھو! میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔" وہ چائے بنانے کے لئے اُٹھ گئی تو ملیحہ فارغ بیٹھنے کے بجائے اپنے اسٹوڈیو میں آ گئی۔ اس نے نیا کینوس اٹھا کر ایزل پر رکھا، برش ہاتھ میں لے کر سوچنے لگی کہ کیا بنائے۔ پھر کسی شعوری کوشش کے بغیر ہی اس کا ہاتھ کینوس پر چلنے لگا۔ سمیرا آئی تو وہ پوری طرح کینوس میں کھوئی ہوئی تھی اور اس کا ہاتھ بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ اسے مگن دیکھ کر آواز دینے کے بجائے کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے سمیرا اسٹوڈیو میں آ گئی اور اس کی پشت سے آگے ہو کر دیکھا کہ وہ کیا بنا رہی ہے مگر کینوس پر نظر پڑتے ہی اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ سمیرا نے وحشت زدہ نظروں سے ملیحہ کے چہرے کو دیکھا تو اس کے ٹھٹکنے کو محسوس کر کے ملیحہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

سمیرا نے کچھ بولے بغیر سکتے کی سی کیفیت میں کینوس کی طرف دیکھا تو ملیحہ کی حیران نگاہیں بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں کینوس پر اُٹھ گئیں۔ سمیرا کو جو محسوس کر کے حیرت ہوئی، اس پر خود ملیحہ بری طرح چونک گئی تھی۔

وہ ادھورا پورٹریٹ اتنا واضح تھا کہ وجدان کا چہرہ اس میں نظر آ جاتا۔ ملیحہ کو دھیان بھی نہیں تھا کہ وجدان کا چہرہ پینٹ کر رہی ہے۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ لب کچلتی ہوئی برش رکھ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ سمیرا اس کے پیچھے بالکونی میں آئی تو وہ گھٹنوں پر چہرہ ٹکائے جھولے میں بیٹھی تھی۔ سمیرا آہستگی سے اس کے ساتھ بیٹھ گئی جو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی خاموشی نے سمیرا

اداس کر دیا تھا مگر خود وہ بھی کوشش کے باوجود بول نہیں پا رہی تھی۔ کئی بوجھل پل گزر گئے تو ملیحہ کی خوابیدہ آواز سنائی دی۔ سمیرا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔

''میں مرنا نہیں چاہتی۔ مگر کچھ دنوں سے لگ رہا ہے کہ میرے اندر سب کچھ مرتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی بھی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے ہی لفظوں پر گھبرا اُٹھی اور گم سم بیٹھی سمیرا کا ہاتھ پکڑ کر ٹوٹ کے فریاد کرنے لگی۔

''میں مرنا نہیں چاہتی سمیرا!..... پلیز مجھے بچالو۔ میری سانسیں، میرا دل گھٹ رہا ہے۔ ہر دھڑکن کے ساتھ دل رُکتا جا رہا ہے مگر میں مرنا نہیں چاہتی اور...... اور اس شخص کا خیال مجھے جینے نہیں دے گا۔ مجھے بچالو سمیرا!...... بچالو مجھے۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔'' سمیرا کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ یک دم ہی ملیحہ سے لپٹ کر رونے لگی۔ پھر خود ہی اس سے الگ ہو کر روتی ہوئی اُٹھ گئی۔

❀❀❀

''میں ملیحہ کی طرف سے بہت فکرمند ہوں اظہر! وہ مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔'' مہندی کی تقریب کے دوران ملک ناصر نے ملیحہ کے بے حس سے روّیے کو خاص طور سے محسوس کیا تھا اور اب اسٹڈی میں بیٹھے وہ بابا جان سے اپنی پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔

''ہوں!'' بابا جان نے ہنکارا بھرتے ہوئے ان کو دیکھا۔ ''میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ وہ آج کل بجھی بجھی سی رہتی ہے۔ مگر یہ سب اس کی اپنی حماقت کا صلہ ہے۔ جو دوسروں پر آسانی سے اعتبار کر لیتے ہیں، انہیں دھوکے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔'' وہ پریشان تو تھے مگر ان کے لہجے میں ہلکا پھلکا غصہ بھی تھا۔ ''جو معاملہ اپنے آپ ہی ختم ہو گیا، اس کے ذکر سے کیا فائدہ؟'' ملک ناصر نے ان کے غصے کو محسوس کیا۔

''لیکن اس شادی کو ملتوی کیا جا سکتا تھا۔ ابھی وہ ایک صدمے سے نہیں سنبھلی اور تم نے اس کے سامنے دوسری آزمائش کھڑی کر دی ہے۔''

''شادی یقیناً ملتوی ہو سکتی ہے لیکن اس التوا کی وجہ کیا بیان کی جائے؟ کیا یہ کہ میری بیٹی جس سے شادی کرنا چاہتی تھی، اس نے میری بیٹی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اب میری بیٹی کو اس صدمے سے نکلنے کے لئے وقت چاہیے؟'' انہوں نے تپے تپے لہجے میں کہا، پھر پست آواز میں بولے۔ ''کیا لگتا ہے تمہیں، کیا میں اپنی بیٹی کا دشمن ہوں جو جان بوجھ کر اسے تکلیف دے رہا ہوں؟...... نہیں ملک!'' ان کے بولنے سے پہلے بابا جان خود ہی بولے۔ ''لیکن اگر سب طے ہو جانے کے بعد اب میں اپنے فیصلے میں کوئی ردوبدل کرتا ہوں تو ملیحہ شکوک کی زد میں آ جائے گی اور شک کی ایک نگاہ بھی پڑ جائے تو پارسائی کی چادر میلی ہو جاتی ہے۔ حماقت تو کی ہے اُس نے، مگر میں نہیں چاہتا کہ ملیحہ کو اس حماقت کی سزا ملے۔ لیکن کچھ نہ کچھ تکلیف تو اسے اٹھانی ہی ہو گی۔'' وہ اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں کہہ رہے تھے۔ لیکن ملک ناصر جانتے تھے، اندر سے وہ کتنے پریشان تھے۔

''دیکھ لو اظہر! کہیں یہ تکلیف ملیحہ کی بساط سے بڑھ کر نہ ہو۔''

''ایسا نہیں ہو گا۔ اور اگر ہوتا تو وہ شادی سے انکار کر دیتی۔ یوں چپ چاپ نورالہدیٰ کے نام کی مہندی ہاتھوں میں نہیں لگا لیتی۔''

''تم بھول رہے ہو اظہر! اسے چپ رہنے کی عادت ہے۔''

''میں یہ نہیں بھول سکتا ملک! کہ ایک شخص نے اسے بولنا سکھا دیا ہے اور اگر وہ مجھ سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتی ہے کہ اسے وجدان سے شادی کرنی ہے تو یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ اسے نورالہدیٰ سے شادی نہیں کرنی۔ لیکن اُس نے ایسا کچھ نہیں کہا تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ اسے اعتراض نہیں۔ یوں بھی خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔'' انہوں نے کہہ کر بات ختم کر دی۔

❁❁❁

ملیحہ کی زندگی کا سب سے کڑا دن طلوع ہو گیا تھا۔ سمیرا منتظر رہی، اب وہ رو پڑے گی۔ اب وہ ضبط کا دامن چھوڑ دے گی۔ اب وہ چیخ چیخ کر فریاد کرے گی۔

'کوئی ہے جو میری زندگی لے کر مجھے وجدان دے دے؟'

مگر ملیحہ کے ہونٹوں سے اُف تک نہیں آئی۔ ہاں مگر اس کی نمازیں آج کچھ زیادہ طویل ہو گئی تھیں۔ نماز پڑھ کر پچھلے تین دن کی طرح دعا مانگے بغیر ہی ملیحہ نے جائے نماز اُٹھا دیا تو سمیرا نے دیکھ کر ٹوکا۔

''دعا تو مانگ لو۔''

وہ تھکن بھرے انداز میں مسکرائی۔

''ایک کا سکھ، دوسرے کا دُکھ۔ تم ہی بتا دو، کس کے لئے کیا مانگوں؟'' ملیحہ تو آج نیم جاں ہو چکی تھی۔ چہرہ تھا کہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور ہاتھ پاؤں برف کی مانند ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ بڑی ممانی نے اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس کی تو پریشان ہو گئیں۔

''دیکھو ذرا آمنہ! اس کے ہاتھ کیسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔'' آمنہ خالہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے دباتے ہوئے بولیں۔

''ہاتھ تو واقعی بہت ٹھنڈے ہو رہے ہیں مگر شادی کے خیال سے اکثر لڑکیوں کا حال ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

''لیکن اس نے کھانا پینا بھی تو چھوڑ رکھا ہے۔ سمیرا ہی زبردستی کچھ کھلا دے تو کھلا دے۔ اور آج تو وہ بھی منتیں کرتی رہ گئی، مگر ملیحہ نے پانی کا گھونٹ تک نہیں بھرا۔ اب شادی کو ایسا بھی کیا ہوّا بنا دیا۔ پھر یہ کون سا دُور جانے والی ہے؟ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کا سفر ہے۔'' گوہر نے کہا جو خود بھی کراچی سے بیاہ کر لاہور گئی تھی۔

"لیکن یہ مختصر سے سفر زندگی بدلنے والے ہیں۔ اور زندگی کا بدلاؤ تو اچھے اچھوں کو ہلا دے۔ جب کہ ملیحہ
ذرا بھی حساس ہے۔" چھوٹی ممانی نے مدبرانہ انداز میں کہا تھا۔

ام سے ذرا پہلے ہی شہر کی ماہر ترین بیوٹیشن، ملیحہ کو سنوارنے آ پہنچی۔ گہری افسردگی کی چادر اوڑھے،
ں میں ویرانی لیے، سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ بھی ملیحہ پر روپ ٹوٹ کر برسا تھا۔ صائمہ نے اسے دیکھا
اُتارتے ہوئے کہا۔

نورالہدیٰ واقعی قسمت کا دھنی ہے۔ ملیحہ خوب صورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی۔"

اب تو مجھے بھی ان کی خوش قسمتی کا یقین ہونے لگا ہے۔" سمیرا نے اس کی بات سنی تو بت کی مانند بے حس
ت بیٹھی ملیحہ کو دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ایک بارات ہی تو نہیں آئی تھی مگر باقی رسمیں تو ہو سکتی تھیں۔

ھر نورالہدیٰ نیوی بلیو کلر کے ڈنر سوٹ میں بنک سک سے تیار ہو کر لان میں بنے اسٹیج پر جلوہ افروز
ے، ادھر ملیحہ کو گھیرے میں لیے بیٹھی لڑکیاں "دودھ پلائی" اور "جوتا چھپائی" جیسی رسموں کے لیے بھاگ
ی ہوئیں۔

"تم نہیں جاؤ گی؟" دونوں ممانیاں تو میزبانی کے لیے پہلے ہی لان میں تھیں، بس آمنہ خالہ ہی ملیحہ کے
بیٹھی تھیں۔ سب لڑکیاں رسموں کے لیے اُٹھ گئیں مگر سمیرا وہیں بیٹھی رہی تو انہوں نے سمیرا سے کہا۔ وہ سر
ے ملیحہ سے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ آمنہ خالہ کی آواز پر سر اُٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"دل نہیں چاہ رہا پھپھو!"

س کی بات پر وہ ہنس پڑیں۔ "تمہارے دل کو کیا ہو گیا ہے؟"

سمیرا نے کچھ کہنا چاہا پر اس سے پہلے ہی ارم آ دھمکی۔ "پھپھو! امی کہہ رہی ہیں، آپ نیچے آ جائیں۔"

"دیکھو ذرا، دُلہن کو اکیلا چھوڑ کر آ جاؤں؟" انہوں نے خود کلامی کرتے ہوئے اپنی بھابی کی عقلمندی کو سلام
پھر ارم سے بولیں۔ "کام کیا ہے انہیں؟"

"وہ تو نہیں پتہ۔" ارم نے بھولپن سے سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔ "آفاق بھائی نے بس اتنا کہا تھا
جا کر آپ سے کہوں کہ امی آپ کو بلا رہی ہیں۔ کام تو نہیں بتایا۔ پوچھ آؤں؟"

"رہنے دو۔ میں خود دیکھ لیتی ہوں۔" وہ بول کر اُٹھیں اور ارم بھی ان کے ساتھ ہی واپس چلی گئی۔

ملیحہ خاموش بیٹھی اپنی چوڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر یوں ہی اس نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ سمیرا اسے ہی دیکھ
تھی۔ ملیحہ قصداً ذرا سا مسکرائی اور پوچھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

سمیرا خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کہا۔ ملیحہ مسکراہٹ کو کچھ اور پھیلا کر بولی۔ "سب کہہ رہے
ہیں میں دُلہن بن کر بہت اچھی لگ رہی ہوں۔"

''ہاں۔'' آخر سمیرا بول پڑی۔ ''اچھی تو لگ رہی ہو۔ مگر ٹھیک نہیں لگ رہیں۔''
''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ مستقل مسکرا رہی تھی۔ سمیرا چڑ سی گئی۔
''یوں مسکرا کر تم دھوکا کس کو دینا چاہ رہی ہو؟ مجھے یا اپنے آپ کو؟''
''اپنے آپ کو۔'' اس نے آرام سے تسلیم کرلیا۔
''تمہارے رونے پر مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوتی، جتنی اس وقت تمہاری مسکراہٹ کو دیکھ کر ہو رہی ہے۔'' اس کی آواز میں دکھ تھا۔ ملیحہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ سمیرا ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔ ''میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ تمہارا فیصلہ غلط ہے لیکن تم نے اچھا نہیں کیا۔ نہ اپنے ساتھ، نہ وجدان کے ساتھ۔'' وجدان کا نام برچھی کی طرح اس کے اندر اُتر گیا تو وہ جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ پل خود کو سنبھالنے میں لگے۔

''نکاح کا وقت ہو چکا ہے۔ آؤ نیچے چلتے ہیں۔'' پھر اس کے انتظار میں رُکی نہیں۔ بھاری شرارے کو اُٹھائے تیز قدموں سے چلتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر دروازے کے پٹ وا کر دیئے۔ اور اسی پل پتھر کی ہو گئی۔ اس کے بالکل سامنے وجدان کھڑا تھا۔ بلیک ڈریس پینٹ پر بلیک شرٹ پہنے، کلین شیو چہرے پر شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگ رہا تھا کئی راتوں سے نہیں سویا۔ اس کے سر پر پٹی نہیں بندھی ہوئی تھی مگر کچھ دن پہلے لگنے والی چوٹ کا نشان فراخ پیشانی پر بکھرے سیاہ بالوں میں سے اُبھار کی صورت جھانک رہا تھا۔ وہ لب بھینچے ملیحہ کو دیکھ رہا تھا۔ گولڈن کلر کے کورے کے نفیس کام والے سرخ شرارہ سوٹ میں زیورات سے سجی ملیحہ کے وجود سے بھینی بھینی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں میں بھر بھر کر کانچ کی چوڑیاں پہنے وہ مکمل دُلہن کا روپ لئے ہوئے تھی۔

وجدان کو حق نہیں تھا ورنہ وہ اس دُلہن کو منہ دکھائی میں اپنی جان دے دیتا۔ دروازے کے پٹوں پر رکے ہاتھ ملیحہ کے پہلو میں آ گرے تھے۔ وجدان نے محسوس کیا، ملیحہ کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی ہیں۔ خود اُس کی دھڑکنیں کہاں بس میں تھیں۔

''رُک کیوں گئیں؟'' اسے بت کی مانند دروازے میں کھڑے دیکھ کر پیچھے سے سمیرا نے کہا پھر کوئی جواب نہ پا کر اس نے سائیڈ سے نکل کر سامنے دیکھا اور چپ سی رہ گئی۔ پھر ان کے گم سم چہروں پر نظر ڈال کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ملیحہ نے وجدان سے نگاہ ہٹا کر سیڑھیاں اُترتی سمیرا کو دیکھا، پھر خود بھی اس کے پیچھے جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ سیڑھیوں تک جانے کے لئے وہ وجدان کے برابر سے گزری تو بے اختیار ہی وجدان نے اس کی کلائی تھام کر اسے روک لیا۔ اس کی مضبوط گرفت میں آ کر ملیحہ کی کلائی میں سرخ اور سنہری کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

ان ٹوٹی چوڑیوں نے ملیحہ کی کلائی کے ساتھ ساتھ وجدان کی ہتھیلی کو بھی زخمی کر دیا تھا جس سے نکلتا خون

کی کلائی پر بہتا اس کے خون سے مل کر پتلی سی لکیر بناتا ملیحہ کے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کی پور سے قطرے کی صورت سفید ماربل کے ٹھنڈے فرش پر ٹپک گیا۔ کوئی سمجھتا تو یہ محبت کی فریاد تھی۔

وجدان، ملیحہ کے ہر نقش کو دیکھ رہا تھا اور پلکیں جھکائے ملیحہ اپنے چہرے پر اسی حدت کو محسوس کر رہی تھی، جس نے ایک دن لائبریری میں بیٹھے بیٹھے اچانک ہی اسے بے چین کر دیا تھا۔ ملیحہ آج بھی بے چین ہو گئی۔ اس بے چینی میں ایک کسک تھی۔ کھو دینے کا ملال پوری شدت سے اس کے اندر جاگا تھا۔ کئی دنوں سے برف میں لپٹی اس کی حسیات کو جیسے کسی نے بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ اس نے چہرہ موڑتے ہوئے پلکیں اٹھا کر وجدان کی سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھا اور ایک آنسو کا قطرہ اس کی آنکھ سے ٹپک کر گال پر پھسلتا چلا گیا۔ ایک ہاتھ میں اس کی کلائی پکڑے دوسرے ہاتھ سے وجدان نے اس آنسو کو سمیٹنا چاہا تھا۔

اس نے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ملیحہ نے آنکھیں میچتے ہوئے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ نارسائی کی تیز دھار تلوار نے وجدان کے وجود کو دو حصوں میں کاٹ ڈالا تھا۔

'یہی پل زندگی کی موت ہے۔' اس کے دل نے کہا۔ اُسے لگا، اگر وہ ایک پل اور وہاں رکا تو اس کے وجود کی دیوار ڈھے جائے گی۔ ملیحہ کی کلائی چھوڑ کر وہ مڑا، پھر تیز قدموں سے ایک ایک کر تا سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ ملیحہ کا دل چاہا، دوڑ کر اسے تھام لے۔ مگر دل کی اس خواہش کو دباتی بجائے آگے قدم بڑھانے کے وہ اُلٹے پیروں چلتی کمرے کی دیوار سے جا لگی۔ وہ دھندلی آنکھوں سے دُور جاتے وجدان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے جیسے سیڑھیاں اُتر رہا تھا، ملیحہ کے بدن سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھتی چلی گئی۔ وجدان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہال کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ یہ وہ منظر تھا جسے دیکھنے کے بعد ملیحہ کی آنکھوں نے اور کچھ نہیں دیکھا۔ آنکھوں کو بھینچتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ پھر اس کا وجود کٹے ہوئے شہتیر کی مانند بائیں طرف ڈھے گیا۔

وجدان نے دُور سے نورالہدیٰ کو دیکھا، جو بڑے مسرور سے انداز میں سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے مبارکبادیں قبول کر رہے تھے اور ایک دم سے اس کا دل چاہا کہ اس شخص کو قریب سے دیکھے جس کی خاطر ملیحہ خود کو مٹانے کے لئے تیار ہے۔ وہ چلتا ہوا اسٹیج پر آ گیا۔

''ہادی بھائی!'' وہ جانے کس سے گفتگو میں مشغول تھے کہ ایک آواز نے انہیں پکارا۔ وہ چونکے۔ اس نام سے بس ملیحہ ہی انہیں پکارا کرتی تھی۔ پھر پلٹ کر دیکھا۔ پکارنے والے کی آواز میں ہی نہیں، چہرے پر بھی ویسی ہی تعظیم تھی جو ملیحہ کے چہرے پر انہیں اپنے لئے نظر آتی تھی۔

''شادی مبارک ہو ہادی بھائی!'' وجدان کے پورے وجود پر مردنی چھائی تھی مگر وہ خلوص سے متبسم لہجے میں بولا۔

''شکریہ۔'' نورالہدیٰ پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ کون ہے؟ اور انہیں اس نام اور اس انداز سے کیوں پکار رہا ہے؟ پھر وہ شکریے کے سوا کچھ نہ بول پائے۔

''میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ ملیحہ کو خوش رکھیئے گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ان کا خیال رکھے بغیر آپ رہ ہی نہیں سکتے۔''

''ان نیک خیالات کا شکریہ۔ مگر معافی چاہتا ہوں، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' انہوں نے وہ سوال کر دیا جو انہیں اُلجھا رہا تھا۔

''ہم پہلی بار مل رہے ہیں ہادی بھائی!''

اور الہدیٰ اور بھی چونک گئے۔ ''پھر اپنا تعارف بھی کروا دیجیے۔''

''میرا تعارف غیر ضروری ہے۔ بلکہ بہتر ہوگا کہ اس ملاقات کے بعد آپ مجھے بھول جائیں لیکن میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' پھر خود ہی آگے بڑھ کر وہ نورالہدیٰ سے بغلگیر ہو گیا۔

''اللہ حافظ ہادی بھائی!'' وجدان نے کہا پھر الگ ہو کر ان سے ہاتھ ملا کر اسٹیج سے اُتر گیا۔

نورالہدیٰ آنکھوں میں حیرت لیے اس اجنبی کو دیکھ رہے تھے جس کی آنکھوں کی ویرانی انہیں عجیب سے انداز میں چونکا گئی تھی۔ پھر سر جھٹک کر وہ بابا جان کی طرف متوجہ ہوئے جو انہیں کسی سے ملوانا چاہ رہے تھے۔ جس وقت وجدان، نورالہدیٰ سے مل کر اسٹیج سے اُترا، آفاق وہیں موجود تھا۔ وجدان کے اُترنے کے بعد وہ بھی اسٹیج سے اُتر کر وجدان کے پیچھے چل پڑا اور اس کے قریب جا کر ہلکی آواز میں پوچھا۔

''ملیحہ سے ملاقات ہو گئی؟''

وجدان نے اسے دیکھا پھر ''ہوں!'' کہہ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا جہاں ہنستے مسکراتے لوگوں کی چہل پہل تھی۔ آفاق سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس سے کیا کہے۔ پھر اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا تھا مگر دوست کی غم گساری پا کر وجدان کا حوصلہ ٹوٹنے لگا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آفاق کو دیکھا اور کہا۔

''اچھا دوست! اب اجازت دو۔''

آفاق اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا، دھیرے سے بولا۔ ''میں اس حالت میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔''

وجدان دل گرفتگی سے مسکرایا۔ ''میری یہ حالت تو اب مستقل رہنے والی ہے۔ تمہیں جب فرصت ملے غمگساری کو آ جانا۔ مگر اس وقت تمہاری بہن کی شادی ہو رہی ہے اور تمہارا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے۔''

آفاق سمجھ گیا تھا کہ وہ اس وقت تنہائی چاہ رہا ہے، اس لیے پھر کچھ نہ کہا۔

''چلتا ہوں۔'' وجدان نے کہا پھر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔

وجدان نے کار اپنے گھر کے گیٹ پر روکی، پھر اُتر کر گیٹ کھولنے کے بعد کار پورچ میں لے جانے کے بجائے وہیں اس کا انجن بند کر دیا اور چابی سے چھوٹا گیٹ کھول کر اندر آ گیا۔ سامنے سے ساجد، مزمل کے ساتھ گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ وجدان کو دیکھ کر مزمل نے ساجد سے کہا۔

"لو بھئی وجدان بھی آ گیا۔ اب تم لوگ باتیں کرو۔" پھر ساجد سے ہاتھ ملا کر واپس اندر چلا گیا۔ ساجد گہری نظروں سے وجدان کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ٹینس لگ رہے ہو۔" اس نے کہا تو وجدان اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔

"بس ایسے ہی۔" پھر فوراً بشاشت سے کہا۔ "تم سناؤ۔"

اور ساجد فوراً سنجیدگی کا چولا اُتار کر اپنی جون میں آ گیا۔ "ضرور سنائیں گے بھائی! کہو، کیا سننا چاہو گے؟ قوالی، غزل یا پھر ٹھمری سے کام چلے گا؟ الحمدللہ اس وقت سب کچھ سنانے کی پوزیشن میں ہیں۔ البتہ نہ رہتے اگر میں نے اپنے کیمرے کا رول دھلوائے بغیر ایڈیٹر صاحب کو دے دیا ہوتا۔" بولتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل میں سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سینے پر مارتے ہوئے جھڑک کر کہا۔

"لے پکڑ اپنی سوغات اور آئندہ میرے کیمرے کو ہاتھ نہ لگانا۔ میں تو تجھے شریف آدمی سمجھتا تھا اور تُو چوری چھپے لڑکیوں کی تصویریں اُتارتا ہے۔ سدھر جا۔ نہیں تو کسی کے بھائی کے ہاتھوں پٹے گا۔" وہ جانے کیا کیا بول رہا تھا۔ وجدان نے دھیان بھی نہیں دیا اور ناسمجھی کے عالم میں اس لفافے کو کھولنے لگا جو ساجد نے اسے پکڑایا تھا۔

لفافہ کھلا اور ملیحہ کی تصویریں وجدان کے ہاتھ میں آ گئیں۔ تصویروں میں مسکراتی ہوئی ملیحہ اس ملیحہ سے کتنی الگ تھی جسے وہ ابھی مل کر آ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے تصویروں کو دیکھتے ہوئے وہ اندر جانے لگا۔

"او بھائی! میں یہاں کھڑا ہوں۔" اسے غائب دماغی کی کیفیت میں اندر جاتے دیکھ کر ساجد اپنی ناقدری پر بلبلایا۔

وجدان ست رفتاری سے چلتا لاؤنج میں آ گیا، جہاں روز کی طرح سب موجود تھے اور چائے پی رہے تھے۔ لیکن وجدان نے کسی کی طرف دیکھا بھی نہیں اور اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ مصطفیٰ عظیم خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

❁❁❁

سمیرا مہمانوں کے درمیان مگر اس رخ سے بیٹھی تھی کہ کوئی بھی اگلے دروازے یا پچھلے لان کی طرف جاتا تو فوراً اس کی نظر میں آ جاتا۔ اس نے وجدان کو آتے دیکھا تو ملیحہ کے پاس جانے کے خیال سے کھڑی ہو گئی۔ لیکن پھر وجدان کو نورالہدیٰ کے پاس جاتے دیکھ کر رک گئی۔ کچھ سیکنڈ کے بعد وہ اسٹیج سے اُترا۔ اس کے پیچھے ہی آفاق بھی اسٹیج سے اُتر گیا۔ پھر دونوں میں مختصر سی بات چیت ہوئی۔

وجدان چلا گیا تو سمیرا نے مایوسی سے سر جھٹک دیا۔ ایک پل کو اسے لگا تھا کہ شاید وجدان، نورالہدیٰ کو سب بتا دے گا۔ لیکن خود کو نارمل کرتے ہوئے وہ پچھلے لان کی طرف آ گئی۔ اس نے آبنوسی دروازے کی چوکھٹ پر قدم رکھا ہی تھا کہ اوپر زینے پر کمرے کے دروازے کے سامنے بے ہوش پڑی ملیحہ پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ نہ

جانے وہ کیا احساس تھا، جس نے سمیرا کو دہلا دیا۔

''پھوپھا جان......!'' کسی خوف کے زیرِ اثر وہ چلّائی اور بجائے ملیحہ کے پاس جانے کے اُلٹے پیروں باہر دوڑ پڑی۔ ''پھوپھا جان! ملیحہ......'' اتنا بول کر ہی ہانپنے لگی تو بابا جان پریشانی بھری عجلت سے بولے۔

''کیا ہوا ملیحہ کو؟''

سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کو قابو کرتے ہوئے اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ملیحہ اپنے کمرے کے باہر بے ہوش پڑی ہے۔''

اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ نورالہدیٰ گلے میں پڑی پھولوں کی مالا کھینچ کر اُتارتے اندر کی طرف بھاگے۔ بابا جان بھی ان کے پیچھے تھے۔ نورالہدیٰ نیچے سے ہی ملیحہ کے بے ہوش وجود کو دیکھ چکے تھے۔ وہ کئی کئی سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ملیحہ کے پاس آبیٹھے اور پھرتی سے اسے اپنے بازو پر سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا، پلکیں نم ہو رہی تھیں، نیم وا ہونٹوں میں مدھم ارتعاش تھا۔ اس کی سانسیں اٹک رہی تھیں اور دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ نورالہدیٰ اس کی بے ترتیب دھڑکنوں کو اپنے سینے پر محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے ملیحہ کی نبض ٹٹولی جو ڈوبتی جا رہی تھی۔ پھر سیڑھیوں پر بھاگتے آفاق کو دیکھ کر چلّائے۔

''آفاق! گاڑی نکالو۔'' اور وہ سر ہلاتا پلٹ گیا۔

نورالہدیٰ کی چھٹی حس خطرے کا اشارہ دے رہی تھی۔ پاس ہی بیٹھے پریشان سے بابا جان کو کوئی دلاسا دیئے بغیر انہوں نے آناً فاناً ملیحہ کو بازوؤں میں اٹھالیا اور تیزی سے سیڑھیاں اُترتے چلے گئے۔ مہمانوں میں افراتفری مچی تھی۔ ہر طرف سے ''کیا ہوا، کیا ہوا؟'' کی آوازیں آ رہی تھیں۔

آفاق، کار کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ صمد نے پھرتی سے آگے بڑھ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اتنے میں بابا جان دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ چکے تھے۔ نورالہدیٰ نے ملیحہ کو ان کی گود میں لٹا دیا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

نورالہدیٰ کے بیٹھتے ہی آفاق نے کار کو طوفانی رفتار سے آگے بڑھا دیا۔ چند لمحوں کی افراتفری کے بعد فضا ایک دم ساکت ہو گئی تھی۔ حیرت کی زیادتی سے ہر شخص جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے جہاں رنگ و بو کا سیلاب تھا، قہقہوں اور مسکراہٹوں کا دریا اُمڈ رہا تھا، وہاں اب یک لخت اندیشوں کے سائے لہرانے لگے تھے۔

''یا اللہ!'' دروازے کے آگے بنے چھوٹے سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بے دم ہو کر بیٹھتی سمیرا کے لبوں سے دعا کی صورت ایک پکار نکلی تھی۔ ہمیشہ نپے تلے انداز میں برتاؤ کرنے والے بابا جان، ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے تھے۔ کبھی وہ ملیحہ کے ہاتھ چومتے کبھی اس کے چہرے کو، پھر اس کے گال تھپکتے ہوئے آوازیں دینے لگتے۔ اور جب پکار رائیگاں جاتی تو اسے خود میں بھینچ کر سسکنے لگتے۔

''اے اللہ! میرے حوصلے کو نہ آزما۔'' یہ دعا ان کی زبان کا وِرد بنی ہوئی تھی۔ نورالہدیٰ بار بار مڑ کر دیکھ

رہے تھے۔ان کی آنکھوں میں تشویش بڑھتی جارہی تھی۔اچانک بابا جان کو دھیان آیا کہ ملیحہ دُلہن بنی ہوئی ہے تو وہ آنکھیں جھپک کر دھند کو صاف کرتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ بابا جان نے زندگی میں کئی صدمے جھیلے تھے مگر کبھی ان کی آنکھ نم نہیں ہوئی۔ لیکن ملیحہ کو دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں بھر آئیں تو وہ اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ کر رو پڑے۔تبھی انہیں احساس ہوا کہ ان کے ہاتھ میں پکڑا ملیحہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے سرک گیا ہے۔وہ ٹھٹک کر اپنے خالی ہاتھ کو دیکھنے لگے، پھر گھبرا کر ملیحہ کی بند پلکوں کو دیکھا اور زور سے چلّائے۔

''آفاق! گاڑی تیز چلاؤ۔''

آفاق پہلے ہی بہت اسپیڈ میں ڈرائیو کر رہا تھا، ان کے لہجے کی سرسراہٹ کو محسوس کر کے اس نے رفتار مزید بڑھادی۔

ہسپتال کے ایمر جنسی ڈیپارٹمنٹ کے گیٹ پر گاڑی رُکتے ہی نورالہدیٰ اُترے اور پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر ملیحہ کو نکالنے لگے۔

''اسٹریچر لاؤ'' کی آواز لگاتا آفاق پیچھے آیا اور ملیحہ کو نکالنے میں نورالہدیٰ کی مدد کرنے لگا۔کوئی شخص تیزی سے اسٹریچر دوڑاتا ہوا آیا تھا۔ان دونوں نے ملیحہ کو کار سے نکال کر اسٹریچر پر ڈال دیا۔اس دوران باقی لوگ بھی پہنچ گئے تھے۔ایک ہجوم، ملیحہ کے اسٹریچر کے ساتھ ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔ایمر جنسی کی اطلاع پا کر ایک ڈاکٹر تیزی سے اس طرف چلا آیا اور رُکے بغیر اسٹریچر کو چلاتے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی اسٹریچر کے ساتھ تیز تیز چلتا ملیحہ کی نبض چیک کرنے لگا۔اسے شک سا ہوا۔

''ایک منٹ۔'' ڈاکٹر کی آواز پر سبھی تھم گئے۔ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ کانوں پر لگا کر ملیحہ کی دھڑکنیں چیک کیں، پھر کوٹ کی جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر اس کی روشنی باری باری ملیحہ کے پپوٹوں کو اٹھا کر اس کی آنکھوں میں ڈالی، پھر سیدھا ہوتا، ہوا میں سر ہلاتا پیچھے ہٹ گیا۔

''کیا ہوا؟'' بابا جان نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ڈاکٹر انہیں دیکھ کر تاسف سے بولا۔

''She is dead.''

اُس نے کہا تھا، وہ مر جائے گی......اور وہ مر گئی۔

❀❀❀

سمیرا کے اندر عجیب سی بے کلی پھیلی تھی۔اُس نے نظر گھما کر اپنے آس پاس دیکھا۔لان میں مہمانوں کے لئے ڈیکوریٹڈ کرسیاں اور میزیں لگی تھیں مگر مہمان جا چکے تھے۔انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شادی غیر اعلانیہ طور پر کینسل ہو چکی ہے۔پھر وہ رک کر کیا کرتے؟ سامنے ہی تازہ پھولوں کے ساتھ خوب صورتی سے سجا اسٹیج تھا جو ویران پڑا تھا۔لان میں تیز روشنیاں جل رہی تھیں جنہوں نے رات کو دن میں بدل دیا تھا۔

قصر فاروقی کی بیرونی دیواروں پر چھت سے رنگین برقی قمقمے لٹکتے ہوئے جھلملا رہے تھے۔یہ جھلملاہٹ ان

میں لگے پودوں اور درختوں کے تنوں سے بھی لپٹی تھی۔ کسی کو بھی ان روشنیوں کو گل کرنے کا خیال نہیں آیا۔
بھی کیسے؟ سبھی تو شاک میں تھے۔ صرف باہر سے ہی نہیں، قصرِ فاروقی اندر سے بھی دُلہن کی طرح سجا تھا۔ گلاب
اور موتی کے پھولوں کی لڑیاں ہر طرف بانہیں پھیلائے کھڑی تھیں۔ مگر اس سج دھج کے باوجود اچانک ہی ویران
لگنے لگا تھا۔ سجا سنورا مگر اُداس...... بالکل ملیحہ کی طرح...... سمیرا نے سوچا اور سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ ٹھنڈ...
بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اکڑنے لگا تھا جب کہیں جا کر ہارن کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا، آفاق کی
گاڑی پورچ میں آگے جا کر رک گئی تھی۔ بچے کھچے مہمانوں نے گاڑی کو گھیرے میں لے لیا۔ مگر اس میں سے
آفاق اور صمد ہی برآمد ہوئے تھے۔ وہ بھی نظر چراتے ان کے نرغے میں سے نکل گئے۔

سمیرا نے دیکھا، آفاق نے ہاتھوں میں لال رنگ کی پوٹلی اُٹھا رکھی تھی اور وہ اُسی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ پاس آ
کر کھڑا ہو گیا تو سمیرا سر اُٹھا کر اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔

''ملیحہ کہاں ہے؟'' سمیرا کو لگا، اس کے سوال پر آفاق کی آنکھیں نم ہوئی ہیں۔ اس نے کوئی جواب دیئے بغیر
وہ پوٹلی سمیرا کے ہاتھوں میں رکھ دی۔ سمیرا دیکھتے ہی پہچان گئی کہ یہ وہی سیلف اور گنزا کا لال کامدانی دوپٹہ تھا جو
ملیحہ شام سے اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دوپٹے کی تہہ ہٹائی تو اس میں رکھا زیورات کا ڈھیر
دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا، یہ ملیحہ کے زیور ہیں۔
صائمہ نے گھبرا کر دوپٹہ سمیرا سے لے لیا، پھر زیور اُلٹ پلٹ کر سرسراتے لہجے میں بولی۔

''یہ تو ملیحہ کے زیور ہیں۔ میں نے خود سمیرا کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھوں سے اسے پہنائے تھے۔''

آفاق کچھ نہ کہہ سکا۔

'جو زیور تم نے ملیحہ کو پہنائے تھے، میں انہیں لاش پر سے اُتار کر لایا ہوں۔' بدستور نظریں چراتے ہوئے اس
نے صمد کو دیکھا اور سر کے اشارے سے کچھ کہا۔ وہ بھی سر ہلاتا اس کے پیچھے لان میں آ گیا۔

دونوں ٹیبل اور کرسیاں اُٹھا کر سائیڈ میں جمع کرتے، لان خالی کرنے لگے۔ گھر کے نوکروں نے جو انہیں
اس کارروائی میں مشغول دیکھا تو ایک ایک کر کے اُن کا ہاتھ بٹانے لگے۔ جنید کی گاڑی ملیحہ کی خالہ اور ممانیوں کو
لے کر آ پہنچی تھی۔ ان روتی بلکتی خواتین کا وہ حال تھا کہ خود سے گاڑی سے بھی نہ اُتر پائیں۔ ان کی بیٹیوں نے
انہیں گاڑی سے اُتارا، پھر سہارے دیتی کرسیوں تک لے آئیں۔

''کیا بات ہے؟ آپ لوگ رو کیوں رہی ہیں؟..... ملیحہ کو کیا ہوا تھا؟ وہ کیسی ہے؟ آپ لوگ اسے ساتھ کیوں
نہیں لائے؟'' وہ سب سے سوال کر رہی تھیں اور ہر سوال کے ساتھ ان کے رونے میں شدت آتی جا رہی تھی۔
یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ نور الہدیٰ کی گاڑی بھی آ گئی اور اس کے پیچھے ہی ایک ایمبولینس بھی آ کر رُکی تھی۔

ایمبولینس کو دیکھ کر سبھی کے دل رُک سے گئے۔ نور الہدیٰ اُتر کے پیچھے آئے اور سہارا دے کر بابا جان کو گاڑی
سے اُتارا جو اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہ ہو پا رہے تھے۔ ملک ناصر اور منیر حسین نے گاڑی سے نکل کر ان

دونوں بازوؤں سے تھام لیا تو نورالہدیٰ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئے۔ وہ دونوں انہیں لان میں لے کر آ گئے اور کرسی پر بٹھا دیا۔

نورالہدیٰ، بابا جان کو چھوڑ کر ایمبولینس کی طرف آ گئے۔ پھر نورالہدیٰ اور آفاق، اسٹریچر اٹھائے ایمبولینس سے نکل آئے جس پر سفید چادر سے ڈھکا ہوا وجود لیٹا تھا۔ جس کسی نے بھی یہ منظر دیکھا، اس کی چیخیں نکل گئیں۔ نڈھال ہوتے بابا جان نے اسٹریچر کو دیکھا جسے نورالہدیٰ، ملیحہ کے کزنز کے ساتھ لان میں لے جا رہے تھے۔ ان کی زبان سے نالہ و فریاد بلند ہونے لگیں۔

سمیرا کا سانس رکا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا، اسے قیامت تک خبر نہ ہو کہ چادر سے ڈھکا وہ وجود کس کا ہے۔ اپنی اس خواہش کے باوجود وہ اُٹھی اور چلتی ہوئی اسٹریچر کے پاس آ گئی۔ وہ چند لمحے چادر کا کونا مٹھی میں جکڑ کر کھڑی رہی، پھر اس نے جھٹکے سے چادر اُلٹ دی اور موت کی آغوش میں سوئی ملیحہ کا چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ سمیرا، اسٹریچر کے پاس گر پڑی۔ وہ آنکھیں پھاڑے بے یقینی سے ملیحہ کو دیکھ رہی تھی، جس کا گلابی چہرہ موت کے اثر سے سفید ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے چمکتے تھے مگر موت کے بوجھ سے بند ہوئی پلکوں تلے اب روشنی کی ہر کرن دب چکی تھی۔ اس کے ہر لحہ مسکراتے ہونٹ ہمیشہ کے لئے ساکت ہو چکے تھے۔ روح، جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ مگر اس کے ہاتھوں سے مہندی کی خوشبو اب بھی آ رہی تھی۔ اس نے ملیحہ کے ہاتھ کی پشت کو ذرا سا چھوا تو ملیحہ کی کلائی میں چوڑیاں چھنک گئیں۔ اس دھیمے شور نے سمیرا کے ضبط میں شگاف ڈال دیئے۔ روکتے روکتے بھی اس کے لبوں سے آہیں نکل گئیں اور وہ ملیحہ سے لپٹ کر دیوانہ وار رونے لگی۔

نورالہدیٰ نے اسے رشک بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ خود اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اونچی آواز میں روئیں...... اتنی اونچی آواز میں کہ ان کی فلک شگاف چیخیں آسمانوں کے اوپر ملیحہ کے کانوں تک پہنچ جائیں۔ مگر ان کی آنکھیں صحرا بنی ہوئی تھیں۔ لب بھینچتے ہوئے انہوں نے بابا جان کی طرف دیکھا۔ ان کی شخصیت کا رعب و دبدبہ نہ جانے کہاں جا سویا تھا۔ اس وقت تو وہ ایک بے کس غمزدہ باپ تھے جنہیں اکلوتی بیٹی کی موت نے توڑ دیا تھا۔ نورالہدیٰ کو ان پر ترس آنے لگا۔ تھک کر وہ اپنے وجود کی ڈھارس دینے کے لئے اُٹھ گئے۔ نورالہدیٰ کا کندھا میسر آیا تو بابا جان کے رہے سہے ہوش بھی کھو گئے۔ ان کے سینے میں منہ چھپا کر وہ رونے لگے۔

"میری ملیحہ مر گئی...... میری عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔ جس کا چہرہ دیکھنے کے لئے سات سال ترس کر گزار دیئے، وہ ایک پل میں مجھے چھوڑ گئی...... جسے ہاتھ تھام کر چلنا سکھایا، اس نے میرے ہاتھوں میں جان دے دی اور میں اپنی بیٹی کو بچا بھی نہ سکا۔ موت اتنی ارزاں ہو گئی ہے تو کہیں سے مجھے بھی لا دو۔" نورالہدیٰ ٹوٹ رہے تھے مگر ان کا ضبط نہ ٹوٹا۔

سمیرا نے دھندلی آنکھوں سے نورالہدیٰ کو دیکھا جو برداشت کی آخری حدوں کو آزما رہے تھے۔ پھر بابا جان

کو دیکھنے لگی، جن کی برداشت کی آخری حد بھی ختم ہو چکی تھی۔ اُس کا دل بھر آیا۔

'کون کہے گا، قیامت آنی باقی ہے؟' پھر اچانک ہی وجدان کا خیال آیا تو کانپ اُٹھی۔

''ہاں، مگر ایک حشر ابھی اور اُٹھے گا۔ پھر قیامت تک قیامت مستقل ہو جائے گی۔'

❁❁❁

بیڈ کی پائینتی سے کمر ٹکا کر بیٹھا وجدان ایک ایک کر کے ملیحہ کی تصویریں دیکھتا جا رہا تھا..... اُس کا ہر انداز بے خبر تھا اور ہر ادا دلفریب...... ایک تصویر کو دیکھ کر وجدان کا دل رُکنے لگا۔ شانے پر پلّو صحیح کرتے ہوئے ملیحہ کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ وجدان کی آنکھوں میں چبھن بڑھ گئی۔ انہی نرم سلاخوں نے تو اسے اسیر کیا تھا۔ نارسائی کے احساس میں اُلجھ کر اُس کے ہاتھوں سے ملیحہ کی تصویریں ایک ایک کر کے کارپٹ پر بکھر گئیں۔ وجدان کی نظر خالی ہاتھ کی ہتھیلی پر پڑی تو وہ غور سے ان خون آلود لکیروں کو دیکھنے لگا، جنہوں نے اُس کی قسمت بدل دی تھی۔

'اگر ہاتھ تھامنے کی یہ سزا ہے تو آپ کو پالینا واقعی مشکل ہوتا۔' پھیلا ہوا ہاتھ سمیٹتے ہوئے اُس نے سامنے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی پینٹنگ کو دیکھا۔

''عشق اوّل و آخر درد ہی درد ہے۔'' عشقِ آتش کو دیکھتے ہوئے ملیحہ کے الفاظ یاد آئے تو اس نے بے ساختہ رگ و پے میں سرایت کرتے درد کو محسوس کیا۔ طلب کسک بن گئی تھی اور وجدان کے اندر ڈیرے ڈال کر بیٹھی ملیحہ کو پانے کی آرزو اسے کھو کر ختم ہونے کے بجائے پہلے سے سوا ہو گئی تھی۔

'کیا یہ عشق کی ابتدا ہے؟' اس نے حیرت سے سوچا۔ 'مگر میں تو انہیں ہمیشہ کے لئے کھو آیا ہوں۔ پھر یہ درد کیونکر میرے دل میں سمائے گا؟'

''عشق حاصل کا نہیں، لاحاصل کا جنون ہے۔'' وہ اُسے عشق کی نشانیاں بتا رہی تھی۔ وجدان کے اندر لاحاصل کا جنون ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''عشق کا جنم جدائی کی کوکھ سے ہوتا ہے...... جدائی درد دیتی ہے۔'' اب وجدان کے دل میں اس درد کے سوا اور کیا تھا؟

''جب یہ درد لہو بن کر جسم میں بہتا ہے تو پھر کوئی اُمید باقی نہیں رہتی۔'' آج وجدان کے لئے اُمید ختم ہو چکی تھی۔

''عشق وہ آتش ہے جو جلائے تو راکھ نہیں کرتا، فنا کر دیتا ہے۔'' لیکن جستجو باقی تھی اور لاحاصل کی جستجو نے وجدان کے اندر الاؤ دہکا دیا تھا جس کے شعلوں میں گھر کر وہ ہر احساس کھوتا جا رہا تھا۔

'ہاں...... مجھے عشق ہے۔' اس نے اعتراف کیا تو ملیحہ کا اعتراف کرنا یاد آ گیا۔

''مجھے وجدان سے عشق ہے۔ عشق کی آگ میں جلنا آسان نہیں۔'' ملیحہ کے اعتراف نے اس کے درد کو بڑھا دیا تو اپنی تکلیف کو بھول کر ملیحہ کی تکلیف اس کی زبان کا گلہ بن گئی۔

'یااللہ! عشق کی بھٹی میں سلگنے کے لئے کیا میرا وجود کافی نہیں تھا جو تُو نے اُنہیں بھی اس آگ میں اُتار دیا؟'

"جس انسان کو عشق ہو جائے تو چوٹ دوسرے کو لگتی ہے، پر درد سے اپنا جسم کراہ اُٹھتا ہے۔ دوسرے کی چوٹ کا درد سہنا آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جستجو ہر کوئی نہیں کر پاتا۔ یہ الاؤ اسی لئے ہر بھٹی میں دہکایا نہیں جاتا کہ جس کا سینہ عشق کی بھٹی بن جائے، اس کی آنکھوں میں کسی دوسرے کے جلنے کا احساس کر کے اپنی جلن بھولنا بہت مشکل ہے......اور جو بھول جائے، وہ عمر بھر جلتا ہے پر آگ نہیں بجھتی۔"

❀❀❀

آفاق جس وقت وجدان کے گھر پہنچا، وہاں ناشتہ شروع کیا جا رہا تھا۔ مزمل اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بجائے ڈائننگ روم میں لے آیا۔

"بیٹھو آفاق! ناشتہ کرلو۔" عائشہ مصطفیٰ نے اسے دیکھ کر خالی چیئر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ آفاق نے تو شاید دھیان بھی نہ دیا تھا کہ انہوں نے اس سے کیا کہا ہے۔

"آنٹی وجدان کہاں ہے؟"

"اوپر اپنے کمرے میں، میں اسے ہی ناشتے کے لئے بلانے جا رہی تھی۔" پھر غور سے آفاق کی اُتری شکل کو دیکھ کر بولیں۔ "تم پریشان لگ رہے ہو۔ سب خیریت تو ہے؟"

آفاق چھپا نہیں پایا تو سر نفی میں ہلاتا ہوا آہستگی سے بولا۔ "کل رات کو میری کزن کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ آج ظہر کے وقت اس کا جنازہ ہے۔"

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔" انہوں نے تاسف سے زیر لب پڑھا۔

"جنازے میں شرکت کے لئے میں وجدان کو اپنے ساتھ لینے آیا ہوں۔ آپ ناشتہ تیار رکھیے، میں اسے لے کر آتا ہوں۔"

وجدان کے کمرے کا دروازہ پوری طرح سے بند نہیں تھا، اس میں جھری سی بنی ہوئی تھی جس میں سے روشنی چھن کر باہر آرہی تھی۔ آفاق نے ہاتھ رکھ کر پورا دروازہ کھول دیا۔ وہ سر بیڈ کی پائینتی سے ٹکائے کارپٹ پر بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا۔ ملیحہ کی تصویریں اُس کے گرد بکھری پڑی تھیں۔ آفاق جانتا تھا، وجدان کو ملیحہ کے مرنے کی خبر دینا کا سب سے کٹھن کام ہوسکتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ حوصلہ کرتا یہاں تک چلا آیا تھا۔ مگر وجدان کی حالت دیکھ کر اُس کی ہمت جواب دے گئی۔

"وجدان!" بڑی دقتوں سے اس نے وجدان کا نام لے کر اسے مخاطب کیا تھا جو ابھی تک اس کی موجودگی سے بے نیاز تھا۔ وجدان نے نظروں کا زاویہ بدل کر آفاق کو دیکھا، پھر سیدھا ہوتے ہوئے بے اختیار پوچھنے لگا۔

"ملیحہ کیسی ہیں؟"

آفاق کے لب بھینچ گئے۔ وہ سمجھ نہیں پایا کہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ پھر اسے یہی بہتر لگا کہ اس کے

سوال کو نظر انداز کر دے۔

"اُٹھ کر تیار ہو جاؤ وجدان! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں؟" اگر کہیں وجدان نے اپنے سوال کے نظر انداز ہونے کو محسوس بھی کیا تھا تو جتایا نہیں۔

"تم چلو تو یہ بھی پتہ چل جائے گا۔"

"مجھے ساتھ لے جانا ضروری ہے؟"

آفاق سمجھ رہا تھا کہ وہ کمرے سے باہر نہیں جانا چاہتا، اسی لئے ٹال مٹول کر رہا ہے۔ مگر اس کی
حالت ایسی تھی کہ وجدان کا خیال کئے بغیر جھنجلا گیا۔

"ضروری نہ ہوتا تو تمہیں لینے نہیں آتا۔ اور پلیز اب مزید کوئی سوال مت کرنا۔ میں بہت پریشان ہوں
پھر وجدان نے کوئی سوال نہیں کیا اور اسی طرح چلنے کو تیار ہو گیا۔

آفاق ڈرائیو کرتے ہوئے خود میں اتنی ہمت جمع کرتا رہا جس سے وہ وجدان کو خبر کر سکے۔ مگر ا
الفاظ ہی نہیں مل پائے جن میں وہ اسے ملیحہ کے مرنے کی خبر سناتا۔ وجدان نے بھی کوئی سوال نہیں ک
گردن جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھتا چپ بیٹھا رہا۔

گاڑی رک چکی تھی۔ وجدان نے کار کا رُکنا محسوس کر کے باہر دیکھا تو چونک گیا۔ پھر اپنے انداز
تصدیق کے لئے اس نے بڑے سے لوہے کے سیاہ گیٹ کے بائیں طرف بیلوں سے ڈھکی اُس سلو
جگمگاتی پلیٹ کو دیکھا جس پر سیاہ روشنائی سے "قصرِ فاروقی" کندہ تھا۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" اس نے حیرت سے آفاق کو دیکھا۔ مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر ا
کھول کر اُتر گیا۔ وجدان کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی کہ آفاق کچھ بولنے سے گریز کرنے کے لئے ا
بی ہیو کر رہا ہے۔ آفاق کے اُتر جانے کے بعد بھی وہ کار میں بیٹھا رہا تو آفاق آگے سے گھوم کر اس کی
آ گیا اور اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ وجدان نے دیکھا، وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھ
آنکھوں میں اُلجھن لئے وہ اُتر گیا تو آفاق نے دروازہ بند کیا اور اسے اپنے ساتھ آنے کا کہتے ہو
سے اندر پتھریلی روش پر آگے بڑھ گیا۔ وجدان نے اس کی تقلید میں قصرِ فاروقی کے اندر قدم رکھا تو ا
کا ایک اور جھٹکا لگا۔

ایک ہی رات میں قصرِ فاروقی کا نقشہ بدل گیا تھا۔ رات قصرِ فاروقی کے در و دیوار سے رنگ و بو کا
اُمڈ رہا تھا لیکن دن کے اُجالے میں وہاں ویرانی ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ رات جن کی خوش گپیوں اور
کے بیچ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، اب وہی لوگ سایوں کی طرح بے آواز گردش کر
احتیاط سے چل رہے تھے کہ آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بارونق چہرے بے رونق ہو چکے تھ
ہوئی آوازیں سرگوشیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ تھوڑے وقفے سے قصرِ فاروقی کے اندرونی حصے

سسکیوں کی آواز اُبھر جاتی اور لان میں بیٹھے کئی مرد چہرہ چھپا کر اپنی آنکھوں کے گوشوں سے نمی سمیٹنے لگتے۔

تھوڑا آگے جا کر وجدان کی نظر اس گوشے پر پڑی جہاں ٹیبلوں کو ڈھیر کی صورت جمع کر کے ان پر کرسیاں اُلٹ کر رکھی ہوئی تھیں اور ان کے آگے ہی لان کی گھاس پر دری ڈال کر قالین بچھے تھے جن پر چاندنی بچھائے بیٹھے لوگ ہاتھوں میں سیپارے لیئے قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ انہی لوگوں کے درمیان وجدان نے بابا جان کو بیٹھے دیکھا تھا۔

رات کو وجدان نے جب انہیں دیکھا تھا تو وہ سر اٹھائے پُرتمکنت انداز میں بڑی شان سے نورالہدیٰ کو لئے اسٹیج کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے قدموں کی دھمک محسوس کی جانے والی تھی۔ جب وہ خاص انداز میں گردن کو اٹھا کر بے تاثر نظر سے کسی کو دیکھتے تو بے چارہ بلاوجہ ہی مرعوب ہو جاتا۔ مگر اب تو ان کی گردن اس قدر جھکی ہوئی تھی کہ ٹھوڑی سینے کو پہنچی ہوئی تھی۔ کمر میں خم ڈال کر بیٹھے ان کے دونوں شانے آگے کو ڈھلک گئے تھے۔ ہمیشہ بے تاثر رہنے والی ان کی آنکھوں میں بے بسی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ وہ رو نہیں رہے تھے، پھر بھی وجدان نے اندازہ لگایا کہ اب تک کی عمر میں بچا کر رکھے سارے آنسو وہ کل رات کو بہا چکے ہیں۔

'آخر ایسی کیا واردات ہوئی ہے؟' اس نے حیرت سے سوچا اور اگلے ہی پل اس کی حیرت کئی گنا بڑھ گئی۔ نورالہدیٰ، بابا جان کے پاس آئے اور گھٹنا ٹکا کر بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں ان سے کچھ کہنے لگے۔ وہ ابھی بھی رات والے کپڑوں میں تھے مگر اب ان کے سوٹ کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ اس ابتری کے باوجود ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا پھر بھی وجدان نے ان کے وجود سے لپٹے کسی دکھ کو محسوس کر لیا تھا اور اس احساس کے ساتھ ہی اس نے حیرت سے سوچا۔

'کل ہی تو ہادی بھائی کو من چاہی ہستی کا ساتھ ملا ہے...... کم از کم آج تو انہیں اس حال میں نہیں ہونا چاہیئے۔' تبھی چلتے چلتے وجدان کو ٹھوکر لگی تھی اور وہ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گر پڑا مگر فوراً ہی ایک ہاتھ زمین پر رکھ کر سنبھلتے ہوئے اُس نے اُٹھنا چاہا۔ پر اچانک ہی اس کا جسم جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ سنبھل کر اُٹھتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا تو اس کی نظر چارپائی پر سفید کفن میں لپٹی ملیحہ کے بے جان چہرے پر پڑی تھی۔ وہ پتھر کیسے نہ ہوتا؟ اُس نے زور لگا کر سینے میں اٹکے سانس کو اندر کھینچنا چاہا تو اُس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے اپنے بازو پر کسی کا ہاتھ محسوس کر کے اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو آفاق اس کے پاس تھا۔ آفاق آہستگی سے کہنے لگا۔

"کل تمہارے جانے کے بعد اچانک ہی ملیحہ کی حالت بگڑ گئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی...... ہم اسے فوراً ہی ہسپتال لے کر گئے مگر اس نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔"

وہ اب کھانس نہیں رہا تھا بلکہ یوں آفاق کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کی زبان سے نکلے لفظ اس کے لئے نامانوس ہوں۔ آفاق نے اس کا چہرہ دیکھا پھر اپنا بازو اس کے کندھوں پر پھیلا کر دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامتے

ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بہت واضح الفاظ میں بولا۔
''ملیحہ مر چکی ہے وجدان......!''
اور اسی دن، اسی پل وجدان بھی مر گیا۔
''بھائی صاحب! جنازے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب میت اُٹھانے کی اجازت دے دیجئے۔'' بس ایک منیر حسین ہی تھے جو نہ جانے کیسے خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ باقی بڑے ماموں کی حالت بھی بابا جان سے مختلف نہیں تھی۔ بابا جان کا ضبط چُور چُور ہو گیا۔
''میری بیٹی کو مجھ سے جدا نہ کرو منیر حسین!''
''بیٹی تو کب کی جدا ہو گئی صاحب! اب تو بس خاک کا پتلا بچا ہے، جسے خاک میں لوٹانا ہے۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
عورتیں لاؤنج کے کارپٹ پر چاندنیاں بچھائے سیپارے پڑھ رہی تھیں۔ آفاق نے صوفے کے پاس رک کر آہستہ سے سمیرا کو آواز دی۔
''تم سب آکر آخری بار ملیحہ کا چہرہ دیکھ لو۔ پھر تھوڑی دیر میں اسے مسجد لے جائیں گے۔'' اس کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہوئیں مگر وہ پلکیں جھپک کر آنسوؤں کا راستہ روکتی، سر ہلا کر واپس پلٹ گئی۔
جنازے کو تو اُٹھنا ہی تھا مگر وہ اُٹھ رہا ہے یہ سن کر کہرام مچ گیا۔ ملیحہ کو زندگی میں تو سکون نہ ملا، لیکن مرَ اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔
وجدان نے سر اٹھا کر نورالہدیٰ کو دیکھا جو اچانک ہی بہت بے چین سے ہو گئے تھے۔ اگر وہ اتنے بدقسمت نہ ہوتے تو آج کا دن ان کی زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہوتا مگر......
''میں نے ایک دعا بھی کی تھی کہ میری خوشی کی خاطر اپنا دکھ سہنے کا حوصلہ رکھنے والے کو کبھی دکھ نہ ملے۔ میں اس کا ساتھ چھوڑنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں جو مجھے ساتھ چھوڑ کر جانے کی اجازت دے رہا ہے۔''
الفاظ جو ایک پل کے لئے وجدان کی سماعتوں کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے، اس کے ذہن میں گونج گئے تو بے اختیار وہ ملیحہ سے گلہ کرنے لگا۔
'آپ تو اپنی ہی دعا کا بھرم نہیں رکھ پائیں...... ہادی بھائی کا ساتھ کیا نبھاتیں؟' اس نے ابھی تک ا دل میں جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہاں کتنی تباہی پھیلی ہے اور آیا کچھ بچا بھی ہے کہ نہیں۔ وہ نورالہدیٰ کو سوچ رہا تھا۔ کیونکہ ملیحہ نے نورالہدیٰ سے آگے کچھ نہیں سوچا تھا۔
'آپ کی یہ ادا بہت ظالم ہے ملیحہ!' اس نے کفن کی چادر سے جھانکتے ملیحہ کے چہرے کو دیکھا۔ 'کل جدائی کا حکم سنایا تھا اور آج ہادی بھائی سے جدا ہو گئیں۔ آپ کو نہ مجھ پر ترس آیا اور نہ ہادی بھائی پر۔' وجد کی آنکھیں نم ہو گئیں تو ملیحہ کا چہرہ اس کی نظروں میں دھندلا گیا۔ اور اس خیال سے کہ آج آخری بار اس

نظریں ملیحہ کو چھو رہی ہیں، اب یہ نظارہ آنکھوں کو پھر نظر نہیں آئے گا۔
'کاش وہ کہیں سے آ جائے...... ایک بار سہی...... آخری بار سہی...... میں اُسے جی بھر کے دیکھ تو لوں۔
اب ایک عمر اس کے بغیر گزارنی ہے۔ کوئی تو سہارا ہو' ملیحہ کو جی بھر کر دیکھنے کی خواہش پر اس کے وجدان سے کہے آخری الفاظ وجدان کو یاد آ کر بے چین کر گئے۔
'کیا وہ بھی اس وقت اسی طرح تڑپی ہوں گی جیسے آج میں تڑپ رہا ہوں؟'
"آج کوئی جا کر اس سے پوچھے، اپنی پوری زندگی میں سے صرف ایک پل مجھے نہیں دے گا...... ایک پل...... صرف ایک پل مجھے دے دے...... ایک بار مجھ سے ملنے آ جائے...... بس ایک بار۔"
'میں اپنی پوری زندگی آپ کو دے دوں گا ملیحہ! اپنی ہر سانس آپ کے نام لکھ دوں گا...... بس ایک بار لوٹ آئیں...... بس ایک بار۔'' اس کے دل میں ہر طرف فریادیں مچل اُٹھیں۔
"اُٹھو اظہر! کیا بیٹی کو کندھا نہیں دو گے؟'' ملک ناصر نے یہ کیا کہہ دیا تھا۔ بابا جان تو دیوانوں کی طرح اپنا سر پیٹنے لگے۔
"میں مر جاؤں گی بابا جان!'' کتنے مان سے اس نے اپنے باپ سے جان بخشی کی درخواست کی تھی۔
"مر جاؤ گی تو تمہیں کندھوں پر اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے دفنا آؤں گا۔'' اپنی بیٹی کے لئے کہے گئے الفاظ کتنے سفاک تھے، بابا جان کو اب احساس ہوا تھا۔
"رہنے دیں ملک انکل! پھوپھا جان سے نہیں ہو گا۔'' آفاق نے ان سے کہا۔
وجدان اُٹھ کر ملیحہ کے سرہانے بائیں جانب آ کھڑا ہوا۔
نورالہدیٰ کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا ورنہ وہ وجدان کو پہچان جاتے۔ لیکن وہ حیران ہوئے تھے کہ جلتی آنکھوں اور دہکتے چہرے والا یہ شخص کون ہے جسے ملیحہ کی موت پر اتنا دکھ ہوا ہے، کہ صبح سے بیٹھا پاگلوں کی طرح ملیحہ کو دیکھے جا رہا ہے۔ اور اب اپنے حلیے سے دیوانہ نظر آتا وہ شخص حق دار کی طرح ملیحہ کو کاندھا دینے آ گیا تھا۔ یہ حیران ہونے کا وقت نہیں تھا سو انہوں نے اپنی حیرت کو جھٹک دیا۔ پھر چاروں ایک ساتھ جھکے اور ملیحہ کا جنازہ اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ کلمے کی صدائیں بلند ہو گئیں۔
آج وہ قصرِ فاروقی سے رخصت ہو رہی تھی...... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ بیس سالوں پر محیط اس کی زندگی کی داستان اچانک ہی ایک موڑ پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔ اسے کہتے ہیں زندگی...... اور یہ ہوتی ہے موت...... ایک بے وفا...... دوسری بے رحم۔ اور کیا بے بسی ہے کہ فرار دونوں سے ہی نہیں...... زندگی سفاک لگے تو موت کے آنچل میں چھپ جاؤ...... لیکن اگر مر کر بھی سکون نہ ملے تو کاش کوئی تیسرا دروازہ بھی ہوتا۔
قبر تیار ہو چکی تھی۔ ملیحہ کا جنازہ، قبر کے پاس اُتار دیا گیا۔ آفاق نے وجدان کو اشارہ کیا تو وجدان کو ملیحہ کا موزنا یاد آ گیا اور وہ جبڑے بھینچ کر نفی میں سر ہلاتا پیچھے نکل گیا۔ آفاق ایک نظر اسے دیکھ کر جنازے کے

پاس آ گیا، پھر کمر کے گرد بندھے کپڑے سے پکڑ کر نورالہدیٰ اور صمد کے ساتھ مل کر احتیاط سے ملیحہ کے جسم کو قبر کے اندر کھڑے جنید اور منیر حسن کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ پھر وہ اور نورالہدیٰ بھی قبر میں اُتر آئے۔

''تم سفید رنگ مت پہنا کرو۔ اس رنگ میں تم اتنی پیاری لگتی ہو کہ ڈر لگتا ہے، تمہیں نظر نہ لگ جائے۔''

کفن کی سفید چادر اس کے چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے نورالہدیٰ کے ہاتھ کانپ گئے۔ انہوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا لیکن آج انہیں ملیحہ سفید رنگ میں اچھی نہیں لگی۔ انہیں بے ساختہ وہ رات یاد آ گئی، جب ان کا انتظار کرتے وہ تھک کر سو گئی تھی۔ سوتے ہوئے اس کے چہرے پر کتنی معصومیت تھی۔ اور وہ نرم سا تاثر جو سوتے جاگتے ہر حال میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ موت کے کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی وہ نرمی، وہ حلاوت اور وہ معصومیت اس کے چہرے پر تھی۔ نورالہدیٰ کو لگ رہا تھا جیسے وہ آج بھی تھک کر سو گئی ہو..... مگر آج یہ تھکن زندگی کی تھی۔

'میں تمہارے سحر سے آزاد نہیں ہونا چاہتا۔' انہوں نے نرمی سے ملیحہ کی پلکوں کو چھوا۔ 'میری زندگی سے تو جا رہی ہو، بس اتنا احسان کرنا کہ میرے دل سے کبھی نہ جانا۔ اپنی یاد کا ایک چراغ جلا کر میرے دل کے طاق پر رکھ دینا۔ میں اسی روشنی میں جینے کی وجہ ڈھونڈ لوں گا۔'

ان کے دل کو کچھ ہوا تھا اور وہ تیزی سے پلٹ کر قبر سے باہر نکل آئے۔ گورکن بیلچوں کی مدد سے مٹی قبر میں بھر رہے تھے اور وجدان دفن ہوتا جا رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر لگی اور ملیحہ کا قیامت تک کے لئے سورج سے پردہ ہو گیا۔ اس کی ادھوری محبتیں، نامکمل آرزوئیں اور ٹوٹے خواب اس کے جسم کے ساتھ ہی منوں مٹی تلے دفن ہو گئے۔

اپنے جذبوں کی صلیب آپ اُٹھائی ہم نے
زندگی سن تو سہی کیسے بتائی ہم نے
مڑ کے دیکھا تو رہِ زیست کو تنہا پایا
تب یہ معلوم ہوا، عمر گنوائی ہم نے

✿✿✿

نورالہدیٰ قبرستان سے نکلے تو گھر نہیں آئے بلکہ وہیں سے ملک انکل کو بابا جان کا خیال رکھنے کو کہہ کر سکون کی تلاش میں جانے کن راستوں پر نکل کھڑے ہوئے مگر سکون کبھی ڈھونڈنے سے ملا ہے؟ انہیں گھر جانے کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی۔ مگر کب تک گھر نہ جاتے؟..... گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی انہوں نے لاشعوری طور پر سامنے لاؤنج میں رکھے صوفے کی طرف دیکھا۔ ان کی نظر کی عادت ہو گئی تھی، وہ جیسے ہی انٹرنس کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے، ان کی نظر سامنے کو اُٹھ جاتی اور ملیحہ جو روز لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی ان کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوتی، ہر روز کئے جانے والا استقبال اس انداز میں ہوتا تھا، جیسے وہ ہفتوں بعد گھر

لوٹے ہوں۔

وہ ایک ہاتھ لاک پر رکھے ابھی تک دروازے میں کھڑے تھے جیسے منتظر ہوں کہ ملیحہ کسی کونے سے نکل کر اچانک ان کے سامنے آ جائے گی۔

'تم کیوں مر گئیں ملیحہ؟' یہ سوال اس وقت انہیں بے چین کئے ہوئے تھا۔ لیکن جواب نہیں ملا۔ لاؤنج میں رکھے اس صوفے سے نظر بچا کر سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے تک آئے......دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا مگر اسے گھما نہ سکے۔ وہ جانتے تھے، جیسے ہی وہ ہینڈل گھما کر دروازہ کھولیں گے، دروازے کے اوپر رکھی ٹوکری میں ملیحہ کے استقبال کی منتظر گلاب کی ڈھیروں پتیاں اُن پر برسنے لگیں گی اور کارپٹ پر بچھے پھول جو ملیحہ کے پیروں کو چھونے کی آس میں تھک کر اب مرجھا گئے تھے، ان کے بھاری بوٹوں کے تلے چرمرا جائیں گے۔ وہ بھلا کیسے اس شور کو سن پائیں گے؟......اور وہ شام جو اگر آ جاتی تو بڑی حسین تھی۔

اس کے حُسن کو دو آتشہ بنانے کی خاطر اپنے وجود کی قربانی دینے والی کینڈلز، جن کا موم کل ملیحہ کو وصل کے لئے سجائی گئی سیج میں نہ پا کر دکھ سے پگھلتا قطرہ قطرہ یوں ٹپکا تھا جیسے کسی آنکھ سے آنسو۔ اور پھر شبِ وصل میں اُجالے بھرنے کے لئے جلائی گئی موم بتیاں، شبِ فرقت کے اندھیروں میں بجھ گئی تھیں۔ اب کون ان کے پگھلے ہوئے وجود کو دیکھتا؟ سیج کو اپنے جھرمٹ میں لئے چھت سے لٹکتی تازہ گلاب کی لڑکیاں جواب اپنی تازگی کھو چکی تھیں......نورالہدیٰ کیسے ان کے کمہلائے چہرے دیکھتے۔ یہ سب اہتمام ملیحہ کے لئے تھا۔ اور جب اسی نے یہاں پاؤں نہیں دھرا تو نورالہدیٰ کیسے یہاں قدم رکھ پاتے۔ دھیرے دھیرے ان کا ہاتھ ہینڈل پر سے سرک گیا۔ وہ اُلٹے قدموں لاؤنج میں آئے تو بابا جان کے بند دروازے کے آگے رک گئے۔ وہ جانتے تھے اس بند دروازے کے دوسری طرف کیا قیامت ٹوٹ رہی ہوگی۔ مگر ایک قیامت ان پر بھی گزر رہی تھی۔

کل سے وہ بابا جان کا حوصلہ بڑھا رہے تھے، انہیں سمیٹ رہے تھے۔ مگر اب انہیں اپنا حوصلہ بڑھانا تھا، خود کو سمیٹنا تھا تاکہ بابا جان کا دکھ بٹا سکیں۔ وہ سر جھکائے اس دروازے کے سامنے سے گزر کر ڈائننگ روم سے ہوتے ہال میں آ گئے جس کی دیواروں پر ملیحہ کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ان کا رخ سیڑھیوں کی جانب تھا۔ ملیحہ کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا، جسے نورالہدیٰ نے دونوں ہاتھوں سے پٹ تھام کر کھول دیا۔ کمرے کی فضا ساکت تھی۔ نورالہدیٰ نے آنکھیں بند کیں اور گہرا سانس لے کر ملیحہ کی خوشبو کو محسوس کرنا چاہا جو کمرے میں ہر جانب بکھری تھی۔ پھر آنکھیں کھول کر کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یہی تو وہ گوشہ تھا جہاں ملیحہ نے اپنی مختصر سی زندگی کا زیادہ تر وقت گزارا تھا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو انسانوں پر ہی نہیں، چیزوں پر بھی اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ملیحہ ان ہی لوگوں میں سے تھی، جن کی چھاپ بہت گہری ہوتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ نورالہدیٰ کو کمرے میں داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے ملیحہ کہیں آس پاس ہی ہے اور اس احساس سے ان کے اعصاب پُرسکون ہونے لگے تھے جیسے جلتے الاؤ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑ گئے ہوں۔

نورالہدیٰ نے آگے بڑھ کر بالکونی کا دروازہ کھول دیا۔ ایک سرد ہوا کا جھونکا نورالہدیٰ سے ٹکراتا ہوا گیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں چودھویں کا چاند جگمگا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے، ملیحہ چاندنی راتوں کی دیوانی تھی۔ خاص طور پر چودھویں کے چاند سے اسے عشق تھا۔ چودھویں کے چاند کی خوب چمکتی چاندنی میں وہ کمرے میں بند ہونے کے بجائے جھولے میں آکر لیٹ جاتی اور چاند کو محویت سے دیکھتے دیکھتے سو جایا کرتی تھی۔

'آج اسے نہ پا کر چاند نے کیا سوچا ہوگا؟' جھولے کے پاس کھڑے وہ سوچ رہے تھے۔

'کتنی دُور چلی گئی ہو ملیحہ!...... چاند سے بھی دُور......' خالی جھولے کو دیکھ کر وہ یاسیت میں ڈوب گئے۔

'میں نے کب قربتوں کی خواہش کی تھی؟ لیکن کبھی یہ بھی تو نہیں چاہا تھا کہ تم دُوریوں کے عذاب بخش دو۔ اب یہ نظر تمہیں کہاں ڈھونڈے؟' وہ مڑے اور واپس کمرے میں آگئے۔

اپنا دھیان بٹانے کے لئے وہ ملیحہ کے اسٹوڈیو میں آگئے۔ دیوار کے سہارے رکھے ایک کینوس کو اٹھا کر قریب سے دیکھنے لگے۔ بالکونی سے آتے تیز ہوا کے جھونکے نے ایزل پر لگے کینوس کو ڈھانپے باریک نیٹ اُڑایا تھا۔

نوالہدیٰ بے ساختہ متوجہ ہو گئے اور نیٹ کا کور ہٹا کر کینوس کو دیکھنے لگے، جس پر بنا ادھورا پورٹریٹ ابتدائی مراحل میں ہی نامکمل چھوڑ دیا گیا تھا۔ اپنی انگلیوں سے کینوس کو چھوتے وہ عجیب سے احساس میں گھر گئے۔

'ملیحہ کی آخری تخلیق...... لیکن ادھوری...... شاید زندگی نے اس تصویر کو مکمل کرنے کی مہلت نہیں دی۔ صرف یہ تصویر ہی کیوں؟ وہ تو سب کچھ ادھورا ہی چھوڑ گئی۔ اتنے اچانک رختِ سفر باندھا کہ یقین ہی نہیں آتا۔'

وہ پورٹریٹ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ اچانک کسی چیز نے انہیں چونکایا تھا۔ وہ غور سے پورٹریٹ کو دیکھنے لگے۔ انہیں احساس ہوا کہ یہ چہرہ تصوراتی نہیں ہے بلکہ اس کے نقوش مانوس لگ رہے تھے۔ مگر اتنے مبہم تھے کہ نورالہدیٰ پہچان نہیں پائے۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ وہ اس چہرے کو دیکھ چکے ہیں۔ کہاں؟ انہیں کوشش کے باوجود یاد نہیں آیا تو وہ اس احساس کو جھٹک کر وہاں سے ہٹ گئے اور چلتے ہوئے کے بیڈ پر آکر بیٹھ گئے۔ پھر یوں ہی ٹانگ لٹکائے وہ پیچھے کو لیٹ گئے۔

نورالہدیٰ نے حساب لگایا۔ بے یقینی کی اس کیفیت کو جھیلتے ہوئے چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے جبکہ انہیں لگ رہا تھا کہ بس اگلے ہی پل جان جسم سے نکل جائے گی۔

'تمہاری محبت دیکھ لی نورالہدیٰ!' خود پر طنز کیا۔ 'کہتے تھے ملیحہ کے بغیر ایک پل بھی نہ رہ پاؤں گا اور دیکھو...... چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں اور سانس اب بھی باقی ہیں۔ مگر صرف سانس ہی تو باقی ہے۔'

اُن کے دل نے شکستہ انداز میں کہا تھا۔ انہوں نے سن کر پلکیں موند لیں۔ ان کے اعصاب تو پہلے ہی ڈھیلے پڑ چکے تھے، پلکیں بند کیں تو جلتی ہوئی آنکھوں کو قرار آ گیا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر تکیہ اٹھایا۔ تکیہ

نیچے ایک ڈائری رکھی تھی۔ نورالہدیٰ حیران ہوتے اُٹھ بیٹھے اور ہاتھ بڑھا کر ڈائری اُٹھالی۔
وہ چھوٹی کتاب کے سائز کی ریڈ کور والی ڈائری تھی جس کے چکنے صفحوں کے درمیان ایک گولڈن کلر کا پین اس طرح سے پھنسا تھا جیسے کوئی لکھتے لکھتے کسی کام سے اُٹھ کر گیا ہو۔ انہوں نے ڈائری کھول کر پہلے صفحے کو دیکھا جس پر ملیحہ کا نام لکھا تھا۔ وہ اور بھی حیران ہو گئے۔ ملیحہ ڈائری لکھا کرتی تھی، یہ بات نورالہدیٰ کے لئے نئی تھی...... انہیں کبھی بھی ملیحہ کی اس عادت کے بارے میں پتہ نہیں چل سکا تھا بلکہ یہ بات تو کسی کے بھی علم میں نہیں تھی۔ شاید بابا جان کے علم میں بھی...... ایک تجسّس سا ہوا کہ وہ اس ڈائری میں کیا لکھتی تھی...... دیکھنا تو چاہئے۔ انہوں نے سوچا اور جوتے اُتار کر آرام سے نیم دراز ہوتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ روشن کیا اور ڈائری کھول کر پڑھنے لگے۔
نورالہدیٰ جانتے تھے، ملیحہ کی زندگی میں کئی خلا تھے اور انہیں لگتا تھا کہ ملیحہ نے ان خلاؤں میں جینا سیکھ لیا تھا۔ اور ایسا لگنے کی وجہ بھی تھی۔ نورالہدیٰ نے ہمیشہ اُسے پُرسکون دیکھا تھا۔
وہ ایسے شوپیس کی طرح لگتی تھی جسے لوگ ڈرائنگ روم میں سجا کر بھول جاتے ہیں۔ پھر یہ تو پتہ رہتا ہے کہ یہیں کہیں ایک شوپیس رکھا تھا، مگر رُک کر اسے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور وہ شوپیس بھی کبھی اس بے توجہی کا گلہ نہیں کرتا۔ بابا جان نے کبھی بھی ملیحہ کو شوپیس سے زیادہ کی اہمیت نہیں دی...... وہ آس پاس ہے، اتنا کافی ہے...... وہ کس حال میں ہے؟ یہ جاننا ضروری نہیں۔ نورالہدیٰ کو لگتا تھا، ملیحہ نے شوپیس کی طرح ہی بابا جان کے ''نولفٹ'' والے روّیے کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن ملیحہ شوپیس نہیں تھی، اس نے کبھی کہا نہیں تھا مگر اسے بابا جان کی بے توجہی کا گلہ تھا اور اپنی تنہائی سے شکایت۔
بابا جان کو حاوی رہنا پسند تھا اور ملیحہ کے مزاج میں پسپائی تھی۔ جب بھی اس کا آمنا سامنا، بابا جان کی سخت گیری سے ہوا، اس نے بہت آسانی سے ہار مانتے ہوئے قدم پیچھے لے لئے اور ٹکراؤ کے امکانات کم کرنے کے لئے اس نے بابا جان کے مزاج کو اپنا لیا تھا۔ لیکن اپنی ذات کی نفی نہیں کر پائی جس نے اس کے اندر کشمکش کو جنم دیا تھا۔ اور یہی کشمکش ملیحہ کی زندگی کی سب سے بڑی تکلیف تھی اور نورالہدیٰ نے اس کی تکلیف کو آج جانا تھا...... جب اسے اس دنیا کو چھوڑے چوبیس گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے...... ملیحہ کی اُداسی، ملیحہ کی ناراضی، ملیحہ کی محرومیاں...... اب جبکہ نورالہدیٰ اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔
ملیحہ کی ڈائری کو پڑھ کر ہی نورالہدیٰ کو ملیحہ کی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن قدرت اچانک ہی ملیحہ پر مہربان ہو گئی اور وہ جو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے لئے ترستی تھی، اس کی زندگی میں ایک ساتھ دو دو روزن کھلے تھے۔ ایک نورالہدیٰ فاروقی اور دوسرا وجدان مصطفیٰ۔ نورالہدیٰ اس نام کو پڑھ کر حیران رہ گئے۔ انہیں تو کبھی احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ ملیحہ کی زندگی میں کوئی اور بھی ہے۔
''یہ شخص مجھ سے سب کروا لے گا، جو میں کبھی کرنا نہیں چاہتی...... جسے کرنے کی مجھ میں ہمت بھی نہیں۔

مجھے لگتا ہے، میں دائرے میں قید ہوگئی ہوں۔ جس بھی راستے پر قدم بڑھاؤں گی، اس کے آخری سرے پر وجدان کو ہی کھڑا پاؤں گی۔'' ملیحہ کبھی کسی کے لئے بے اختیار بھی ہوئی تھی، نورالہدیٰ کو یقین ہی نہیں آیا۔ ملیحہ کے آگے آگہی کا پل نورالہدیٰ پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ گیا۔

نورالہدیٰ کے لئے ایک ایک لفظ میں حیرتوں کا جہان آباد تھا۔ وہ بے اختیار ہی صفحے پلٹتے چلے گئے اور آنکھیں تحیر سے پھیل گئیں۔ مگر وہ فون کال...... وہ رک گئے۔ آگے صفحے سادہ تھے۔ نہ بھی ہوتے تو نورالہدیٰ میں اب اور ہمت نہیں بچی تھی۔ ڈائری ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ پر جا گری۔ انہیں ایک دم سے ہوا میں آکسیجن کی کمی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اُٹھ کر بالکونی میں آ گئے۔

'تو کیا ملیحہ، وجدان سے محبت کرتی تھی؟' نورالہدیٰ نے تھک کر بالکونی کی گرِل سے ٹیک لگا لی اور سر جھکا کر بائیں کندھے سے ذرا نیچے اپنی شرٹ پر کاجل کے اس نشان کو دیکھا جو ملیحہ کی آنکھ سے بہہ کر ان کی شرٹ میں جذب ہوگیا تھا۔ ان کے دماغ پر چھائی دُھند چھٹنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نشان پر انگلیاں پھیرتے ان کا ذہن بہت تیزی سے تانے بانے جوڑ رہا تھا۔

ایگزیبیشن کی رات ملیحہ نے بابا سے وجدان کا ذکر کیا تھا اور ان کی ناراضی کے اظہار پر اس نے کھل کر وجدان سے محبت کا اعتراف کیا تو بابا جان نے اس پر نورالہدیٰ کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ مسلط کر دیا...... بے شک وہ اس بارے میں نورالہدیٰ کا عندیہ بہت دن پہلے لے چکے تھے لیکن ملیحہ کو یہ فیصلہ سزا کی صورت میں سنایا گیا تھا...... اب نورالہدیٰ کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ بابا جان نے صرف تین دن کے وقفے سے تاریخ کیوں طے کی تھی؟ وہ ملیحہ کو موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ لیکن ملیحہ نے کسی موقع کا انتظار نہیں کیا اور زندگی میں پہلی بار بابا جان سے اختلاف کی جرأت کرتے ہوئے وجدان سے ملنے جا پہنچی۔

اگر وجدان اس دن اسے مل جاتا اور اس کا ساتھ دینے کو تیار بھی ہوتا تو باپ بیٹی کے بیچ سرد جنگ کا آغاز ہو جاتا۔ اس جنگ میں جیت کس کی ہوتی، کہنا مشکل ہے۔ لیکن پھر ملیحہ کسی بھی قیمت پر وجدان سے دستبردار نہیں ہوتی۔ لیکن وہ وجدان سے نہیں مل پائی۔ اور جب گھر آئی تو سب رشتے دار اس کی منگنی میں شرکت کرنے آ پہنچے تھے۔ ملیحہ کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے، وہ جو ساری عمر خود پر جبر کرکے بابا جان سے بلا مقابلہ ہار مانتی آئی تھی، پہلی بار اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کے فیصلے کے مخالف آن کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن قسمت نے اسے اسی فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر اس رات وہ فون کس کا تھا؟ نورالہدیٰ سوچنے لگے اور سوچتے سوچتے ان کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ ملیحہ کو خوش رکھئے گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ان کا خیال رکھے بغیر آپ رہ ہی نہیں سکتے۔'' انہیں وہ لڑکا یاد آیا جس نے شادی کی رات اسٹیج پر آ کر انہیں مبارک باد دی تھی۔ نورالہدیٰ سوچنے لگے، انہیں ''ہادی بھائی'' کہہ کر پکارنے والا اجنبی کون تھا جو انہیں اتنی گہرائی سے جانتا تھا۔ نورالہدیٰ

یاد آ گیا کہ یہ وہی لڑکا تھا جس نے ملیحہ کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ سب لوگ کندھا بدل کر ہٹتے جا رہے تھے مگر وہ شخص تمام راستے ملیحہ کی میت کو کندھے پر اُٹھائے چلتا رہا اور جب ملیحہ کی تدفین مکمل ہو چکی تو انہوں نے آفاق کو اس سے کہتے سنا

"کیا تم یہاں کچھ دیر ٹھہرنا چاہو گے؟"

اس نے کہا۔ "مجھے روح سے غرض تھی اور یہاں جسم رکھا ہے...... ٹھہر کر کیا کروں گا؟ آؤ آفاق! اب یہاں سے چلنا چاہیے۔"

وہ کون ہو سکتا ہے جسے ملیحہ کے مرنے پر اتنا دکھ ہوا تھا؟...... اچانک ہی ان کے ذہن میں ایک اور جھماکا ہوا۔ وہ تیزی سے چلتے ایزل کے سامنے آ گئے۔ اپنی یادداشت میں محفوظ چہرے کو نورالہدیٰ نے پورٹریٹ سے ملا کر دیکھا۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔

وہ شخص وجدان مصطفیٰ ہی تھا۔ اور اگر وہ شادی کی رات قصرِ فاروقی میں آیا تھا تو منگنی کی رات ملیحہ کے لئے آنے والا فون بھی اسی نے کیا ہو گا۔ مگر اس وقت تک بات ملیحہ کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ نورالہدیٰ نے اپنا چکراتا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بال مٹھیوں میں جکڑ کر بھینچ ڈالے۔ چوبیس گھنٹوں سے ایک ہی سوال ان کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔

"ملیحہ کیوں مر گئی؟" انہیں جواب مل گیا تھا۔

'کیوں ملیحہ!...... کیوں؟' وہ درد کی شدت سے چلّا اُٹھے۔ 'تم جانتی تھیں کہ اس کے بغیر مر جاؤ گی تو کیوں کی یہ خودکشی؟...... ایک بار تو کہا ہوتا، تمہیں وجدان چاہیے...... خدا کی قسم! میں تمہیں وجدان لا دیتا...... کہا تھا نا میں نے، تمہاری مسکراہٹ مجھے اپنی محبت سے زیادہ عزیز ہے۔ تم نے اعتبار نہیں کیا تھا...... ایک بار تو آزما کر دیکھتیں۔ کیوں مجھے اندھیرے میں رکھا؟...... کیوں؟' نورالہدیٰ جیسا مضبوط انسان جو ملیحہ کو قبر میں اُتارتے ہوئے نہیں رویا، اب دیوانوں کی طرح چلّا رہا تھا۔ قصرِ فاروقی ان کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

'کس نے کہا، وجدان کے بغیر مر جاؤ گی...... ایک بار تو مجھ سے کہا ہوتا۔ میں نے کب تمہاری خواہش کی تھی؟...... کہا تھا نا کہ دل نہ مانے تو اس رشتے کو توڑ دو۔ پھر کیوں خود کو میرا پابند سمجھا؟' آنسوؤں سے روتے وہ فرش پر بیٹھ گئے۔

"میرے اور آپ کے بیچ ایک بس پکار کا فاصلہ ہے...... میرا نام لے کر بلایئے گا، میں آ جاؤں گی۔" ملیحہ کی آواز ان کے کانوں میں گونجی تھی اور وہ بے اختیار اُسے پکارنے لگے۔

"لوٹ آؤ ملیحہ! تمہارے بغیر جینا بہت مشکل ہے۔" نورالہدیٰ تڑپ تڑپ کر رو رہے تھے اور رو رو کر تڑپ رہے تھے۔ "تمہاری خوشی کے لئے میں اپنا دکھ بھی سہہ لیتا، مگر یہ کیسے سہوں کہ تمہارا دکھ میری خوشی بن گیا؟...... تم دکھ جھیلتی رہیں اور میں خوش ہوتا رہا۔ یہ احساس مجھے عمر بھر چین نہیں لینے دے گا۔"

• چمکتی ہوئی چاندنی میں دونوں ہتھیلیاں فرش پر ٹکائے سر جھکا کر روتے اس شخص کو واقعی عمر بھر چین نہیں آ

❁❁❁

وجدان صبح کا نکلا ہوا تھا اور اب رات کے گیارہ بج رہے تھے اور اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ویسے رات گئے آنا اب اس کی روٹین میں شامل تھا اور گھر والے بھی اس روٹین کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے کھانے کے بعد چائے پی کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ بس عائشہ ہی وجدان کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ گیارہ بجنے کے بعد وجدان نے گھر میں قدم رکھا۔ دروازہ کھول کر اندر آتے وجدان کو دیکھ کر ایسا لگا انہوں نے وجدان کے ہیولے کو دیکھا ہو۔ یوں تو کئی دنوں سے وہ خود کو بھلائے ہوئے تھا لیکن اس وقت اس کی حالت بدترین ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں بے گانگی لئے اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ گرد جم کر بلیک پینٹ شرٹ کا رنگ خاکستری لگنے لگا تھا۔ عائشہ آخر ماں تھیں، ان کا دل پسیج گیا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس چلی آئیں۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے وجدان؟"

وجدان نے انہیں دیکھا، اس کی آنکھوں کا بے جان تاثر دیکھ کر وہ کٹ گئیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟ چل ادھر آ!" وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے صوفے پر لے آئیں۔ "اچھا طریقہ ہے ماں کو پریشان کرنے کا۔ یہی ضد ہے نا کہ ملیحہ سے شادی کرنی ہے۔ یہ لے!" انہوں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "غلطی ہوگئی کہ تیری بات نہیں مانی۔ تُو جیتا، میں ہاری۔ اب خوش؟" وہ بول کر خود مسکرائیں۔ "اب صبح مجھے اس کے گھر لے جانا۔ اس کے ماں باپ سے شادی کی بات کروں گی اور اس وقت تک چوکھٹ نہیں چھوڑوں گی جب تک وہ ہاں نہیں کر دیتے۔" انجانے میں ہی انہوں نے بھڑکتی آگ پر پٹرول کی بارش کر دی تھی۔ چپ بیٹھے وجدان کے اندر بلا کے طوفان اُٹھے تھے اور وہ ان سے بے خبر کہہ رہی تھیں۔

"میں اپنے بیٹے کے لئے کھانا لے کر آتی ہوں۔ تب تک تم نہا کر کپڑے بدل لو۔ ٹھیک ہے؟" وہ چھوٹے بچے کی طرح اسے پچکار کر بولتیں کھانا گرم کرنے کچن میں چلی گئیں۔

وجدان کے اندر دھواں بھر رہا تھا۔ بہت سی آوازوں کا شور اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہا تھا۔

"آپ مجھ سے شادی کریں گی؟"

"آپ یا تو پاگل ہیں یا دیوانے۔"

"کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار میرے بارے میں سوچ لیجئے گا۔" کیا التجا تھی۔

"فیصلہ کرنے کا اختیار کبھی بھی میرے پاس نہیں رہا۔" اور کیسی بے بسی تھی۔

"آپ ایک بار اور لائبریری جا سکتے ہیں؟"

"میں پورا دن آپ کا انتظار کروں گا۔" مگر وعدہ وفا نہ ہوا۔

"لیجئے، میری طرف سے تحفہ ہے۔" عشق آتش کیسا انوکھا تحفہ تھا۔
وجدان نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر سر گھٹنوں سے ٹکا دیا مگر آوازیں بند نہ ہوئیں۔
'بہت چاہا ہے اسے...... اتنا کہ اب اس چاہت سے دستبردار نہیں ہوا جاتا...... اس سے الگ ہونے کا خیال میرے جسم سے روح کھینچ رہا ہے۔' وجدان کو کفن میں لپٹی ملیحہ کا چہرہ یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا۔
"میں قیامت تک آپ کا انتظار کروں گا۔" اور قیامت تک کا انتظار اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔
وجدان نے تیز ہنسی کی آواز سنی تھی۔ اسے لگا، تقدیر اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ وہ بازوؤں میں سر چھپا کر دوہرا ہوا بیٹھا رہا۔ اس بار چوڑیاں کھنکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وجدان نے سر اٹھا کر دیکھا تو اسے لاؤنج کے کھلے دروازے سے باہر پلر کے پاس چاندنی میں ڈھلا ایک پیکر دکھائی دیا۔ جیسے کوئی ہاتھ بڑھا کر بارش کے قطروں کو ہتھیلیوں پر جذب کرتا ہے۔ وہ ہتھیلی کو کبھی الٹتی، کبھی سیدھا کرتی اپنے ہاتھ پر چاندنی کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔
وجدان کی طرف اس کی پشت تھی اور اس کے لمبے گھنے بال پوری طرح اس کی کمر کو ڈھک رہے تھے۔ پھر وجدان پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گیا مگر حیرت کی وجہ سے اس کا نام وجدان کی زبان سے چند سیکنڈ کی تاخیر کے بعد سرسراتی ہوئی آواز میں نکلا۔
"ملیحہ۔"
وجدان کی آواز پر اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ وہ ملیحہ ہی تھی۔ مسکراتی نگاہوں سے ہکا بکا بیٹھے وجدان کو دیکھتے ہوئے اس نے اچانک ہی اپنا ہاتھ اس کی طرف اٹھا دیا جیسے اسے ہاتھ تھامنے کی دعوت دے رہی ہو۔
وجدان بے تاب ہو کر اٹھتا تیزی سے باہر آ گیا۔ پھر جیسے ہی اس نے ملیحہ کا ہاتھ تھامنا چاہا، وہ شرارت سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ کر ہنستی ہوئی پلٹ کر بھاگی۔
"رکیے ملیحہ!" اس نے آواز دی۔ ملیحہ نے پلٹ کر تو دیکھا مگر رکی نہیں اور بھاگتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی۔
"ملیحہ پلیز رک جائیں۔" وجدان اسے آواز دیتا خود بھی گیٹ کی طرف لپکا۔ وہ گیٹ سے باہر نکلا تو ملیحہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے سامنے کھڑی شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وجدان چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور وہ مسکراتے ہوئے قدم پیچھے کی طرف لینے لگی۔
"میں کب تک آپ کو بلاتا رہوں گا اور آپ کب تک مجھ سے دور بھاگتی رہیں گی؟...... اب بس کر دیں۔" وہ شکایت کر رہا تھا۔ مگر ملیحہ الٹے پیروں پر چلتی رہی۔ پھر اچانک ہی وجدان نے اسے روکنے کے لئے لپک کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا اور وہ تیزی سے پیچھے ہٹتی پلٹ کر بھاگنے لگی۔ وجدان بھی اس کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔
عائشہ کھانے کی ٹرے لئے لاؤنج میں آئیں تو وجدان وہاں نہیں تھا۔ انہوں نے اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا تو کھلے دروازے سے انہوں نے وجدان کو گیٹ کی طرف بھاگ کر جاتے دیکھا۔ وہ اسے آوازیں

لگاتی دروازے تک آئیں مگر وہ گیٹ سے نکل چکا تھا۔

واپس پلٹ کر انہوں نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ پر آ گئیں۔ انہوں نے باہر نکال کر دیکھا تو وجدان بھاگتا ہوا کسی گلی میں مڑ رہا تھا۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں وارننگ دی تھی۔ یکدم پلٹیں اور جتنا تیز دوڑ سکتی تھیں دوڑتی اپنے کمرے میں آ گئیں اور سوتے ہوئے مصطفیٰ عظیم کو جھنجوڑا۔

''اُٹھیے مصطفیٰ صاحب! وجدان کو روکیں۔ وہ کہیں چلا گیا ہے۔''

وہ آنکھیں ملتے اُٹھ بیٹھے۔

''وجدان آ گیا؟'' انہوں نے کچھ اور ہی سوال کیا۔

''ہاں۔ اور چلا بھی گیا ہے۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے مصطفیٰ صاحب! میرے بیٹے کو میرے پاس لے آئیں۔''

وہ اصل صورتِ حال کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ بس اتنا سمجھ آیا کہ وجدان گھر آیا تھا اور پھر چلا گیا۔ اب وہ چاہ رہی ہیں کہ مصطفیٰ عظیم اسے گھر لے کر آئیں۔ وہ بہت سے سوال کرنا چاہتے تھے کہ وجدان کیوں اور کہاں گیا ہے؟ اور اگر چلا گیا ہے تو پریشانی کی کیا بات ہے؟ واپس آ جائے گا۔ مگر جس طرح عائشہ مصطفیٰ کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ انہیں احساس ہوا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے اور ان کے پاس سوال کا وقت نہیں۔ فوراً وجدان کے پیچھے نکلنا چاہیے۔

وہ جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نائٹ ڈریس پہنے ہی سلیپر پاؤں میں اڑستے باہر بھاگے۔ عائشہ بھی باہر آ گئیں اور اپنے کمرے کے ساتھ والا دروازہ پیٹتے ہوئے مزمل کو آوازیں دینے لگیں۔ مصطفیٰ عظیم کسی طرف دھیان دیئے بغیر باہر نکلتے چلے گئے۔ ان کی اور مزمل کی کاریں پورچ میں کھڑی تھیں اور وجدان کی بائیک بھی...... اس کا مطلب وہ پیدل ہی گیا ہے۔ تیزی سے سوچتے وہ اس کی تلاش میں خود بھی پیدل نکل پڑے۔ دروازہ کھول کر مزمل نے اپنی ماں کے حواس باختہ چہرے کو دیکھا تو فکرمندی سے پوچھا۔

''کیا بات ہے امی؟''

''وجدان کہیں چلا گیا ہے۔ جاؤ مزمل! اسے ڈھونڈ کر لے آؤ۔''

''کہاں چلا گیا ہے؟ اور پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ وہ بچہ نہیں ہے۔ واپس آ جائے گا۔''

''میرا دل کہہ رہا ہے مزمل! وہ واپس نہیں آئے گا۔ تم جا کر اسے لے آؤ۔ تمہارے ابو بھی گئے ہیں۔''

''کیا کچھ ہوا ہے جو وہ چلا گیا؟'' مزمل کو یہی سمجھ میں آیا کہ شاید وجدان کی ماں باپ سے کوئی بات ہوئی ہے اور وہ جھگڑا کر کے چلا گیا۔ ورنہ عائشہ اتنا پریشان کیوں ہوتیں۔

''مجھے نہیں پتہ کہ کیا ہوا ہے۔ لیکن کچھ ہوا ضرور ہے۔ جب وہ آیا تو اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔ دیر مت کرو مزمل! جاؤ جا کر اپنے بھائی کو ڈھونڈو۔'' وہ رونے لگیں تو مزمل نے

کھڑی ہوئی انیقہ آگے نکل کر ان کے پاس آئی اور انہیں ساتھ لگا کر چپ کرانے لگی۔
"امی پلیز! آپ روئیں تو مت۔ میں جا کر اسے لاتا ہوں۔" ان کے رونے پر اس نے پریشان ہو کر کہا
پھر اندر سے گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔
گاڑی لے کر گلیوں میں گھومتے مزمل کو وجدان تو نہیں ملا لیکن مصطفیٰ عظیم مل گئے۔ اس نے کار روک کر
انہیں ساتھ بٹھالیا۔ پھر دونوں باپ بیٹا گلیوں کو چھوڑ کر مین روڈ پر وجدان کو تلاش کرنے کے لئے نکل گئے۔ دو
گھنٹے کی تلاش کے بعد وہ نامراد لوٹ آئے۔
"وجدان نہیں ملا؟" عائشہ کے سوال پر مصطفیٰ عظیم کو لگا، وہ اچانک ہی بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ وہ شکستہ
انداز میں گردن جھکا کر بیٹھ گئے۔
"انتظار کر کے دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے صبح تک وہ خود ہی آ جائے۔" انیقہ نے مرجھائے چہروں پر اُمید
جگانی چاہی۔
"میں وجدان کے دوستوں کو فون کرتا ہوں۔" کسی کو مخاطب کئے بغیر کہہ کر مزمل اٹھا اور ٹیلی فون اسٹینڈ
سے ڈائری اٹھا کر اس میں سے وجدان کے دوستوں کے نمبر تلاش کرنے لگا۔ سب سے پہلے اسے آفاق کا نمبر
نظر آیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔
"نہیں مزمل بھائی! وجدان یہاں تو نہیں آیا۔ بلکہ میں نے خود اسے آپ کے گھر ڈراپ کیا تھا۔"
"اچھا۔" ان کی آواز ست ہو گئی۔
"مزمل بھائی! ایسا کرتے ہیں، میں آپ کی طرف آ جاتا ہوں پھر مل کر اسے ڈھونڈتے ہیں۔" آفاق واقعی
پریشان ہو گیا تھا۔
"فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ ابو اور میں اسے تلاش کر رہے ہیں۔ پھر تمہاری اپنی فیملی کرائسس سے
گزر رہی ہے۔ امی نے بتایا تھا تمہاری کزن کے بارے میں۔ سن کر واقعی افسوس ہوا۔"
آفاق لب کاٹنے لگے۔
"اچھا، میں باقی دوستوں کی طرف ٹرائی کرتا ہوں۔ شاید وہاں مل جائے۔ اور اگر وہ تمہاری طرف آئے تو
فون کر دینا۔"
"جی مزمل بھائی! ویسے کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں آپ اس وقت کتنے پریشان ہوں گے۔"
"اللہ حافظ!" دوسری طرف سے لائن ڈس کنکٹ ہو گئی تو آفاق نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔
سمیرا کو اچانک ہی وہ بہت تھکا ہوا لگنے لگا تھا۔ وہ اس کے پاس آئی اور آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ
رکھ دیا۔ آفاق اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔
"سمجھ نہیں آ رہا، یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پہلے ملیحہ کی طرف سے بری خبر ملی، اب وجدان کی طرف سے دھڑکا

لگ گیا ہے۔"

"کیا ہوا؟" سمیرا نے سہم کر پوچھا۔

"وجدان گھر سے چلا گیا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ واپس آ جائے گا۔"

"تم سمجھ نہیں رہی ہو، وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ مجھے تو ڈر ہے وہ کہیں کوئی حماقت نہ کر بیٹھے۔"
آفاق پریشان تھا وجدان کے لئے اور جب کچھ نہ سوجھا تو گاڑی لے کر وجدان کی تلاش میں نکل پڑا۔

✿✿✿

بابا جان کو ملیحہ کے مر جانے پر اتنی حیرت نہیں ہو رہی تھی جتنی اپنے زندہ ہونے پر ہو رہی تھی۔ سر چیئر کی پشت سے لگا کر ملیحہ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے لٹ جانے کا سوگ مناتے رہے۔ نیا دن طلوع ہو رہا تھا لیکن بابا جان کی زندگی کے اندھیروں کو روشن کرنے جتنی طاقت اب کسی سورج میں نہیں تھی۔ دستک دیئے بغیر نورالہدیٰ دروازہ کھول کر اندر آئے تھے اور چلتے ہوئے بابا جان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ بابا جان نے ان کی طرف دیکھا اور انہوں نے بابا جان کے بھیگے چہرے کو۔

"آپ کیوں رو رہے ہیں بابا جان؟" انہوں نے حیرت سے استفسار کیا۔ "بیٹی کی موت کا دکھ تو آپ کو ہو نہیں سکتا۔ تو کیا یہ خوشی کے آنسو ہیں؟"

"کیا کہہ رہے ہو؟" ان کی تو جیسے کسی نے گردن پر چھری پھیر دی ہو۔

"مر جاؤ گی تو تمہیں کندھوں پر اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے دفنا آؤں گا۔" نورالہدیٰ ٹھہر ٹھہر کر بولے۔ بابا جان نے سانس تک روک لیا۔

"بہت شوق تھا آپ کو اسے دفنانے کا۔ کہیے، اسے دفنا کر کیسا لگ رہا ہے؟" وہ نورالہدیٰ کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن نورالہدیٰ کو ان پر رحم نہیں آیا۔

"کیا آپ مجھے اس کا گناہ بتائیں گے، جس کی پاداش میں آپ نے اس پر زندگی حرام کر دی؟"

"بس کرو نورالہدیٰ!" وہ برداشت نہیں کر سکے۔ "میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اور کرتا بھی کیوں؟ آخر وہ میری بیٹی تھی۔" نورالہدیٰ چیخ کر بولے۔

"یہی تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں بابا جان! کہ آخر وہ آپ کی بیٹی تھی، پھر کیوں آپ نے اپنی بیٹی کو مار ڈالا؟"

بابا جان حیرت کی زیادتی سے گنگ رہ گئے۔ پھر اس الزام پر تڑپ اٹھے۔

"چاہو تو مجھے جان سے مار دو نورالہدیٰ! لیکن مجھ پر اتنا بھیانک الزام مت لگاؤ۔ میں نے ملیحہ کو نہیں مارا اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور یہ بات تم بھی جانتے ہو۔"

"اور ملیحہ کو ہارٹ اٹیک کیوں ہوا تھا؟" وہ برفیلے لہجے میں سوال کر رہے تھے۔ "بیس سال کی عمر میں ہارٹ اٹیک بے وجہ نہیں ہوا کرتا۔ مجھے وہ وجہ بتائیں گے جو اس کے ہارٹ اٹیک کا سبب بنی؟" سرد آواز اور بے تاثر چہرہ...... ان دو چیزوں کے ساتھ بابا جان نے بہت سے لوگوں کو بے بس کیا تھا۔ آج وہ خود ان دونوں کے آگے بے بس ہو گئے تھے۔ ان کا دایاں ہاتھ دونوں ہاتھ میں لے کر دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

"ملیحہ کیوں مر گئی؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے آپ کو ایک اعتراف کرنا ہے اور اس اعتراف کے بعد ہو سکتا ہے ملیحہ تو آپ کو معاف کر دے لیکن بابا جان! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ قیامت تک تو کیا، اس کے بعد بھی میں آپ کو معاف نہیں کروں گا۔"

اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں اور اٹھ کر باہر نکل گئے۔ بابا جان ابھی تک سکتے کی کیفیت میں تھے۔ پھر ان کا دھیان اپنی گود میں رکھی ڈائری کی طرف گیا۔ انہوں نے ڈائری اٹھا کر کھولی پھر پڑھنے لگے۔

ڈائری کیا تھی، ان کے جرائم کی فہرست تھی۔ انہیں لگا، وہ کٹہرے میں کھڑے ہیں اور تند و تیز لہجے والا وکیل بھری عدالت میں ان کے جرائم کی فہرست پڑھ کر سنا رہا ہے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو قیدِ تنہائی بخشی تھی۔ انہوں نے ہر قدم پر اس کے جذبات مجروح کئے اور آخر بات وہاں تک آ پہنچی جہاں انہوں نے ملیحہ کو ایسے دوراہے کی طرف دھکیل دیا، جہاں آ کر ملیحہ پر زندگی مشکل اور موت آسان ہو گئی تھی۔ الزام کڑے تھے لیکن بابا جان کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر الزام سچا تھا اور ہر جرم حقیقت۔ اعتراف کے سوا اور کیا راستہ تھا؟ ڈائری اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر گود میں گری، پھر سرک کر ان کے پیروں پر اوندھی جا پڑی۔ پچھتاوے سے زیادہ اذیت کسی احساس میں نہیں۔ اور اعتراف سے زیادہ کرب انگیز کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ چلّانے لگے۔

"میں نے ملیحہ کو مار ڈالا۔ میں نے اپنی ہی بیٹی کی جان لے لی۔ کوئی ہے جو مجھ جیسے ظالم باپ کی گردن اتار دے، جس نے اپنی اولاد کا خون کیا ہو۔ مار ڈالا میں نے اپنی بچی کو۔ اپنی بیٹی کا قاتل ہوں میں۔ میری ملیحہ میرے ہاتھوں مر گئی۔ لوگو! مجھے مار ڈالو" ان کی آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجتی ہی رہی۔

✿✿✿

فجر کی اذانوں کے ساتھ کراچی کے مضافات میں زندگی معمول کے مطابق جاگ اُٹھی تھی۔ "چاچا ہوٹل" کے مالک چاچا روز کی طرح اپنی بھینسوں کا دودھ نکال کر چھوٹے کی ہمراہی میں تڑکے ہی پہنچ گئے تاکہ گاہکوں کے آنے سے پہلے ان کے ناشتے کا بندوبست ہو سکے۔ ویسے بھی اس ہوٹل پر گاہک بہت آتے تھے۔ ایک تو یہ وجہ تھی کہ یہ ہوٹل ہائی وے کے ساتھ تھا۔ دوسرے آس پاس پچاس کلومیٹر تک کوئی دوسرا ہوٹل نہیں تھا۔ اس لئے ہائی وے سے گزرنے والے ٹرک ڈرائیوروں کو پیٹ پوجا کے لئے "چاچا ہوٹل" میں ہی رُکنا پڑتا۔

بابا جان تو دودھ کی بالٹیاں سائیڈ میں رکھ کر تھڑے پر بیٹھا غرارے کرنے لگا اور چھوٹا چارپائیوں کو بازیاب

کرانے کے لئے کچن کے دروازے کا تالا کھولنے لگا۔ تبھی اس کی نظر تندور کے ساتھ رکھے لکڑیوں کے ڈھیر پڑی۔ اسے وہاں کوئی چھپا ہوا نظر آیا۔ اس نے ''پھس پھس'' کی آواز نکال کر چاچا کو متوجہ کر کے لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ چاچا نے آنکھیں سکیڑ کر ڈھیر کو دیکھا پھر کسی کی جھلک پا کر وہ تھڑے سے اُترا۔ پہلوان تھا، اس نے چھپے ہوئے سے ڈرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اس کے سر پر پہنچ کر اس کا شا دبوچ لیا۔

''ہاں بھائی! بول کون ہے تُو؟ اور اِدھر گھسا کیا کر رہا ہے؟''

''ہش!'' اس نے فوراً منہ پر اُنگلی رکھ کر اسے چپ ہونے کو کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر اس کے کان کے پا سرگوشی کی۔ ''آہستہ بولو۔ نہیں تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ میں یہاں پر چھپا ہوں۔''

''کس کو پتہ چل جائے گا؟'' چاچا اسی کے لہجے میں بولا۔

''وہ جو اندر ہیں۔'' اس نے کچن کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ چھوٹے نے ڈر کے مارے تالا ہا سے چھوڑ دیا اور دروازے سے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''دروازے پر تو تالا ہے۔ پھر کوئی اندر کیسے جائے گا؟'' چاچا بولا۔

''وہ دروازے سے نہیں گئیں۔''

''پھر؟'' چاچا نے چونک کر پوچھا۔

''وہ ہاں سے اندر گئی ہیں۔'' چاچا اور چھوٹے نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھا تو ہنس پڑے

''اوئے، وہ یہاں سے اندر گئی ہیں؟..... کمال ہو گیا۔'' چاچا نے روشن دان کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے جس میں سے کوئی بچی بھی مشکل سے گزرتی۔ اور اس کی باتوں سے تو لگتا تھا وہ کسی خاتون کا ذکر کر رہا ہے۔

''ہاں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''تم اُنہیں بتانا نہیں کہ میں یہاں ہوں۔ اگر اُنہیں پتہ چلا تو وہ بھا جائیں گی۔''

''چل نہیں بتاتے۔ پر ہمارے ملنے پر تو پابندی نہیں ہے۔ او چھوٹے! تالا کھول۔'' وہ بدستور مذاق اُڑا ہوئے چھوٹے سے بولا جس نے تالا تو کھول دیا لیکن دروازہ بھڑا رہنے دیا۔

''تُو اسی لئے چھوٹا ہے۔'' چاچا اس کے خوف پر اسے ملامت کرتا کچن کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ چ بھی خوف زدہ ہوتا اندر آیا پھر وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ اس نے شکھ کا سانس لیا اور چارپائیاں باہر بچھانے اس نے اوٹ میں ہو کر اندر جھانکا پھر انہیں نہ پا کر وہ کچن میں آ گیا۔

''وہ کہاں چلی گئیں؟''

''او پائیا! یہاں کوئی نہیں ہے۔''

''نہیں۔ وہ اِدھر ہی تھیں۔ میں نے خود دیکھا تھا۔ وہ سڑک کراس کر کے یہاں آئیں، پھر تندور پر چڑ

انہوں نے روشندان سے اندر چھلانگ لگا لی۔ وہ ضرور مجھ سے چھپ رہی ہیں۔'' اس نے کہا پھر پلیٹیں اٹھا کر دیکھا اور گلاس جھاڑتا ہوا انہیں ایسے تلاش کرنے لگا جیسے سوئی ہوں۔

''دیکھو روشندان سے چھلانگ لگا کر اندر آئی تھی۔ اب روشندان سے چھلانگ لگا کر باہر چلی گئی ہو گی۔ ایسا کرو اسے باہر جا کر ڈھونڈو۔ جا شاباش!'' اس نے پچکار کر کہا۔ ادھر وہ بھی ان کو نہ پا کر مایوس ہو گیا۔ وہ باہر آ گیا اور سڑک پر آنکھیں گھما گھما کر دیکھتا جیسے اندازہ کرنے لگا کہ وہ کدھر گئی ہوں گی۔ پھر ایک سمت کا تعین کر کے وہ دوڑ پڑا۔ جوتے نہ جانے کب اس کے پیروں سے نکل گئے تھے۔ ویسے بھی رات بھر بھاگنے کے بعد اب اس کے زخمی پاؤں جوتا پہننے کے قابل رہے بھی نہیں تھے۔ وہ ننگے پاؤں سڑک پر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

''چاچا! یہ کون تھا؟'' چھوٹے نے سوال کیا۔

''پاگل تھا بے چارہ۔'' چاچا نے کہہ کر چارپائی اُٹھائی اور بچھانے کے لئے باہر لے آیا۔

❁❁❁

رات آفاق کے آنے کے بعد ساجد بھی جلد ہی پہنچ گیا تھا۔ ساری رات وجدان کی تلاش جاری رہی۔ گھنٹیں ہوتی رہیں، فون بجتے رہے مگر لاحاصل۔

''اتنا تو بتا دو عائشہ! کہ آخر ہوا کیا تھا؟'' مصطفیٰ عظیم کے لہجے میں بھی تھکن تھی۔

''کتنی بار کہوں مصطفیٰ صاحب! کہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ جب گھر آیا تو پہلے سے ہی پریشان تھا۔ بلکہ وہ تو کئی دنوں سے ملیحہ والے معاملے پر اپ سیٹ تھا، مجھ سے دیکھا نہیں گیا اور اس سے کہا کہ وہ ملیحہ سے شادی کر لے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پھر میں اس کے لئے کھانا لینے چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ اور بس اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' لیکن آفاق کو بہت کچھ معلوم تھا۔ اس نے ملیحہ کے نام پر ان کو دیکھا پھر سر جھکا کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

''ابو! میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں ہسپتالوں میں دیکھ لینا چاہئے۔ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔'' کچھ دن پہلے کے واقعے کو نظر میں رکھتے ہوئے مزمل نے کہا تو ساجد تائید کرنے لگا۔

''بالکل ٹھیک کہا مزمل بھائی! ہمیں اس امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔''

''تو پھر چلیں۔'' آفاق اُٹھتے ہوئے بولا تو باقی تینوں بھی فوراً ہی اُٹھ گئے۔ پھر شہر کا کوئی ہسپتال اور کلینک ایسا نہیں بچا تھا، جہاں ان لوگوں نے وجدان کو تلاش نہ کیا ہو۔ لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ گھر لوٹنے پر ان کے اداس چہروں کو دیکھ کر عائشہ نے نم آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے مصطفیٰ صاحب! میں ماں ہوں پھر بھی جس وقت سے آپ گئے ہیں، مستقل دعا کر رہی تھیں کہ کاش میرے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہو...... اور آپ باپ ہو کر بھی بیٹے کو لئے بغیر آ گئے ہیں۔'' مصطفیٰ عظیم نے ان کی طرف دیکھا پھر نظر چراتے ہوئے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کسی خیال کے تحت مزمل نے انیقہ کو

مخاطب کیا۔

''انیقہ ! تم ذرا دھیان سے وجدان کے کمرے کی تلاشی لو۔شاید وہ اپنا کوئی سراغ چھوڑ گیا ہو۔''

''آپ کے کہنے سے پہلے ہی میں یہ کام کر چکی ہوں۔اور مجھے اس کے کمرے سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی البتہ......'' اتنا بول کر وہ چپ ہوئی تو مزمل فوراً بولا۔

''کیا؟''

''وجدان کا N.I.C، اُس کا ڈرائیونگ لائسنس اور چیک بک وغیرہ سب غائب ہیں۔میں نے باقی جگہ بھی چیک کیا ہے مگر کہیں نہیں ملے۔'' وہ جو کہنا چاہتی تھی، سب پل میں سمجھ گئے۔

''اس کا مطلب وجدان اپنے ضروری ڈاکومنٹس اور چیک بک ساتھ لے گیا ہے۔اور اگر ایسا ہے تو وہ جہاں بھی گیا ہے، یقیناً واپسی کے ارادے سے نہیں گیا۔'' ساجد پریشان کن لہجے میں بولا۔مصطفیٰ عظیم تو کچھ کہنے کے لائق ہی نہیں رہے تھے اور عائشہ بھی دوپٹے میں منہ چھپا کر سسکنے لگیں۔آفاق نے انیقہ سے پوچھا۔

''اس کے استعمال کی چیزوں میں سے اور کیا کچھ غائب ہے؟''

''اور تو کچھ بھی نہیں۔اس کے کپڑے، جوتے اور باقی سامان سب اپنی جگہ پر ہے۔بلکہ مجھے اس کا والٹ بھی اس کے بیڈ کے ڈراز میں رکھا ملا تھا۔اور تو اور وہ ملیحہ کی تصویریں بھی گھر پر چھوڑ گیا ہے۔''

''ملیحہ کی تصویریں؟'' ایک دم ہی آفاق کے لہجے سے حیرت بھری آواز نکلی۔

''ہاں۔'' انیقہ نے کہا پھر ایک لفافہ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔''یہ مجھے وجدان کی کتابوں میں رکھا ملا تھا۔''

آفاق سے پہلے مزمل نے وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے لے کر تصویریں نکالیں اور ایک تصویر پکڑ کر باقی مصطفیٰ عظیم کے ہاتھ میں دے دیں۔ساجد نے ان کے ہاتھ سے دو تصویریں لے کر ایک آفاق کو دی اور ایک خود دیکھنے لگا۔پہلی نظر میں ہی وہ پہچان گیا کہ یہی وہ تصویریں تھیں جو وجدان نے اس کے کیمرے سے کھینچی تھیں۔مگر اُسے تردّد ہوا، یہ کیسے معلوم ہو کہ یہی ملیحہ ہے۔عائشہ مصطفیٰ نے تصویروں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے۔وہ یقیناً یہ تصویریں پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ ملیحہ کی تصویریں ہیں؟'' مصطفیٰ عظیم نے وہ سوال کیا جو سب کے ذہنوں میں تھا۔

''میں ملیحہ سے مل چکی ہوں۔'' اس نے بم پھوڑا تھا۔سب کے منہ حیرت سے کھل گئے۔مزمل نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''کب؟''

وہ بتانے لگی۔''جس دن وجدان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، وہ وجدان سے ملنے گھر آئی تھی اور اس نے خود بتایا تھا کہ وہ ملیحہ فاروقی ہے۔پھر اپنا نمبر دے کر کہا تھا کہ وجدان سے کہوں اسے کال کر لے۔لیکن میں نے اس سے نمبر لے کر پھاڑ دیا۔''

"ویسے اب تو یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ وجدان گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔" بے دلی سے ملیحہ کی تصویر ٹیبل پر ڈالتے مزمل کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں پولیس کی مدد لے لینی چاہئے۔ شاید وہ اسے ڈھونڈ سکیں۔" مصطفیٰ عظیم کے چہرے پر ویرانی مستقل ڈیرہ ڈال چکی تھی۔ وہ کمزور سے لہجے میں کسی کو مخاطب کیے بغیر بولے تھے۔

لاؤنج میں بیٹھا ہر شخص ان کے اندر کی تھکن کو محسوس کر کے سر جھکا گیا۔ پریشانی سے ہونٹ کاٹتے ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ وجدان سے ان کی محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ان کے لئے یہ سانحہ واقعی بہت عظیم تھا۔ شوہر کو ناامید ہوتے دیکھ کر عائشہ کی اپنی طاقت بھی کمزور پڑ گئی تھی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کو چھلکنے سے باز رکھنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔ ان کو روتے دیکھ کر مزمل کی افسردگی گہری ہو گئی۔ اسے بیک وقت وجدان پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس کے لئے بڑے بھائی کی طرح پریشان بھی ہو رہا تھا۔ مصطفیٰ عظیم طویل خاموشی کے بعد تھکے ہوئے لہجے میں بولے۔

"تم نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا ہے عائشہ!"

انہوں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بے بسی سے بولیں۔ "مگر میں تو اجازت دے چکی تھی مصطفیٰ صاحب! پھر کیوں.....؟" بات ادھوری چھوڑ کر وہ آنسو پینے لگیں۔

❀❀❀

'دھڑکنیں تھم جاتی ہیں، سانسیں رُک جاتی ہیں مگر وقت نہیں رُکتا' نورالہدیٰ نے سوچا۔ آج ملیحہ کا سوئم بھی ہو گیا تھا۔

"تم بہت بڑے وکیل ہو نا منیر حسین! ایک بات بتاؤ گے؟" قالین پر بچھی چاندنی پر بیٹھے بابا جان نے اپنے سامنے بیٹھے منیر حسین سے سوال کیا۔

"پوچھیں بھائی صاحب!" وہ بولے۔

"اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو مقتول کے ماں باپ کو یہ حق ہوتا ہے کہ اگر چاہیں تو اپنی اولاد کے قاتل کو معاف کر دیں لیکن اگر باپ ہی اپنی اولاد کا قاتل ہو تو خون کون معاف کرے گا؟"

منیر حسن ان کے سوال پر حیران ہوتے ہوئے بولے۔ "بچے کی ماں۔"

"اور اگر ماں پہلے ہی مر چکی ہو تو؟"

"آپ اس طرح کی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں بھائی صاحب؟"

"کیونکہ میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ لیکن جن کا گناہگار ہوں، نہ مجھ میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہے اور نہ ان سے معافی ملنے کی امید۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان کے سوا وہ کون شخص ہے جو مجھے معاف کر سکتا ہے۔" ایک دم ہی ان کی آواز میں لرزش آ گئی اور آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے

نورالہدیٰ نے اپنے جبڑے بھینچ لیے اور لاتعلق سے گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔

"ایسا کیا گناہ کیا ہے آپ نے؟" منیر حسن حیرت سے پوچھ رہے تھے۔ بابا جان نے اپنے کانپتے ہونٹوں سے توقف کے بعد کہا۔

"میں نے ملیحہ کو قتل کیا ہے۔"

اس انکشاف کو سن کر سب منہ کھولے حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

"آپ جانتے ہیں بھائی صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" افتخار سرسراتی آواز میں بولے۔

"ہاں مگر تم نہیں جانتے افتخار! کہ کیسے میں نے اپنی خود پسندی، ضد اور ہٹ دھرمی کا سلو پوائزن دے ملیحہ کو مار ڈالا۔ کیسے اپنے فیصلے کی اُلٹی چھری سے اس کی شہ رگ کاٹی ہے، کس طرح اپنی انا کے ہاتھوں اس کے دل کا گلا گھونٹا ہے۔ ایک پل کی موت نہیں دی اسے، پل پل اس کے جسم سے روح کھینچی ہے۔ تڑپا تڑپا کر مارا ہے اسے۔ اپنی بیٹی کو لمحہ لمحہ کی اذیت بخشی ہے۔" نورالہدیٰ کے لئے ان کا اعتراف بھی ناقابل برداشت تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اُٹھے اور باہر نکل گئے۔

"لیکن کیوں؟" افتخار حسن حیرت سے سوال کر رہے تھے۔ "آخر ملیحہ سے کیا گناہ سرزد ہوا تھا؟"

بابا جان تڑپ کر بولے۔ "میری بیٹی معصوم تھی افتخار حسن! اس کے نامہ اعمال میں کوئی گناہ درج نہیں۔ ہاں...... مگر میں نے محبت کو اس کا گناہ جانا۔"

"محبت۔" آمنہ خالہ نے دہرایا۔

"ہاں محبت۔ میری بیٹی نے محبت کی تھی۔"

"کس سے؟"

بابا جان نے بڑی ممانی کو دیکھا اور کہا۔ "وجدان مصطفیٰ سے۔"

"کیا؟" سمیرا اور آفاق کے سوا ہر شخص شاکڈ رہ گیا تھا۔ بے ساختہ سب کی نگاہوں میں ملیحہ کا جنازہ اٹھائے وجدان کا چہرہ گھوم گیا۔

"میں ملیحہ کی شادی نہیں کر رہا تھا افتخار! بلکہ اپنی بیٹی کی موت کا وقت، دن اور تاریخ طے کر رہا تھا۔" ان کی آواز لڑکھڑا گئی اور وہ کانپتے لہجے میں بولے۔ "اور دیکھو ذرا، موت نے ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کی۔" پھر بلند آواز میں روتے ہوئے بے بسی سے کہنے لگے۔ "میری ملیحہ کو کوئی ڈھونڈ لائے۔ میں اس کے پیروں پر رکھ کر معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

افتخار حسن کا اپنا دکھ کچھ کم نہیں تھا۔ جس کے چہرے میں اپنی مرحومہ بہن کا عکس دیکھتے تھے، وہ آئینہ ٹوٹ گیا تھا۔ انہیں خود بھی ملیحہ سے بڑی محبت تھی۔ وہ جب بھی بابا جان کو دیکھتے تھے، انہیں ان پر ترس آتا تھا۔ اللہ نے کتنی دیر سے اولاد دے کر کتنی جلدی واپس لے لی تھی۔ مگر اب ان کے دل میں بابا جان کے لئے کوئی

ہوری باقی نہیں رہی تھی۔ وہ یوں بے حس نگاہوں سے انہیں روتے ہوئے دیکھ رہے تھے جیسے ان کے آگے تماشا چل رہا ہو۔

"کس امید پر معافی کی بات کرتے ہیں بھائی صاحب؟" وہ سرد لہجے میں بولے۔ "جب آپ نے اپنی بیٹی کی بے گناہی نہیں بخشی تو کوئی آپ کے گناہ کیسے بخش سکتا ہے؟ مجھ میں تو اتنا ظرف نہیں کہ اس بے حس پر ترس کھاؤں جس نے اپنی اولاد پر ترس نہیں کھایا۔ کیا آپ میں اتنا ظرف ہے کہ خود پر ترس کھائیں، خود کو معاف کر سکیں؟"

بابا جان نے مجرموں کے انداز میں سر جھکا لیا۔

"جب آپ خود کو معاف نہیں کر سکتے تو بتائیں کوئی اور آپ کو کیسے معاف کرے گا؟" وہ رکے، پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔ "میں جانتا تھا، آپ خود پسند ہیں۔ اپنی انا، اپنی ضد آپ کو ہر چیز سے پیاری ہے۔ مگر میں سوچتا تھا، آخر آپ ملیحہ کے باپ ہیں۔ جو کچھ اس کے لئے آپ کے دل میں ہے، کسی کے دل میں نہیں ہو سکتا۔ میں کتنا صحیح تھا، جو سنگ دلی ملیحہ کے لئے آپ میں تھی، وہ اور کسی میں نہیں۔" وہ بول کر چپ ہو گئے تو بابا جان کہنے لگے۔

"رک کیوں گئے افتخار؟ مرنے والی سے تمہارا خون کا رشتہ تھا۔ کوسو مجھے، طعنے دے دے کر مار ڈالو۔ ہاتھ اٹھاؤ اور بددعا مانگو میرے لئے۔ کوئی ایسی سزا منتخب کرو جس سے میری روح کانپ جائے۔"

"سزا کا انتخاب ہو چکا ہے بھائی صاحب!" آمنہ خالہ شعلہ بار نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ "اب آپ عمر بھر خود کو کوسیں گے۔ اپنے خالی دامن کو پھیلا کر خود کو بددعائیں دیں گے۔ آپ کا نقصان آپ کو یاد آ آ کر آپ کی روح کو تڑپائے گا۔ آپ کا گناہ جتنا بڑا ہے، اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ آپ عمر بھر خود سے معافی کی بھیک مانگتے رہیں اور عمر بھر خود کو معاف نہ کر سکیں۔" بابا جان کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ افتخار حسن اٹھ کھڑے ہوئے تو سب ان کی تقلید میں اٹھ کر جانے لگے۔

"تم مجھے معاف کئے بغیر نہیں جا سکتے افتخار!" وہ حواس باختہ سے اٹھ کر ان کے پاس آئے۔

"اور میں آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔" افتخار حسن نے ہمیشہ انہیں احترام دیا تھا۔ ان سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ نظر جھکا کر رکھتے تھے مگر آج ان کے دل میں بابا جان کا احترام ختم ہو چکا تھا۔ وہ بدلحاظی سے بول کر ان کا ہاتھ جھٹکتے آگے بڑھ گئے۔

"رک جاؤ منیر حسن!" بابا جان نے اب کے ان کا بازو تھاما۔

"آپ کس رشتے سے مجھے روکتے ہیں بھائی صاحب؟ میری بہن کو گزرے برسوں بیت گئے اور آج اس کی بیٹی بھی مر گئی۔ اب آپ کا ہم سے کیا واسطہ؟ جائیے بھائی صاحب! اللہ آپ کو آپ کے عذاب مبارک کرے۔" وہ سختی سے ان کا ہاتھ جھٹک کر باہر نکل گئے اور ان کے پیچھے ملیحہ کی ممانیاں، خالہ اور تمام کزنز بھی۔

اب قصرِ فاروقی میں ان کا کیا رکھا تھا۔

نورالہدیٰ لان میں ٹہل رہے تھے۔ ان لوگوں کو اندر سے نکل کر گاڑیوں میں بیٹھتے دیکھ کر وہ تیز پورچ میں آ گئے۔ افتخار حسن بیٹھنے کے لئے دروازہ کھول چکے تھے۔

''ماموں جان!'' نورالہدیٰ نے پیچھے سے آ کر دروازہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ افتخار حسن پلٹ کر انہیں دیکھ

''بولو نورالہدیٰ! ویسے لگتا تو نہیں کہ اب سننے کو کچھ باقی بچا ہے۔'' مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی نورالہد مجرم سمجھنے لگے۔ انہوں نے سر جھکا لیا اور صفائی دینے کے انداز میں آہستہ سے بولے۔

''میں لاعلم تھا ماموں جان!''

''جانتا ہوں۔'' ان کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ نورالہدیٰ ان کا چہرہ دیکھ کر ملتجی انداز میں بولے۔

''مجھ سے اپنا رشتہ مت توڑیئے گا ماموں جان!''

''تم سے میرا رشتہ ہی کب تھا؟'' وہ اچانک ہی سفاک ہو گئے۔ ''اور جس سے رشتہ تھا، وہ اب نہ ہاں مروّت باقی تھی۔ لیکن اب مروّت نبھانے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں؟ نہیں نورالہدیٰ! اب قصرِ فا میرے لئے کچھ نہیں بچا۔ سب ٹھکانے لگ چکا ہے۔''

''آپ بابا جان سے ناراض ہیں؟''

''تم نہیں ہو؟'' انہوں نے پلٹ کر سوال کیا۔

''ہوں۔'' ہونٹ دبا کر بولتے وہ سر اقرار میں ہلانے لگے۔ ''لیکن انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

وہ نورالہدیٰ کو دیکھ کر رہ گئے پھر ''اللہ حافظ!'' کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

نورالہدیٰ دو قدم پیچھے ہٹے اور وہ گاڑی نکال کر لے گئے۔ وہ کھڑے پورچ کی زمین کو گھور رہے انہیں بابا جان کا خیال آیا تو اندر آ گئے۔ مگر ان کے قدم انٹرنس سے آگے نہ جا سکے۔ گلاس وال طرف لاؤنج میں بابا جان اپنے سر کو بازو میں چھپائے بیٹھے ملیحہ کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے۔

''تم کیا مجھ سے منہ موڑ کر چلی گئیں؟ ہر کوئی مجھ سے منہ موڑ رہا ہے...... یہ کیسی روایت ڈال گئی؛ سزا ہے کہ کوئی مجھے سزا کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔ نہ سزا ملتی ہے نہ معافی...... کفارہ کیسے ادا ہو؟'' نورا کی طرح ایستادہ ہو گئے تھے۔ ان کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ ایک طرف ان کا دل چاہ ہا تھ بابا جان کو گلے لگا لیں، دوسری طرف جی چاہتا تھا ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں۔ ایک محبہ کھینچ رہی تھی، دوسری پیچھے کو۔ وہ کشمکش میں اُلجھ گئے۔ سوچ سوچ کر ان کا دماغ پھٹنے لگا تو بے رحمی۔ دل میں بابا جان کو مخاطب کر کے بولے۔

''فکر مت کریں بابا جان! میں آپ کو سزا دوں گا...... وہی سزا جو آپ نے عمر بھر ملیحہ کے ساتھ ر اور بڑی بے اعتنائی سے وہ چلتے ہوئے بابا جان کے پاس سے گزر کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ روتے

جان نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور حیرت سے سوچنے لگے۔
'بے حسی کی صفت نورالہدیٰ میں تو نہیں تھی۔'

❀❀❀

"کاش تم نے پہلے بتا دیا ہوتا آفاق! تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔"
"تب بھی یہی ہوتا، تایا ابو! آج پھوپھا جان کی جو حالت ہے، وہ صرف اس لئے ہے کہ ملیحہ اب اس دنیا میں نہیں۔ لیکن اگر وہ زندہ ہوتی تو پھوپھا جان کسی بھی قیمت پر وجدان کو قبول نہیں کرتے۔ ان کی سخت طبیعت کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ اور رہ گئی ملیحہ تو کون نہیں جانتا کہ اسے ہارنے کا شوق تھا۔ جب وہ ہی ہتھیار ڈال چکی تھی تو آپ کیا کر لیتے؟" افتخار حسن جانتے تھے وہ صحیح کہہ رہا ہے، اس لئے چپ سے ہو گئے۔ لیکن میر حسن مطمئن نہ ہو سکے۔
"پھر بھی آفاق! تمہیں بتا دینا چاہئے تھا۔ شاید کوئی راستہ نکل پاتا۔ ملیحہ نے کون سا کسی گئے گزرے کا انتخاب کیا تھا؟ وہ آخر کس بیس پر وجدان کو ریجیکٹ کرتے؟ بس ایک ذرا ان کی انا ہی تو تھی.....ٹوٹ جاتی۔"
"آفاق صحیح کہہ رہے ہیں چاچو! واقعی کوئی راستہ نہیں تھا۔ ملیحہ کبھی بھی پھوپھا جان کی مرضی کے بغیر وجدان سے شادی نہیں کرتی۔ اور پھوپھا جان بھی اُس کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ پھر بھلا وہ رضامندی دیتے ہی کیوں؟ بلکہ سچ تو یہ ہے، ملیحہ کی اسی کمزوری نے ہی پھوپھا جان کی انا کو آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔ میں مانتی ہوں ان کا روّیہ ملیحہ کے ساتھ ہمیشہ ہی ناروا رہا۔ لیکن ملیحہ نے بھی تو کبھی پلٹ کر شکایت نہیں کی۔ پھر وہ کیوں احساس کرتے؟"
"اب ان باتوں کا کیا فائدہ؟ جتنا ذکر کرو گے، اتنا ہی دل جلے گا۔ بس اب ختم کرو اس قصے کو۔" چھوٹی ممانی کے لئے سچ مچ یہ ٹاپک بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ جھنجلا کر بولیں۔
"آفاق! مجھے وجدان کے پاس لے جاؤ۔ نہ جانے کس حال میں ہو گا۔" افتخار حسن فکرمند سے ہو گئے تھے۔ آفاق ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔
"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"
آفاق نے نظر جھکا لی۔ "یہی تو پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کس حال میں ہے۔"
"کیا مطلب؟" آمنہ خالہ نے ٹھٹک کر پوچھا۔
"وجدان پرسوں رات سے لاپتہ ہے۔"
"کیا کہا؟" بڑی ممانی سہم کر بولیں۔
"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وجدان گھر سے چلا گیا ہے۔ پرسوں جب میں اسے قبرستان سے لے کر آیا تو اس کی دماغی حالت نارمل نہیں تھی۔ پھر میں نے ہی اسے گھر ڈراپ کیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کچھ دیر آرام کرنے

سے اس کی حالت سنبھل جائے گی۔ مگر وہ گھر سے چلا گیا۔ اس کے نکلتے ہی انکل اور مزمل بھائی اس کی تلاش میں لگ گئے تھے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک لاپتہ ہے۔ سب دوستوں، رشتے داروں کے گھر چیک کر لیا۔ پورے شہر کے ہسپتال دیکھ لئے لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ کل میں اور ساجد، مزمل بھائی اور انکل کے ساتھ مل کر سارا دن اسے سڑکوں اور پارکوں میں تلاش کرتے رہے ہیں۔ شہر کا کوئی کونہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں ہم نے اسے نہ ڈھونڈا ہو...... سمجھ نہیں آتا اسے زمین نگل گئی ہے یا آسمان...... کہیں سے کوئی خبر تک نہیں ملتی۔ اب تو پولیس میں بھی رپورٹ کرا دی ہے اور صبح کے سب اخباروں میں اس کی گمشدگی کا اشتہار بھی چھپ گیا ہے۔ دعا کریں کہیں سے کوئی اطلاع مل جائے۔''

اس نئی افتاد پر ہر کوئی چپ سا ہو گیا۔

''یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہر طرف سے بری خبریں مل رہی ہیں۔ سکون تو جیسے اب ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے۔'' افتخار حسن گھبرا کر بولے۔ منیر حسن نے ایک نظر اپنے بھائی کو دیکھا جو ٹوٹ سے گئے تھے پھر آفاق سے تیز لہجے میں بولے۔

''تم یہ سب آج بتا رہے ہو۔''

''اور کیا کرتا؟ جو سانحہ گزر چکا، وہ کیا کم ہے جو میں آپ سب کو اور پریشان کرتا؟''

''اچھا اب یہ باتیں چھوڑو۔'' بڑی ممانی پریشان سے لہجے میں بولیں پھر اپنے شوہر سے کہا۔ ''افتخار ! ہمیں وجدان کے گھر چلنا چاہئے۔''

''تائی جان! آپ وہاں نہ ہی جائیں تو بہتر ہے۔''

''کیوں؟'' وہ اسے دیکھ کر بولیں۔

''کیونکہ آپ بار بار ملیحہ کا نام لے کر رونے لگتی ہیں اور میں نے وجدان کے گھر والوں کو ملیحہ سے اپنے رشتے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے اور شاید وجدان نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ورنہ وہ ضرور ذکر کرتے۔ پھر انہیں ملیحہ کے انتقال کے بارے میں بھی کوئی اطلاع نہیں۔''

''لیکن تم نے یہ سب ان سے کیوں چھپایا جب کہ اس کی ضرورت نہیں؟'' منیر حسن کی بات سن کر آفاق نے کہا۔

''تو کیا بتاتا کہ ملیحہ کی موت کے صدمے نے وجدان کے دماغ پر اثر کیا ہے اور اس نے ہوش مندی میں نہیں بلکہ پاگل پن کی کیفیت میں گھر چھوڑا ہے تاکہ ان کے دلوں سے رہا سہا اطمینان بھی رخصت ہو جائے جیسے میرے دل سے رخصت ہو گیا ہے۔ اور اب تک تو در در بھٹکتا وہ سچ مچ پاگل ہو گیا ہو گا...... غلط لوگوں کو دل میں جگہ دی۔ ان دونوں نے تو اپنے دل کے آگے کسی اور کے دل کی پروا ہی نہیں کی۔'' آفاق دل گرفتہ ہو گیا۔ وہ چشمِ تصور سے وجدان کو قریہ قریہ دیوانوں کی طرح بھٹکتے دیکھ رہا تھا۔

✿✿✿

مغرب کی نماز کے بعد نمازی مسجد سے نکل رہے تھے جب وہ خستہ حال شخص ایک دم کہیں سے آ دھمکا۔ اس کے سر کے بال اور بڑھی ہوئی داڑھی میں گرد جمی ہوئی تھی۔ کپڑوں کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ ڈھیروں مٹی لئے زخمی پاؤں جوتے کی قید سے آزاد تھے۔ وہ یقیناً کوئی دیوانہ ہی تھا جو ایک ایک کو پکڑ کر پوچھ رہا تھا۔

"تم نے انہیں دیکھا ہے؟...... ابھی ابھی وہ اِدھر تھیں...... نہیں نہیں..... اُدھر...... نہیں اُدھر...... ہاں اُدھر ہی تھیں۔ پھر پتہ نہیں کدھر گئیں؟ انہیں جاتے دیکھا ہے؟" اس نے پہلے مسجد کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا، پھر فوراً ہی انہیں منع کرتے وہ اندر برآمدے کی طرف اشارہ کرنے لگا مگر کسی نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ ہر شخص اس سے بچ کر نکلنے کی کوشش میں تھا۔ وہ التجائیں کرنے لگا۔

"کوئی تو بتا دے وہ کہاں گئیں؟ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کوئی تو مجھے بھیک میں ان کا دیدار دے دے۔" اپنی فریاد کے رائیگاں جانے پر اس نے یک دم ہی سفید کاٹن کے کلف لگے شلوار قمیض میں ملبوس سیاہ رنگت کے موٹے سے آدمی کو دبوچ لیا۔ اس پر جنون سوار ہونے لگا تھا۔ موٹے کو جھنجوڑتے وہ چیخنے لگا۔

"تُو بتا مجھے وہ کہاں ہیں؟..... بتا۔ میں جانتا ہوں تجھے پتہ ہے۔ بول کدھر ہیں وہ؟"

وہ پہلے تو اس افتاد پر گھبرا گیا۔ پھر خود کو چھڑا کر حقارت سے زوردار تھپڑ اُس کے گال پر جڑ دیا۔

"ہٹ پاگل کہیں کا۔ سارے کپڑوں کا ستیاناس کر دیا۔"

اور وہ تھپڑ کھا کر گر پڑا۔ تبھی اسے نمازیوں کی بھیڑ کے اندر کسی کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ جھٹکے سے اُس کی اس طرف بڑھا۔ موٹے شخص نے جو اس پاگل کو اُٹھ کر اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو حواس باختہ سا ہو کر اس نے فوراً جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور تاک کر اس کی طرف پھینک دیا۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ وہ بس ایک پل کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہوا تھا۔ پھر بہتے ہوئے خون کی پروا چھوڑ کر وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ موٹے شخص نے جو بدستور اسے اپنی جانب آتے دیکھا تو ایک اور پتھر اٹھا کر اسے دے مارا۔ پھر ایک ساتھ کئی پتھر اس نے ہاتھ میں اٹھا لئے اور ایک کے بعد ایک مارنے لگا۔ باقی نمازیوں نے جو ایک پاگل کو اس موٹے آدمی سے بھڑتے دیکھا تو وہ بھی اس پر پل پڑے۔

"شرم نہیں آتی، نمازیوں کو پریشان کرتا ہے۔ ہٹا کٹا مسٹنڈا ہو کر آوارہ گردی کرتا ہے۔ مسجد جیسی متبرک جگہ تیری بدمعاشی کے لئے نہیں ہے۔" ہر طرف سے ایسے جملے پڑ رہے تھے اور اسی رفتار سے لاتیں اور گھونسے بھی۔ مگر وہ خوشبوؤں میں ڈھلے اس پیکر پر نگاہ جمائے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھاتا بدن کی پوری طاقت لگا کر خود کو ان لوگوں کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پر اُس کی ایک نہ چلی۔ اسے اتنے سارے لوگوں کے بے رحم شکنجے میں دیکھ کر ان جھیل سی آنکھوں میں طغیانی آ گئی پھر جیسے اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ اچانک ہی پلٹ کر بھاگنے لگی۔

''رُک جائیں۔ مت جائیں مجھے چھوڑ کر۔'' وہ چلّایا پھر اپنے اردگرد موجود لوگوں کو دھکیلنے لگا۔ وہ جب چپ کر کے پٹتا رہا، لوگ اُسے پیٹتے رہے۔ اب جو وہ انہیں دھکے مار کر خود کو چھڑانے لگا تو سب اسے چھوڑ خوف زدہ سے پیچھے ہٹ گئے اور وہ اس کے پیچھے بھاگا جو نظر سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ پھر بھاگتے بھاگتے اُسے پتھر سے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اس کے دانتوں سے خون نکل آیا تھا۔ اس نے کراس طرف دیکھا جدھر وہ گئی تھی۔ پھر گھبرا کر چاروں طرف نظر گھمائی۔ لیکن وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ اوندھے منہ لیٹے اس نے سر اُٹھا کر آسمان کو دیکھا اور کر سے فریاد کی صورت پکارا۔

''یا اللہ!'' لوگ ہنس رہے تھے، بچے پاگل پاگل کی صدائیں لگاتے تالیاں بجا رہے تھے اور وہ زمین پر پوری طاقت سے ایک ہاتھ کا مُکا بنائے زمین کو پیٹ پیٹ کر اپنے ہاتھ زخمی کر رہا تھا۔ دھول اُڑ اُڑ کر اس چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ کرب سے چلّاتا جا رہا تھا۔ قریب ہی ایک دکان کے باہر کھڑا شخص اس تماشے محظوظ ہوتا اپنے سامنے کھڑے آدمی سے بولا۔

''دیکھو یار! کیا تماشا چل رہا ہے؟''

''ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ادھر دیکھو، اصل تماشے کی خبر تو آج اخبار میں چھپی ہے۔ سنتے آئے لڑکیاں گھروں سے بھاگتی ہیں۔ پر اب تو لڑکے بھی گھر سے بھاگنے لگے۔'' اس نے مطلق دھیان نہ د ہوئے اخبار میں چھپی خوش شکل اور خوش لباس نوجوان کی تصویر اسے دکھائی جس کے نیچے لکھا تھا۔

''نام، وجدان مصطفیٰ ولد مصطفیٰ اعظیم، عمر پچیس سال، رنگت سانولی، قد پانچ فٹ گیارہ انچ، بلیک شرٹ بلیک پینٹ میں ملبوس ہے اور پیروں میں بوٹ پہنے ہوئے ہے۔ ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا ہے۔ اگر صاحب کو وجدان مصطفیٰ کے بارے میں اطلاع ہو تو براہِ مہربانی نیچے دیئے گئے ٹیلی فون نمبرز پر رابطہ کریں اطلاع دینے والے کو ایک لاکھ روپے نقد انعام دیا جائے گا۔'' اس نے اپنے ساتھی سے اخبار لے کر بلند میں خبر پڑھی اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔

❁❁❁

بابا جان کی پہلے بھی کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ بس بوائی اور کٹائی کے سیزن میں نگرانی کے لئے زمینوں پر چلے جاتے یا پھر اگر کوئی تنازع کھڑا ہو جاتا تو اس کے حل کے لئے انہیں جانا پڑتا۔ منافع اور اخراجات اندراج بھی ان کا سر درد تھا۔ مگر جب وہ قصرِ فاروقی میں ہوتے تو واقعی ریٹائرڈ لائف گزارا کرتے۔ فراغت فراوانی میں یا تو وہ ملک ناصر کے گھر پر ہوتے یا ملک ناصر، قصرِ فاروقی میں ڈیرے ڈال کر بیٹھے رہتے دونوں دوست جوانی کے قصوں اور آرمی لائف کی یادوں کو دہراتے، شطرنج کی بساط پر ایک دوسرے کو مات دیتے رہتے۔ مگر ملیحہ کے جانے کے بعد سب کچھ بدل گیا تھا۔ زمینوں کے معاملات میں ان کی دلچسپی

ُ ۔نشی جو چاہے فصل بوتا، جس دام پہ چاہتا فصل منڈی میں بیچ دیتا۔کوئی باز پرس نہ کرتے۔کتنی بار
الہدیٰ سے بھی کہا کہ اب وہ زمینوں کے معاملات ہینڈل نہیں کر پاتے، اس لئے نورالہدیٰ ان کا انتظام
ہاتھ میں لے لیں۔مگر نورالہدیٰ نے صاف جواب دے دیا۔

''اگر آپ زمینوں کے معاملات نہیں سنبھال سکتے تو بیچ دیں۔ مجھے اپنے بزنس سے فرصت نہیں۔''

اور زمینوں کو بیچنا، بابا جان کو گوارا نہیں تھا۔خیر کسی نہ کسی طرح معاملات چلتے ہی رہے۔گو عملاً بابا جان نے
اٹھادیا تھا اور بس اپنے کمرے تک محدود ہو گئے تھے۔ملک ناصر کی طرف جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔لیکن وہ خود
آجاتے۔مگر اب شطرنج کی بساط نہیں بچھتی تھی، بس ملیحہ کا ذکر ہوتا رہتا اور ملیحہ کے ذکر میں خوشی کہاں تھی؟
کی تو پوری زندگی بابا جان کا پچھتاوا بن گئی تھی اور پچھتاوے کا احساس کسی پل ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔
ان کے پاس ملیحہ کو یاد کر کے آنسو بہانے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔احساسِ جرم سے بے حال وہ بند
ے میں ملیحہ کی تصویر کے آگے چلّایا کرتے تھے۔

''ملیحہ میری جان! اپنے بابا کو معاف کر دو۔میرے گناہ بخش دو بیٹا! ترس کھاؤ اپنے باپ پر۔'' وہ ملیحہ کی
کو سینے سے لگائے روتے جاتے۔نورالہدیٰ کی بے اعتنائی اس سے سوا تھی۔انہوں نے بابا جان سے نہ
جھگڑا کیا اور نہ ناراضی کا اظہار۔بس ان سے لاتعلق ہو گئے۔بابا جان کی چیخیں ان کے کانوں تک بھی
تھیں، مگر وہ کبھی انہیں دلاسا دینے نہیں آئے۔اُلٹا اپنی سرد مہری سے ان کے احساسِ جرم کو اور بھی
تے جاتے۔انہوں نے بابا جان کو گھر میں رکھے سامان کی طرح سمجھ لیا۔کبھی ان کے کمرے میں جھانکنے
ت بھی نہیں کی۔اور اگر کبھی بابا جان ہی ان کے پاس چلے آتے تو اس طرح نظر انداز کرتے کہ وہ کٹ
جاتے۔مگر شکایت کیسے کرتے؟ انہوں نے بھی تو کبھی ملیحہ کو خود سے قریب نہیں ہونے دیا تھا۔لیکن ملک
ے برداشت نہیں ہو سکا اور وہ نورالہدیٰ کے پاس جا پہنچے۔

''جس شخص نے تمہیں کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، اس کے ساتھ تم یہ سلوک کر رہے ہو۔کاٹھ
کی طرح اسے ایک کونے میں ڈال دیا ہے۔''

رالہدیٰ ان کے جلال کے جواب میں بے تاثر لہجے میں بولے۔''آپ کس سلوک کی بات کر رہے ہیں
کل؟ میری طرف سے بابا جان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔اس گھر میں ان کا جو رتبہ اور مقام کل
ا آج بھی ہے۔گھر کے سارے ملازم ان کے حکم کے پابند ہیں اور میں نے خود بھی انہیں سختی سے
دے رکھی ہے کہ بابا جان کے آرام و آسائش کا خیال رکھیں۔''

نوکر تمہارا نعم البدل نہیں ہو سکتے نورالہدیٰ! کیا تمہیں خبر بھی ہے، اظہر کئی دن سے بیمار ہے؟ کیا ایک
نہیں اتنی توفیق ہوئی کہ جا کر اس بیمار آدمی کی خیریت ہی دریافت کر لو، جس نے تمہیں اولاد کی جگہ
ہے؟''

'بابا جان بیمار ہیں۔' اس خیال سے وہ اندر ہی اندر بے چین ہو گئے۔ لیکن جب بولے تو ان کی آواز
سے خالی تھی۔

''گھر میں تین تین ڈرائیور موجود ہیں۔ اگر وہ بیمار ہیں تو مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ڈرائ
ساتھ ہسپتال جا سکتے ہیں۔ اور اگر خود نہ بھی جانا چاہیں تو ڈاکٹر کو فون کر کے گھر پر بلوا لیں۔''

ملک ناصر ان کی بے حسی پر حیران رہ گئے۔

''اس کی بیماری کا علاج ڈاکٹر کے پاس نہیں، تمہارے پاس ہے۔ تم تو اپنی زندگی میں مگن ہو گئے، لیکن
تمہاری ضرورت ہے۔ کبھی دو گھڑی کے لئے ہی سہی، ان کے پاس بیٹھ جایا کرو۔ تنہائی کو جھیلنا آسان نہ

''تنہائی'' وہ زہر خند ہو کر بولے۔ پھر اُٹھے اور صوفے کی بیک پر جا کر دونوں ہاتھ اس کی پشت
ہوئے کہنے لگے۔ ''تنہائی کو جھیلنا آسان نہیں ملک انکل! اور ملیحہ نے جذباتی تنہائی کے ساتھ نو سال گ
ہیں، بنا شکایت کئے۔ اور بابا جان چند مہینوں میں ہی شکوہ کرنے لگے؟''

ملک ناصر ہکا بکا رہ گئے۔ ''تم ایک باپ سے اُس کی بیٹی کی موت کا انتقام لینا چاہتے ہو۔ کیا تمہیں
حق ہے؟''

''مرنے والی اگر ملیحہ ہو اور مارنے والے بابا جان، تو ہادی بھائی کو حق ہے کہ ملیحہ کی موت کا انتق
سکیں۔'' ان کے لہجے میں کوئی گنجائش نہ پا کر ملک ناصر چپ کے چپ رہ گئے۔ بعد میں جب بابا جا
چلا تو کہا۔

''نور الہدیٰ سے بدگمان نہ ہونا ملک! اس نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں اسی سلوک
ہوں۔ اس نے تو بہت صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اسے ملیحہ کے ساتھ کی ضرورت نہیں، وہ یوں بھی ا
محبت کر لے گا۔ مگر میں نے زبردستی ملیحہ کو اس کے ساتھ نتھی کرنا چاہا۔ وہ ملیحہ کی تکلیف برداشت نہیں
تھا۔ کہاں تو میں نے اسے ہی ملیحہ کی تکلیف بنا دیا۔ ذرا سوچو تو ملک! میرے ہاتھوں اس کا کتنا بھاری
ہوا ہے۔ پھر وہ اتنا بڑا ظرف کہاں سے لائے کہ مجھے معاف کر سکے؟'' پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں
لیکن پچھتاووں سے دامن چھڑانا بہت مشکل ہے۔

✿✿✿

صوبہ پنجاب کے دور دراز علاقے میں سرحدی پٹی کے بالکل قریب واقع پسماندہ گاؤں ''چنگ د
آبادی محض چند سو نفوس پر مشتمل تھی۔ مولوی عبدالخالق کا شمار اس چھوٹی سی آبادی کے معززین میں
مولوی عبدالخالق گاؤں کے مؤذن تھے اور جماعت کی امامت بھی ان کے فرائض میں شامل تھی۔ ان
جنہیں گاؤں والے عقیدت سے بڑے امام صاحب کہتے تھے، مولوی عبدالخالق سے پہلے وہ ہی اذا
اور نماز پڑھایا کرتے تھے۔ بڑے امام صاحب دین دار آدمی تھے۔ لیکن انہوں نے دنیا کا دامن بھی

تھا اور حسن و خوبی دین اور دنیا میں توازن قائم رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی پوری زندگی گزار دی۔ اپنے بیٹے کی تربیت بھی انہوں نے ان ہی خطوط پر کی۔ پیش امام کی ذمہ داری سنبھالنے سے پہلے وہ لاہور سے گریجویشن کر چکے تھے۔ پھر جب وہ اپنے والد کے پیچھے نماز پڑھانے لگے تو بڑے امام صاحب نے انہیں روزگار کو اپنانے کی ترغیب دی۔ مولوی عبدالخالق نے گھر کے ہی ایک کمرے میں دکان کھول لی۔ مہینے میں ایک بار دکان میں سامان ڈالنے کے لئے وہ شہر کا چکر لگاتے۔ ان کی دکان میں اشیائے خور و نوش کے علاوہ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا سامان بھی موجود ہوتا۔ یعنی ایک لحاظ سے اسے گاؤں کا جنرل اسٹور کہا جا سکتا تھا۔

بڑے امام صاحب کا برسوں پہلے انتقال ہو چکا تھا اور اب تو مولوی عبدالخالق بھی بزرگی کی عمر میں داخل ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب نے گاؤں کی ہی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی۔ مگر اللہ نے اولاد کی نعمت سے محروم ہی رکھا۔ رفیقہ ہاجرہ بی بی بقید حیات تھیں اور ''ملانی جی'' کے لقب سے خاص و عام میں مشہور تھیں۔ سالوں سے مولوی عبدالخالق ایک ہی لگی بندھی روٹین کے عادی ہو گئے تھے۔ فجر کی اذان سے ذرا پہلے جس وقت رات کا آخری پہر ڈھل رہا ہوتا، وہ نیند سے جاگ جاتے۔ پھر تہجد کی نماز پڑھ کر بیوی کو جگاتے، گاؤں کی کچی گلیوں سے گزر کر مسجد آ جاتے، پھر جب تک فجر کی اذان کا وقت ہوتا، مولوی صاحب مسجد میں جھاڑو لگا کر نمازیوں کے لئے صحن میں دریاں بچھا چکے ہوتے۔ نماز کے بعد وہ کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کرتے، پھر اپنی دکان پر اُٹھ آتے جو پھر ظہر کی نماز کے لئے بند ہو جاتی۔ نماز کے بعد ایک گھنٹے کا درس ہوتا، جس میں بڑے احکامِ شریعت کے بجائے چھوٹی چھوٹی عام فہم باتوں کو شامل کیا جاتا۔ وہ باتیں جن سے انسان کے کردار کا بنیادی ڈھانچہ تشکیل ہوتا ہے۔ بڑے امام صاحب اکثر مولوی عبدالخالق سے کہا کرتے تھے۔

''اصل چیز بنیاد ہی ہے۔ تُو بنیاد مضبوط کئے جا، عمارت اپنے آپ سیدھی اور مضبوط اُٹھے گی۔''

درس ختم کر کے پھر مولوی صاحب دُکان پر آ بیٹھتے اور پھر عصر کی نماز پڑھا کر گھر لوٹتے تو صحن میں گاؤں کے بچے سیپارے اور اسکول کی کتابیں لے کر بیٹھے ان کا انتظار کر رہے ہوتے۔ مولوی صاحب دکان اور گھر کے صحن کا درمیانی دروازہ کھول دیتے اور دکان داری کے ساتھ ساتھ دین اور دنیا کی تعلیم دی جاتی۔ یہ سلسلہ مغرب تک چلتا، پھر عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں ہی نمازیوں کی بیٹھک ہوتی جس میں ہر طرح کے دینی اور دنیاوی مسئلے زیر بحث لائے جاتے۔ یہ بیٹھک ایک سے ڈیڑھ گھنٹے میں برخاست ہو جاتی اور لوگ اُٹھ کر اپنے اپنے گھر کو سونے چلے جاتے۔

اتنے برسوں میں آج پہلی بار مولوی صاحب کی روٹین میں فرق آیا تھا۔ آج ظہر کے بعد درس کی محفل نہیں ہوئی اور مولوی عبدالخالق نمازیوں سے معذرت کرتے اُٹھ آئے اور اب چلچلاتی دھوپ میں وہ گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر تیزی سے چل رہے تھے۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ تین دن سے گاؤں والوں میں کسی ''سائیں'' کے چرچے زور پکڑ رہے تھے جو نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا اور اب گاؤں کے باہر ڈیرہ ڈال رکھا

تھا۔ گاؤں کے سادہ لوح لوگ سائیں کے آنے سے پُرجوش ہو گئے تھے اور اب انہیں سائیں کی کرامات کا انتظار تھا۔ مولوی عبدالخالق نے جو کچے ایمانوں کو ڈولتے دیکھا تو معاملے کی تحقیق کرنا ضروری سمجھا۔ وہ گاؤں سے کافی دور نکل آئے تھے۔ کچی مٹی کے مکان بہت پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ بلا کی گرمی تھی، مولوی صاحب کا حلق پیاس سے خشک ہو گیا تو رُک کر سانس بحال کرنے لگے، پھر سامنے سے چہرے پر آیا پسینہ خشک کر کے آنکھوں پر ایک ہاتھ کا چھجا سا بنا کر اپنے سامنے دُور تک دیکھا۔

خشک زمین پر اُبھری لکیریں اس کی پیاس کی گواہ تھیں اور ایک سوکھا درخت جس کی خوب پھیلی بنجر شاخوں پر کوئی خشک پتا تک نہیں تھا، مُردہ زمین کے سینے پر یوں گڑا تھا جیسے وہ خود اپنے ہی حال پر نوحہ کناں ہو۔ دُور تک پھیلا نیلا آسمان ایک دم صاف تھا جس پر سورج پیلے رنگ کے تھال کی مانند دہک رہا تھا، تاحدِ نگاہ پھیلے اس منظر کی ویرانی کو اور بھی گہرا کر رہا تھا۔ وہ اکلوتا ذی روح جو اس سوکھے درخت کی چھاؤں میں بیٹھا تھا، اس کے سیاہ کپڑوں پر مسافتوں کی گرد جمی تھی۔ سر کے بال لمبے اور گرد آلود تھے۔ بے ترتیب داڑھی جھاڑ کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ زمین پر بچھی ٹانگ کی ران پر تھا جبکہ دوسرا موڑ کر کھڑی کی ہوئی ٹانگ کے گھٹنے پر۔ سر پیچھے تنے سے ٹکا کر آنکھیں بند کئے وہ تپتی زمین پر اتنے سکون سے بیٹھا تھا جیسے صدیوں سے اسی حال میں ہو اور صدیاں اسی عالم میں گزار دے گا۔ اس کے چہرے کے مبہم نقوش سے کرب و اذیت کی عجیب کی کیفیت جھلک رہی تھی۔ مولوی عبدالخالق نے بے ساختہ جھرجھری لی اور اس کی طرف چلنے لگے۔ درخت کے پاس پہنچ کر مولوی صاحب نے کچھ توقف کیا، پھر پکارا۔

''بھائی!'' اور اُسے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگے کہ آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھے گا۔ مگر اس کی پلکوں میں تو لرزش بھی نہیں ہوئی۔ مولوی صاحب نے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

''کون ہو بھائی! کہاں سے آئے ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ ایسے بیٹھا رہا جیسے کوئی آواز سنی ہی نہ ہو۔ مولوی صاحب انتظار کرتے رہے پھر کہا۔ ''یہاں کے تو نہیں لگتے۔ پھر وہ کیا خواہش ہے جو تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے؟'' وہ اُس کے پراگندہ لباس پر ایک نظر ڈال کر ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ یہاں کا نہیں ہے، تو پوچھ لیا۔ وہ آنکھیں کھولے بغیر بولا

''بتا بھی دوں تو کیا کر لے گا؟''

''جو بھی میرے بس میں ہوا۔'' مولوی صاحب اس کے سامنے زمین پر بیٹھتے بولے تو اس نے آنکھیں کھول دیں، مگر اُنہیں نہیں دیکھا اور آسمان پر نظریں جمائے کہنے لگا۔

''ایک مدت خواہش کے پیچھے بھاگا ہوں، لیکن اب خواہش سے بھاگتا پھر رہا ہوں مگر وہ ہیں کہ جان ہی نہیں چھوڑتیں۔'' پھر اس نے ایک دم مولوی صاحب کو دیکھا۔ ''تُو کوئی ایسی جگہ جانتا ہے جہاں میں خواہش سے جا چھپوں؟''

مولوی صاحب نے اسے مترحم نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''او جھلیا! بندہ خواہش کا گھر ہے۔ یہ باہر کھلی نہیں پھرتی، آدمی کے اندر چھپ کے بیٹھ جاتی ہے اور تُو اپنے اندر سے چھپنا چاہتا ہے۔''

''اندر کو خود سے قریب نہ سمجھ۔'' وہ تنبیہہ کے انداز میں بولتا انہیں اپنی سرخ آنکھوں سے گھورنے لگا۔ ''یہ چھل رہتا ہے۔ تُو دیکھے گا تو قریب لگے گا۔ ہاتھ بڑھائے گا تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا، پھر خالی ہتھیلی آسمان کی طرف کی اور گمبھیر آواز میں بولا۔ ''یہ ہاتھ بھر کا فاصلہ تو عمر بھر کی مسافت سے بھی نہ مٹے۔''

''تجھے کیسے معلوم؟'' مولوی صاحب کی بات سننی تھی کہ اس پر ہیجان طاری ہو گیا۔

''میں سرپٹ دوڑا ہوں اس سفر پر۔ لیکن منزل کے بجائے ہر قدم پر ٹھوکر ملی اور میں ہر بار منہ کے بل زمین پر گر پڑتا، پھر فوراً ہی اُٹھ کر دوڑنے لگتا۔ مگر ایک اِنچ کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکا۔ اور اب جب میں اس سفر سے عاجز آ گیا ہوں تو اس نے خواہش کو میرے پیچھے لگا دیا۔ جہاں جاتا ہوں، پاس چلی آتی ہیں۔ لیکن وہ ہاتھ بھر کا فاصلہ نہیں مٹتا۔'' اس کی آواز میں کسک تھی۔ پھر وہ اچانک ہی آسمان کی طرف دیکھ کر چلانے لگا۔

''مکر کرتا ہے میرے ساتھ۔ فریب دیتا ہے۔ کیسا خدا ہے تُو، بندے کو دھوکا دیتا ہے۔ ہنستا ہے مجھ پر، پاگل ہے۔ پاگل!''

پھر وہ مٹی اور کنکر مٹھیوں میں بھر بھر کر آسمان کی طرف پھینکنے لگا۔ ''یہ لے، نکل یہاں سے...... چلا جا۔ نہیں ضرورت مجھے تیری۔ مذاق اُڑاتا ہے میرا۔''

مولوی صاحب لب بھینچتے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اسے روکنے یا قابو کرنے کی کوشش نہیں کی، پھر وہ ایک دم ان کی طرف پلٹ کر بولا۔

''تُو نے یہ آواز سنی؟ وہ...... وہ آسمانوں پر بیٹھا مجھ پر ہنس رہا ہے، خوب اونچی اونچی آواز میں۔'' پھر اس نے ڈھونڈ کر ایک پتھر اُٹھایا اور آسمان کی طرف اُچھال دیا۔ ''تُو چلا جا...... کیوں نہیں جاتا یہاں سے؟...... جا چلا جا۔ اکیلا چھوڑ دے مجھے۔'' پتھر اُٹھا اُٹھا کر پھینکتے اسے اچانک ہی جانے کیا نظر آ گیا تھا کہ ایک جانب نظریں جمائے سہمے ہوئے انداز میں وہ پیچھے کو ہٹنے لگا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرا بھی، مگر رکا نہیں اور زمین پر خود کو گھسیٹتا درخت کے تنے سے جا لگا۔

''جائیں، چلی جائیں۔ کیوں بار بار آ جاتی ہیں؟...... خدا کے لئے چلی جائیں۔'' وہ ہاتھ اُٹھا کر ہلاتا جانے کے چلے جانے کو کہہ رہا تھا۔ مولوی صاحب نے مڑ کر دیکھا بھی، لیکن انہیں تو کوئی نظر نہیں آیا اور وہ بدستور کہتا جا رہا تھا۔ ''اور کتنا برباد کریں گی مجھے؟...... کتنا ستائیں گی؟...... اب اور برداشت نہیں ہوتا۔'' حسرت بھرے لہجے میں کہتے اس نے سر بازو میں چھپا لیا اور بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''چلی جائیں یہاں سے۔ چلی جائیں۔''

مولوی صاحب گہری نظروں سے اُسے دیکھتے رہے، پھر اسے روتا بلکتا چھوڑ کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔

اگلے دن درس کے بعد مولوی عبدالخالق گھر آئے تو ملانی جی سے کہہ کر کھانے کی ٹرے تیار کروائی، پھر
اسے کپڑے سے ڈھک کر گاؤں سے باہر نکل آئے۔ دینو تانگے والا روز کی طرح سواریاں اُتار کر دوپہر
کھانا کھانے گھر کو جا رہا تھا۔ مولوی عبدالخالق کو دیکھا تو تانگہ روک لیا۔

''سلام مولوی صاحب!''

''وعلیکم السلام! گھر جا رہے ہو علم دین؟''

وہ مؤدب انداز میں بولا۔ ''جی مولوی صاحب! پر آپ کا ارادہ کدھر کو ہے؟ حکم ہو تو چھوڑ آؤں؟''

اُس کی پُرخلوص پیشکش کے جواب میں مولوی عبدالخالق مسکرائے اور کہا۔ ''کیوں زحمت کرتے ہو بھا
میں تو بس جو مہمان گاؤں کے باہر آکر ٹھہرا ہے، اسے کھانا دینے جا رہا ہوں۔''

''سائیں کی بات کر رہے ہیں؟'' اس نے کہا، پھر بولا۔ ''لیکن وہ تو چلا گیا۔''

''چلا گیا......؟'' مولوی صاحب حیرت سے بولے۔ ''کہاں چلا گیا؟''

''وہ تو پتہ نہیں۔ پر کل شام سے اسے کسی نے نہیں دیکھا۔''

مولوی عبدالخالق نے اس کی بات سنی، پھر خود کلامی کرتے ہوئے بولے۔ ''حیرت ہے، مسافر کے
زنجیر کرنے کا وقت آ گیا ہے اور وہ ابھی تک بھاگتا پھر رہا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب؟'' وہ خاک بھی نہیں سمجھا۔

مولوی صاحب اس سے لاتعلق اپنی سوچ میں ڈوبے رہے، پھر نظر اُٹھا کر اُس کے اُلجھن بھرے چہر
دیکھا اور کہا۔

''وہ کہیں نہیں جا سکتا علم دین! اُس کا سفر تمام ہوا۔ اب وہ جتنا بھی بھاگ لے، اسے لوٹ کر یہیں
ہے۔'' اپنی بات کہہ کر وہ واپسی کے راستے پر پلٹ گئے۔ لیکن بے چارہ دینو کتنی ہی دیر تک راستے میں کھڑ
کی بات سے مطلب اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

اگلے دن پھر مولوی صاحب درس کے بعد گھر آئے تو کھانے کی ٹرے بنوا کر ہاتھوں میں اٹھائے
سے باہر آ گئے۔ مگر آج بھی انہیں ٹرے اسی طرح گھر واپس لے جانی پڑی۔ تیسرے دن بھی وہ ٹرے
گاؤں سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ دُور سے ہی دیکھ چکے تھے کہ درخت کے پاس کوئی نہیں تھا۔ ان کے ما
شکنیں اُبھر آئیں۔ آج واپسی کے لئے قدم موڑتے ہوئے ان کے چہرے پر تردّد تھا۔ دینو اپنا تانگہ
سے باہر نکل رہا تھا۔ اس وقت سواریاں بھی اس کے ساتھ تھیں، پھر بھی مولوی عبدالخالق کو دیکھ کر اس نے
روک دیا۔

''کب تک اس کا انتظار کرتے رہیں گے مولوی صاحب! اس جیسے کے پیروں کو واپسی کا راستہ نہیں
وہ بھید سے بولے۔ ''تجھے کیا لگتا ہے علم دین! وہ یہاں صرف صورت دکھانے آیا تھا؟ اُس کا یہاں

لا ہے طے ہے۔ اب چاہے اس کے پیروں کو واپسی کا راستہ نہ ملے۔ جس نے اس کی تقدیر لکھی ہے، وہ خود ہی ہاتھ تھام کر یہاں لے آئے گا۔'' وہ اپنی بات کہہ کر چلتے چلے گئے اور دینو ایک بار پھر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔

''کس سوچی پے گیا دینو!...... چل پڑ۔ شاموشامے واپس وی آنا اے۔'' پیچھے بیٹھے شخص نے اُسے ٹھوکا مارا تو وہ ''پچ، پچ'' کی آواز نکالتا تانگہ بڑھا لے گیا۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تو مولوی صاحب دکان بند کر کے بچوں کو پڑھتا چھوڑ کر مسجد آ گئے۔ وضو کر کے اذان دی، پھر باجماعت نماز کی امامت کروائی اور دعا مانگ کر تسبیح کے دانے گراتے گھر کی طرف چل دیے۔ چودہ، پندرہ سال کا لڑکا بھاگتا ہوا ''مولوی صاحب! مولوی صاحب!'' چلاتا ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ مولوی صاحب نے سنا تو رک گئے اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ قریب آیا تو پوچھنے لگے۔

''کیا بات ہے منور علی؟''

وہ اتھل پتھل سانسوں کے بیچ جلدی میں بولا۔ ''دینو تانگے والا آپ کے مہمان کے ساتھ حکیم جی کی دکان پہ بیٹھا ہے۔ اس نے کہا تھا، آپ کو خبر کر دوں۔''

مولوی عبدالخالق حیران سے کہنے لگے۔ ''میرا مہمان کون ہو سکتا ہے؟ اور علم دین کو کہاں مل گیا؟''

''وہ تو پتہ نہیں مولوی صاحب!''

''اچھا ٹھیک ہے، میں جا کر دیکھتا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور حکیم جی مطب کی طرف چل پڑے۔ ان کی پہلی نظر علم دین کے چہرے پر پڑی تھی اور دوسری لکڑی کے بینچ پر آنکھیں بند کیے لیٹے سائیں پر۔ جس کے پاؤں پر حکیم جی مرہم لگا رہے تھے۔ مولوی صاحب تیزی سے آگے آئے۔

''یہ تمہیں کہاں مل گیا علم دین؟''

''لاری اڈے پہ سواریوں کا انتظار کر رہا تھا کہ یہ مجھے ٹکٹ گھر کی دیوار کے ساتھ پڑا ہوا نظر آیا۔ پاس جا کے دیکھا تو بے ہوش تھا اور بدن ایسے تپ رہا تھا کہ ہاتھ نہ لگایا جائے۔ بس مولوی صاحب! پھر میں نے اسے جیسے تیسے کر کے تانگے میں ڈالا اور گاؤں پہنچتے ہی سیدھا حکیم جی کے پاس لے آیا۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔'' وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے علم دین سے بولے جو اس سادہ سے جملے پر ہی پھول کر کپا ہو گیا تھا۔ پھر اس کے بہت کہنے کے باوجود بھی مولوی عبدالخالق نے اسے حکیم جی کی فیس ادا نہیں کرنے دی اور خود اپنی جیب سے پیسے نکال کر گلک پر بیٹھے شخص کو تھما دیے۔

''یہ دوا تین ٹائم اسے کھلا دینا۔'' چلتے ہوئے حکیم جی نے پڑیوں میں بند سفوف انہیں دے کر کہا۔ مولوی صاحب نے پڑیا لے کر انہیں سلام کیا، پھر سائیں کو بے ہوشی کی حالت میں ہی اُٹھا کر دینو کے تانگے میں ڈالے اپنے گھر لے آئے۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ مولوی عبدالخالق اندر سے چھوٹا ٹیبل ا
کر لے آئے اور اس کے سرہانے رکھ کر مٹی کے تیل سے جلنے والا لیمپ روشن کر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ ملانی
بھی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے باہر آ گئیں۔

''یہ کسے اُٹھا لائے مولوی صاحب؟'' انہوں نے اس مفلوک الحال شخص کو دیکھ کر اچنبھے سے سوال کیا۔

''یہ ہمارا مہمان ہے۔''

''حلیے سے تو پاگل لگتا ہے۔'' وہ فوراً بولیں۔

''پر باتوں میں سیانا ہے۔ ہوش میں آئے گا تو تُو خود دیکھ لینا۔''

''پر یہ ہے کون؟'' وہ اُلجھ کر بولیں تو مولوی صاحب جھنجلاہٹ کے باوجود تحمل سے بولے۔

''او کرموں والی! کہا نا، مہمان ہے۔ اب زیادہ سوال مت کر اور جا کر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ر
انتظام کر۔ بے چارے کا جسم جہنم بنا ہوا ہے۔'' اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ٹمپریچر چیک کرتے ہو
فکرمندی سے بولے۔ ملانی جی نے پھر کوئی سوال نہیں کیا اور ایک کٹورے میں پانی لے کر کسی پرانے کپ
کو کاٹ کر اس کی پٹیاں بناتی مولوی صاحب کے پاس لے آئیں۔ مولوی صاحب نے کٹورا ان کے ہاتھ
لے کر ٹیبل پر رکھا، پھر بڑی محبت سے اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھنے لگے۔ پوری رات مستقل مزاجی
سائیں کے ماتھے پر پٹیاں رکھتے رہے، کچھ دیر کا بریک آیا بھی تو عشاء کی نماز کے لئے۔ مگر آج کی
انہوں نے برخاست کر دی۔ وہ کبھی اس کے ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھتے، کبھی تولیہ بھگو کر اس کے پیروں کی
آ بیٹھتے۔ پاؤں کے چھالے پیر مسلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ گیلا تولیہ اس کے پیروں کے گرد
لپیٹ کر ہلکے ہاتھ سے دھیرے دھیرے دباتے جاتے کہ شاید اس طرح اس کے تندور کی طرح جلتے
راحت مل جائے۔

فجر کی نماز کے بعد مولوی صاحب تسبیح پڑھتے ہوئے گھر کی طرف چلے جا رہے تھے۔ گلی میں مڑتے
دیکھ چکے تھے کہ لکڑی کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ دروازہ اندر سے مقفل نہیں ہوگا۔ دن کی
میں اس دروازے پر کبھی قفل نہیں چڑھا، یہ بھی بڑے امام صاحب کی نصیحت تھی۔

''اپنے دروازوں کو بند کر کے حاجت مندوں کی خودداری کا مذاق نہ اُڑاؤ کہ وہ دروازہ بجا کر
کھڑے تم سے اعانت کی درخواست کریں، بلکہ چوکھٹوں کو کھلا رکھو، تاکہ وہ سیدھے اندر چلے آئیں اور
بے کسی کا حال کسی دوسرے پر آشکار نہ ہو۔''

مولوی عبدالخالق نے دروازہ کھول کر اندر کچے صحن میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ ان کے کانوں میں د
کراہنے کی آواز آئی۔ رات بھر وہ بے سدھ رہا تھا، مگر اب نیم بے ہوشی کی حالت میں سر کو دائیں بائ
کراہ رہا تھا۔ یہ اس کی حالت میں بہتری کا اشارہ تھا۔ مولوی عبدالخالق مسکراتے ہوئے اس کے پاس

اور جھک کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک کرنے لگے۔ بخار کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ملانی جی پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"تھوڑا بہت ہوش تو آ ہی گیا۔ اب کوشش کر کے دوا بھی کھلا دیں۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے ملانی جی سے کہنے لگے۔

"دوا خالی پیٹ تو نہیں کھلا سکتا نا۔ پہلے اس کے کھانے کا بندوبست کر۔" پھر کچھ سوچا اور بولے۔ "پتہ نہیں کب سے اس کے حلق میں کچھ نہیں گیا۔ کھانا کھا بھی پائے گا یا نہیں۔ ایک کام کر ہاجرہ! تھوڑا سا دودھ گرم کر کے لے آ اور اس میں چینی بھی ڈال لینا۔"

"جی مولوی صاحب!" وہ صحن کے ایک جانب بنے باورچی خانے میں آ گئیں، جس کے گرد چاردیواری نہ تھی۔ یہ ایک اوپن کچن تھا، جس میں موجود مٹی کا چولہا اوپلوں کی مدد سے سلگایا جاتا تھا۔ نیم گرم دودھ کو گلاس میں ڈالنے کے بجائے انہوں نے دوپٹے کے کونے سے ڈول کا ہینڈل پکڑ کر اُٹھا لیا اور سٹیل کا گلاس لے صحن میں چلی آئیں۔ پاؤں مار کر دُور رکھی پیڑھی کو انہوں نے چارپائی کے ساتھ کیا، پھر پیڑھی پر بیٹھ کر ڈول میں سے دودھ ہاتھ میں پکڑے گلاس میں ڈال کر مولوی عبدالخالق کو دیکھنے لگیں جو سائیں کا شانہ ہلا کر اسے اٹھ کر بیٹھنے کو کہہ رہے تھے۔ مگر وہ یوں ہی سر پٹخ پٹخ کر کراہتا رہا تو مولوی عبدالخالق نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو تھام کر دوسرا ہاتھ اس کی گردن کے نیچے دیتے ہوئے اسے اٹھا کر بٹھا لیا۔ مولوی عبدالخالق دھان پان سے آدمی تھے، پھر عمر بھی کافی ہو چلی تھی۔ جبکہ سائیں کو دیکھ کر ہی پتہ چل جاتا تھا کہ تیس کے آس پاس ہو گا۔ مگر خاک نوردی نے اس کے جسم سے ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔ اسے اٹھا کر بٹھانے میں مولوی عبدالخالق کو بہت زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ وہ بیٹھ چکا تو مولوی عبدالخالق نے ملانی جی کے ہاتھوں سے گلاس لے کر اس کے ہونٹوں سے لگایا، مگر نیم بے ہوشی کے باوجود اس نے گلاس ہاتھ مار کر دُور کر دیا، جس سے دودھ چھلک کر مولوی صاحب کے ہاتھ اور کپڑوں پر گر پڑا تو وہ ڈپٹ کر بولے۔

"توں وی جھلا ای ایں۔ رازق سے جھگڑا سمجھ میں آتا ہے پر رزق سے کیا ناراضی ہے؟....... چل پی جا چپ چاپ۔"

اس نے اپنی نیم غنودہ آنکھوں سے انہیں دیکھا، جن میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ ان آنکھوں کی وحشت ناکی دیکھ کر ملانی جی تو گھبرا ہی گئیں۔ مگر مولوی عبدالخالق ذرا متاثر نہ ہوئے اور کہا۔

"ایسے کیا گھورتا ہے؟"

وہ چپ چاپ انہیں گھورتا رہا۔ حالانکہ آنکھوں کو مستقل کھلا رکھنے کے لئے اُسے جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی، پھر بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی پلکیں جھپک جاتیں۔

"یہ لے، دودھ پی۔ پھر دوا بھی کھانی ہے۔" انہوں نے ایک بار پھر دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا

دیا۔ اس بار اُس نے مزاحمت نہیں کی، مگر کمزوری اتنی زیادہ تھی کہ ایک ایک گھونٹ حلق سے نیچے اُتارنے کے لئے اسے ہر بار دوسرا گھونٹ بھرنے سے پہلے توقف کرنا پڑتا۔ جب وہ پورا گلاس خالی کر چکا تو مولوی عبدالخالق نے گلاس ملّانی جی کو دے کر اور دودھ ڈالنے کا اشارہ کیا۔ پھر گلاس اس کے منہ سے لگایا تو اس نے گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دوسرا گلاس پہلے گلاس سے کم وقت میں ختم ہو گیا تھا۔ تیسرا گلاس بھر کر اسے پکڑاتے انہوں نے ایک پڑیا کھول کر اس کے ہاتھ میں دے دی اور کہا۔

''یہ دوا ہے۔ کھا لے۔''

اُس نے بلا چون و چرا کئے وہ پڑیا حلق میں جھاڑ کر چند گھونٹ بھرے، پھر گلاس واپس کر کے چارپائی پر گر سا گیا۔ وہ پورا دن اس نیم بے ہوشی کی کیفیت میں گزارا۔ رات ہوئی تو مولوی عبدالخالق اپنی چارپائی کو اُٹھا کر اُس کی چارپائی کے پاس لے آئے۔ ارادہ تھا کہ پچھلی رات کی طرح رات بھر جاگ کر اس کا خیال رکھیں گے۔ آدھی رات تک تو وہ جاگے، مگر اس عمر میں اتنی مشقت کی جسم اجازت بھی تو نہیں دیتا۔ بلکہ ابھی کل کی تھکن باقی تھی۔ وہ تو کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے لیٹے تھے، پر آنکھ لگ گئی۔ حسبِ عادت تہجد کے وقت آنکھ کھلی تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ گردن موڑ کر سائیں کی چارپائی پر نظر ڈالی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے فوراً بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ چوپٹ کھلا تھا۔

''بڑی پکی ضد لگائی ہے۔'' وہ بڑبڑائے، پھر اُٹھ کر دروازہ بند کر کے صحن میں اس طرف آ گئے، جہاں ہینڈ پمپ لگا تھا اور ایک ہاتھ سے پمپ چلاتے بالٹی میں وضو کے لئے پانی جمع کرنے لگے۔

دوپہر میں ظہر کی نماز کے بعد درس سے فارغ ہو کر وہ گھر لوٹے تو گرمی سے برا حال تھا۔ حالانکہ سر پر پہنی ٹوپی کے اوپر انہوں نے صافہ بھی لپیٹ رکھا تھا، پھر بھی لگ رہا تھا جیسے دماغ کھول رہا ہو۔ گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے آواز لگائی۔

''ہاجرہ! ایک گلاس پانی پلا دے۔'' پانی لانے کا کہہ کر وہ رُکے نہیں اور صحن کے آخر میں بنے دو کمروں میں سے ایک میں گھس کر اندر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بجلی کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا، وہ تکیے پر رکھا پنکھا اُٹھا کر ٹوپی اور صافہ سائیڈ میں رکھتے ہاتھ سے پنکھا جھلنے لگے۔ چند لمحوں بعد ہی ملّانی جی ہاتھ میں پانی کا گلاس لئے کمرے میں آ گئیں۔ انہوں نے ملّانی جی کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور منہ تک بھی لے گئے لیکن ہونٹوں سے نہ لگا سکے۔ کمرے کی ٹھنڈی نیم تاریک فضا میں بیٹھے انہیں اس کا خیال آ گیا جو اس تپتی دوپہر میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا خود کو جھلسا رہا ہو گا۔

''کیا بات ہے مولوی صاحب! آپ پانی کیوں نہیں پیتے؟'' انہیں سوچ میں گم دیکھ کر انہوں نے ٹوکا تو مولوی عبدالخالق بڑبڑانے لگے۔

''اُسے بھی تو پیاس لگی ہو گی۔ اُس کا بھی حلق سوکھتا ہو گا۔''

"کون مولوی صاحب؟...... کس کی بات کر رہے ہیں؟" وہ ناسمجھی سے پوچھنے لگیں۔ لیکن مولوی عبدالخالق جواب دیئے بغیر باہر نکل آئے۔ مٹکے سے پانی جگ میں انڈیلا اور گلاس پکڑ کر دروازے سے نکل گئے۔ انہوں نے دور سے ہی اسے ٹنڈ منڈ درخت کے سائے میں بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ اطمینان کا سانس لیتے انہوں نے اپنی رفتار بڑھادی۔ وہ سر جھکا کر بیٹھا اُنگلی سے زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ جگ اور گلاس اس کے سامنے رکھتے وہ زمین پر بیٹھے تو اس کی تپش کا احساس ہوا۔ فوراً پیروں پر ہوتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا جو اس جھلستی زمین پر اتنے اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے ایئر کنڈیشنڈ روم میں مخملی نشست پر بیٹھا ہو۔ اس نے سر اُٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ بس پلکیں اُٹھا کر ایک سرسری سی نظر اُن پر ڈالی اور پھر سے اپنے مشغلے میں مشغول ہو گیا۔

"صبح سے دوپہر ہو گئی، سورج سر پر چڑھ آیا ہے۔ اس گرمی سے تو زمین خشک ہو جائے۔ تیرا حلق بھی سوکھ رہا ہو گا۔ چل دو گھونٹ پانی پی لے۔" انہوں نے بہت پیار سے اسے بلایا تھا مگر اس نے توجہ نہیں دی۔

"اوجھلیا! ظلم ہر حال میں برا ہے۔ مگر اپنی ذات پر بدترین ہے۔ کیونکہ اپنی ذات پر روا رکھے جانے والا ظلم انسان کو بے حس بنا دیتا ہے۔ اور جو بے حس ہو جائے، وہ انسان نہیں رہتا، آدمی ہو جاتا ہے۔ صرف آدمی بننے سے جانور ہونا بہتر ہے۔ اپنے مرتبے کو پہچان، صرف آدمی ہونا قبول مت کر۔" دل جلے انداز میں سمجھاتے ہوئے انہوں نے پانی گلاس میں ڈالا اور گلاس ہاتھ میں لے کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لے پکڑ۔ اور خود پر قہر نہ توڑ۔"

اُس نے ایک نظر ان کے باریش چہرے کو دیکھا پھر ان کے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو اور گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ مگر اس میں سے پانی پینے کے بجائے ہاتھ اونچا کر کے گلاس کو اتنا غور سے دیکھنے لگا جیسے وہ سٹیل کا گلاس، کانچ کا ہو جس کے شفاف پیندے سے، وہ پانی کا معائنہ کر رہا ہو کہ آیا پانی صاف بھی ہے یا نہیں۔ پھر اُس نے بہت عجیب سی حرکت کی...... آہستگی سے گلاس اُلٹتے ہوئے اس نے سارا پانی زمین پر گرا دیا۔ اس کے بعد گلاس نیچے رکھا اور اسی ہاتھ سے جگ اُٹھا کر پانی گلاس میں انڈیلنے لگا۔ اس کے بعد گلاس کو اسی طرح اونچا کر کے پانی زمین پر گرا دیا اور پہلی حرکت دہرانے لگا۔ پھر تیسری بار اس نے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو مولوی صاحب چپ نہ رہ سکے۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"آرزو کو خاک کر رہا ہوں۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر بولا پھر دوسرے ہاتھ میں گلاس اٹھا کر ان کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جستجو کا برتن ہے اور انسان اس برتن کو آرزو سے بھر دیتا ہے۔" اُس نے بولتے ہوئے گلاس پانی سے لبالب بھرا۔ "مگر آرزو کی قسمت میں تکمیل نہیں۔ آرزو کی تقدیر ہے کہ خاک ہو جاتی ہے۔ اور جستجو کا برتن خالی رہ جاتا ہے۔" اُس نے جگ رکھ کر گلاس سیدھے ہاتھ میں لیا پھر ہاتھ اونچا کرتے ہوئے دھیرے دھیرے پانی زمین پر گرا دیا اور خالی گلاس کو دیکھتا ہوا بولا۔

''جتنی بار اس برتن کو بھرو گے، یہ اتنی بار خالی ہو جائے گا۔ یہاں صدیوں سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ جستجو باقی رہ جاتی ہے اور آرزو خاک ہو جاتی ہے۔'' اُس کے چہرے پر محظوظ سی مسکراہٹ تھی۔ مگر پھر بولتے بولتے اچانک ہی وہ افسردہ ہو گیا۔

''جستجو کا خالی برتن زیادہ وزن دار ہوتا ہے۔'' وہ گلاس کو دیکھتے ہوئے تاسف بھری آواز میں بولا تھا پھر جیسے اس کا دل اس کھیل سے اُچاٹ ہو گیا۔ گلاس زمین پر لڑھکا تا پُر جلال آواز میں گرج کر بولا۔ ''کیوں آتا ہے تُو یہاں؟......مت آیا کر۔''

مولوی صاحب ذرا متاثر نہ ہوئے اور گہری نگاہوں سے اس کے بگڑے ہوئے چہرے کو دیکھتے رہے پھر گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''باہر کی آگ بس اسے نہیں جلاتی جس کے اندر آگ لگی ہو۔ تیرے اندر کون سی آگ ہے؟'' اس کی آنکھوں میں قہر کی جگہ کرب نے لے لی اور وہ اپنے سینے کو مسلتے ہوئے بولا۔

''یہاں عشق کی بھٹی سلگ رہی ہے۔'' اس کی آواز میں وہ آنچ تھی جیسے سچ مچ اُس کا سینہ جل رہا ہو۔ پھر بے چارگی سے بولا۔ ''پر بجھنے پر اس کا دھواں نظر نہیں آئے گا۔ باہر آگ لگے تو شعلے بھڑکتے ہیں، دھواں اٹھتا ہے اور بربادی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ پر اندر آگ لگ جائے تو چنگاری بھی نہیں سلگتی اور سب کچھ خاکستر ہو جاتا ہے۔ کچھ باقی نہیں بچتا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہو پاتی کہ کیا کچھ تھا جو تباہ ہو گیا اور تُو اس آگ پر پانی ڈالنے لایا ہے۔'' وہ طنز سے بول کر مذاق اُڑاتے لہجے میں کہنے لگا۔

''مجھے جھلا کہتا ہے۔ نادان تو تُو خود ہے۔ اس آگ کو بجھانے آیا ہے جو جلتی ہی نہیں ہے، صرف جلاتی ہے۔'' تیز لہجے میں بولتا وہ اچانک کھو سا گیا پھر دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ ''وہ کہتی تھیں، عشق وہ آگ ہے جو جلائے تو راکھ نہیں کرتا، فنا کر دیتا ہے۔ جا چلا جا یہاں سے اور دوبارہ اِدھر نہ آنا۔ یہاں فنا کا عمل جاری ہے۔'' پھر انہیں نظر انداز کرتا وہ جنونی انداز میں اُنگلیوں کے ناخن سے زمین کھرچنے لگا۔ وہ پھر بھی بیٹھے اُسے دیکھتے رہے کہ شاید وہ کچھ کہے مگر وہ چپ ہی رہا تو مولوی صاحب ''اللہ اکبر'' کہتے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ گئے۔

❁❁❁

نورالہدیٰ کے لئے دن رات کا فرق مٹ گیا تھا۔ انہوں نے خود کو بے تحاشا کام میں اُلجھا لیا۔ ایسے میں
اگر گھڑی کی فرصت میسر آ جاتی تو خود بھی حیران ہونے لگتے۔ انہوں نے کب اس طرز پر زندگی گزارنی
چاہی تھی۔ اس تیز رفتاری سے ہی گھبرا کر وہ لندن سے پاکستان آئے تھے اور اب لگتا تھا، وہ آنکھوں پر پٹی
باندھے اندھا دھند دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ کدھر ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ کچھ خبر نہیں۔ ابھی گارمنٹس
کی امنگ سے اسٹیبلش بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ٹیکسٹائل کے بزنس میں بھی آ گئے اور اب وہ ایکسپورٹ
کے لئے پَر تول رہے تھے۔ کارپوریٹ سیکٹر میں لوگ کہنے لگے تھے، نورالہدیٰ فاروقی ایک ہی جست میں
آسمان پار کر لینا چاہتا ہے۔ کون جان پاتا کہ جو سودا اُنہیں چین نہیں لینے دیتا، وہ تو کچھ اور ہی ہے۔ وہ تو خود
کو ان یادوں سے بچانا چاہتے تھے جو ہر لمحہ ان کی گھات میں رہتی تھیں۔ گھر سے باہر تو فرار کے کئی راستے تھے
مگر گھر میں قدم رکھتے ہی اس کی یادیں انہیں نرغے میں لے کے بے بس کر دیتی تھیں۔ گھر لوٹنے کا خیال
ہی خوفزدہ کر دیتا۔ وہ خود کو بے نام مصروفیتوں میں اُلجھائے رکھتے۔ مگر گھر تو لوٹنا ہی پڑتا ہے۔
انہوں نے انٹرنس کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھنا ہی تھا کہ نظر نہ چاہتے ہوئے بھی لاؤنج کے صوفے پر
گئی اور اس کی یادوں نے ان کی آنکھوں پر ملیحہ کے عکس کا پردہ ڈال دیا۔ اب انہیں دھوئیں کی دھندلی دیوار
کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے انگلیوں میں دبا سگریٹ مسل کر بجھاتے ہوئے ایک جانب اُچھال دیا۔
"ایک تم جو نہیں ہو تو لگتا ہے کچھ نہیں۔" اس عکس کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ہر روز کی طرح یہ الفاظ
دہرائے پھر دروازے کے آگے بنے اسٹیپ پر بیٹھے اور دونوں ہاتھوں پر سر گرا دیا۔
"صاب! بہت دیر گزر گئی تھی، بہادر کی آواز پر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "کھانا لگا دوں؟" انہیں
ہوش دیکھ کر بہادر نے پوچھا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ انہیں بھوک نہیں ہے پھر خیال آیا، بھوک تو صبح بھی نہیں
تھی۔ پر انہوں نے ناشتہ کیا تھا۔ کل رات کا کھانا بھی بھوک کے بغیر ہی کھا لیا تھا بلکہ ملیحہ کے انتقال کے بعد
سے ان کی بھوک پیاس مر ہی گئی تھی۔ اب وہ بھوک لگنے پر نہیں، گھڑی دیکھ کر کھانا کھاتے تھے اور صرف بھوک
ہی کیوں، ان کا تو ہر احساس مر گیا تھا بلکہ کبھی کبھی تو وہ محسوس کرنے لگتے کہ جیسے وہ بھی مر گئے ہیں۔ مگر وہ پھر

بھی جیسے جا رہے تھے۔ کھانے کا وقت ہوتا تو کھانا کھا لیتے، رات ہو جاتی تو آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ جاتے۔ نیند آئے نہ آئے، کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی کو خود پر فرض کیسے کرتے ہیں یہ تو نورالہدیٰ نے اب جانا تھا۔
''لگا دو۔'' کچھ توقف کے بعد انہوں نے یوں سوچ کر جواب دیا تھا جیسے بہادر نے کوئی مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔ وہ اُٹھ کر فریش ہونے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ فریش ہو کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ ڈائننگ رُوم میں چلے آئے۔ بہادر بڑی خاموشی سے کھانا لگا رہا تھا۔
''کیا بات ہے بہادر صاحب! آج کل کھانا کم کھا رہے ہیں؟'' وہ پہلے جیسی بشاشت سے بولے۔ بہادر نے ہاتھ روک کر اچنبھے سے انہیں دیکھ کر کہا۔
''نہیں تو۔''
''پھر تمہاری آواز کیوں کم نکلتی ہے؟ میں تو سمجھا تھا، توانائی کے اسراف سے پرہیز کر رہے ہو۔ ورنہ تمہارے بولنے کی رفتار سے تو ملیحہ جیسی کُول مائنڈڈ لڑکی بھی غصے میں آ جاتی تھی۔'' ملیحہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کا لہجہ سرسری سا تھا لیکن بہادر، ملیحہ کا نام سن کر ہی اُداس ہو گیا تھا۔
''اسی لئے تو بولتا تھا صاب! شرارت کرتا تھا ان سے۔ اور بی بی صاب بھی جانتی تھیں پھر بھی کبھی مذاق کرنے سے نہیں روکا۔ بہت اچھی تھیں وہ۔ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ پھر خیال آتا ہے، ہم تو نوکر ذات ہیں۔ کرنل صاحب کی تو بیٹی تھیں، وہ انہیں کتنا یاد کرتے ہوں گے۔ ہر وقت تو بی بی صاب کی تصویر دیکھ کر روتے رہتے ہیں۔ ملک صاب! اتنا سمجھاتے ہیں، صبر کرنے کو کہتے ہیں پر صبر بھی تو ایک دم سے نہیں آ جاتا۔ ایک ہی تو اولاد تھی ان کی، وہ بھی نہیں رہی۔ ان کے دل پر جو گزرتی ہوگی، وہ تو وہ ہی جانیں۔ اماں کہتی ہے اولاد کا دکھ قبر تک ساتھ جاتا ہے۔ اللہ ان کے حال پر رحم کرے۔'' اُس نے جھرجھری لی اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ اپنے آگے رکھے کھانے کو گھورتے نورالہدیٰ کے اندر کی بے چینی کو بہادر نے انجانے میں ہی ہوا دے دی تھی۔
''بہادر!''
''جی صاب!'' وہ برتن رکھ کر کچن میں جا رہا تھا، نورالہدیٰ نے اس کا نام پکارا تو پلٹ آیا۔
''بابا جان نے کھانا کھایا تھا؟''
''نہیں صاب! وہ تو صبح سے دروازہ بند کر کے بیٹھے ہیں۔ دروازہ بجانے پر بھی نہیں کھولا، کھانا کیا کھائیں گے۔''
ان کی بے چینی پریشانی میں بدل گئی۔
''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' اسے سرزنش کرتے نورالہدیٰ فوراً اُٹھ گئے لیکن بابا جان کے دروازے کے باہر کھڑے وہ دستک کے لئے ہاتھ نہیں اٹھا پائے۔ پیچھے ہٹتے ہوئے انہوں نے بہادر کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے آ کر دروازہ بجانے کے ساتھ ہی آواز لگائی۔

"دروازہ کھولیے کرنل صاحب!" مگر دروازہ کھلا، نہ ہی اندر سے کوئی آواز سنائی دی۔ اس نے پھر دستک دی۔ "دروازہ کھولیے۔"

اس بار بھی جواب نہیں آیا۔ نورالہدیٰ کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں۔

"بہادر! جاؤ اور کمرے کی چابی لے کر آؤ۔ فوراً۔"

وہ سر ہلا کر چابی لانے چلا گیا۔ نورالہدیٰ نے پریشانی میں ہی دروازے کے آگے دو تین چکر کاٹے پھر مضطرب ہو کر دروازہ بجا ڈالا۔

"بابا جان! دروازہ کھولیں۔"

ملیحہ کی ڈائری کو سینے سے لگائے، راکنگ چیئر پر نیم دراز بابا جان سکتے کی سی حالت میں آتش دان کے اوپر لگی ملیحہ کی تصویر کو دیکھتے جا رہے تھے۔ بہادر کے دروازہ بجانے اور پھر دروازہ کھولنے کے لئے کہتی ہوئی اس کی آواز کو سن کر بھی ان کے جسم میں کوئی ردِ عمل نہیں ہوا۔ کچھ پل کے وقفے سے دوبارہ دستک ہوئی، ساتھ نورالہدیٰ کی آواز بھی سنائی دی۔

'نورالہدیٰ' اُن کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ ملیحہ کی ڈائری کو سنبھال کر وہ تیزی سے اُٹھے اور دروازہ کھول دیا۔ ملیحہ کی موت کے بعد آج نورالہدیٰ دوسری بار ان کے دروازے تک آئے تھے۔ بابا جان ایسے ان کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے بیٹا پردیس سے لوٹا ہو۔

"آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ۔" اندر آنے کو کہتے ہوئے وہ انہیں راستہ دینے کے لئے سامنے سے ہٹ گئے۔ انہیں اپنی طرف بے تابی سے دیکھتا پا کر نورالہدیٰ کا دل بھی پگھلنے لگا تھا۔ انہیں اس کے سوا اور کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ نواب کے سائے سے محروم ہو گئے تھے مگر بابا جان نے ان کی زندگی میں اس محرومی کو نکلنے نہیں دیا۔ ان کا جی چاہا کہ بابا جان سے لپٹ جائیں کہ تبھی وہ نورالہدیٰ کو راستہ دینے کے لئے ان کے سامنے سے ہٹے تھے اور ملیحہ کی تصویر نورالہدیٰ کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ پل بھر میں ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ انہوں نے کمرے میں قدم نہیں رکھا، دروازے میں کھڑے کھڑے ہی انہوں نے نظروں کا زاویہ بدل کر بابا جان کو دیکھا۔ انہیں موت سے چند لمحے پہلے ملیحہ کی نم پلکوں کی لرزش یاد آ گئی تھی۔ بابا جان کی متورم آنکھوں پر اُنہیں رحم کیسے آتا۔

'اپنی اس حالت کے لئے یہ خود ہی ذمہ دار ہیں۔' بابا جان کے تھکے ہوئے پژمردہ وجود پر ایک نظر ڈال کر انہوں نے سوچا۔

"یہ کیا بچوں جیسی حرکت تھی؟" وہ بولے تو آواز میں وہ نرمی غائب تھی جو کبھی ان کے لہجے کی پہچان ہوا کرتی تھی۔

"کیا تم جانتے ہو نورالہدیٰ! کہ کسی مجرم کو سزا دینے سے پہلے اس کا منہ کالا کر کے چوراہے پر کیوں گھمایا

جاتا ہے؟'' ان کی بات سن کر بابا جان عجیب سے لہجے میں بولے تھے۔ کچھ پل وہ نورالہدیٰ کی طرف سے کسی استفسار کے منتظر رہے، پھر کہا۔ ''کیونکہ اپنے ماتھے پر اپنے جرم کی سیاہی لے کر لوگوں کا سامنا کرنا سزا پانے سے بھی کٹھن ہے۔''

''آپ کے پچھتاوے کسی چیز کا مداوا نہیں کر سکتے۔'' ان کی بات پر وہ تنفر سے بولے۔

''جانتا ہوں۔ اور یہی احساس تو پچھتاوے کو اور بھی گہرا کر دیتا ہے کہ میں چاہے جان دے ڈالوں، میری بیٹی کی جان واپس نہیں آئے گی۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولے پھر ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ''کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟''

نورالہدیٰ سرد لہجے میں بولے۔ ''میری معافی، ملیحہ کی معافی سے مشروط ہے۔ جائیے، جا کر اپنی بیٹی سے معافی مانگیں۔ اگر اُس نے معاف کر دیا تو میں بھی معاف کر دوں گا۔''

سر جھکائے بابا جان، بے بسی کی انتہا پر پہنچ گئے تھے۔

''ایک بات اور......'' اُنگلی اُٹھا کر نورالہدیٰ کہنے لگے۔ ''براہِ مہربانی آئندہ اس قسم کی حرکت کر کے مجھے پریشان مت کیجئے گا۔''

پھر اُن کا ردِعمل دیکھنے کے لئے وہ رُکے نہیں۔ ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ بابا جان کے کھنڈر ہوتے وجود کو ایک سیکنڈ بھی اور دیکھ پاتے۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ چپل اُتارے بغیر بیڈ پر گر گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو ان کی آنکھوں کے کونوں سے نکل کر کنپٹیوں پر بہتے، چادر میں جذب ہوتے گئے۔

محبتوں کا حُسن اسی صورت قائم رہتا ہے جب یہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک ہی سفر پر گامزن ہوں۔ لیکن اگر محبتیں آپس میں نبرد آزما ہو جائیں تو بڑی تباہی لاتی ہیں۔ انہی معرکوں نے ملیحہ کی زندگی تباہ کی تھی اور اب نورالہدیٰ کے درپے تھیں۔ محبت کا سحر ہو یا قہر، بچ پانا آسان نہیں۔

❁❁❁

مولوی عبدالخالق اُس خانماں برباد کے پاس سے اُٹھ تو آئے مگر دوبارہ اس کے پاس جانے سے خود کو روک نہ پائے۔ اُنہیں اُس میں عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی۔ اس کے لئے انہیں اپنے سینے میں ایک عجیب گداز محسوس ہوتا تھا۔ حالانکہ اُس کا انداز ہنوز وہی تھا۔ کبھی تو وہ مولوی عبدالخالق کو اس طرح نظر انداز کرتا جیسے ان کی موجودگی سے یکسر لاعلم ہو۔ کبھی جنون میں چلانے لگتا اور کبھی مغموم سا جانے کیا بڑبڑاتا رہتا۔ مولوی صاحب نے کبھی اُس کی کسی کیفیت میں دخل نہیں دیا۔ وہ ایک سامع کی حیثیت سے اس کے پاس آتے تھے اور اُس کی بے ربط باتوں کو بڑے دھیان سے سنتے جیسے وہ کوئی اہم بیان دے رہا ہو۔ اور اگر اس کا ایک بھی پوائنٹ مس ہو گیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ پھر تنہائی میں بیٹھ کر اُس کی باتوں کو سوچتے ہوئے اُلجھنے لگتے۔ اُس کے ذہن میں پڑی گرہ کو کھولنے کے لئے کوئی سرا ہاتھ آتا دکھائی نہیں دیتا تھا مگر وہ صبر کے ساتھ بڑھتے

برعکس انداز میں اپنی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔

"تو پھر آ گیا؟" اُس نے مولوی عبدالخالق کو دیکھا تو گھورا۔ لہجہ ایسا تھا، جیسے کہہ رہا ہو۔ 'بڑا ڈھیٹ ہے۔'
مولوی عبدالخالق اُس کے لہجے کو محسوس کر کے مسکرائے۔

"کیا کریں۔ دل لگ گیا ہے تیرے ساتھ۔ جب تک دو گھڑی تیرے پاس نہ بیٹھ جاؤں، چین ہی نہیں آتا۔" صاف لگ رہا تھا، وہ اُس کی جھنجلاتی شکل دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہیں۔ اُس نے تپ کر رخ پھیر لیا تو مولوی صاحب بدستور مسکراتے ہوئے بولے۔

"بلکہ مجھے تو لگتا ہے، تیرا بھی دل لگ گیا ہے۔ کہاں تو تُو صحرا نوردی کو نکلا تھا اور اب چار مہینے ہو گئے ہیں یہاں سے ہلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔"

"میں دل لگا کر نہیں، تھک کر یہاں بیٹھا ہوں۔" اُس کے لہجے میں درد بولنے لگا تھا۔ "سکون کی تلاش میں ذرّہ ذرّہ چھان مارا مگر وہ تو جیسے کائنات میں ناپید ہو گیا ہے۔ پھر تلاش کا کیا فائدہ جب سکون ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔"

"جو چیز ڈھونڈنے سے نہ ملے، مانگ لینی چاہئے۔" ایک مہرہ جوان کے ہاتھ آیا تو مولوی عبدالخالق نے بساط بچھانے میں دیر نہیں کی۔

"کس سے مانگوں......؟" اس نے پوچھا۔ ساتھ ہی ان کے متوقع جواب کو سوچ کر اس کی تیوریاں بھی چڑھ گئیں۔

"اللہ سے۔" اُن کے لہجے میں سکون تھا۔ اُس کی آنکھیں آگ اُگلنے لگیں۔

"جو مانگا، وہ دیا نہیں۔ اب اور کیا مانگوں؟" اس نے بپھر کر کہا پھر کرب سے آنکھیں میچ کر سر پیچھے درخت کے تنے سے لگا دیا۔ "پر میں تو اس پر بھی راضی تھا۔ کوئی شکایت نہیں کی۔ ہاں مگر دونوں ہاتھ اٹھا کر سکون مانگا تھا۔ وہ بھی اپنے لئے نہیں، ان کے لئے۔ پر اس نے کیا، کیا؟" اس نے تڑپ کر آنکھیں کھولتے ہوئے گردن سینے تک لٹکائی اور سر کو دائیں بائیں جھٹکنے لگا۔ ایسے میں اس کے ناتراشیدہ بال عجیب سے انداز میں اس کے چہرے کو ڈھکے شانوں پر جھولنے لگے تھے۔ "اب کبھی کچھ نہیں مانگوں گا۔" وہ بڑبڑایا پھر جھٹکے سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتا ہوا دھاڑنے لگا۔ "تُو سن رہا ہے؟......نہیں آؤں گا تیرے در پر۔ تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ مجھے تجھ سے کچھ چاہئے بھی نہیں۔ میرا کوئی ناتا نہیں تجھ سے۔"

مولوی عبدالخالق کو اُس پر ترس آنے لگا تھا۔ "او جھلّیا! حکیم سے تو دشمنی کر لی تُو نے، اب تیرے زخم کیسے بھریں گے؟"

مگر وہ اُن کی طرف سے غافل ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔

"اب چلتا ہوں۔ اور دیکھ یہ کھانا رکھا ہے۔ جی کرے تو کھا لینا۔ پر خبردار جو تُو نے اُٹھا کر پھینکا۔ رزق کی

بے ادبی ہوتی ہے۔'' سائیڈ میں رکھی ٹرے کی طرف اشارہ کر کے وہ جس طرح سے بولے تھے، لگ رہا تھا سائیں نے یہ کام کئی بار کیا ہے۔ ایک آخری نظر اُس کے جھکے سر پر ڈال کر وہ اُٹھ گئے۔ پر دوسرے ہی قدم پر انہوں نے ٹرے کو اُٹھا کر پٹخنے کی آواز سنی۔ مولوی عبدالخالق نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ چہرے پر سختی لئے کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہا تھا اور اس کے سامنے ٹرے کھانے سمیت اُلٹی پڑی تھی۔ انہوں نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر ٹرے سیدھی کر کے وہ جتنا کھانا اُٹھا سکتے تھے، اُٹھا کر ٹرے میں ڈالا۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر لڑھکے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے اور ناراضی سے بولے۔

''یہی کام کرنا ہوتا ہے تو کل سے کھانا نہیں لاؤں گا۔ رہ بھوکا۔'' وہ خفا خفا سے اُٹھ کر چل پڑے۔ لیکن اگلے دن وہ اپنے ساتھ کھانا لانا نہیں بھولے تھے۔

✿✿✿

ملک کے ایک نامور اور با اثر بزنس مین، اقبال یزدانی کی طرف سے پی سی کے لاؤنج میں زبردست ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں شرکت کے لئے موصول ہونے والے دعوت ناموں کو شہر کے چوٹی کے بزنس مین اور پولیٹیشن اپنے لئے اعزاز سمجھ رہے تھے۔ اور کون نہیں جانتا کہ ایلیٹ کلاس کے ڈنرز اور پارٹیز موقع کی مناسبت سے نہیں بلکہ موقع کی تلاش میں دی جاتی ہیں۔

نورالہدیٰ کو موقع کی تو نہیں مگر مصروفیت کی تلاش اب اکثر رہا کرتی تھی اور آج تو وجہ بھی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اہتمام سے تیار ہوئے، وقت پر ہی پہنچ گئے۔ مگر وی آئی پیز کی آمد تو تاخیر سے ہوا کرتی ہے۔ اقبال یزدانی، نورالہدیٰ کی ٹیبل پر بیٹھے حسبِ عادت پھلجھڑیاں چھوڑ رہے تھے۔ نورالہدیٰ واقعی ان کی باتوں کو انجوائے کر رہے تھے کہ چیمبر آف کامرس کے صدر کی آمد کا شور اُٹھا اور وہ انہیں ویلکم کرنے کے لئے اُٹھ گئے۔

''ارے وہ نورالہدیٰ فاروقی ہے نا؟ بھلا یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' نوید اختر کی نظر کریم کلر کے سوٹ میں ملبوس نورالہدیٰ پر پڑی تو ساتھ بیٹھے اقبال یزدانی سے بولے۔ انہوں نے کہا۔

''کمال کرتے ہیں نوید صاحب! ہم نے بلایا ہے تو یہاں نظر آ رہا ہے۔''

''کمال تو آپ نے کیا ہے یزدانی صاحب! یہ لڑکا جسے بزنس فیلڈ میں آئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے، آپ اسے پرسنلی انوائٹ کر رہے ہیں۔'' ان کے لہجے میں نورالہدیٰ کی تحقیر کے ساتھ ساتھ اقبال یزدانی کے لئے طنز بھی تھا جسے محسوس کر کے بھی انہوں نے برا نہیں مانا بلکہ ہنس کر بولے۔

''یہی سوچئے نوید صاحب! اگر ہم نے بلایا ہے تو اس لڑکے میں کچھ خاص بھی ہوگا۔''

''کیا خاص ہو سکتا ہے اس کل کے بچے میں؟'' وہ بدستور طنز کر رہے تھے۔

''خاصیت کی بات کی آپ نے تو کیا یہ خاصیت کم ہے کہ چیمبر آف کامرس کا صدر اسے اس کے نام سے جانتا ہے۔'' وہ اپنے شگفتگی بھرے انداز میں ان کے طنز کا جواب دے کر بولے تھے اور اس برجستگی پر اپنا

دار قہقہہ گونجا تھا۔ ساتھ والے ٹیبل پر بیٹھی لڑکیاں جو باآسانی اس گفتگو سے مستفید ہو رہی تھیں، وہ بھی ان کے جملے پر مسکرانے لگیں۔

"اقبال انکل تو نورالہدیٰ سے بڑے امپریسڈ لگ رہے ہیں۔" ایک نے مسکراہٹ روک کر تبصرہ کیا تو دوسری بولی۔

"صرف اقبال انکل ہی کیوں؟ اقبال انکل کی بیٹی بھی نورالہدیٰ فاروقی سے کافی متاثر ہے۔ کیوں مریم؟" شرارت سے کہتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی لڑکی کو ٹہوکا دیا جس کی نظریں مستقل نورالہدیٰ پر جمی تھیں۔ اپنی فرینڈز کی بات پر مسکراتے ہوئے اس نے کافی کا گھونٹ بھرا پھر کپ نیچے رکھ کر دوبارہ نورالہدیٰ کو دیکھنے لگی تو لیو اونگ گاؤن میں ملبوس لڑکی مصنوعی فکرمندی سے بولی۔

"کنٹرول یور سیلف مریم! تم کہاں اس زاہد خشک کے چکر میں پڑ رہی ہو جو کسی کو بھاؤ ہی نہیں دیتا۔ ویسے بھی سنا ہے، موصوف لینڈ لارڈ ہیں اور یہ زمیندار قسم کے لوگ ذرا ٹیڑھی کھیر ہوتے ہیں۔"

"میں بھی یہ سوچ رہی ہوں کہ یہ شخص مجھے اس طرح سے اپنی طرف اٹریکٹ کیوں کر رہا ہے۔ شاید پاس جاؤں تو کچھ پتہ چلے۔" پُرسوچ انداز میں کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تو اسی لڑکی نے اس کا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

اُس نے ایک ادا سے شانوں سے ذرا نیچے لٹکتے بے حد سیاہ بالوں کو جھٹک کر کہا۔ "نورالہدیٰ کے پاس۔" پھر چنچل سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا بازو چھڑا کر اسی ہاتھ سے اس کا گال تھپکتی ہائی ہیل سے "کھٹ کھٹ" کا شور بجاتی نورالہدیٰ کے ٹیبل کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی پھر بڑے دل آویز انداز میں نورالہدیٰ کو مخاطب کر کے کہا۔

"گڈ ایوننگ مسٹر فاروقی!"

نورالہدیٰ اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں سے باتوں میں مصروف تھے، وہ چونک گئے۔ وہ سیاہ آنکھوں میں شوخی لئے زیرِ لب مسکراتی اپنا دایاں ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔ نورالہدیٰ نے بیٹھے بیٹھے ہی اُسے "گڈ ایوننگ" کہا اور اس کا کومل سا ہاتھ پل بھر کو تھام کر چھوڑ دیا۔

"آئی ایم مریم یزدانی۔ ڈاٹر آف اقبال یزدانی۔" وہ خود ہی اپنا تعارف کروانے لگی تو نورالہدیٰ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"مجھے بھی خوشی ہوئی نورالہدیٰ!" وہ ایک دم ہی "مسٹر فاروقی" سے "نورالہدیٰ" پر آ گئی پھر بے تکلفی سے کہا۔ "کیا ہم کچھ دیر بات کر سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے ہم اس وقت بھی بات ہی کر رہے ہیں۔"

اُن کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''مجھے حاضر جواب لوگ پسند ہیں۔''

نورالہدیٰ نے اُس کے dominating style کو محسوس تو کیا مگر وہ ان کے میزبان کی بیٹی تھی لہٰ
لحاظ سے خود بھی میزبان تھی اور نورالہدیٰ اس وقت اُس کے مہمان۔ اُنہیں منع کرنا اچھا نہیں لگا تو اُ
کے ساتھ ساتھ چلتے باہر کھلی فضا میں چلے آئے۔

''ہاں تو اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔'' چلتے ہوئے وہ ان کے سامنے آکر کھڑی ہوئی اور اس طر
جیسے ان پر اپنی موجودگی کو جتا رہی ہو جو اس کے ساتھ چلتے ہوئے بھی اس سے بے نیاز لگ ر
نورالہدیٰ اُسے دیکھ کر مسکرائے۔

''نام تو آپ جانتی ہی ہیں۔ اور کیا بتاؤں؟''

''نام سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ اس لئے جو دل کرتا ہے، بتا دیجئے۔''

''نام سے زیادہ جان کر آپ کیا کریں گی؟'' وہ گریزاں ہوئے۔

''جان پہچان بڑھاؤں گی۔'' مریم کی بات پر نورالہدیٰ نے اس کی طرف دیکھا اور اندازہ لگا
اس نے بے ساختگی میں یہ بات کہی ہے یا وہ بے باکی کی حد تک صاف گو ہے اور وہ ان کی سوچوں
نیاز کہتی جا رہی تھی ''اینی وے، آپ اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی۔ کم از کم میرے بار
کچھ پوچھ سکتے ہیں۔''

''بتایئے۔'' اُس کے اصرار پر نورالہدیٰ نے کہا اور وہ بتانے لگی۔

''تھوڑی سی ضدی ہوں، تھوڑی سی موڈی۔ اور ہاں، بزنس سے مجھے ذرا دلچسپی نہیں ہے۔ مگر پاپا
پر میں نے بھی ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا ہے۔''

وہ بولے جا رہی تھی اور نورالہدیٰ کو اس کی بولڈنیس اچھی تو لگی تھی مگر وہ اس کا مقصد سمجھ کر اند
ہوشیار ہو گئے تھے۔ لندن کی آزاد فضاؤں میں رہتے ہوئے انہیں اس طرح کی تیزی طراری کا کئی با
چکا تھا اور وہ اس طرح کی بولڈ لڑکیوں سے جان چھڑانے میں ماہر ہو چکے تھے۔ وہ کوئی فرشتہ صفت
نہیں تھے ہاں مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ اس طرح کی فضولیات سے ہمیشہ بچتے ہی رہے تھے۔ وجہ صرف ا
کوئی ان کے دل تک پہنچ نہیں پائی۔ اور جو پہنچی، اس نے محبت کو ان کے لئے اس طرح عبادت
نورالہدیٰ اُسے پانے کی خواہش بھی نہ کر سکے۔

''آپ سے بات کر کے اچھا لگا۔ لیکن اب اجازت دیجئے۔ مجھے جانا ہو گا۔'' نورالہدیٰ نے اس
چھڑانا چاہی۔ ادھر وہ سمجھ کر بھی حیران ہو کر بولی۔

''ایکسکیوز می۔ آپ کو یہاں ڈنر پر بلایا گیا ہے اور آپ ڈنر کئے بغیر جانا چاہتے ہیں۔''

"مجبوری ہے۔ مجھے ایک بے حد ضروری کام سے جانا ہے۔" روانی سے جھوٹ بولتے ہوئے انہیں وہ لڑکی یاد آ گئی جس کے لئے انہوں نے جھوٹ بولنا سیکھا تھا۔ اور ان کے چہرے پر یاسیت اُبھر آئی جسے محسوس کر کے مریم نے رُکنے پر اصرار تو نہیں کیا مگر اگلی ملاقات طے کرنے سے خود کو روک نہیں پائی۔

"دس دن بعد نیو ایئر نائٹ ہے۔ تو ہم نیو ایئر نائٹ میں مل رہے ہیں۔ ڈن؟" کہہ کر اس نے وعدہ لینے کے لئے اپنا دایاں ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ نور الہدیٰ نے اسے دیکھا پھر اس کا ہاتھ تھام کر بولے

"بائے!" پھر فوراً ہی اُس کا ہاتھ چھوڑ کر پلٹے اور اندر جا کر کسی کو اپنے جانے کی اطلاع دیئے بغیر وہ پارکنگ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ مریم حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُنہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُسے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ اتنے آرام سے اُس کی انسلٹ کر کے جا چکے ہیں۔ پھر ایک دم ہی اُسے نور الہدیٰ پر غصہ آیا اور پیر پٹخ کر اندر چلی گئی۔

✿✿✿

سرد اور تاریک رات اس ویرانے میں اُتر چکی تھی۔ سیاہ رنگ آسمان پر نہ چاند چمک رہا تھا، نہ تارے ٹمٹما رہے تھے۔ پھر چاند تاروں کو دیکھنے کے لئے وہاں تھا بھی کون؟ خلقت سو چکی تھی اور جو جاگ رہا تھا، وہ بند آنکھوں کے پیچھے جہان آباد کئے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا کہ جیپ کے انجن کی آواز اس سناٹے میں غراہٹ کی طرح اُبھری تھی۔ پھر لحہ لحہ قریب آتی آواز تیز ہوتی گئی۔ پھر یوں لگا جیسے پل بھر کو جیپ رُکی ہو۔ مگر اس کا انجن اب بھی غرّا رہا تھا۔ دروازہ کھول کر کوئی اُترا، پھر چند سیکنڈ بعد ہی دوڑتا ہوا واپس جیپ میں بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ جیپ ہوا کے ساتھ اُڑتی دُور نکل گئی۔ مگر سائیں کے استغراق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پھر ایک باریک سی آواز سنائی دی۔ اتنی باریک کہ اگر سناٹا اتنا دبیز نہ ہوتا تو شاید سنائی نہ دیتی۔ پل بھر کو وہ آواز معدوم ہو گئی، مگر کچھ سیکنڈ بعد دوبارہ سنائی دینے لگی اور پھر چپ ہو گئی۔ اس کے بعد دوبارہ اُبھری اور مستقل آنے لگی۔

سائیں نے پٹ سے آنکھیں کھول کر دیکھا اور سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، لیکن اس اندھیرے میں بھلا کیا نظر آتا؟ آخر آواز کی سمت کا تعین کر کے وہ اُٹھا اور ایک طرف کو چلنے لگا۔ اب آواز صاف اور واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ چلتا ہوا اس جگہ آ پہنچا جہاں خودرو جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے اُس نے جھاڑیوں کے گرد چکر کاٹا، مگر آواز کا ماخذ دکھائی نہیں دیا تو وہ جھاڑیوں سے آگے کی طرف چلنے لگا۔ کچھ قدم آگے جا کر لگا کہ اب آواز پیچھے سے آ رہی ہے۔ وہ واپس جھاڑیوں کے پاس آ گیا اور پیروں پر بیٹھتے، ہاتھ سے ٹٹول کر "آواز" کو تلاش کرنے لگا۔ زمین پر ہاتھ پھیر کر دیکھتے ہوئے اس نے یوں ہی جھاڑیوں کے اندر ہاتھ ڈالا تو ہاتھ میں کپڑا آ گیا۔ وہ حیران ہو کر کپڑے کو ٹٹولنے لگا۔ تبھی اس کا ہاتھ کسی نرم و ملائم چیز سے ٹکرایا تھا۔ وہ ٹھٹکا، پھر دوسرا ہاتھ بھی اندر جھاڑیوں میں ڈال کر ننھی سا شور مچاتی کپڑے میں

لپٹی اس چیز کو احتیاط سے باہر نکال لیا۔ باہر نکال کر جو دیکھا تو اندھیرے میں نظر آتے اس کے خدوخال کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔ پھر جو گھبرا کر ٹٹولا تو اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

وہ ایک بچہ تھا..... کسی کتے، بلی کا نہیں، انسان کا بچہ۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اور تمام مخلوقات میں بس اسے ہی یہ شرف حاصل ہے کہ جگر کے ٹکڑے کو گوشت کے لوتھڑے کی طرح گدھ اور چیل، کووں کی خوراک بننے کے لئے ویرانوں میں پھینک آتا ہے۔ وہ ہکا بکا اسے گود میں لئے بیٹھا تھا۔ صحیح الدماغ ماں نو ماہ پیٹ میں رکھ کر جنم دینے کے بعد اسے مرنے کے لئے کانٹوں کے مقبرے میں لا پھینکا تھا۔ مگر اس پاگل میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کول وجود کو کھردری زمین پر لٹا دے۔ اسے سینے سے چمٹائے وہ اپنے ٹھکانے لوٹ آیا۔ دماغ تو ایک مدت سے ماؤف ہو چکا تھا اور ہستی کھنڈر بن گئی تھی، لیکن چھاتی پر ہلچل مچاتے ننھے ہاتھوں اور پیروں کی حرکت نے اس کھنڈر کو بھی زیروزبر کر دیا۔ اس نے سر کو جھکا کر اندھیرے کی نقاب اوڑھے اس معصوم چہرے کو دیکھا، جس کا رونا اب اسے بے چین کر رہا تھا۔

'یہ اتنا کیوں رو رہا ہے؟' ایک عرصے سے بند پڑی دماغ کی مشین کے کل پرزوں پر سے گرد جھاڑ کر اس نے انہیں کام پر لگا دیا۔ 'کہیں اسے ٹھنڈ تو نہیں لگ رہی؟..... سردی بھی تو کتنی زیادہ ہے۔' طویل مدت کی بے حسی میں جیتے ہوئے اچانک ہی اُس کے احساسات بیدار ہو گئے اور وہ ہوا میں پھیلی خنکی کو محسوس کرنے لگا جس سے وہ کچھ دیر پہلے تک بے خبر تھا۔ اُس نے اس ہلکے سے تولیے کو بچے کے گرد اور بھی کسا، جس میں وہ لپٹا ہوا تھا۔ پر اسے وہ ناکافی محسوس ہوا تو اپنی شرٹ اُتار کر اچھی طرح اس کے گرد پھیلانے لگا، جس کی حالت اتنی خستہ ہو چکی تھی کہ اُتارنے کے لئے بٹن کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پھر اُسے بانہوں میں سمیٹ کر سینے میں چھپاتے ہوئے اس نے اپنے گھٹنوں کو موڑ کر اس طرح خود کو گٹھڑی بنا لیا کہ محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی گود میں بچہ ہے۔ اس حالت میں اُسے کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ سردی کی شدت کو کم کرنے کے لئے خود میں سمٹ کر بیٹھا ہے۔ سردی بہت زیادہ سہی پر اس کا خیال تھا کہ اس کے جسم کی گرمی سے بچے کو راحت تو مل جائے گی کہ رونا بند کر دے گا۔ مگر وہ روتا ہی رہا۔

'ہو سکتا ہے اسے بھوک لگ رہی ہو۔' وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا، مگر چند منٹ یا شاید گھنٹہ بھر پہلے پیدا ہونے والے بچے کے جسم پر چپچپاہٹ کو محسوس کر کے اندازہ لگا چکا تھا کہ پیدائش کے بعد اسے غسل نہیں دیا گیا۔ 'جس ماں نے ایک لوٹا پانی بہانے کی زحمت نہیں کی، اس نے کہاں بچے کے حلق میں دودھ اُتارا ہو گا۔' اُس نے سوچتے ہوئے اپنے خیال کی تائید کی۔ 'ہاں..... اسے بھوک ہی لگی ہے۔' وہ پریشان ہو گیا۔ 'لیکن اس کے لئے دودھ کہاں سے لاؤں؟' دماغ کی مشین تو اب چل ہی پڑی تھی، اسے ایک راستہ بھی سوجھ گیا۔

مولوی عبدالخالق موٹی سی رضائی اوڑھے آرام سے سو رہے تھے کہ کسی نے زور سے ان کے گھر کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میٹھی نیند سے جاگنے میں کچھ وقت لگ گیا تھا۔

"اتنی رات کو کون آیا ہے؟" ملانی جی بھی جاگ گئی تھیں، بستر پر اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔
"جا کر دیکھتا ہوں۔" چارپائی پر بیٹھے انہوں نے چپل پیر میں اڑستے ہوئے کہا، پھر لالٹین اٹھا کر کمرے کا دروازہ کھولتے صحن میں نکل آئے۔

"ہاں بھائی! آ رہا ہوں۔" انہوں نے اونچی آواز میں بول کر تواتر سے دروازہ پیٹنے والے کو اپنی آمد کی اطلاع کی، جس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا اور دروازہ اس وقت تک بجتا رہا جب تک کہ انہوں نے کھول نہیں دیا۔
"او توں ایں؟" لالٹین کی روشنی میں آنے والے کا چہرہ دیکھ کر وہ حیرت سے بولے، پھر اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر کرتے ہوئے بولے۔ "چل اندر آ جا۔" وہ دروازے کے کنڈے میں زنجیر اٹکا کر پلٹے تو وہ ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ "او جھلیا! اِدھر کیوں کھڑا ہے؟ کمرے میں آ جا۔ بڑی ٹھنڈ ہے۔"
پھر اُسے ساتھ لئے کمرے میں چلے آئے۔ جس کا اوپری دھڑ برہنہ تھا اور ایک پوٹلی سی اس نے بازوؤں میں چھپا رکھی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے اپنے بازو ڈھیلے کیے تو بچے کی جھلک دیکھ کر چارپائی کے سرہانے سے اپنا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھتی ملانی جی کے ہاتھ رُک گئے۔
"یہ کس کا بچہ اُٹھا لایا ہے؟"
"انسان کا۔" اُس نے متانت سے اطلاع دی۔
"پر تجھے کہاں سے مل گیا؟" مولوی صاحب کی حالت بھی ملانی جی سے مختلف نہیں تھی۔
"جھاڑیوں میں سے۔"

"سبحان اللہ!" مولوی صاحب ایسے لہجے میں بولے جیسے یقین نہ آیا ہو۔
"اسے بھوک لگی ہے۔" وہ ان کی کیفیتوں کی پروا کیے بغیر بچے کی طرف اشارہ کر کے بولا جو بھوک سے اندر نڈھال ہو چکا تھا کہ اب رو بھی نہیں پا رہا تھا۔ مولوی صاحب اب بھی پریشان تھے، مگر بچے کی بھوک کا احساس کر کے بولے۔
"ہاجرہ اُٹھ! دودھ لے کر آ۔"
"پر مولوی صاحب! اس سے یہ تو پوچھ لیں کہ کس کا بچہ اُٹھا لایا ہے؟"
"وہ بھی پتہ چل جائے گا۔ تُو دودھ تو لے آ۔"
پر وہ اُٹھی نہیں۔ ان کی نظر بچے پر جمی تھی، جسے گود میں لئے سائیں چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔
"اس کا تو ابھی غسل بھی نہیں ہوا۔" ملانی جی کی بات پر مولوی عبدالخالق کا دھیان بچے کی حالت پر گیا اور معاملے کی تہ تک پہنچ گئے۔ پھر جب وہ بولے تو ان کے لہجے میں کچھ دیر پہلے والا ہیجان نہیں تھا۔
"پھر پہلے اس کے غسل کا انتظام کر، پھر اس کی بھوک کا بندوبست کرتے ہیں۔" اپنی بات کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل آئے اور باورچی خانے سے بھگونا اُٹھا کر صحن میں لگے ہینڈ پمپ کے نیچے رکھا اور ہینڈ پمپ چلا کر

دیگچہ پانی سے بھرنے کے بعد اُٹھا کر باورچی خانے میں چلے آئے جہاں ملانی جی مٹی کے چولہے میں آ
چکی تھیں۔ بھگونا چولہے پر رکھ کر وہ پھر صحن میں آ گئے اور بالٹی میں ہینڈ پمپ سے پانی بھرنے لگے۔ بالٹی
بھر گئی تو انہوں نے ہینڈ پمپ چلانا بند کر دیا اور باورچی خانے میں آ کر بیٹھ گئے۔ پھر چولہے پر رکھا پانی
چکا تو کپڑے سے پکڑ کر بھگونا اُٹھایا۔ وہ صحن میں آ گئے اور دیگچے کا گرم پانی بالٹی کے ٹھنڈے پانی سے
کے نیم گرم پانی تیار کرنے لگے۔ اُدھر ملانی جی چولہا بجھا کر کمرے میں آ گئیں۔

''لا بچے کو نہلا دوں۔'' وہ بچے کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولیں۔ سائیں نے انہیں دیکھا، پھر بچہ انہیں
کے بجائے گود میں لئے باہر آ گیا۔ ہینڈ پمپ کے پاس ہی کپڑے اور برتن دھونے کے لئے جگہ مخصوص
وہاں رکھی چوکی پر آ بیٹھا اور بچے کو ران پر لٹا کر رگڑ رگڑ کے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ دھونے لگا۔ ملانی
گئیں، وہ بچہ اُنہیں نہیں دے گا، اس لئے انہوں نے دوبارہ اس سے بچہ نہیں مانگا اور چوکی اٹھا کر ا
پاس آ بیٹھیں جواب بچے کے گرد لپٹے کپڑے ہٹا رہا تھا۔ پھر اس نے دونوں پاؤں جوڑ کر بچے کو پیروں
لیا۔ ملانی جی بالٹی میں سے پانی کے مگ بھر بھر کر بچے پر انڈیلنے لگیں اور وہ ایک ہاتھ سے بچے کو
دوسرے ہاتھ سے اس کے جسم کو نرمی سے صاف کرنے لگا۔ بچہ ٹھنڈ اور پانی سے پریشان ہو کر رونے لگا
وہ دونوں پورے اطمینان سے اسے غسل دیتے رہے۔ جب وہ پاک ہو چکا تو مولوی صاحب نے ا
تولیہ سائیں کے ہاتھوں میں پکڑا دیا، جس میں بچے کو لپیٹ کر وہ کمرے میں آ گیا۔ ملانی جی اور مولوی
کمرے میں آئے تو وہ بچے کو تولیے سمیت چارپائی پر لٹائے اس کے جسم کو خشک کر رہا تھا۔

''اب اس کے لئے کپڑے کہاں سے لاؤں؟'' ملانی جی بولیں تو مولوی عبدالخالق نے کہا۔

''سورج تو نکلنے دے، اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔''

''پھر ایسا کرتی ہوں، گرم چادر نکال لیتی ہوں۔ ابھی اس میں لپیٹ لیتے ہیں۔'' بولتی ہوئی وہ صند
سے گرم چادر نکالنے لگیں۔ پھر جب بچے کو گرم چادر میں لپیٹ چکے تو مولوی صاحب، سائیں سے بو

''لا، بچہ مجھے دے دے۔''

اس نے کچھ کہا تو نہیں، مگر بچے کو سینے میں بھینچ لیا۔ مولوی عبدالخالق متبسم لہجے میں بولے۔

''اس کے کان میں اذان دینی ہے۔ یا پھر تو اذان دیدے۔'' اُس نے اُن کی بات سنی اور پھر
بچہ اُنہیں دے دیا۔ ملانی جی دودھ گرم کرنے چلی گئیں اور مولوی صاحب بچے کے کان میں ذات
کبریائی بیان کرتے ہوئے اذان کے الفاظ اُس کی سماعتوں میں انڈیلنے لگے۔ اذان کی ادائیگی کے
نے بچہ اس کی گود میں ڈالا تو اُس کی بے چینی کو محسوس کر کے مسکرانے لگے۔ ملانی جی دودھ گرم کر لا
انہوں نے بچے کو دودھ پلانے کی پیشکش نہیں کی، بلکہ چھوٹے ٹیبل پر دودھ کا پیالہ اس کے سامنے
اسے تو بچے کو چمچے سے دودھ پلانا مشکل لگ رہا تھا، وہ اور بھی رونے لگا۔ آخر کئی بار کی ناکام کوشش

بچے کے حلق میں دودھ کے چند قطرے چلے ہی گئے۔ پتہ نہیں پھر اس کا پیٹ بھرا کہ نہیں، مگر زیادہ دودھ گرا کر اور تھوڑا سا پی کر وہ کچھ دیر بعد سو گیا تھا۔ وہ سوئے ہوئے بچے کو گود میں لے کر بیٹھا رہا۔ پھر جب لگا کہ وہ گہری نیند میں چلا گیا ہے تو بہت آہستگی سے اُسے بستر پر لٹا کر اُٹھ گیا۔ شرٹ وہ پہلے ہی پہن چکا تھا، پھر کسی طرف دیکھے بغیر چلتا ہوا گھر سے چلا گیا۔ مولوی صاحب دروازہ بند کر کے اندر آئے تو ملّانی جی بستر پر بچے کے پاس بیٹھی دھیرے دھیرے اُسے تھپک رہی تھیں۔ مولوی صاحب دوسری طرف سے چارپائی پر بیٹھ کر بچے کو دیکھنے لگے جو بڑے معصوم انداز میں سو رہا تھا۔

"میں تو پریشان ہوگئی ہوں مولوی صاحب! پتہ نہیں کس کا بچہ ہے اور اسے کہاں سے مل گیا۔"

"بتا تو رہا تھا کہ جھاڑیوں سے ملا ہے۔" وہ چپل اُتار کر پاؤں اوپر اٹھا کر آرام سے بیٹھے اور رضائی اپنے اوپر پھیلاتے ہوئے لاپرواہی سے بولے۔ ملّانی جی کو ان کا انداز ذرا نہ بھایا۔

"جھاڑیوں سے ملا ہے؟" انہوں نے منہ بنایا۔ "بھلا بچے جھاڑیوں میں اُگا کرتے ہیں؟ ایسا ہوتا نا مولوی صاحب! تو دنیا میں کوئی بھی بے اولاد نہ رہتا۔ میں آپ جھاڑیوں سے دو چار بچے اُٹھا لاتی۔ اس پاگل نے ایک بات کیا کہہ دی، آپ تو ایمان لے آئے۔"

"تم اب بھی اسے پاگل کہہ رہی ہو؟" ان کا اشارہ کچھ دیر پہلے کے اُس کے روّیے کی طرف تھا۔ ملّانی جی بھی ایک پل کو خاموش ہوگئیں، پھر عاجزی سے بولیں۔

"میں تو وہی کہہ رہی ہوں جو نظر آتا ہے۔ پھر اس کی بات پر واقعی دل نہیں ٹھہرتا۔ کوئی بھلا کیوں اپنا بچہ جھاڑیوں میں پھینکے گا؟ چلیں لڑکی ہوتی تب بھی مان لیتے کہ چودہ سو سال پہلے کی جہالت ابھی بھی ختم نہیں ہوئی۔ مگر یہ تو لڑکا ہے۔"

"تُو بہت بھولی ہے ہاجرہ! اور میں کوئی برا قیاس کرنا نہیں چاہتا۔ پر اتنا سمجھ لے، جس عورت نے بچہ گود سے نکال پھینکا، وہ اس پر دعویٰ نہیں کرے گی۔ کر سکتی ہی نہیں۔ اور جو دعویٰ کرتی ہو، وہ اپنا بچہ خود سے جدا نہیں کرے گی۔ اب اور کیا کہوں؟ تُو یہ بات ذہن سے نکال دے کہ اس کی ماں دُکھ میں ہوگی۔ اس نے کسی سکھ کی خاطر ہی اپنی اولاد خود سے دُور کی ہوگی۔ اور بس اب اس بارے میں کوئی بات نہ کرنا کہ بات سچ ہوئی تو غیبت ہے۔ جھوٹ ہوئی تو بہتان اور گناہ دونوں صورتوں میں ہے۔ خود کو سمجھا لے کہ اس کا رزق اس گھر میں لکھا تھا اور یہ اپنا حصہ لینے آیا ہے، اللہ کے کام حکمت سے خالی نہیں ہوتے۔ اسے یہاں بھیجا ہے تو اس میں بھی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ اس کے کھیل وہی جانے۔" تہجد کا وقت ہو چکا تھا، اپنی بات ختم کر کے مولوی عبدالخالق وضو کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مسجد سے نکل کر مولوی عبدالخالق تسبیح کے دانے گراتے گھر کی طرف جا رہے تھے، ملّانی جی کو جو دروازے پر کھڑے دیکھا تو ٹھٹک کر رُک گئے۔ انہیں یاد نہیں آیا کہ پچیس سالہ ازدواجی زندگی میں کبھی ملّانی جی نے

دروازے پر کھڑے ہو کر ان کا انتظار کیا ہو۔ حیران ہوتے وہ ان کے پاس چلے آئے اور ان کے اُلجھن بھرے چہرے پر نظر ڈال کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''وہ آیا ہوا ہے۔'' ملانی جی پریشانی سے گویا ہوئیں۔

''کون؟'' بولتے ہوئے مولوی صاحب نے ان کے اوپر سے اندر گھر میں نظر ڈالی، پھر انہیں سائیڈ میں کر کے گھر کے اندر چلے آئے۔

خالی صحن کو دیکھتے ہوئے بیٹھک میں آ گئے۔ بچہ جاگ چکا تھا اور سائیں اسے گود میں لئے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ حالانکہ وہ یک ٹک بچے کو دیکھ رہا تھا، لیکن اُس کی آنکھیں دلچسپی سے خالی تھیں اور نہ ہی وہ بچے سے کھیل رہا تھا۔ مگر بچے کو اس کی موجودگی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ کبھی اپنے چھوٹے چھوٹے نرم ہاتھ اس کے سینے پر مارتا اور کبھی اس کی داڑھی میں اُلجھا کر کھینچتا بہت مگن لگ رہا تھا۔ پتہ نہیں سائیں نے مولوی عبدالخالق کی موجودگی کو محسوس کیا یا نہیں، کیونکہ ان کے آنے کے بعد بھی وہ انہماک سے بچے کو دیکھتا رہا تھا۔ اس پر سے نظر ہٹا کر مولوی عبدالخالق پیچھے کھڑی ملانی سے بولے۔

''دکان کھولنے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں دکان کھولتا ہوں، تم ناشتہ بنا لو۔ لیکن آج ناشتہ تین لوگوں کا بنانا ہے۔'' وہ یوں بول رہے تھے جیسے روٹین کی بات ہو اور پھر جا کر دکان کا دروازہ کھولنے لگے۔ ملانی جی دو کے بعد تیسرا پراٹھا بیل رہی تھیں کہ انہوں نے سائیں کو کمرے سے نکل کر باہر جاتے دیکھا اور وہ جھنجلاتے ہوئے پراٹھا لپیٹنے لگیں۔

جنگل میں لگی آگ کی طرح گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ سائیں کسی کا بچہ اٹھا لایا ہے، جو اب مولوی صاحب کے گھر میں پل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مولوی صاحب کا بہت احترام تھا، مگر بات ہی ایسی تھی کہ اسی شام کی بیٹھک میں یہ ذکر چل نکلا۔

''ایک بات سنی ہے مولوی صاحب! پتہ نہیں سچی ہے کہ جھوٹی پر سارے پنڈ میں شور مچا ہے کہ سائیں کسی کا بچہ اُٹھا لایا ہے۔''

''جھوٹ سنا ہے۔'' جبار عرف جیرے کی بات پر مولوی عبدالخالق نے کہا۔ ''وہ کسی کا بچہ نہیں اٹھا لایا بلکہ بچے کے والی وارث خود بچے کو اس کے پاس چھوڑ گئے تھے۔''

''لیکن بچہ ہے کس کا؟'' ایک اور نے کہا۔

''دیکھ نیاز محمد! ہمیں تو اُس کی نگہبانی کا فرض سونپا گیا ہے، سو ہم کر رہے ہیں، باقی کی باتیں تو اللہ جانے۔'' انہوں نے متانت سے جواب دے دیا۔ مگر ملانی جی زِچ ہوئی جا رہی تھیں۔

''عقل کی بات کر زینب! جس نے رات کے اندھیرے میں بچہ ویرانے میں پھینک دیا، کوئی کہاں سے

کا پتہ ڈھونڈ رہے؟"

ان کی بات پر زینب بولی۔ "یہ بھی ہے۔ پر کچھ دن انتظار کر کے دیکھ لیں۔ شاید کوئی اسے لینے آ جائے۔"

"زینب! تُو واقعی کم عقل ہے۔" ایک دوسری عورت بولی۔ "اگر لینے ہی آنا تھا تو کوئی چھوڑ کے کیوں

!لیکن ملانی جی! معاملہ تو مشکوک ہے۔ کوئی کیوں اپنا بچہ پھینکے گا؟ وہ بھی اتنے سوہنے منڈے کو۔ میرے والے نے منڈے کے چکر میں تین بیاہ کر لیے، اب کہتا ہے چوتھا کرے گا۔ بھلا کوئی وارث کو بھی پھینک ہے؟"

"اب کیا کہوں سعیدہ! بات تو میری عقل میں بھی نہیں آتی، پر مولوی صاحب کہتے ہیں، برا قیاس نہ کرو۔" ان نے کہہ کر اس ٹاپک کو ختم کر دیا۔

صحن میں چارپائی بچھا کر بیٹھی عورتیں دھوپ سینکتے ہوئے اپنے اندازے لگاتی رہیں، جبکہ وہ جس کی ذات بنی ہوئی تھی، سائیں کی گود میں لیٹا مزے سے انگوٹھا چوس رہا تھا۔ دھوپ اُتر گئی تھی اور مولوی عبدالخالق گھر کا آنگن بچوں سے بھر گیا تھا۔ برابر برابر دو دریاں بچھی تھیں۔ ایک دری پر بیٹھے بچے ہاتھوں میں رے لیے لہک لہک کر قرآن پڑھ رہے تھے اور دوسری دری پر وہ بچے بیٹھے تھے جو قرآن کا سبق لے کر یاد چکے تھے اور اب اپنے سکول کی کتابیں کاپیاں لے کر بیٹھے ہوم ورک کر رہے تھے۔ سائیں نے آج پہلی بار یلی مولوی صاحب کے گھر کا رخ کیا تھا۔ حالانکہ کچھ دنوں سے وہ برابر ان کے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر بچے کے ساتھ گزارتا، پھر اُٹھ کر چلا جاتا۔ مگر جتنی دیر بھی وہاں رہتا، بچے کے سارے کام خود ۔ بچہ بھی اس سے مانوس ہو گیا تھا۔ وہ اسے پہچاننے لگا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ مسکرا کے یوں اپنے ہاتھ جیسے اسے بلا رہا ہو۔ پھر جتنی دیر اس کے ساتھ رہتا، کھیلتا رہتا۔ روتا تو بالکل بھی نہیں تھا۔

سائیں دروازے پر آ کر رُک گیا تو بچے تجسس سے اُسے دیکھتے ہوئے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ وحساب کا سوال سمجھاتے ہوئے مولوی عبدالخالق نے دروازے کی طرف بچوں کی دلچسپی محسوس کر کے سر کر دیکھا، پھر سائیں پر نظر پڑتے ہی بشاشت سے بولے۔

"او جھلیا! باہر کیوں کھڑا ہے؟ اب تو اس چوکھٹ پر تیرے نام کے تعویذ گڑے ہیں۔ سیدھا اندر چلا آ۔"

چلتا ہوا اندر آیا اور مولوی عبدالخالق کے ساتھ دری پر بیٹھ گیا۔ اسے چپ دیکھ کر مولوی عبدالخالق نے "کاکے سے ملنے آیا ہے؟"

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا، پھر کہا۔ "مجھے بھوک لگی ہے۔"

"سبحان اللہ!" مولوی صاحب نے بے ساختہ کہا، پھر آوازیں دینے لگے۔ "ہاجرہ!...... او ہاجرہ! کھانا لاؤ بھئی۔ لیکن ایک منٹ۔" انہیں کچھ خیال آیا تو یوں کر معنی خیز نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ "کھانا تو ضرور ملے گا، پر پہلے ایک کام کرنا ہو گا۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے اُنہیں دیکھا۔ مولوی عبدالخالق اُس کے استفسار کو سمجھ گئے تھے، لیکن اسے کچھ بتانے کے بجائے وہ اشارے سے ایک بچے کو پاس بلانے لگے۔ ''اِدھر آ۔''

بچہ پاس آ گیا تو بولے۔ ''جا کر جبار سے کہہ کہ اپنا تام جھام اُٹھا کر چلا آئے۔''

''جبار کون؟...... جیرا نائی؟'' بچے نے معصومیت سے بولتے ہوئے تصدیق چاہی تو مولوی صاحب ماتھا پیٹ کر بولے۔

''تم لوگ نام بگاڑنے سے باز نہ آنا۔ ہاں بھئی۔ جا کر جیرے نائی سے کہو، میں نے بلایا ہے۔'' اور بچہ ان کے کلسنے پر محظوظ ہوتا باہر بھاگ گیا۔ اسے بھیج کر مولوی عبدالخالق، سائیں کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے بچوں کو پڑھانے لگے۔

''سلام مولوی صاحب!'' جبار نے دروازے پر سے ہی سلام جھاڑا۔ مولوی صاحب اس کے سلام کا جواب دیتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''اپنا سامان ساتھ لائے ہو؟''

''جی مولوی صاحب! سب اُٹھا لایا۔'' اس نے اپنے کندھے سے لٹکے لکڑی کے صندوق کو تھپکا۔ ''پر آپ کے بال تو جمعے کو ہی تراشے تھے اور خط بھی بنایا تھا۔ پھر کیسے بلانا ہوا؟''

اس کی بات پر مسکرا کر مولوی صاحب نے سائیں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''تیری ضرورت مجھے نہیں، اسے ہے۔'' پھر اُس کے پاس آ کر بولے۔

''چل اُٹھ۔ بہت پھر لیا اس طرح۔ اب تجھے انسان کا بچہ بناتے ہیں۔'' اس کے بعد اندر سے میز اور کرسی منگوا کر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ جبار پھرتی سے اپنا سامان نکال کر میز پر رکھتا جا رہا تھا۔ سائیں کے جی میں جانے کیا آئی کہ آئینہ اٹھا کر اس میں اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔

وہ چہرہ جسے مدت سے دھویا نہیں گیا تھا، بڑھے بالوں اور ناتراشیدہ داڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ اسے جیسے خود بھی اپنی پراگندہ حالی پر یقین نہیں آیا۔ داڑھی کے چپچپاتے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اپنے اصل روپ کو یاد کرنا چاہا۔ پر حیرت کی بات تھی کہ اسے اپنی صورت یاد نہیں آئی۔ اور آتی بھی کیسے؟ آئینے میں نظر آتا چہرہ اس قدر اجنبی تھا کہ اس میں سے پرانے نقوش ڈھونڈ پانا مشکل ہوتا۔ جبار نے اس کے کندھوں پر تولیہ ڈال کر سر کے بال تراشنا شروع کیے۔ اس نے مدت سے سر نہیں دھویا تھا اور نہ بالوں میں تیل لگایا تھا۔ سو اب ان کی حالت جھاڑ جھنکاڑ جیسی ہو رہی تھی، جسے کاٹنا آسان کام نہیں تھا۔ پر جبار اپنے کام کا کاریگر تھا۔ دقت تو ہوئی پر اس نے بالوں کو تراش خراش کی حد تک صحیح حالت دے دی تھی۔ پھر اس کے داڑھی کے بالوں کو معقول حد تک چھوٹا کر دیا۔

جبار اپنی طرف سے کام ختم کر کے سیدھا ہوا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر آئینہ اُٹھا لیا۔ چہرہ اب بھی انجان لگ

نما۔ بنا کچھ سوچے اس نے شیونگ کے لئے جھاگ بنا کر ہاتھ سے چہرے پر پھیلایا، پھر اُسترا لے کر شیو
نے لگا۔ اب اُس کے چہرے کو بلیڈ کی رگڑ کی عادت نہیں رہی تھی، اس نے ایک ہاتھ مارا ہی تھا کہ چہرے
ٹ پڑ گیا۔ مگر اُس نے شیونگ روک کر خون صاف کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس کی حرکات و سکنات
ابدہ سی تھیں۔ جیسے وہ اپنی پرانی عادتوں کو یاد کر رہا ہو۔ وہ آرام سے شیو کرتا رہا، مگر اب اس کے انداز میں
نبالا تھی۔

داڑھی ہٹا کر اس نے تولیے سے جھاگ منہ پر سے صاف کرتے ہوئے آئینے میں دیکھا اور ماضی میں
ما کا۔ اب بھی اس کے چہرے میں کچھ اجنبی سا تھا۔ مونچھوں کو صاف کر کے اس نے پھر آئینہ دیکھا۔ اب
کے اُسے چہرے سے شناسائی کا احساس ہو رہا تھا۔

'اب کچھ بات بنی ہے۔' اپنی ٹھوڑی کو مسلتے ہوئے اس نے سوچا۔

"یہ کپڑے لے اور جا کر نہا لے۔ ویسے میرا ناپ تجھے چھوٹا ہو گا۔ مگر جو چیتھڑے تُو نے پہن رکھے ہیں،
ن سے بہرحال بہتر ہیں۔ ابھی ان سے ہی کام چلا لے۔ کل تیرے دو جوڑوں کا کپڑا خرید کر درزی کو سلنے
کے لئے دے دوں گا۔" مولوی صاحب ہاتھ میں اپنا ایک شلوار قمیض لئے اس سے کہہ رہے تھے۔ اس نے ان
کے ہاتھ سے کپڑے لئے، پھر رسّی سے تولیہ اُٹھا کر غسل خانے میں چلا گیا۔ وہ اتنی دیر تک نہایا کہ مولوی
صاحب مغرب کی نماز پڑھا کر آ گئے۔ مگر جب وہ گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتا غسل خانے سے برآمد ہوا تو
دونوں میاں بیوی خوشگوار حیرت میں گھرے اُسے دیکھتے رہ گئے۔ اس کے بال جو مٹیالے رنگ کے لگا کرتے
تھے، ان کی سیاہ رنگت کئی بار صابن سے دُھل کر نکھر آئی تھی۔ گہری سیاہ آنکھوں کی مقناطیسیت تو وہی تھی، لیکن
اب ان میں وحشت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہاں، مگر ویرانی جوں کی توں تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے واضح
ہو رہے تھے۔ رنگ شاید یوں بھی قدرے سانولا رہا ہو گا، مگر اب جھلس کر گہرا ہو گیا تھا۔ گالوں کا ڈھیلا ماس بتا
رہا تھا کہ یہ چہرہ کبھی پُر گوشت تھا۔ عنابی رنگت کے ہونٹ جو سختی سے بھینچے رہتے تھے، اس وقت نرمی سے بند
تھے، جن سے چہرے کا تاثر ہی بدل گیا تھا۔ وحشت اور دیوانگی کی جگہ سنجیدگی اور متانت نظر آ رہی تھی۔ اس کی
دراز قامت تو نظر آتی تھی، مگر شانوں کی چوڑائی اب زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کبھی
تن مند جسم کا مالک رہا ہو گا، لیکن اب اُس کا وزن کافی کم ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کے کپڑے اس کے
لمبے قد پر کافی چھوٹے تھے۔ شلوار ٹخنوں سے اوپر جا رہی تھی اور قمیض گھٹنوں سے اوپر۔ اس پر مضحکہ یہ کہ
کمزوری کی حد تک دُبلا ہونے کے باوجود قمیض اس کے چوڑے چکلے سینے پر پھنسی ہوئی لگ رہی تھی۔ مگر جس
نے اسے دیوانگی کے عالم میں دیکھا ہو، اس کے لئے اس کی بدلی ہوئی حالت واقعی خوشگوار تھی۔

"سائیں کی تو حالت ہی بدل گئی ہے مولوی صاحب! دیکھیں ذرا، کیسا سوہنا رُوپ نکلا ہے۔" ملّانی جی
کی بات پر اُسے دیکھتے ہوئے وہ مسکراتے لہجے میں بولے۔

''یہ سائیں نہیں ہے ہاجرہ! اللہ کا بندہ ہے۔ عبداللہ ہے۔ کیوں عبداللہ! میں نے ٹھیک کہا نا؟''
وہ اُنہیں ہی دیکھ رہا تھا، پر اُن کے استفسار پر نظر چرا کر گیلا تولیہ رسّی پر پھیلانے لگا۔ مولوی صاحب کی معنی خیز مسکراہٹ اور بھی گہری ہوگئی۔

''نہ مان۔ تیرے نہ ماننے سے اُس کی بزرگی اور تیری بندگی میں فرق نہیں آئے گا۔''
اور وہ انجان سا بنا اُنگلیوں کی مدد سے اپنے بال سلجھانے لگا۔ ملانی جی نے دیکھا تو بولیں۔
''اِدھر آ میرے پاس۔ میں بال بنا دیتی ہوں۔'' اور اُٹھ کر دیوار گیر الماری سے کنگھا پکڑ کر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھیں۔ اُس نے صحن میں پڑی پیڑھی اُٹھا کر چارپائی کے پاس رکھی، جس پر ملانی جی بیٹھی تھیں اور اس پر بیٹھ کر سر ان کے سامنے جھکا دیا۔ مولوی صاحب کی مسکراتی نظریں اُس پر ٹکی تھیں جو نگاہیں نیچی کیے کسی بھی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ جبکہ ملانی جی اس کے بال بناتے ہوئے بولتی جا رہی تھیں۔
''دینے والے نے کتنی پیاری صورت دی ہے، پر تُو ہے کہ خوامخواہ بگاڑ رکھی تھی۔ اب نہ وہ حالت بنانا۔ مجھے نہیں پتہ تجھ پر کیا بیتی ہے۔ تیرے زخم اُدھڑ نہ جائیں، اس لیے پوچھوں گی بھی نہیں۔ لیکن ایک بات کہوں گی کہ اگر آج بیتے ہوئے کل کا ماتم منایا جائے تو اس کی نحوست کے سائے آنے والے کل پر بھی پڑ جاتے ہیں۔ جو ہوا، اگر اسے بھول نہیں سکتا تو یاد کرنا بھی چھوڑ دے۔ لے، تیرے بال بھی بن گئے۔'' اُس کے بال بن چکے تو انہوں نے کہا۔ تبھی اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ اندر چارپائی پر سو رہا تھا اور جاگنے پر خود کو اکیلا پا کر رونے لگا تھا۔

''کاکا جاگ گیا ہے۔ میں ذرا اُسے دیکھ لوں۔'' خود کلامی کرتی وہ اُٹھنے لگیں تو اس نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر روکتے ہوئے کہا۔

''آپ رہنے دیجیے، میں دیکھتا ہوں۔'' حلیہ کیا سنورا، اس کا تو بات کرنے کا انداز بھی سنور گیا تھا۔ شائستگی سے بول کر وہ کمرے میں آ گیا اور بچے کو شانے سے لگا کر چپ کرانے لگا۔ لیکن بچہ تو اس کی گود میں آتے ہی ایسے چپ ہو گیا جیسے ماں نے گود میں لے لیا ہو۔ اُس کا رونا بند ہوا تو عبداللہ نے جیسے اس کا تاثر دیکھنے کے لیے اپنا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے کیا۔ بچہ پریشان سا ہو گیا۔ لمس جانا پہچانا ہے، پر چہرہ اجنبی۔ اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں کو پٹپٹاتا وہ اپنے نرم ہاتھوں سے اجنبی چہرے کو چھونے لگا تو ایک مدت کے بعد عبداللہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اظہارِ تشکر کے طور پر اس نے ان نرم ہاتھوں کو چوم لیا۔
''عبداللہ! آ کر کھانا کھا لو۔'' کچھ دیر بعد ملانی جی نے دروازے پر آ کر کہا، پھر بچے کو اُس کی گود میں دیکھ کر بولیں۔ ''اسے بھی ساتھ لے آنا۔ اس کے فیڈر کا وقت ہو گیا ہے۔ پر کمبل میں ٹھیک سے لپیٹ لینا، کہیں سردی نہ لگ جائے۔''

وہ چلی گئیں تو عبداللہ بھی اسے کمبل میں لپیٹ کر باہر باورچی خانے میں آ گیا۔ مولوی صاحب کھانا ختم کر

اُٹھ گئے۔

"اچھا ہاجرہ! میں مسجد جا رہا ہوں۔ عشاء کا وقت ہو گیا ہے۔ اور تُو سن عبداللہ! کھانا کھا کر اِدھر اُدھر نہ نکل جا۔ بہت ہو گئی آوارہ گردی۔ اب آرام سے گھر پر بیٹھ۔ اس کے لئے بھی بستر بچھا دینا۔" وہ عبداللہ سے کہہ کر آخر میں پھر ملانی جی سے بولے تھے۔

جب مولوی صاحب مسجد سے لوٹے تو وہ بچے کو ساتھ لئے سو رہا تھا جبکہ بچہ سر گھما گھما کر کمرے میں ہر طرف دیکھتا اس کے بازو کے تکیے پر لیٹا جاگ رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر مولوی عبدالخالق نے ملانی کو دیکھا اور بولے۔

"رب سوہنے کی یہی بات تو سب سے سوہنی ہے کہ بندہ جو مانگتا ہے، اس سے دوگنا دیتا ہے۔ اب دیکھ، تُو اُس سے ایک پتر مانگا کرتی تھی، اس نے دو دے دیئے ہیں۔ اب سنبھال انہیں اور اپنے چاؤ پورے کر۔ پر یاد رکھنا، جس نے دیئے ہیں، وہ لے بھی لے گا۔"

"بے شک مولوی صاحب! پر ابھی تو میرا آنگن بھر گیا ہے۔ مجھے اس پر خوش ہو لینے دیں۔"

"پر شکر کرنا مت بھولنا۔" انہوں نے تنبیہہ کی۔

"نہیں بھولوں گی۔" ملانی جی نے یقین دلایا۔

✿✿✿

بہادر نے جھانک کر اندر اسٹڈی میں دیکھا۔ نور الہدیٰ فائلوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔

"صاب!" اُس کی آواز پر انہوں نے مصروف سے انداز میں کہا۔

"ہاں بولو!"

"آپ سے ملنے کوئی بی بی آئی ہیں۔"

انہوں نے حیرت سے بہادر کو دیکھا۔

"رات کے گیارہ بجے کون سی بی بی مجھ سے ملنے آ گئی؟"

"میں کیا جانوں؟" وہ خوامخواہ شرما گیا تو نور الہدیٰ جھنجلا گئے۔

"تم نے نام پوچھا تھا؟"

"مریم بتا رہی تھیں۔"

ایک پل کو تو اُنہیں یاد ہی نہیں آیا کہ یہ نام کہاں سنا ہے۔ پھر جب یاد آیا تو اُچھل پڑے۔

"او مائی گاڈ! مریم یزدانی۔ یہ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے؟" وہ تو خود کلامی کر رہے تھے۔

"جا کر اُسے کہہ دو، میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔" وہ رُوڈ سے لہجے میں کہہ کر دوبارہ فائلوں میں اُلجھ گئے اور بہادر "جی صاب!" کہتا ڈرائنگ روم میں آ گیا اور نور الہدیٰ کا پیغام حرف بہ حرف مریم کے کانوں تک پہنچا

دیا۔ اُس کے تو تلوؤں میں لگی، سر پر جا کر بجھی۔

"مجھے اپنے صاحب کے پاس لے چلو۔" وہ بگڑے لہجے میں بولی تو بہادر منمنایا۔

"صاب آپ سے ملنا نہیں چاہتے۔"

"شٹ اپ!" وہ حلق کے بل چلائی۔ "مجھے ابھی اور اسی وقت نورالہدیٰ کے پاس لے کر چلو۔ ورنہ میں تمہارا حشر کر دوں گی۔"

بہادر بے چارہ تو اس کی اونچی آواز سن کر ہی ڈر گیا، اپنا حشر کیا کرواتا؟

"جی میم صاحب!" کہہ کر وہ اسے اپنے ساتھ لئے لاؤنج میں آیا، پھر دُور سے ہی بیسمنٹ میں بنی اسٹڈی کی طرف اشارہ کیا۔ "صاب وہاں ہیں۔"

نورالہدیٰ سے ڈانٹ پکی تھی، اس لئے جلدی سے کہہ کر غائب ہو گیا۔ وہ شعلہ بار انداز میں اسٹڈی میں داخل ہوئی تھی۔ نورالہدیٰ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے مگر چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور کمر کرسی کی پشت سے ٹکا کر اسے دیکھنے لگے جو چلتی ہوئی ان کے ٹیبل کے پاس آ کر رُکی، پھر نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔

"تمہیں کس چیز کا غرور ہے نورالہدیٰ؟...... چند مربعے زمینوں کا، جنہیں میں سو بار خرید کر پھینک سکتی ہوں۔ تمہارے بزنس کا، جس کا سیٹ اپ کھڑا کئے تمہیں چار دن نہیں ہوئے یا تمہاری پرسنالٹی کا، جسے خاص بنانے والی بھی میری نظر ہے...... تم ہو کیا اور تمہیں یہ سوچنے کی جرأت بھی کیسے ہوئی کہ تم میری انسلٹ کر سکتے ہو؟ اُس دن تو میں نے یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ تم شاید اپ سیٹ ہو۔ مگر آج جو تم نے کیا، اس کی تمہارے پاس کوئی وضاحت ہے؟ کیا لگا تمہیں، مریم یزدانی تم پر مرمٹی ہے؟...... مجھے تو ترس آیا تھا تم پر کہ اتنی ینگ ایج میں تم کام کے بوجھ تلے دب کر اکیلے اور ڈپریسڈ ہو گئے ہو۔ میں نے سوچا تھا، تمہیں اپنے دوستوں سے ملواؤں گی، ان کے ساتھ کچھ وقت گزار کر تم ریلیکس فیل کرو گے تو تمہاری ڈل لائف میں کچھ انرجی آ جائے گی اور تم......" تیز لہجے میں بولتے بولتے اچانک ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اپنی بے عزتی کے احساس سے زیادہ نورالہدیٰ کی بے رخی کے لئے تھے۔

"forget it" بس ایک پل کو اس کی آواز بھرّائی تھی پھر تنفر سے کہہ کر وہ مڑی اور جتنی تیزی سے آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے واپس چلی گئی۔

'مجھے اُسے رُلانا نہیں چاہئے تھا۔' اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اطمینان سے اُس کی صلواتیں سنتے نورالہدیٰ جھٹکے سے سیدھے ہوئے تھے۔ پھر وہ اتنی تیزی سے نکل گئی کہ نورالہدیٰ کو اسے روکنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اور اب وہ بیٹھے افسوس کر رہے تھے۔ وہ فطری طور پر بہت کیئرنگ انسان تھے مگر ملیحہ کے بعد ان کی اس عادت میں خلل آ گیا تھا۔ لیکن وہ مریم سے ایکسکیوز بھی کرنا چاہتے تھے۔ پھر بھی جھجک میں دو دن گزر گئے۔ مریم اُن سے کہہ تو آئی تھی کہ ان کے پاس ان کی خاطر گئی تھی مگر اُسے خود بھی احساس تھا کہ یہ سچ نہیں

ے۔اور جو سچ تھا، وہ اسے سوچ کر خوف زدہ تھی۔ اسی لئے جب سے ان کے پاس سے آئی تھی، منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ ملازمہ کئی بار اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے چکی تھی مگر مریم کے کان میں جوں تک نہیں رینگی۔ آخری حربے کے طور پر اس کی ممی دوسری چابی سے دروازہ کھول کر اندر آ گئیں اور بیڈ پر بیٹھ کر اس کا شانہ ہلاتے ہوئے آوازیں دینے لگیں۔

"مریم اُٹھو! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

"مگر آیا کون ہے؟" وہ بدستور چڑتے ہوئے بولی۔

"نام تو بتایا تھا اس نے۔ بڑا الگ سا ہے۔ کیا نام تھا......؟" ان کی بڑبڑاہٹ پر مریم کو مزید طیش آنے لگا گر ضبط کئے بیٹھی رہی۔ پھر اُنہیں بھی یاد آ گیا۔ "ہاں، نورالہدیٰ ہے اس کا نام۔"

"واٹ......؟" وہ اُچھل ہی تو گئی۔ "مما! آئی ایم سو ہیپی۔" وہ اُن سے لپٹ کر بولی، پھر اُن کا گال چوم کر باہر بھاگ گئی۔

ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر اُسے بریک لگ گئے تھے۔ نورالہدیٰ کی رُوڈنیس کو یاد کر کے اُس کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔ مگر ان سے ملنا بھی چاہ رہی تھی۔ سنجیدہ سا چہرہ بنائے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو نورالہدیٰ اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

"تھینک گاڈ۔ ورنہ تو لگ رہا تھا، تم ملنے کے لئے منع کر دو گی۔"

"میں تمہاری طرح بداخلاق نہیں ہوں۔" اس کے منہ بنا کر کہنے پر نورالہدیٰ بے ساختہ مسکرائے اور کہا۔

"ہاں وہ واقعی بداخلاقی تھی اور اسی لئے میں تمہیں سوری کہنے آیا ہوں۔"

اُس کی صورت ایک دم سے روہانسی ہوگئی اور اس نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ نورالہدیٰ اسے دیکھ کر بولے۔

"آئی ایم سوری۔"

اُس نے توجہ نہیں دی۔

"اچھا بابا! یہ لو، ہاتھ جوڑ کر سوری کہہ رہا ہوں۔" اُسے مانتا نہ دیکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھ جوڑے تو بالکل اچانک ہی اُنہیں وہ پل یاد آ گئے، جب خفا سی ملیحہ اُن کے ہار ماننے پر بھی نہیں مانی تھی اور انہوں نے ہار کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"تم جو رُوٹھ جاؤ گی تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟" اپنا کہا جملہ یاد کر کے ان کے اندر کا خالی پن سوا ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھ بے دم ہو کر گر گئے۔ مریم نے ان کی طرف دیکھا، پھر ان کے چہرے پر پھیلے بنجر پن کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا تمہیں؟" نورالہدیٰ نے خالی آنکھوں سے اُسے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ "کم آن نورالہدیٰ! میں مذاق کر رہی تھی۔"

وہ آہستہ سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئے مگر باہر نکل جانے کے بجائے وہ وہیں رک گئے۔ انہیں معلوم تھا، اب آگے ان پر کیا بیتے گی۔ ان میں بگولوں کے طوفان اُٹھیں گے اور وہ گلی کوچوں میں بھٹکتے پھریں گے۔ پھر جب ملیحہ کی یادوں کے شکنجے میں جکڑے قصرِ فاروقی لوٹیں گے تو ہمت جواب دے جائے گی۔ مگر پھر بھی ان کے قدم ان کی مرضی کے بغیر اُنہیں ملیحہ کے کمرے میں لے جائیں گے۔ وہ کمرہ نورالہدیٰ کے زندہ وجود کا مقبرہ تھا اور پھر...... پھر خود پر اختیار کیسے رہے گا....... ہر پل کے ساتھ یادوں کے اندھے کنوئیں میں اُترنا، اُبھرنا اور پھر اُترنا آسان نہیں ہوتا۔ روح تک کو نڈھال کر دینے والا یہ عمل نورالہدیٰ کی برداشت سے باہر تھا۔ مریم اُلجھن بھرے انداز میں ان کی پشت کو دیکھ رہی تھی کہ وہ ایڑی کے بل گھوم کر بڑے ریلیکس موڈ میں بولے۔

''آئس کریم کھانے چلو گی؟''

''کیوں نہیں؟'' وہ جھٹ سے بولی پھر کہا۔ ''لیکن میں ذرا چینج کر لوں۔''

نورالہدیٰ، ملیحہ کی یادوں کو پل بھر کی مہلت نہیں دینا چاہتے تھے، فوراً بولے۔ ''کیا ضرورت ہے؟ ٹھیک تو لگ رہی ہو۔''

''میں نے صبح سے کپڑے نہیں بدلے اور تمہیں ٹھیک لگ رہے ہیں؟ تم گاڑی میں چل کر بیٹھو، میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔'' رف سے ٹراؤزر ٹی شرٹ میں مریم ان کے پل پل بدلتے موڈ پر حیران زِچ ہو کر بولی تھی مگر وہ مصر رہے۔

''کہا نا، ضرورت نہیں۔ اور مجھے تو اس وقت تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔''

''اوکے۔'' وہ جھگڑا ختم کرنے کو بولی۔ ''لیکن شوز پہننے کی اجازت تو ملے گی نا؟ ایکچوئیلی تمہارے آنے کا سن کر میں بیڈروم سے ننگے پاؤں بھاگی چلی آئی۔'' اپنی جلد بازی کا اعتراف اس نے اتنی معصومیت سے کیا کہ نورالہدیٰ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

مریم کافی باتونی قسم کی لڑکی تھی مگر اس کی باتیں بھی بہت دلچسپ تھیں۔ نورالہدیٰ اس کی کمپنی میں بہت انجوائے کر رہے تھے۔ آئس کریم کھا کر وہ ساحل سمندر پر نکل آئے اور دُور تک گیلی ریت پر پیروں کے نشان بناتے چلتے چلے گئے۔ شام کے سائے ڈھلے تو انہیں وقت گزرنے کا احساس ہوا اور وہ پلٹ آئے۔ نورالہدیٰ اُسے ڈراپ کرنے آئے تو گاڑی اس کے گھر کے باہر روک دی۔ مگر وہ بیٹھی ہی رہی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' اسے بیٹھے دیکھ کر نورالہدیٰ نے پوچھا تو وہ دھیرے سے بولی۔

''سوچ رہی ہوں کہ آج تم اگلی ملاقات کا وعدہ کرو گے یا نہیں۔''

''نہیں۔'' اس ایک لفظ پر اُس کا چہرہ دھواں ہو گیا اور اس نے فوراً دروازہ کھول کر اُتر جانا چاہا۔ پر نورالہدیٰ نے دروازے کے لاک پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ ''پوری بات تو سنتی جاؤ۔'' وہ ڈپٹ کر بولے۔

پھر اسے دیکھ کر مسکرائے جو خفا خفا سی اُنہیں گھور رہی تھی اور کہا۔ ''آج میں تم سے اگلی ملاقات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں۔'' اور مریم ایک دم سے ہنس پڑی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

❁❁❁

باورچی خانے میں بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے مولوی صاحب، ملانی جی سے کہہ رہے تھے۔

''آج میں نے پیش امام کو کہہ دیا ہے کہ کل تڑکے ہی لاہور کے لئے نکل جاؤں گا۔''

''مگر ابھی تو دکان میں دو ہفتے کا سامان موجود ہے۔ پھر لاہور کیا کرنے جائیں گے؟'' وہ اچنبھے سے بولیں تو مولوی عبدالخالق مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

''بھلی عورت! دکان کے سامان کی میں نے بات ہی کب کی؟ میں تو ننھے میاں کے لئے لاہور جا رہا ہوں۔ خود ہی تو کہہ رہی تھی کہ اس کے لئے بستر لینا ہے، گرم کپڑے لینے ہیں اور بھی پتہ نہیں کیا کیا۔ خیر جو بھی منگوانا ہے، بتا دینا۔ میں لکھ کر لے جاؤں گا۔''

عبداللہ خود فراموشی کی کیفیت سے تو باہر آ گیا تھا پر ابھی تک اس کا دماغ غنودگی کے عالم میں تھا۔ کہیں کوئی تحریک ہوتی تو دماغ کا وہ حصہ جھٹکا لے کر چل پڑتا مگر ان الگ الگ حصوں کا آپس میں کوئی ربط ضبط نہیں بن پایا تھا، اسی لئے اُس کے ذہن پر دُھندسی چھائی رہتی۔ لیکن دماغ بہر حال فعال ہو چکا تھا۔

ابھی بھی ان دونوں کی باتوں کو سن کر اس کے ذہن میں تحریک ہوئی تھی۔ بچے کا سامان خریدنے کے لئے پیسے کی ضرورت تھی اور پیسہ کام کرنے سے آتا ہے۔ عبداللہ، بچے کو اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور وہ اپنے آپ ہی عبداللہ کی ذمہ داری بن گیا۔ اب عبداللہ سوچ رہا تھا کہ اسے بچے کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کام کرنا چاہئے۔ لیکن اس نے مولوی صاحب سے اس بات کا ذکر نہیں کیا بلکہ وہ تو کسی سے بھی کسی بات کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ ایک جامد چپ کی مہر اس کے ہونٹوں پر لگی تھی اور شاذ و نادر ہی اس کی زبان سے کوئی لفظ ادا ہوتا تھا۔ حالانکہ دیوانگی کے عالم میں تو وہ بہت بڑبڑاتا تھا، مگر فرزانگی نے اس کی آواز گھونٹ دی تھی۔

ناشتہ کر کے اس نے ہینڈ پمپ پر جا کر ہاتھ دھوئے اور خشک کئے بغیر باہر چلا گیا۔

''یہ دو دن تو آرام سے بیٹھا رہا، آج پھر نکل گیا ہے۔'' ملانی جی اُسے جاتا دیکھ کر پریشان ہوتیں، مولوی صاحب سے بولیں تو وہ اُنہیں تسلی دیتے ہوئے بولے۔

''فکر کیوں کرتی ہے؟ وہ تجھے اور مجھے تو چھوڑ کر جا سکتا ہے، پر اسے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔'' بولتے ہوئے انہوں نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر ''اللہ اکبر!'' کہتے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

عبداللہ سر جھکائے پیروں میں دیکھتا ہاتھ پشت پر باندھے چلتا چلا جا رہا تھا مگر اس کے دماغ کی سُوئی ایک جگہ پر ہی اٹک گئی تھی۔ اُس نے یہ تو سوچ لیا تھا کہ اب کام کرے گا لیکن سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کون سا کام

کرے۔ وہ سوچتے سوچتے تھک گیا تو ایک مکان کے آگے بنی ڈیوڑھی پر بیٹھ گیا۔ گلی میں کچھ بچے کنچے کھیل رہے تھے۔ وہ اُنہیں دیکھنے لگا۔ وہ بظاہر انہیں دیکھ رہا تھا پر اُس کا دماغ ''کیا کیا جائے؟'' میں اُلجھا تھا۔ بچوں کو دیکھتے دیکھتے اُس کی نظر اس شخص کی طرف اُٹھ گئی جو سامنے والی دکان کے باہر زمین پر بیٹھا تھا اور جب وہ لوہے کی دہکتی سلاخ کو سل پر رکھ کر ہولڈر سے پکڑے بھاری ہتھوڑے کے وار سے ضرب لگاتا تو چنگاریاں سی اُڑنے لگتیں۔ اُسے وہ آتش بازی اتنی دلچسپ لگی کہ قریب سے دیکھنے کے لئے اُٹھ کر لوہار کی دکان کی طرف چل پڑا۔ لوہار نے ہاتھ روک کر عبداللہ کو دیکھا جو اس کے مقابل بیٹھ رہا تھا۔

وہ پچاس کے پیٹے میں تھا مگر اوپر تک چڑھا رکھی آستینوں میں سے اُس کے بازو کی طاقت کوندتی محسوس ہو رہی تھی اور جب وہ بولا تو اُس کی آواز بھی کڑکڑاتی ہوئی تھی۔

''خیر ہو عبداللہ! اَج تُوں فیر مٹرگشت شروع کر دِتی ہے؟''

اُس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا اور پھر وہ کہا جو اس کے دماغ میں چل رہا تھا۔

''اب کام کروں گا۔''

''اوئے کیہڑا کام؟''

''کوئی بھی۔'' اُس نے کندھے اُچکا دیئے پھر بولا۔ ''تم جو کر رہے ہو، وہ سکھا دو۔''

عبداللہ کو سنجیدہ دیکھ کر لوہار بھی اب کچھ سنجیدہ ہوا۔ ''پہلاں کدی ایہہ کم کیتا اے؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر کہا۔ ''یاد نہیں۔'' اور اس کے ساتھ ہی عبداللہ کے چہرے پر ایسے تاثرات اُبھرے جیسے دماغ پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسے پریشان ہوتا دیکھ کر لوہار جلدی سے بولا۔

''کوئی گل نئیں۔ میں سکھا دیاں گا۔'' اس کے جملے پر وہ خود سے چونکا پھر پہلے کی طرح ہی پُرسکون ہو گیا۔ اور اس کے بعد لوہار اُسے لوہا پگھلا کر کوٹنے کا طریقہ سمجھانے لگا۔ پھر جب اچھی طرح سمجھا چکا تو عبداللہ کو آزمائشی طور پر ایک کمان کے جیسی مڑی سلاخ پگھلا کر سیدھی کرنے کو دی۔

عبداللہ نے اسے بھٹی میں ڈال کر انگارے کی مانند سرخ کر لیا، پھر اسے سل پر رکھ کر ہولڈر سے پکڑے ہوئے دوسرے ہاتھ میں وزن دار ہتھوڑا لے کر تولا۔ ہتھوڑا کافی بھاری تھا اور اسے اٹھا کر پورا ہاتھ اوپر کر کے لوہے پر چوٹ کرنے کے لئے کافی طاقت کی ضرورت تھی۔ کام واقعی مشکل تھا مگر عبداللہ نے جی نہ چرایا۔ حالانکہ جب اس نے پوری طاقت سے لوہے پر پہلی ضرب ماری تو لوہے سے نکلتی سرخ چنگاریوں کو دیکھ کر اسے لگا کہ وہ اس کے چہرے اور آنکھوں کو جلا ئیں گی۔ بلکہ اس نے تو بے ساختہ ہی اپنا چہرہ بھی بازوؤں میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ مگر دو تین ضربوں کے بعد اسے مزا آنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ آگ کا کھیل کھیل رہا ہو۔

پورا دن گزار کر جب شام میں دکان بند کرنے کا وقت ہو گیا اور لوہار سامان اُٹھا اُٹھا کر دکان کے اندرونی

میں رکھنے لگا تو عبداللہ بیٹھا اپنی چھالوں بھری ہتھیلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے کبھی اتنی
ت والا کام نہیں کیا تھا۔ سامان اندر کر کے لوہار نے شٹر کھینچ کر گرایا اور تالا لگا دیا۔ پھر وہ عبداللہ کی طرف
ہوا اور جیب میں سے کچھ روپے نکال کر گننے کے بعد عبداللہ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔
"ایہہ تیری اَج دی دیہاڑی۔" پھر کہا۔ "کل وی آئیں گا؟"
عبداللہ نے کہا۔ "صبح ہی آ جاؤں گا۔" اور پیسے پکڑ کر گنے بغیر ہی جیب میں رکھ لئے۔
مغرب کی جماعت ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی اور اب تو مولوی عبدالخالق بھی گھر آ گئے تھے جب عبداللہ
ر لوٹا۔
"آؤ عبداللہ! آؤ۔ سنا ہے آج سارا دن حیدر لوہار کی دکان پر بیٹھے لوہا پگھلاتے رہے۔ دل پر چڑھایا
بھی پگھلایا یا نہیں؟" اُسے دیکھ کر مولوی عبدالخالق نے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں معنی خیزی سے کہا۔ پر اس
، تو جیسے اب ان سے بحث نہ کرنے کی قسم کھالی تھی۔ بولتا ہی نہیں تھا۔ پر جب سے وہ چپ ہوا تھا، مولوی
حب بہت بولنے لگے تھے۔ ملانی جی اُن کی معنی خیز مسکراہٹ پر دھیان دیئے بغیر تیزی سے اُٹھ کر عبداللہ
، پاس آئیں۔ اُن کی اس عجلت کی وجہ عبداللہ کے ہاتھوں کے چھالے تھے جن پر ان کی نظر پڑ گئی تھی۔ پاس آ
اس کے دونوں ہاتھ پکڑے وہ پریشان ہو کر بولیں۔
"ہائے میرے ربا!...... عبداللہ! ایہہ کی اے؟ تجھے اور کوئی کام نہیں ملا؟"
مولوی عبدالخالق پیچھے سے بولے۔ "اسے پتہ چلنے دے ہاجرہ! کہ اگر لوہے کو بھی سیدھا کرنا ہو تو پہلے
ے بھٹی میں پگھلانا پڑتا ہے۔ تب شاید اس کی عقل میں بات آ جائے کہ لوہا ہو، سونا ہو یا آدمی...... سنوارنے
، لئے سختیوں سے گزارنا ضروری ہے۔ کیونکہ جو پگھلایا گیا ہو، وہی سانچے میں ڈھل سکتا ہے۔" وہ اب بھی
عنی انداز میں بات کر رہے تھے۔
عبداللہ نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں اور ملانی جی سے ہاتھ چھڑاتا وہ بچے کے پاس آ گیا۔ پھر جیب
ے پیسے نکال کر بچے کی مٹھی میں پکڑانے کے بعد وہ کسی کو دیکھے بغیر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے
ر ملانی جی، مولوی عبدالخالق سے بولیں۔
"آپ ہر وقت عبداللہ سے یہ کیا بولتے رہتے ہیں؟ مجال ہے جو آپ کی ایک بھی بات میرے پلّے پڑ
ے۔"
وہ ملانی جی کو دیکھ کر مسکرائے۔
"لوہے کو اگر پگھلا کر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو ٹھنڈا ہوتے پر مڑ تڑ جاتا اور اس کی شکل پہلی حالت سے بھی
ی ہو جاتی ہے۔ اس لئے گرم لوہے پر چوٹ کرنی پڑتی ہے تاکہ اس کی نئی ہیئت پہلے سے بہتر ہو۔" وہ
ہرے لہجے میں معرفت کے اصول سمجھا رہے تھے۔

''چوٹ بھی کر لیجئے گا مگر ابھی تو جا کر اس کے ہاتھوں پر مرہم لگا دیں۔''

مولوی صاحب نے سنا تو شکایت کرنے لگے۔''میں تو مرہم لگانا چاہتا ہوں پر وہ لگوائے تب نا.....زخم پر تو ہاتھ نہیں دھرنے دیتا۔'' وہ خفگی سے بول کر اٹھے اور دیوار گیر الماری سے مرہم نکال کر ہاتھ میں پکڑے باہر آ گئے۔

❁❁❁

'تجھے میرے ساتھ کھیل کھیلنے میں بہت مزا آتا ہے نا؟......بس ایک آرزو کی تھی اور تُو نے میرے دل کو ویران کر دیا.....لیکن اب جب میں اپنی آرزو ہی تیاگ چکا اور فنا کے راستے کو تلاش کر رہا تھا، تُو نے ایک اور آرزو میرے دل میں ڈال دی۔ مگر اب میرے پاس کھونے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔'

''عبداللہ!'' وہ صحن میں بچھی ننگی چارپائی پر چت لیٹا تاریک آسمان کو گھورتا ہوا اپنے دل میں اللہ سے مخاطب تھا کہ ملّانی جی نے اسے آواز دی۔ اُس نے سر گھما کر ہینڈ پمپ پر برتن دھوتی ملّانی جی کی طرف دیکھا۔ اُسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ بولیں۔

''تُو کاکے کے پاس جا کر بیٹھ جا۔ مولوی صاحب تو کب کے نماز پڑھانے چلے گئے ہیں۔ وہ اندر اکیلا ہے، ڈر جائے گا۔''

اُن کی بات سن کر وہ اٹھا، چپل پہن کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ مگر دروازے پر پہنچ کر اُس کے پیر جیسے زمین نے جکڑ لئے تھے۔ دروازے کے فریم میں اسٹیچو کی طرح ایستادہ اندر کے منظر کو دیکھ کر حسرتیں اُس کی آنکھوں میں کروٹ لینے لگیں۔ چارپائی پر سوئے بچے کے قریب وہ کہنی کے بل نیم دراز اُس پر جھکی بہت پیار سے سوئے ہوئے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ اور بچے کے سینے پر رکھا اُس کا نازک ہاتھ دھیرے دھیرے اُسے تھپک رہا تھا۔ عبداللہ کی موجودگی کو محسوس کر کے اُس نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا اور عبداللہ کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے مسکرا کر بچے کی طرف دیکھا، پھر عبداللہ کی طرف۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

''آ گئے ہو تو اپنی امانت سنبھالو۔'' اور ایک ادا سے زمین پر پیر رکھ کر بستر سے اُٹھ گئی۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی دروازے کی طرف بڑھی۔ اُسے اپنی طرف آتے دیکھ کر عبداللہ کے چہرے پر ایسے تاثرات اُبھرتے گئے جیسے اس کے ہر قدم کے ساتھ عبداللہ کی جان نکلتی جا رہی ہو۔ عبداللہ نے اس سے نظر ہٹاتے ہوئے نگاہ کو جھکا لیا۔ وہ چلتی ہوئی عبداللہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ عبداللہ نے نگاہ نہیں اٹھائی مگر اسے معلوم تھا کہ اس کے چہرے پر عبداللہ کو دیکھتے ہوئے فدا ہو جانے والی مسکراہٹ ہے۔ عبداللہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ مگر چوڑے دروازے میں اتنی جگہ تو تھی کہ اُس جیسی دُبلی پتلی لڑکی ترچھی ہو کر اُس کے برابر سے نکل جاتی۔ وہ کچھ سیکنڈ عبداللہ کا چہرہ دیکھتی رہی، پھر سمٹ کر اُس کے سائیڈ سے ہو کر نکل گئی۔

وہ اُس کے اتنے پاس سے ہو کر گئی تھی کہ عبداللہ با آسانی اُس کا ہاتھ تھام سکتا تھا۔ اُس کے لباس کی

راہٹ نے عبداللہ کو مضطرب بھی کیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ہاتھ بڑھایا تو دونوں کے درمیان وہ انچ کی دُوری، کبھی نہ ختم ہونے والے فاصلوں میں بدل جائے گی۔ وہ چلی گئی تو بھی عبداللہ نے پلٹ کر ں دیکھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جسے پلٹ کر دیکھنا ہے، وہ اب وہاں نہیں تھی۔ یہ کچھ پل عبداللہ کے لیے ے ہی تھے کہ کوئی اس کے جبڑے کے راستے ایک سلاخ اس کی کھوپڑی میں گھسا کر زور سے ہلائے کہ اس کا اغ جھنجھنا اُٹھے۔ اُس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گرنے لگے۔

❁❁❁

بچوں کے سبق پڑھنے کی آوازوں کے بیچ عبداللہ چٹائی پر بیٹھا ایک بچے کو سائنس کا مضمون سمجھا رہا تھا۔ ب یہ اُس کی روٹین بن چکی تھی۔ پہلے وہ مغرب کے بعد دکان سے گھر آتا۔ اب عصر کے بعد ہی آ جاتا تھا اور کول کے بچوں کو فری آف کاسٹ ٹیوشن پڑھاتا۔ یہ ذمہ داری عبداللہ نے خود قبول نہیں کی تھی بلکہ مولوی حاحب نے غیر محسوس انداز میں اسے اس روٹین میں شامل کر لیا تھا۔ اس دن دکان پر کام زیادہ نہیں تھا اس لے عبداللہ بھی جلدی فارغ ہو گیا۔ گھر آیا تو مولوی عبدالخالق بچوں کے درمیان بیٹھے اُنہیں پڑھا رہے تھے۔ ساتھ میں دکان بھی کھول رکھی تھی۔ جب کوئی گاہک آ کر آواز لگاتا تو مولوی صاحب اُٹھ کر دکان میں چلے جاتے۔ پھر گاہک کو فارغ کر کے واپس صحن میں آ کر بچوں کو پڑھانے لگتے۔ عبداللہ آیا تو ہاتھ منہ دھو کر صحن میں ہی چارپائی بچھا کر لیٹ گیا۔ مولوی عبدالخالق گاہے بگاہے اس پر بھی نظر ڈال لیتے۔ تبھی ایک گاہک نے دکان کے کاؤنٹر پر آ کر آواز لگائی تھی۔ مولوی صاحب کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ فوراً اسے آواز دے کر پاس بلایا۔

"عبداللہ! اِدھر آؤ۔"

وہ اُٹھ کر پاس آیا تو بولے۔ "تم تنویر کو حساب کا سوال سمجھا دو۔ میں گاہک کو دیکھ لوں۔"

"مگر مولوی صاحب......" اس نے کچھ کہنا چاہا تو وہ ڈپٹ کر بولے۔

"شکل سے ایم اے، بی اے لگتا ہے۔ دوسری کلاس کے بچے کو حساب کا سوال بھی نہیں بتا سکتا؟ جا تنویر! عبداللہ تجھے حساب کا سوال سمجھا دے گا۔ اسے ویسے بھی حساب کتاب کا بڑا شوق ہے۔ احمق نے اللہ کے ساتھ بھی کھاتہ کھول رکھا ہے۔" وہ بچے سے کہہ کر آخر میں کلس کر بولے تھے۔ بچے نے فوراً اپنی کاپی مولوی عبدالخالق کے قریب زمین پر بیٹھے عبداللہ کی ران پر رکھ دی۔ مولوی عبدالخالق اُٹھ کر جا چکے تھے اور بچہ منہ اُٹھائے اسے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ گہرا سانس بھر کر کاپی پر لکھے سوال کو یوں دیکھنے لگا جیسے عجوبہ ہو۔ تقسیم کا وہ آسان سا سوال بھی عبداللہ کو لگا کہ وہ نہیں کر پائے گا۔ اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سوال کو حل کس طرح کرنا ہے۔ مگر جب اس نے بچے کے ہاتھ سے پنسل لے کر سوال کرنا شروع کیا تو بنا ہاتھ روکے اُس نے ایک بار میں ہی سوال حل کر دیا۔ پھر تو بچہ پھیل ہی گیا اور باقی سوال حل کرنے کی فرمائش کر دی۔

''یہ سوال بھی حل کر دیں ماسٹر جی! نہیں تو کل سکول میں مار پڑے گی۔''

''میں تمہیں طریقہ سمجھا دیتا ہوں۔ سوال تم خود حل کرو۔'' وہ کہہ کر بچے کو سمجھانے لگا۔ پھر اسے فارغ کیا تو دوسرے بھی اپنی کتابیں کاپیاں لئے اس سے سبق پوچھنے چلے آئے۔ اندر دکان میں مولوی صاحب، گاہک کو دو کلو آٹا تول کر دے چکے تھے اور اس سے پیسے بھی لے چکے تھے مگر ٹائم پاس کے لئے بیٹھے اُس سے باتیں بگھارنے لگے تھے۔ انہوں نے جو باہر کا منظر دیکھا تو مسکرا کر دل میں بولے۔

'کل تک جو رسیاں تڑوا رہا تھا، اب کیسے کام پر لگ گیا ہے۔ واہ مالک! تیرے کام نرالے ہیں۔'

بچوں کو مولوی صاحب کے پُرشفقت انداز کے مقابلے میں عبداللہ کے نپے تلے انداز میں کشش محسوس ہوئی تھی۔ وہ یوں بھی گاؤں والوں کے لئے مسٹری مین تھا۔ اور یہی چیز اس کے متعلق تجسس کو اُبھارتی تھی۔

بچوں نے فرمائش کر دی کہ کل سے عبداللہ ہی سکول کا کام کرائے۔ اور عبداللہ انکار نہیں کر سکا۔ اب تو وہ گاؤں میں ماسٹر عبداللہ کے نام سے جانا جانے لگا تھا۔

نماز کا وقت قریب آیا تو مولوی عبدالخالق نے دکان بند کر دی اور صحن میں آ کر وضو کرنے لگے۔ وہ دروازے سے نکلنے لگے تھے کہ ایک خیال آیا اور مڑ کر عبداللہ کو دیکھنے لگے۔ صحن میں موجود چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر سارے بڑے بچے نماز کے لئے بستہ، سیپارے بند کر کے وضو کرنے لگے تھے۔ پر عبداللہ آرام سے بیٹھا تھا۔

''عبداللہ!'' وہ آواز دے کر بولے۔

''چل اُٹھ! وضو کر۔ ذرا دیر میں جا کر اذان دے لوں گا۔ تجھے نماز نہیں پڑھنی؟''

اُن کا خیال تھا کہ اگر وہ نماز پڑھنے نہ بھی اُٹھا تو بھی چپ رہے گا۔ اُس کی آنکھیں اچانک ہی بہت سرخ ہو گئیں۔ اس نے مولوی صاحب کی طرف دیکھا، پھر پتھریلے لہجے میں کہا۔

''نہیں۔'' یہ ایک لفظ کہہ کر اس نے سر جھکایا اور بچے کی کتاب میں سے سبق پڑھ کر اسے یاد کرانے لگا۔

'بہت سخت ناراض۔ لیکن کوئی بات نہیں، ہم منا لیں گے۔' اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے دل میں کہا اور مسجد کی طرف جانے کو دروازے سے نکل پڑے۔

❁❁❁

''مولوی صاحب! آپ عبداللہ پر کچھ دم درود کیوں نہیں پھونکتے؟'' ملانی جی نے کہا تو وہ بولے۔

''کیسا دم درود؟''

''میں کیا جانوں؟'' انہوں نے کندھے اچکا دیئے پھر کہا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے مولوی صاحب! کہ عبداللہ پر جنات کا قبضہ ہے۔''

''اچھا؟'' وہ محظوظ انداز میں ہنس پڑے۔

وہ جون کی گرم رات تھی۔ ہوا بھی نہیں چل رہی تھی جس سے حبس بڑھ گیا تھا۔ عبداللہ پیپل کے درخت کے

نیچے پیڑھی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا تھا اور بچہ واکر میں اس کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ وہ گھومتا پھرتا عبداللہ کے پاس آتا تو عبداللہ ہلکے سے دھکے کی مدد سے واکر پیچھے دھکیل دیتا۔ لیکن وہ دوبارہ واکر چلاتا عبداللہ کے پاس آ جاتا تو دونوں ہنسنے لگتے۔ مولوی صاحب صحن میں بچھی چارپائی پر سونے کے لئے لیٹے تھے۔ ملّانی جی ساتھ والے بستر پر بیٹھی تھیں جب وہ مولوی عبدالخالق سے عبداللہ کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرنے لگیں۔ انہیں مولوی صاحب نے ہنسی میں اُڑا دیا۔ مگر وہ برا منائے بغیر اسی سنجیدگی سے کہتی گئیں۔

"اب کیا کہوں مولوی صاحب! کہ میں نے عبداللہ میں کیسی کیسی عجیب باتیں محسوس کی ہیں۔ اچھا بھلا بیٹھا باتیں کر رہا ہوتا ہے کہ اچانک ہی کسی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہاں کوئی ہو۔ پھر اس کی حالت عجیب ہو جاتی ہے۔ چہرہ تن جاتا ہے اور آنکھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے خدانخواستہ جان کنی کا عالم ہو۔ اس کے بعد الگ تھلگ گوشے میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے کئی بار چھپ کر دیکھا ہے کہ یوں کونوں میں منہ چھپا کر بیٹھا وہ آنسوؤں سے روتا ہے۔ سچ کہتی ہوں مولوی صاحب! اتنے جوان مرد کو روتے دیکھ کر میرا تو دل ہی بیٹھ جاتا ہے۔ پھر بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ میں نے اکثر اسے تنہائی میں کسی سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ پھر ابھی شام میں کیا ہوا۔ چلو نماز نہیں پڑھتا، روزے بھی نہیں رکھتے پر بہت سے لوگ ہیں جو نماز روزے کے معاملے میں غفلت کرتے ہیں لیکن کوئی اس طرح تو نماز کے لئے منع نہیں کرتا جس طرح آج عبداللہ نے کیا۔ اس کا لہجہ سن کر تو ایسا لگ رہا تھا کہ آپ نے اسے کوئی بہت ہی مشکل کام کرنے کو کہہ دیا ہو۔ میں نے سنا ہے، جس پر جنات قبضہ کر لیں، اسے نماز روزے سے روک دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا وجود ناپاک ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں اللہ کا نام لیا جاتا ہے، یہ وہاں نہیں ٹھہر پاتے۔"

ان کی باتیں سن کے مولوی صاحب اُٹھ بیٹھے تھے اور گہری نظروں سے عبداللہ کو دیکھنے لگے۔ پھر جب ملّانی جی خاموش ہوئیں تو سانس بھرتے گمبھیر لہجے میں بولے۔

"قبضہ تو ہے اس پر مگر جنات کا نہیں۔"

وہ نا سمجھی سے جھنجلا کر بولیں۔ "چلیں جس کا بھی ہو، پر دم درود کر کے اس کی جان چھڑائیں۔"

"جس نے اپنی جان دے دی، وہ بھلا اس کی جان کیوں چھوڑے؟" ہلکی سرگوشی میں بول کر وہ ملّانی جی سے کہنے لگے۔ "تو نہ سوچا کر ان باتوں کو۔ وہ روئے یا باتیں کرے، تیرا کیا نقصان ہے؟" پھر پیپل کے درخت کی طرف منہ کر کے زور سے بولے۔

"عبداللہ! آ کر سو جا۔ بہت رات ہو گئی ہے۔"

اُن کی بات سن کر وہ فوراً اُٹھ گیا اور بچے کو بھی واکر سے نکال کر گود میں لیتا ملّانی جی کے پاس آیا اور بچہ ان کی گود میں دے کر اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔

❁❁❁

نورالہدیٰ نے گاڑی پورچ میں لے جا کر روکی، پھر وہ اور مریم ساتھ ساتھ چلتے قصرِ فاروقی میں داخل ہو گئے۔ نورالہدیٰ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کی بجائے لاؤنج میں لے آئے۔

"تم بیٹھو۔ میں بابا جان کو بلا کر لاتا ہوں۔" اُسے بٹھا کر وہ بابا جان کو بلانے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ان کی واپسی ہوئی تو مریم ان کے ساتھ گرے بالوں والے سرخ وسفید رنگت کے بارعب شخص کو دیکھ کر احتراماً اُٹھ کھڑی ہوئی جنہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ یقیناً فوجی رہے ہوں گے۔ سفید شلوار کُرتے میں ملبوس ان کے پیروں میں کالے رنگ کے سادہ سے چپل تھے اور آنکھوں پر سنہرے فریم والا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ مریم ایک ہی نظر میں ان سے متاثر ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم انکل!" وہ عام طور پر ہیلو سے کام چلاتی تھی پر ان کی شخصیت کا رعب تھا کہ ادب سے سلام کر کے سر کو ذرا سا جھکا دیا۔ بابا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"وعلیکم السلام! بیٹھو۔"

تینوں بیٹھ چکے تو مریم نے کہا۔ "میں بتا نہیں سکتی انکل! کہ آپ سے مل کر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ پر ساتھ میں افسوس بھی ہو رہا ہے کہ میں آپ سے پہلے کیوں نہیں ملی۔ مگر غلطی میری نہیں ہے۔ میں نے نورالہدیٰ سے کئی بار کہا تھا کہ آپ سے ملوا دے۔ پر یہ سنتا ہی نہیں۔ اور آج بھی یہ تو ٹال مٹول ہی کر رہا تھا پر میں زبردستی اسے ساتھ لئے چلی آئی۔"

"بہت اچھا کیا۔" بابا جان دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"اور میں تو آپ کے گھر کو دیکھ کر بہت امپریسڈ ہوں۔ قصرِ فاروقی واقعی کسی محل کی طرح خوبصورت ہے۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے خوش دلی سے کہہ رہی تھی۔

"محل تو خوب صورت ہوتے ہیں مگر ویران سے لگتے ہیں۔" بابا جان کا لہجہ تھکن سے بھرا تھا۔ مریم جلدی سے بولی۔

"لیکن مجھے قصرِ فاروقی تو ویران نہیں لگتا...... ہاں بس یہاں خاموشی بہت ہے۔ پر اس کی بھی وجہ ہے۔ گھر میں بس آپ اور نورالہدیٰ ہی تو ہیں۔ بلکہ اصل میں تو آپ ہی ہوتے ہیں۔ نورالہدیٰ تو آدھی رات تک باہر ہوتا ہے۔ ایسے میں خاموشی تو ہو گی ہی۔"

بہادر چائے لے آیا تھا۔ مریم نے اسے کہا۔

"چائے میں بناؤں گی۔ تم جاؤ۔"

اُس نے بابا جان کو دیکھا پھر ان کے اشارے پر ٹرالی چھوڑ کر چلا گیا۔ مریم نے ٹرالی اپنے سامنے کھسکائی اور چائے بنانے لگی۔

"یہ لیجئے۔ ایک کپ آپ کا، دوسرا میرا۔ اور نورالہدیٰ تو چائے پیتا نہیں۔" اس نے دو کپ چائے بنا کر

کپ بابا جان کو پکڑایا اور دوسرا اپنے ہاتھ میں لے کر صوفے پر پیچھے ہو کر بیٹھتی بولی۔ ''نورالہدیٰ سگریٹ
کار نہیں پیتا تو وجہ سمجھ میں آتی ہے، یہ صحت کے لئے مضر ہیں۔ پر چائے سے پرہیز سمجھ نہیں آتا۔''
''تم کیا کرتی ہو؟'' بابا جان اس کے تبصرے کو نظرانداز کر کے بولے اور وہ چنچل سی مسکراہٹ کے ساتھ
الہدیٰ کو دیکھ کر بولی۔
''پہلے کچھ نہیں کرتی تھی۔ لیکن اب نورالہدیٰ کا سر کھاتی ہوں۔''
نورالہدیٰ نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تو اس نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔
''تم کیوں چپ ہو؟...... کچھ بولتے کیوں نہیں؟''
''میں بول کر کیا کروں گا؟ تم بابا جان سے ملنے آئی ہو۔ ان سے باتیں کر کے جان پہچان بڑھاؤ۔ میں تو
ں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔'' ان کے لہجے میں سانپ جیسی پھنکار کو محسوس کر کے مریم کو بہت عجیب
۔ اس نے آج تک نورالہدیٰ کو اس انداز میں بات کرتے نہیں دیکھا تو اسے لگا، اسے وہم ہوا ہے۔ پر بابا
ن کا چہرہ دیکھ کر لگ رہا تھا کہ زہر کے اثر سے ان کا تنفس رُکنے لگا ہو۔ ہاتھ کی لرزش پر بمشکل قابو پا کر انہوں
ے کپ رکھا اور اُٹھ گئے۔
''تم لوگ باتیں کرو۔ میں اب اپنے کمرے میں چلوں گا۔'' انہوں نے سنبھل کر مریم سے کہا اور چلے گئے۔
مریم کو یہ سب بہت عجیب لگا۔ مگر نورالہدیٰ سے اس بارے میں بات نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ
ا۔ مگر وہ اُلجھ گئی تھی۔ اس نے چائے کا کپ سائیڈ میں رکھا اور اپنی کیفیت کو نارمل کرنے کے لئے اُٹھ کر دیوار
کی تصویریں دیکھنے لگی۔
نورالہدیٰ نے اسے تصویروں کی طرف متوجہ دیکھا تو اس کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ ایک تصویر پر ہاتھ
رکھ کر بتانے لگے۔
''یہ میاں جی ہیں۔''
''تمہارے دادا؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں۔ اور ان کی رائٹ سائیڈ پر بابا جان ہیں اور لیفٹ پر پاپا۔''
وہ چونک کر مڑی اور کہا۔ ''یہ بابا، پاپا کا کیا چکر ہے؟''
''بابا جان میرے چچا ہیں۔ میرے اپنے پیرنٹس کا انتقال تو تبھی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہو گیا تھا، جب
میں تین سال کا تھا۔'' نورالہدیٰ نے بتایا تو وہ متاسف انداز میں بولی۔
''آئی ایم سوری۔''
''اِٹس اوکے۔'' انہوں نے کہا۔ ''امی اور بابا جان نے مجھے کبھی ماں باپ کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔
ویسے بھی میں اس وقت اتنا چھوٹا تھا کہ اپنے والدین کے چہرے بھی مجھے یاد نہیں۔ ماں باپ کے رشتے میں،

میں نے ہمیشہ امی اور بابا جان کو ہی دیکھا ہے۔''

ان کی باتوں کو سن کر مسکراتی مریم کو یقین ہو گیا کہ اس نے جو کچھ دیر پہلے محسوس کیا تھا، وہ صرف اس کا وہم ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اب ایک دوسری تصویر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''یہ تصویر بہت انٹرسٹنگ ہے۔ اس دن میں پہلی بار کھڑا ہوا تھا۔ لیکن بابا جان بتاتے ہیں کہ جتنی دیر میں پاپا کیمرہ لے کر پہنچے، میں گر چکا تھا۔''

مریم نے اس تصویر کو دیکھا، جس میں ایک بچہ زمین پر گرا منہ بسور رہا تھا۔ وہ ہنسنے لگی۔

''یہ امی کی تصویر ہے۔ یہ میں نے اس دن کھینچی تھی، جب میں لندن جا رہا تھا۔ اور جانتی ہو، میں نے کیا کیا؟'' وہ مزے سے بولے۔

''کیا، کیا؟'' وہ اشتیاق سے بولی۔

''میں نے کیمرے میں سے ریل نکالی اور چھپا کر اپنے ساتھ لندن لے گیا۔ پھر دو سال پہلے میرے پاکستان آنے کے بعد ہی یہ تصویر پاکستان پہنچ سکی۔''

مریم نے دلچسپی سے مسکراتے ہوئے ایک تصویر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''یہ تم ہو نا؟''

نورالہدیٰ نے اس تصویر کو دیکھ کر اثبات میں جواب دیا۔

''دیکھا، کتنی آسانی سے تمہیں پہچان لیا۔'' وہ ناز سے بول کر ہنسی، پھر دوبارہ سے تصویر کو دیکھنے لگی۔

''یہ اتنی کیوٹ سی بے بی کون ہے؟'' سات آٹھ سال کے نورالہدیٰ کی گود میں پھولے پھولے گالوں والی بچی کی طرف اشارہ کر کے مریم نے پوچھا۔ نورالہدیٰ بہت دلچسپ انداز میں اسے تصویریں دکھا رہے تھے۔ پر اس تصویر کو دیکھ کر ان کا لہجہ سست ہو گیا۔

''یہ ملیحہ ہے...... بابا جان کی بیٹی۔''

''اچھا......'' وہ مگن سی بول کر مزید تصویریں دیکھنے لگی۔ ''یہ ضرور ملیحہ ہو گی۔'' اس نے ایک نوجوان لڑکی کی تصویر پر انگلی رکھ کر کہا۔

''ہاں......'' وہ اس تصویر کو دیکھ کر آہستگی سے بولے۔

''ویری پریٹی...... اب تو اس سے ملنا پڑے گا۔ جاؤ بلا کر لاؤ اسے۔ اور تم نے اب تک مجھے اپنی کزن سے ملوایا کیوں نہیں؟'' وہ پلٹ کر لڑنے کے سے انداز میں نورالہدیٰ سے بولی تو نورالہدیٰ نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا پھر نظر چراتے ہوئے کہا۔

''ملیحہ کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔''

اس نے حیرت سے انہیں دیکھا اور بولی۔ ''واٹ......؟ کیا کہا تم نے؟''

نورالہدیٰ نے اسے دیکھا مگر بولے کچھ نہیں۔ وہ ان کے دیکھنے سے سمجھ گئی کہ اس نے جو سنا، صحیح سنا تھا۔

اس نے افسوس بھری نظر اس نوجوان لڑکی کی تصویر پر ڈالی۔
"یقین نہیں آتا، چھوٹی عمر میں ...... کیا کوئی حادثہ ہوا تھا؟"
"مریم پلیز!" بمشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مریم کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔
"اس بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔ اِٹس پرسنل۔"
"آئی ایم سوری۔" اس نے جلدی سے کہا۔ مگر نورالہدیٰ کی حالت نہیں سنبھلی۔ وہ پلٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ظاہر نہیں کیا تھا، مگر مریم نے محسوس کر لیا کہ بے چینی ان کے وجود میں پھیل گئی تھی۔ ایک لڑکی کی موت پر اتنا صدمہ ...... وہ بھی اس کے انتقال کے اتنے عرصے بعد ...... مریم کو یہ سب نارمل نہیں لگا۔ وہ اندیشوں میں اُلجھی نورالہدیٰ کے برابر جا بیٹھی۔ پھر اچانک ہی اس نے کہا۔
"میں کسی کی محبت میں مبتلا ہوں۔"
نورالہدیٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر یہ انکشاف کرتے ہوئے چمک نہیں بلکہ کشمکش تھی۔ پھر بولے۔
"مبارک ہو۔"
"تم مجھ سے اُس کا نام نہیں پوچھو گے؟" وہ اب انہیں دیکھ رہی تھی۔ نورالہدیٰ نے پل بھر کے توقف کے بعد کہا۔
"نہیں۔" جواب غیر متوقع تھا۔ وہ حیرت سے بولی۔
"کیوں؟"
نورالہدیٰ نے سر جھکا کر کچھ دیر غور کیا، پھر براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولے۔
"کیونکہ ہو سکتا ہے، میرے ساتھ زندگی گزارنا تمہارے لئے مشکل ہو جائے۔"
وہ دنگ رہ گئی۔ اسے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ نورالہدیٰ اس کے دل میں چھپے راز تک پہنچ گئے ہیں۔
"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟"
وہ اس سے نظر چرا کر اٹھے اور ٹہلتے ہوئے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ یوں لگ رہا تھا۔ انہیں بولنے کے لئے مہلت کی ضرورت ہے۔ کھڑکی سے باہر لان میں بکھری دھوپ کو دیکھ کر وہ گویا ہوئے۔
"میں ملیحہ سے محبت کرتا تھا ...... کرتا ہوں ...... اور مرتے دم تک کرتا رہوں گا۔"
کچھ سیکنڈ پہلے مریم کے ذہن میں سپارک تو ہوا تھا مگر نورالہدیٰ کی زبان سے اعتراف شاکنگ تھا۔ وہ سن رہ گئے۔
"موت بھی ملیحہ کے لئے میرے احساسات کو بدل نہیں سکی۔ تمہیں شاید عجیب لگے کہ کوئی کسی مرے ہوئے

شخص سے کیسے محبت کر سکتا ہے؟ مگر زندگی اور محبت میں یہی تو فرق ہے کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن محبت ن
نہیں ہوتی۔ ہمارا رشتہ بہت انوکھا تھا اور ہماری محبت بہت پاکیزہ اور خوب صورت۔ بالکل ملیحہ کی مسکراہٹ ک
طرح بے ریا اور خالص۔ ہمارے درمیان پانے کا نہیں، دینے کا رشتہ تھا۔ اور ملیحہ کو دینے کے لئے میر
پاس سب سے قیمتی چیز میری محبت تھی۔ اور میں نے اپنی محبت کو اس پر بے دریغ لٹا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ د
بھر کی خوشیاں اس کے قدموں میں ڈال دوں۔ اگر میری زندگی اس کی ایک مسکان کی قیمت ہوتی تو م
کھڑے کھڑے جان دے دیتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ مجھے اس کی پروا تھی۔ میں بس اس کا خیال رکھنا چا
تھا۔ دل چاہتا کہ اسے یوں ہاتھوں میں سنبھالوں جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہو۔'' انہوں نے بولتے ہوئے اپ
دونوں ہاتھ اس طرح باہم ملائے جیسے ان میں کوئی قیمتی مگر نازک شے چھپا رکھی ہو۔ پھر وہ اپنے ہاتھوں کو الگ
کر کے دیکھنے لگے۔ ''مگر میں اُسے سنبھال نہیں سکا مریم!''

شکست خوردگی سے کہہ کر انہوں نے اپنے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال لئے۔ پھر دُور لان میں دیکھ
ہوئے آزردگی سے کہا۔ ''دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس اذیت کا مداوا کر سکے۔''

وہ اب خاموش ہو چکے تھے پھر بھی رخ موڑے کھڑے تھے۔ وہ اس نمی کو چھپانا چاہتے تھے جو ان ک
آنکھوں میں تیرنے لگی تھی۔ مریم پتھرائی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی جن کا عکس اس کی آنکھوں کی تر
میں دھندلا گیا تھا۔ چاہے جانے والے شخص کی زبان سے کسی اور کے لئے چاہت کا اعتراف سننا ننگے پاؤ
انگاروں پر چلنے سے زیادہ کٹھن ہے۔

''مجھے ہمیشہ لگتا تھا کہ تم نے اپنے دل کے گرد اونچی اونچی فصیلیں تان رکھی ہیں۔ میں چاروں طرف چ
کاٹتی رہتی، پر اندر جانے کا راستہ ہی نہیں ملتا۔ اب سمجھ میں آ رہا ہے، تمہارے دل کے دروازے بھلا مجھ
کیسے کھل سکتے تھے؟ وہاں تو ملیحہ پہلے سے ہی موجود تھی۔''

''وہاں اب تم بھی آ چکی ہو۔'' نورالہدیٰ نے پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا، جس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ
آنسو گر رہے تھے، جسے انہیں پونچھنے کا خیال تک نہیں آیا۔

نورالہدیٰ کے اس انکشاف پر خوش ہونے کی بجائے اس نے ایسے انہیں دیکھا جیسے تکلیف کئی گنا بڑھ گ
ہو۔ وہ چلتے ہوئے اس کے قریب قالین پر بیٹھے اور اس کے سرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگے۔

''میرے دل کے سب در و دیوار تمہارے ہیں۔ بس ایک کونا ملیحہ کے نام پر مخصوص ہے اور ہمیشہ رہے گا
میں نے ملیحہ سے بھی کچھ پانا نہیں چاہا مگر تم سے دنیا کا ہر سکھ پانا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ میں دل کا سکو
پانا چاہتا ہوں۔ بہت گہرا زخم لگا ہے دل پر لیکن تم ہاتھ رکھو گی تو شاید کبھی یہ زخم بھر جائے۔ محبت کرتا ہوں تم س
لیکن مجھے اس پر اختیار نہیں کہ ملیحہ سے محبت نہ کروں۔ اور میں جانتا ہوں کہ یہ شراکت داری تم سے جھیلی نہیں
جائے گی۔'' دل گرفتگی سے کہہ کر انہوں نے مریم کے ہاتھ چھوڑنا چاہے۔ پر مریم نے انہیں اپنے ہاتھ چھوڑنے

نہیں دیئے اور ان کے ہاتھوں پر اپنی انگلیوں کی گرفت مضبوط کرتی وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔
"کھونے کی بات نہ کرنا نورالہدیٰ! میں شراکت داری برداشت کرلوں گی پر تمہارا دُور جانا مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ اور پھر ملیحہ زندہ تو نہیں ہے، مر چکی ہے۔ کیا فرق پڑے گا اگر تمہارے دل کے کونے میں پرانے سکّوں کی مانند کچھ یادیں پڑی بھی رہیں تو۔ تمہارے دل کے باقی گلی کُوچے تو میرے لئے ہیں۔" وہ کہہ رہی تھی کہ اسے فرق نہیں پڑے گا۔ مگر ان کے ہاتھوں پر سر رکھے پھُوٹ پھُوٹ کر رو بھی رہی تھی۔
نورالہدیٰ نے نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑا کر اس کے سارے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لئے۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
"مجھ سے شادی کرو گی؟"
اور اقرار میں سر ہلاتی مریم ان کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر ایک بار پھر رو پڑی۔
"دیکھ لیجئے گا، میرے جانے کے بعد آپ کی بیگم آ کر مجھے ری پلیس کر دیں گی۔" ملیحہ کی آواز نورالہدیٰ کے اردگرد گونج رہی تھی۔
ایک ماہ بعد مریم یزدانی نے مسز نورالہدیٰ فاروقی بن کر قصرِ فاروقی میں قدم رکھ دیئے تھے۔ لان کے نیم تاریک گوشے میں تنہا کھڑے نورالہدیٰ روشنیوں سے سجے قصرِ فاروقی کو بڑی یاسیت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دو سال پہلے کی ایک ایسی ہی رات کا منظر کسی فلم کی طرح گھوم رہا تھا اور اس رات کی قیامتیں انہیں ایک ایک کر کے یاد آتی گئیں۔
"کوئی شخص تمہارا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ دکھ جب ایک بار وجود میں گھر کر لے تو پھر کوئی خوشی، خوشی نہیں دیتی۔" وہ اپنے دکھ کی دوا لینے مریم کے پاس چلے آئے۔ وہ غیر روایتی سی لڑکی ان کے انتظار میں روایتی انداز میں دُلہن بنی چہرے پر گھونگھٹ ڈال کر بیٹھی تھی۔ نورالہدیٰ اس کے قریب بیٹھ گئے تو اپنی بولڈنیس کے باوجود وہ خود میں سمٹ گئی۔ نورالہدیٰ اس کی شرم کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ پھر انہوں نے دھیرے سے اس کے گھونگھٹ کو اُلٹ دیا۔
سرخ کامدانی دوپٹے کے ہالے میں اس کا سجا سنورا رُوپ دوآتشہ تھا۔ شرم سے نگاہیں جھکی جا رہی تھیں۔ چہرے پر گھبراہٹ لئے ہونٹوں میں مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھتے دیکھتے نورالہدیٰ کھو سے گئے۔
انہیں دُلہن بنی ملیحہ کا چہرہ یاد آ گیا۔ اس کی پلکیں نم تھیں اور آنکھوں کے پپوٹے ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ نیم وا ہونٹوں میں کپکپاہٹ تھی اور چہرے سے پسینہ جھلک رہا تھا۔ وہ ان کی بانہوں میں عالم نزع سے گزر رہی تھی۔ لب کاٹتے ہوئے نورالہدیٰ نے اپنے بائیں پہلو پر اس جگہ ہاتھ رکھا جہاں اپنے سینے پر انہوں نے ملیحہ کی آخری دھڑکنوں کو محسوس کیا تھا۔ اور پھر سینے کے اندر ان کے اپنے دل کی دھڑکنیں ان بے ترتیب دھڑکنوں کی تال میں ہمیشہ کے لئے کھو گئی تھیں۔

''رشتے جب بنائے جاتے ہیں نورالہدیٰ! تو انہیں نبھایا کرتے ہیں۔'' ایک آواز نے ان کے ذہن میں اُبھر کرانہیں سرزنش کی تھی۔ وہ دفعتہً سنبھلے پھر کوٹ کی جیب سے چھوٹی مخملیں ڈبیہ نکالی اور اسے کھول کر اس میں سے انگوٹھی نکالنے کے بعد ڈبیہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر مریم کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں اس رشتے کو آخری سانس تک نبھاؤں گا۔'' مریم کی مخروطی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر انہوں نے اس کے ہاتھ کی پشت کو چوما۔ پھر پلکیں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بلند آواز میں انہوں نے ملیحہ سے وعدہ کیا تھا۔

❁❁❁

عبداللہ گہری نیند میں تھا جب اس کے احساسات اچانک بیدار ہو گئے۔ اسے یوں لگا کہ کوئی اس کے بستر پر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا ہے۔ پھر کسی نے جھک کر اس کی پیشانی پر آئے سیاہ بالوں کو پھونک مار کر ہٹایا تھا۔ عبداللہ نے سونے جاگنے کی کیفیت میں اپنے چہرے پر کسی کی گرم مہکتی سانس کو محسوس کر کے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چہرہ اس کے اتنے پاس تھا کہ عبداللہ چاہتا تو اس کی سنہری پلکوں کی گھنی جھالروں کو گن سکتا تھا۔ وہ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ وہ سرہانے کی طرف بیٹھی ایک ادا سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ دھیرے دھیرے بستر پر کھسکانا شروع کیا اور عبداللہ کے ہاتھ کے بالکل پاس لے جا کر روک دیا۔ پھر پلکیں اُٹھا کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے چاہ رہی ہو، باقی کا فاصلہ خود ختم کر دے۔ عبداللہ کا سانس سینے میں رکا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے پاس رکھے اس کے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر جیسے ہی عبداللہ نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی، اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ عبداللہ نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا اور کہا۔

''جب قریب نہیں آنا تو پاس بھی کیوں آتی ہیں؟ جھلک دکھا کر چھپ جانا...... بس آپ کو یہی ہنر تو آتا ہے۔ سب کو چین قرار ملے۔ بس کبھی میرے ہی دل پر ہاتھ نہیں رکھا۔ مجھے تڑپا کر بہت سکون ملتا ہو گا...... ہے نا؟''

سوئے ہوئے مولوی عبدالخالق کے شانے پر کسی نے ہاتھ مارا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئے۔ پھر ملانی کو اپنے بستر پر بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''اُدھر دیکھیں مولوی صاحب! عبداللہ کو پھر دورہ پڑا ہے۔''

ان کے اشارے پر انہوں نے پیپل کے درخت کے نیچے الگ تھلگ بچھی عبداللہ کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ بستر پر بیٹھا سرہانے کی طرف یوں دیکھ کر آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا جیسے وہاں کوئی موجود ہو۔

''آج تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا مولوی صاحب! اب تو میری بات کا یقین کریں گے؟''

''تُو سو جا آرام سے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ پھر بستر سے نکل کر چپل پہنتے ہوئے عبداللہ کی طرف آ گئے۔ ملانی جی بھی اُٹھ کر اپنے بستر پر جا لیٹیں۔

ئی سردیاں پوری طرح سے نہیں آئی تھیں۔ پر رات میں ہلکی خنکی کی وجہ سے صحن میں سوتے ہوئے گم کھیس
لیتے تھے۔ ملانی جی نے بستر پر لیٹ کر اچھی طرح بچے پر پھیلایا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔
"کیوں خود کو ہلکان کرتا ہے عبداللہ!" مولوی عبدالخالق پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔
اس نے یوں اُن کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا جیسے ڈوبتے ہوئے شخص کو سہارا نظر آ گیا ہو۔ سامنے کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے اس نے مولوی عبدالخالق سے کہا۔
"اُن سے کہیں مولوی صاحب! یہ یہاں سے چلی جائیں۔ میں مان چکا، یہ میرے نصیب میں نہیں۔ پھر
کیوں مجھے سراب دکھاتی ہیں؟" وہ دردمندی سے مولوی صاحب کا چہرہ دیکھ رہا تھا کہ سرسراہٹ محسوس کر کے
اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اُٹھ کر جانے کے لئے مڑ گئی تھی۔ عبداللہ بے تابی سے اسے آواز دینے کو اٹھا اور
روکنے کے لئے ہاتھ بھی بڑھایا، پھر جانے کیا ہوا کہ ہاتھ پہلو میں گرا کر اس نے آزردگی سے آنکھیں بند
کر کے چہرہ موڑ لیا جیسے کسی تکلیف دہ منظر سے آنکھیں بچانا چاہتا ہو۔ مولوی عبدالخالق نے اسے مترحم نظروں
سے دیکھا اور بولے۔
"جس کی آنکھوں میں حقیقت چبھتی ہو، وہ سراب کا پردہ بصارت پر گرا لیتا ہے۔ جو سراب سے عاجز آ
جائے، وہ حقیقت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ پر تُو تو دونوں سے بھاگ رہا ہے۔ تیرا کیا بنے گا عبداللہ!" ان کی
بات پر اس کا احساسِ شکست اور بڑھ گیا تھا۔ وہ تھک کر چارپائی پر جا بیٹھا۔
"کوئی ایسا امرت لا دیں مولوی صاحب! جس کے چھینٹوں سے سینے میں ٹھنڈ پڑ جائے، سکون مل جائے
۔" مولوی صاحب نے اسے دیکھا جو سختی سے چارپائی کے کناروں کو پکڑ کر آگے کو جھکا زمین کو ساکت
نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"سکون ڈھونڈنے سے نہیں، مانگنے سے ملتا ہے۔" مولوی صاحب نے کہا۔
"اس سے سکون مانگ عبداللہ! جس کے نام سے دلوں کو راحت ملتی ہے۔"
"وہ مانگنے سے کب دیتا ہے؟ مرضی سے دیتا ہے۔ ورنہ میرے مانگنے میں تو کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ پر
اس سے زیادہ ان کی تکلیف ستاتی ہے۔ اس نے بے قصور انہیں آزمائشوں میں لپیٹا تھا اور وہ آخری
سانس تک اس کی مدد کے آسرے پر رہیں۔ پر اس نے مدد نہیں کی۔" اس نے طنز سے کہا تو مولوی صاحب کو
بھی آ گیا۔ طیش میں آ کر بولے۔
"تو شکوے کر کر کے تھکا نہیں عبداللہ؟...... ہاں نہیں دیا اس نے تجھے وہ جو تُو نے مانگا تھا۔ پر یہ بھی تو دیکھ
تُو نے مانگا کیا تھا؟" عبداللہ کی سوالیہ نظروں پر وہ کہنے لگے۔ "بندے تو سبھی ہوتے ہیں عبداللہ! پر بندگی کا
حق کسی میں ہوتا ہے۔ سر تو بہت سے جھکتے ہیں پر جب آزمائش کی دو دھاری تلوار گردن کو کاٹتی ہے تو کتنے
سر اپنے آپ اُٹھ جاتے ہیں۔ پر معبود کا حق تو تب ادا ہو کہ سر نہ اُٹھے چاہے گردن کٹ کر گر جائے۔"

انہوں نے توقف کیا، پھر گمبھیر آواز میں بولے۔

''بندگی کا سلیقہ تھا اس میں، جتنی آزمائش بڑھی اس نے اتنا صبر بڑھایا۔ پھر گردن کٹ کر گری تو گری پر اس کا سر نہیں اٹھا اور تو...... تُو جس نے ایک چوٹ کیا کھائی، معبود سے منہ موڑ لیا۔ او جھلّیا! دیکھ تو سہی، تیرا سوال تیری حیثیت سے بڑا تھا۔ پھر تیری طلب تیرے دامن میں کیسے سماتی؟ پر بات تیری عقل میں نہیں آئے گی۔ کیونکہ عقل کے دروازے تو تُو نے بند کر رکھے ہیں۔'' وہ یک ٹک مولوی صاحب کو دیکھتا دم سادھے بیٹھا تھا۔ کچھ پلوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر گویا ہوئے۔

''بندے کی نظر کمزور ہوتی ہے۔ وہ صرف ناک کی سیدھ میں دیکھ سکتا ہے۔ دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف نظر جاتی ہی نہیں۔ اگر جا پاتی تو تجھے بھی نظر آ جاتا کہ جو تجھے آزمائش کی انتہا لگ رہی ہے، وہ اس کے لئے نجات کا راستہ تھا۔ یہی چاہا تھا اس نے کہ اس کا وعدہ وفا ہو جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھ جھلّیا! اس کے سارے وعدے پورے ہو گئے۔ سوہنے رب نے اس طرح اسے آزمائش سے نکالا کہ اس کے ذمے کسی کا گلہ نہیں رہا۔ پر بندہ ناپ تول کا شوقین ہے۔ لیکن بندے کا تول خالص نہیں ہوتا۔ غرض کے کھوٹے باٹوں میں کبھی سچا تول نہیں آتا...... اللہ کا تول سب سے کھرا ہے۔ دیکھ تُو عبداللہ!...... اللہ نے اس کے ہر ناپ میں برابر کے باٹ رکھے ہیں۔ کیا تُو اب بھی گلہ کرے گا؟'' انہوں نے رک کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

''صحیح کہا تھا اس نے، عشق کی آگ جلائے تو راکھ نہیں کرتی، فنا کر دیتی ہے۔ پر شاید اسے یہ بتانا یاد نہیں رہا کہ جو فنا نہ ہو سکے، وہ امر نہیں ہوتا۔ تم دونوں ہی عشق کی بھٹی میں ڈالے گئے۔ پر وہ تپ کر کندن بن گئی اور تُو راکھ بھی نہ ہو سکا۔ عشق تم دونوں نے ہی کیا، پر اس کے عشق نے اس کا نام صابروں میں لکھ دیا اور تیرے عشق نے تجھے راندہ درگاہ بنا دیا۔''

احساسِ ندامت سے عبداللہ کی آنکھیں جھک گئیں اور آنکھوں سے پانی بہہ بہہ کر چہرے کو بھگونے لگا۔ مولوی صاحب تاسف سے بولے۔

''صرف تُو ہی نہیں ہے عبداللہ! اس عشق کے ہاتھوں بہت لوگ برباد ہو گئے۔ اس خرابے میں ہر کوئی بے زار ہے۔ خلقت گمراہ ہو رہی ہے۔ پر عشق کے ہنگامے سرد نہیں پڑتے۔ کون ہے جو عشق نہیں کرتا۔ کوئی ظاہر کا دیوانہ، کوئی باطن کا۔ کوئی حق پہ مرتا ہے، کوئی ناحق مر جاتا ہے۔ کسی کو تن کی پیاس ہے تو کسی کو من کی۔ کوئی زمین کے لئے روتا ہے، کوئی آسمان کے لئے۔ کوئی مایا چاہے، کوئی چھایا مانگے۔ ہر کوئی اپنے اپنے حصے کا جہنم دہکا کر بیٹھا ہے۔ پور پور جل جائے پر الاؤ سرد نہیں ہوتا۔ اور ہو گا بھی نہیں۔ بندہ جب تک اپنے اصل سے رجوع نہ کر لے، جہنم سے رہائی ممکن نہیں۔''

پھر وہ اٹھے اور وارث شاہ کی نظم گنگناتے چلے گئے۔

رات دا جاگن اوکھا ہوندا اے

اِک جاگدا چوکیدار راتیں

اِک جاگدا عشق دی مرض والا

اِک جاگدا یار دا یار راتیں

اِک جاگدا راتیں چور راتے

اِک جاگدا پہرے دار راتیں

وارث شاہ سبھے گلاں کوڑیاں نیں

اِک جاگدا پروردگار راتیں

یہ آج کیسا انکشاف ہوا تھا۔ مولوی صاحب کی دُور جاتی آواز، عبداللہ کے وجود کو جھنجوڑ رہی تھی۔ اسے لگا اس کے تنفس کا عمل رک گیا اور روح جسم میں پھڑ پھڑا رہی ہے۔ نہ جانے کس طرح وہ اپنی جگہ سے اٹھا پھر وہ بڑھا اور دروازے کے کواڑ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ لیکن وہ رُکا نہیں اور اپنے وجود کی ساری طاقت لگا کر خود کو گھسیٹتا ہوا ننگے پاؤں گلیوں میں چلتا وہ مسجد کے باہر پہنچ گیا۔ ہر سیڑھی پر اُترتے ہوئے اسے اپنا آپ پاتال میں اُترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے گیٹ کی جالیوں کو پکڑ لیا۔ یوں جیسے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا ہو۔ وہ جالیوں کو یوں ہاتھوں سے ٹٹول رہا تھا جیسے اندھا کسی چیز کو انگلیوں سے محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ گیٹ کو پکڑے پکڑے سیڑھی پر گر گیا۔

اس کے آنسوؤں کی روانی میں تیزی آ گئی تھی۔ پھر اس کی پست سی آواز اُبھری۔

"منکرِ حق پر حق سب سے زیادہ آشکار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا کفر ہی اسے حق کی شناخت کرا دیتا ہے۔ میں نے تیرے دائرۂ اختیار سے نکل جانا چاہا تھا۔ میں نے زمین کی گہرائیوں سے کائنات کی وسعتوں تک وہ راستہ تلاش کیا ہے جو مجھے تیری خدائی سے باہر نکال دے۔ کہاں کہاں نہیں بھٹکا...... بستی میں، ویرانے میں، جنگل میں، صحراؤں میں...... خود اپنی ہستی کی گہرائی تک کو کھوج آیا۔ پر ایسا کوئی ذرّہ نہیں ملا جو تیرے قادرِ مطلق ہونے پر گواہی نہ دے۔ ایسا کوئی راستہ نہیں جو تیرے حصار سے باہر لے جائے۔ اور اب میرے پاؤں تھک چکے ہیں۔ میرے بدن میں سکت نہیں...... میں نے مان لیا کہ تیرا اختیار سب سے بڑا ہے۔ میری تلاش لاحاصل تھی اور تجھ سے فرار کی کوئی راہ نہیں۔ اور جو تیری بادشاہت سے نہ نکل سکے، اسے تیرے فیصلوں پر سوال کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں اپنی عاجزی کو تسلیم کرتے ہوئے تیری بڑائی کا اقرار کرتا ہوں۔ میرے اعتراف کو قبول کر لے۔" گیٹ سے ماتھا ٹکائے وہ ندامت کی پستیوں میں گر رہا تھا۔

"اللہ!" اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتے ہوئے درد سے کراہ کر فریاد کی۔ "بہت درد ہے اللہ!...... مجھے سہارا دے۔ میری آتی جاتی سانسیں برچھی کی طرح میرے اندر کو چھید رہی ہیں...... میرا سینہ الاؤ بنا ہوا

ہے۔ مجھ پر رحم کر کہ میری ہستی میں بپا حشر تھم جائے...... میری برداشت میرے دکھ سے ہار گئی ہے۔ میرے زخموں سے خون رسنا بند نہیں ہوتا۔ میرا روم روم اذیت میں جکڑا ہے۔'' وہ کرب سے چلاّ اُٹھا۔

''اللہ! میرا گناہ بہت بڑا ہے، پر مجھے میری سرکشی کی سزا نہ دے، میری ذات کے عذاب مجھ سے سہے نہیں جاتے۔ تیرے غیض و غضب کا سامنا کس طرح کر پاؤں گا؟...... میری ناتوانی کو دیکھ...... مجھے عذاب نہ دینا...... رحم کرنا مجھ پر۔ میری روح تک جھلس گئی ہے۔ مجھے اور کسی جہنم کے حوالے نہ کرنا۔ اس آبلہ پائی کے سفر نے میری روح تک میں چھالے ڈال دیئے ہیں...... میں بکھر چکا ہوں۔ درد کی آندھی سے کہہ کہ اب تھم جائے...... اللہ! میرے تنکا تنکا وجود کو سمیٹ دے۔'' وہ روتے روتے سجدے میں گر پڑا اور بلکنے لگا۔

کبھی بادل وار برس سائیں
میرا سینہ گیا ترس سائیں
میں توبہ تائب دیوانہ
آباد کروں کیا ویرانہ
مری بس سائیں مری بس سائیں
کبھی بادل وار برس سائیں
اس عشق نے عجب اسیر کیا
خود دل سینے میں تیر کیا
کیا چلے پیش و پس سائیں
کبھی بادل وار برس سائیں
ہم بھی کچھ کھل کر سانسیں لیں
اشکوں سے دُھل کر سانسیں لیں
کبھی گھول فضا میں رس سائیں
کبھی بادل وار برس سائیں

اسے مسجد کی سیڑھیوں پر سجدے کی سی حالت میں سمٹے دیکھ کر مولوی عبدالخالق رک گئے۔ وہ یوں بے حس و حرکت تھا کہ انہیں شبہ ہوا کہ وہ بے ہوش ہے۔ تیزی سے اس کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اسے سیدھا کرنے کے لئے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تو قمیض کے اوپر سے ہی انہیں اس کا جسم آگ اُگلتا محسوس ہوا۔ پر وہ ان کے ہاتھ رکھنے پر اُٹھتا چلا گیا تو مولوی صاحب نے بے ساختہ شکر ادا کیا کہ وہ بے ہوش نہیں ہے۔ پھر اس کے چہرے کو دیکھ کر بولے۔

''جب یہاں تک آ ہی گیا تھا تو اندر بھی چلا جاتا۔''

وہ خوفِ اللہ سے بھرّائی آواز میں بولا۔ ”کیسے جاتا مولوی صاحب؟ اس کے در سے کسی کو دھکے مار کے
نکالو تو نہیں نکلتا اور میں کتنی نخوت سے اس سے لاتعلقی کا اعلان کرتا، آپ اُٹھ آیا تھا۔“
”اپنے نامۂ اعمال سے نظر ہٹا کر دیکھ، اس کی رحمت بہت وسیع ہے۔“
”پر میں اس کے سامنے کس منہ سے جاؤں گا؟“ وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔
”تیرے منہ کو کوئی نیا چہرہ نہیں مل سکتا عبداللہ! اپنے اسی منہ کو توبہ کی چادر سے ڈھک کر چلا آ۔“
”لیکن اگر اس نے مجھے قبول نہ کیا تو....؟“ وہ خوفزدہ ہو گیا تو مولوی صاحب اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔
”او جھلّیا! واپسی کی توفیق قسمت والوں کو ہوتی ہے۔ اپنی قسمت کھوٹی مت کر۔ جس نے بھی اس خوف
ڈر کر اس چوکھٹ پر قدم روکے ہیں پھر وہ اندر نہیں جا پایا...... یہ بے نیاز کا در ہے، یہاں کسی کے نام کی
ی نہیں کی جاتی...... خبردار، بلاوے کا انتظار مت کرنا۔“ یہ کہہ کر اُٹھے پھر اس کے آنے کا انتظار کئے بغیر
ی کھول کر گیٹ وا کرتے ہوئے مسجد میں چلے گئے اور کونے میں بنے اسٹور روم سے جھاڑو اٹھا کر معمول
مطابق دریاں سمیٹ کر جھاڑو لگانے لگے۔ عبداللہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا، پر مسجد کے
پہلا قدم رکھتے ہی لڑکھڑا گیا۔ مگر فوراً ہی دیوار کا سہارا لے کر سنبھل بھی گیا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا وضو خانے
طرف آیا۔

وضو کرتے ہوئے اس نے جوں ہی چلّو میں ٹھنڈا پانی لے کر چہرے پر مارا تھا، اسے یوں راحت کا
اس ہوا جیسے تپتے لوہے کو کسی نے ٹھنڈے پانی کے برتن میں ڈال دیا ہو۔ وضو کے پانی نے اس کی ساری
چینی کو دھو دیا۔ وہ نماز پڑھنے برآمدے کی طرف آیا تو آنکھوں کے ساتھ سر بھی جھکا رکھا تھا۔ اس نے دو
ت نفل کی نیت باندھ کر ہاتھ کانوں تک اٹھا کر ”اللہ اکبر“ کہا تو اس کے دل نے سچے ایمان کے ساتھ گواہی
ی۔ وہ جیسے جیسے نماز پڑھتا گیا، اسے اپنی رگوں میں سکون اُترتا محسوس ہوا۔ ایک مدت کی بے سکونی کے
اس نے اس لذت کا مزا چکھا تھا۔ سلام پھیر کر اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو آنکھیں اس کی رحمت کو
س کر کے بھر آئیں۔

”یاد نہیں کب سے، پر ایک مدت ہوئی میں بے سکونی میں جیے چلا جا رہا تھا۔ اب کہیں جا کر تیرا نام لیا تو
قرار آیا ہے۔ اللہ! اپنی رحمت کے سائے مجھ پر مستقل کر دے۔ میرے صبر کی چادر کو اتنا بڑھا کہ میرا غم
ے جائے۔ مجھے اتنی طاقت دے کہ ان کے بغیر جی جاؤں۔ میرے زخم نہیں بھرتے پروردگار! میں تیری
ائی کا سوال کرتا ہوں۔ میرا گناہ بہت بڑا ہے پر تیری رحمت سے اُمید ہے کہ میری توبہ قبول کر لی گئی۔ اللہ!
اتنا حق تو دینا کہ تیری مغفرت طلب کر سکوں۔“

وہ بڑے گداز دل کے ساتھ بند آنکھوں سے دعا کر رہا تھا کہ کہیں پاس ہی چوڑیاں کھنک گئیں اور بے اختیار
نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ دور بیٹھی اپنی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ عبداللہ کی نظریں محسوس کر کے

اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر کسی شرارت کے خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ نچلے ہونٹ کا کنارہ دانتوں میں دبا کر مسکراتے ہوئے اس نے کلائی کو سب چوڑیاں ہاتھ سے پھنسا کر اوپر کیں، پھر اچانک چھوڑ دیں۔ کئی سُر تال ایک ساتھ بج اٹھے تھے۔ عبداللہ کی بصارتیں اس دلفریب شور سے جھنجنا اُٹھیں تو اس نے تڑپ کر آنکھیں بند کر لیں۔

''یہ سراب عذاب ہے یا رب!...... میرے سارے زخم اُدھڑنے لگتے ہیں۔ یہ خواب بہت حسین سہی پر جب ٹوٹتا ہے تو روح فنا ہو جاتی ہے۔ مجھے اس سے نجات دے دے۔'' مولوی صاحب جھاڑو لگا کر دریاں بچھا چکے تھے پھر بھی فجر میں کچھ دیر باقی تھی تو فارغ ہو کر عبداللہ کے پاس آ بیٹھے۔

عبداللہ نے دعا ختم کی اور منہ پر ہاتھ پھیر کر آنکھیں کھولتے ہوئے اس طرف دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے خوشبو میں بسا ایک وجود جلوہ افروز تھا..... لیکن اب جلوہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے سر گھما کر اِدھر اُدھر اسے تلاش کرنا چاہا پر لا حاصل...... مولوی صاحب بہت غور سے اس کی حرکات کو نوٹ کر رہے تھے، ٹوک کر بولے۔

''جب تُو اس کے جانے پر اتنا تڑپتا ہے تو بتا، وہ آنا کیوں چھوڑے؟'' اس نے مولوی صاحب کو دیکھا پھر ہولے سے بولا۔

''مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں۔''

''یہ معاملہ ہی بے اختیاری کا ہے عبداللہ!'' وہ سانس بھر کر بولے تو عبداللہ نے کہا۔

''پر بے اختیاری تکلیف دیتی ہے۔''

''تُو اس تکلیف کو سہنے کی عادت ڈال لے عبداللہ! کیونکہ عشق تیری ہی نہیں، اس کی بھی مجبوری ہے۔'' انہوں نے کہا۔ پھر ''اذان کا وقت ہو گیا ہے'' کہتے ہوئے وہ اُٹھ گئے۔

❁❁❁

پیاس سے مریم کی آنکھ کھلی تھی۔ اوپر کو کھسک کر اس نے ٹیبل لیمپ آن کیا تو اس کی نظر بیڈ کے دوسرے کونے پر پڑی جو خالی تھا۔

'شاید وہ واش روم میں ہو' اس نے نورالہدیٰ کی غیر موجودگی پر سوچا پھر سائیڈ ٹیبل سے جگ اٹھا کر گلاس میں پانی ڈال کر پینے لگی۔ کچھ دیر گزر گئی اور نورالہدیٰ نہیں آئے تو کچھ پریشان ہو کر وہ بیڈ سے اُٹھی اور اٹیچ باتھ روم کا دروازہ بجا دیا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

'نورالہدیٰ اتنی رات کو کہاں چلا گیا؟' اس نے پریشانی سے سوچا اور ان کو ڈھونڈنے کمرے سے نکل آئی نیچے آئی تو لاؤنج خالی پڑا تھا۔ اس نے اسٹڈی روم میں دیکھا پھر سٹنگ روم کے ساتھ ساتھ ڈائننگ روم اور کچن کو بھی چیک کر لیا مگر نورالہدیٰ کہیں نہیں تھے۔ کچھ سوچ کر وہ لان میں آ گئی۔ لان میں جلتی لائٹوں نے رات کے اس پہر بھی کافی روشنی تھی۔ مریم نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اشارہ

ے واچ مین کو پاس بلایا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ تینوں گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں۔ پھر رات کے اس پہر
ورالہدیٰ کہاں جا سکتے تھے؟ واچ مین پاس آیا تو پوچھنے لگی۔

"نورالہدیٰ کہیں گیا ہے؟"

"نہیں میڈم۔" اس نے کہا پھر اس کی پریشان شکل دیکھ کر پوچھا۔ "کیا صاحب اندر نہیں ہیں؟"
وہ سنبھل کر بولی۔ "آف کورس! اندر ہی ہیں۔ میں اُٹھی تو وہ کمرے میں نہیں تھے۔ شاید بابا جان کے پاس
ہوں۔ میں دیکھتی ہوں۔"

"ہاں میڈم! اندر ہی دیکھیں۔ صاحب باہر نہیں گئے۔ پھر رات کے تین بجے وہ جائیں گے بھی کہاں؟"
اسے تسلی دے کر وہ واپس ڈیوٹی دینے چلا گیا۔

مریم نے کہہ تو دیا تھا کہ شاید وہ بابا جان کے کمرے میں ہوں پر اسے معلوم تھا کہ اتنی رات کو نورالہدیٰ بھلا
ان کے پاس کیوں جاتے؟ پلٹ کر اندر جانے کے بجائے وہ چلتی ہوئی پچھلی طرف لان میں نکل آئی۔
نورالہدیٰ وہاں بھی نہیں تھے۔ اس نے پہلی بار اس خوف کو محسوس کیا کہ بڑے گھر میں لوگ کھو سکتے ہیں۔ بابا
کو جگانے کا سوچ کر ہال کے کھلے دروازے سے اندر آ گئی۔ دفعتہً اس کی نظر ملیحہ کے کمرے پر گئی۔ اسے
کبھی اس طرف آنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ سیڑھیوں کے اوپر والا کمرہ
ہے، وہ اُدھر بھٹکتی بھی نہیں تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ گھر کے باقی لوگ بھی اس طرف شاذ و نادر ہی آتے
ہوں گے۔ آج پہلی بار اس نے ملیحہ کے کمرے کے دروازے پر پڑا تالا کھلا دیکھا تھا۔ اس کی تو شاید نظر بھی نہ
پڑتی پر دروازے کے نیم وا پٹوں میں جھری سی بنی تھی اور اس نے مریم کو چونکایا تھا۔ وہ ریلنگ تھام کر سیڑھیاں
چڑھتی اوپر آ گئی۔ اس نے زینے سے دروازے تک کا فاصلہ دو قدموں میں ہی طے کر لیا تھا۔ پھر دروازے کی
اسی جھری سے جھانک کر دیکھا۔

کمرے کی دیواروں سے ہوتی اس کی نظر ملیحہ کے بیڈ پر جا رکی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ پر ہال کی روشنی
سے کمرے میں نیم تاریکی کا ماحول بن گیا تھا۔ اسی نیم تاریکی میں مریم نے نورالہدیٰ کو ایک بازو آنکھوں پر
رکھے بیڈ پر لیٹے دیکھا تھا۔ اس کے اندر آندھیاں سی چلنے لگیں۔ آج صحیح معنوں میں اسے ملیحہ اپنی شراکت دار
لگی۔ پر اسے خود کو سنبھالنا تھا۔ وہ اس معاملے میں نورالہدیٰ سے سوال نہیں کر سکتی تھی۔ وہ پہلے ہی مریم سے
اس محبت کرتے رہنے کی اجازت لے چکے تھے۔ خود پر ضبط کرتی وہ پلٹ آئی۔ مگر اندھیرا کیے بستر پر لیٹی
پل بھر نہیں جھپک سکی اور نورالہدیٰ کے انتظار میں جاگتی رہی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر مریم نے فوراً آنکھیں
بند کر لیں۔ نورالہدیٰ بنا کوئی آواز کیے دوسری طرف جا کر بیڈ پر مریم کی طرف سے کروٹ لے کر لیٹ گئے۔
مریم نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں ان کی پشت کو دیکھا پھر وال کلاک کے چمکتے ہوئے ہندسوں پر نظر کی۔
پانچ بج چکے تھے۔ مریم نے کلاک پر سے نظر ہٹا کر نورالہدیٰ کی طرف سے کروٹ لے لی۔

"رات میں تین بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو تم کمرے میں نہیں تھے۔" تکیہ گود میں رکھ کر بیڈ پر بیٹھی مریم گہری نظروں سے آفس کے لئے تیار ہوتے نورالہدیٰ کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان کا ہر انداز اتنا نارمل تھا کہ اگر رات میں مریم خود انہیں ملیحہ کے کمرے میں نہ دیکھ چکی ہوتی تو اس وقت انہیں دیکھ کر قیاس بھی نہ کر پاتی کہ ان کی گزشتہ رات کس طرح گزری ہے۔ ان کا نارمل انداز اُسے اُکسا رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی ملیحہ کے ذکر سے بچنا چاہ رہی تھی بلکہ اس کی تو ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ نورالہدیٰ کی زبان پر ملیحہ کا نام بھی آ جائے۔ اور نورالہدیٰ نے بھی بس ایک بار کے بعد دوبارہ ملیحہ کا اس سے ذکر نہیں کیا تھا۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ مریم کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اس سلسلے میں ان کی ساری کوششیں بے کار جا رہی ہیں۔

مریم نے ملیحہ کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا تھا۔ کہیں جو وہ انہیں خاموش بیٹھا دیکھتی تو اسے یہ خیال ستانے لگتا کہ نورالہدیٰ، ملیحہ کو یاد کر رہے ہیں۔ وہ جھٹ سے ان کے پاس پہنچ جاتی۔ پھر چاہے وہ کسی بزنس پرابلم کا حل سوچ رہے ہوتے یا یوں ہی ان کے سر میں درد ہو رہا ہوتا اور وہ سکون کی خاطر آنکھیں بند کیے نیم دراز ہوتے مریم زبردستی انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ کبھی تو بس باتیں کیے جاتی اور کبھی وقت کا خیال کیے بغیر آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیتی تو نورالہدیٰ کی وارڈ روب میں پہلے سے موجود کپڑے اس ڈیڑھ مہینے میں دھیرے دھیرے وارڈ روب سے باہر جا چکے تھے۔ اگر کسی دن نورالہدیٰ آفس سے آ کر بلیو شرٹ اتار کر بلیو ٹی شرٹ پہن لیتے تو مریم کو وہم ہو جاتا کہ یقیناً ملیحہ کو ان پر یہ رنگ اچھا لگتا ہوگا۔ اس نے وارڈ روب سے بلیو کلر کی ساری شرٹس، ٹی شرٹس، ٹراؤزرز یہاں تک کہ ٹائیاں بھی نکال کر نوکروں میں تقسیم کر دیں۔

نورالہدیٰ نے اگر کوئی سوٹ زیادہ استعمال کر لیا تو اس کی نظر میں وہ سوٹ ملیحہ کا فیورٹ ہو جاتا..... پھر بھلا اس کی وارڈ روب میں کیا جگہ تھی؟ بے چارہ بہادر تک اس کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ اس نے ہفتے میں دوسری مرتبہ پلاؤ کیا پکا لیا، مریم کو لگا ملیحہ کے حکم پر پلاؤ زیادہ پکتا ہوگا۔ آخر مالکن تو وہی تھی تو مینیو بھی وہی سیٹ کرتی رہی ہوگی۔ اس نے غصے میں بہادر کو خوب جھاڑ دیا کہ وہ سر پر چڑھتا جا رہا ہے، جو دل کرتا ہے پکا لیتا ہے۔ پھر مریم نے اسے مینیو کی لسٹ بنا کر دی جس پر سختی سے عمل کرنا بہادر پر فرض تھا۔ مگر نورالہدیٰ کو واقعی مریم سے محبت تھی۔ انہوں نے کبھی اس کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا مگر مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ بابا جان کو چپ نہیں کرا سکتی تھی جو کھلے عام ملیحہ کا ذکر کرتے تھے۔ حالانکہ یہ ذکر نورالہدیٰ کے سامنے نہیں ہوتا تھا۔ احساسِ ندامت سے وہ ان کے سامنے ملیحہ کا نام نہیں لے پاتے تھے۔ پہلے تو وہ صرف ملک ناصر سے ملیحہ کی باتیں کیا کرتے پر ان کے انتقال کے بعد بہادر ان کا سامع بن گیا تھا۔ پھر مریم رخصت ہو کر آئی تو اسے بھی ملیحہ کا ذکر گاہے بگاہے سننا پڑتا۔ حالانکہ زیادہ تر وہ اُٹھ کر ہی چلی جاتی تھی۔ پر بابا جان اس کی ناگواری کو سمجھ نہ سکے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ نورالہدیٰ اسے ملیحہ کے بارے میں اپنے جذبات سے آگاہ کر چکے ہیں۔

خود اپنے طور پر تو انہوں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ کبھی ملیحہ کے ذکر میں نورالہدیٰ کا نام کچھ اس طرح نہ آئے کہ مریم کی دل شکنی ہو۔ انہوں نے بہادر اور دوسرے نوکروں کو بھی منع کر دیا تھا کہ ملیحہ اور نورالہدیٰ کی منگنی یا شادی طے ہونے کا ذکر مریم سے نہ کریں۔ پھر کون سا ملیحہ کی شادی ان سے ہو گئی تھی کو بتانا ضروری ہوتا۔ مگر مریم، بابا جان کو کس طرح کہہ سکتی تھی کہ اپنی بیٹی کا نام نہ لیا کریں۔ مجھے اس کے ذکر سے نفرت ہے اور ایک ہی رات میں یہ نفرت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ پھر بھی اندر کی بے چینی نے اسے نورالہدیٰ سے بات کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ہاں، کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ اس لئے میں باہر چلا گیا۔'' ان کا لہجہ سرسری سا تھا۔ مریم نے ڈریسنگ کے آئینے میں ان کے عکس کو گھورا جو اب ٹائی پہن رہے تھے اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

''باہر کہاں، لان میں؟''

ٹائی کی ناٹ لگاتے نورالہدیٰ کے ہاتھ تھم گئے۔ مریم آئینے میں ان کے ردِعمل کو دیکھ رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ اب تھوڑا سا گھبراتے ہوئے نورالہدیٰ بھی اس سے جھوٹ بولیں گے مگر انہوں نے توقف کے بعد کسی خاص تاثر کے بغیر کہا۔

''نہیں، ملیحہ کے روم میں۔''

مریم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ کتنے آرام سے اعتراف کر رہے تھے کہ کل وہ پوری رات ملیحہ کو یاد کرتے رہے تھے۔ اس نے سختی سے لب بھینچ لئے مگر نورالہدیٰ کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ ٹائی کی ناٹ لگا کر انہوں نے کوٹ پہنا پھر بریف کیس اٹھا کر بشاشت سے بولے۔

''کیا بات ہے؟ مسز آج گاڑی تک سی آف کرنے کے موڈ میں نہیں لگ رہیں۔ کیا بندے کو اکیلے ہی جانا ہوگا؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' ان کی فرمائش کے جواب میں اس نے بے دلی سے کہا تو وہ پریشان ہوتے اس کے پاس جا بیٹھے۔

''کیوں، کیا ہوا؟...... کہیں بخار تو نہیں ہے؟'' فکرمندی سے کہہ کر انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ٹمپریچر چیک کرنا چاہا تو مریم نے بظاہر نرمی سے مگر حقیقتاً بےزاری سے ان کا ہاتھ ہٹا دیا۔

''بس یوں ہی سر میں ہلکا سا درد ہے۔''

''طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں آفس نہیں جاتا۔''

''تو کیا گھر پر رہ کر میرا سر دباؤ گے؟'' چڑ کر کہتی نورالہدیٰ کو وہ اجنبی سی لگی۔ وہ پھر بھی درگزر کرتے پیار سے بولے۔

''کوئی حرج بھی نہیں ہے۔''

''نورالہدیٰ! یو آر ڈسٹربنگ می۔'' ان کا لہجہ ناقابل برداشت ہو گیا۔
نورالہدیٰ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس بدتمیزی پر ہتھے سے اُکھڑ جاتا پر وہ برا منائے بغیر ہاتھ اٹھا کر صلح جو انداز میں بولے۔

''اوکے یار! آئی ایم گوئنگ۔ تم آرام کرو اور میڈیسن ضرور لے لینا۔'' وہ اُٹھتے اُٹھتے بھی بولے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی بات سن کر مریم نے جھٹکے سے تکیہ بیڈ پر پٹخا اور کمبل سر تک تان کر لیٹ گئی۔ نورالہدیٰ کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔

'کہیں مریم کو میرا ملیحہ کے رُوم میں جانا تو برا نہیں لگا؟' دروازہ کھولنے کے ساتھ انہیں کلک ہوا تھا۔ پُرسوچ نظروں سے انہوں نے کمبل اوڑھ کر لیٹی مریم کو دیکھا پھر آہستگی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے باہر نکل گئے۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ کمبل پھینک کر اُٹھی۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ پھر وہ تنفر سے غرّائی۔

''ملیحہ فاروقی! میں کبھی برداشت نہیں کروں گی کہ میرا شوہر رات کے آخری پہر میرے پہلو سے گھبرا کر اُٹھے اور سکون کے لئے تمہاری پناہ میں چلا جائے۔''

اس دن کے بعد اس نے نورالہدیٰ کی چوکیداری شروع کر دی تھی۔ رات میں جب تک نورالہدیٰ نہ سو جاتے، وہ جاگتی رہتی۔ اس پر بھی سوتے سے اُٹھ اُٹھ کر دیکھتی کہ وہ اپنی جگہ پر ہیں یا نہیں۔ لیکن نورالہدیٰ بھی محتاط ہو چکے تھے۔ اپنی ازدواجی زندگی کو تلخیوں سے بچانے کے لئے انہوں نے راتوں کو اُٹھ کر ملیحہ کے کمرے میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ دن میں ایسے وقت ملیحہ کے کمرے میں جاتے جب مریم گھر پر نہ ہوتی۔

❁❁❁

ایک پریشان حال عورت، حیدر لوہار کی دکان پر آئی اور عجلت بھرے انداز میں بولی۔
''پا حیدر! ماسٹر عبداللہ کتھے اے؟''
''کیا ہوا؟'' اپنا نام سن کر عبداللہ دکان کے اندر سے آتے ہوئے بولا۔ وہ عورت بولی۔
''چھیتی چل عبداللہ! کوٹھے توں ڈِگ کے تیرے منڈے دا سر پاٹ گیا اے۔''
''تیرے منڈے'' پر ٹھٹک کر عبداللہ نے اسے دیکھا پر کچھ کہنے سننے کا وقت نہیں تھا۔ وہ فوراً دکان سے نکل گیا۔ گھر پہنچا تو صحن میں آس پاس کی عورتوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ ان کے درمیان ملّانی جی چارپائی پر دو ڈھائی سال کے بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھیں۔ بچے کے سر پر رنگین کپڑے کی پٹی بندھی تھی اور وہ بری طرح سے رو رہا تھا۔

''ہُن کیوں رو رہیا ایں؟ دیکھ تیرا ابا وی آ گیا اے۔'' ایک عورت نے سہمے ہوئے بچے کو چپ کراتے ہوئے دلاسا دیا تھا۔ بچہ غالباً بہت دیر سے ابا کے آنے کی نوید سن رہا تھا، جبھی عبداللہ کو دیکھ کر مچلتے ہوئے اس

اپنے ننھے ننھے بازو اس کی طرف اٹھا کر روتے ہوئے ''ابا!'' پکارا۔
عبداللہ اس کے پاس آ گیا اور چارپائی پر بیٹھ کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ حیرت انگیز طور پر بچہ اس کے آتے ہی چپ ہو گیا تھا۔ بچہ پُرسکون ہو گیا تو عورتوں کا ہجوم بھی چھٹنے لگا۔ بچے کو تحفظ کا احساس دلانے کے لئے عبداللہ اسے اپنے ساتھ لگائے ہلکے ہاتھ سے تھپکتا رہا یہاں تک کہ بچہ اس کی گود میں سو گیا۔
عشاء کی نماز کے بعد عبداللہ، مولوی صاحب کے ساتھ گھر واپس آیا تو وہ ایسے ہنس کھیل رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور عبداللہ کو دیکھ کر روز کی طرح دوڑتا ہوا آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ پھر دونوں بازو اٹھا کر بولا۔
''ابا اُٹھاؤ۔'' اس معصوم فرمائش پر نہال ہو کر عبداللہ نے جھک کر اسے بازوؤں میں بھر لیا، پھر اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے پوچھا۔
''درد ہو رہا ہے؟''
''نہیں۔'' بچے نے زور سے سر کو دائیں بائیں جھلا کر کہا۔ عبداللہ اسے اٹھائے باورچی خانے میں آیا تو مولوی صاحب ہنس رہے تھے۔
''ہم تو بیٹا سمجھتے تھے، یہ تو پوتا نکلا۔ کیسے لہک لہک کر عبداللہ کو ابا کہہ رہا ہے۔''
''گاؤں کی عورتوں نے تو یوں ہی عبداللہ کو اس کا ابا کہہ دیا تھا پر اسے یہ لفظ اتنا پسند آیا ہے کہ دوپہر سے عبداللہ کو ابا، ابا کہتا اس کے آگے پیچھے گھوم رہا ہے۔'' ملّانی جی کو بھی اس کی معصومیت لطف دے رہی تھی۔
''صحیح تو ہے۔'' مولوی صاحب اب کچھ سنجیدگی سے بولے۔ ''اس نے جو پہلی شفقت محسوس کی، وہ عبداللہ کی تھی۔ دودھ کا پہلا گھونٹ اس کے حلق میں عبداللہ نے اُتارا۔ وہ پہلا گہوارہ جس میں اس پر نیند مہربان ہوئی، عبداللہ کی آغوش تھی۔ یہ جب بھی بیمار پڑا، عبداللہ راتوں کو جاگا، اسے انگلی پکڑ کر عبداللہ نے چلنا سکھایا۔ یاد ہے، اس نے ہم دونوں سے پہلے عبداللہ کو پہچاننا شروع کیا تھا۔ ماں تو کہہ نہیں سکتا، باپ ہی کہے گا۔'' پھر وہ سر جھکا کر بیٹھے عبداللہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''اسے پیدا کرنے والوں نے آپ ہی اس پہ سے اپنا حق اٹھا لیا۔ پر عبداللہ! تُو نے وہ حق اپنے نام کرا لیا ہے۔''
عبداللہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ملّانی جی نے کھانا سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ چپ کر کے کھانے لگا۔ ساتھ ہی نوالے بنا کر گود میں بیٹھے بچے کے منہ میں رکھ دیتا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ملّانی جی نے اپنے ہاتھ پھیلا کر عبداللہ سے کہا۔
''لا، اسے مجھے دے دے۔ سلا دیتی ہوں۔''
پر وہ عبداللہ کے بازو سے چمٹ کر منہ بسورتا بولا۔ ''ابا کے ساتھ سوؤں گا۔''
مولوی صاحب پھر ہنسنے لگے۔ ''ہاجرہ! باپ بیٹے کا بستر ساتھ بچھا دے۔''
وہ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹا تھا جبکہ دوسرا ہاتھ لیٹے بچے کے بالوں میں گردش کر رہا تھا اور آنکھیں

دُور آسمان پر جمی تھیں۔

'صحیح کہتے ہیں مولوی صاحب! اللہ کو بندے کا سجدہ کافی نہیں۔ وہ کھرے کھوٹے کی پہچان آزمائش سے کرتا ہے۔ سکّے کی طرح اس کی آزمائش کے بھی دو رُخ ہوتے ہیں۔ وہ کبھی لے کر آزماتا ہے اور کبھی دے کر۔ مجھے لے کر آزما چکا...... اب شاید دے کر آزمانا چاہتا ہے۔'

بچہ کسمسایا تھا۔ عبداللہ نے اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت کو دیکھ کر عبداللہ کو بے ساختہ اس پر پیار آ گیا۔ انگلی سے اس کے رُوئی کے گولے جیسے گال کو چھو کر وہ سوچنے لگا۔

'شاید اس کی ماں نے اسے اس خوف سے خود سے الگ کر دیا کہ دنیا اس سے بچے کے باپ کا نام پوچھے گی۔ پر کیا اس نے کبھی سوچا بھی تھا کہ ایک دن دنیا خود اس کے ساتھ باپ کا نام منسوب کر دے گی۔ اس نے تو آزمائش سے جان چھڑا لی، پر میں اس آزمائش کو مرتے دم تک خود سے الگ نہیں ہونے دوں گا۔' عبداللہ نے اس کے پٹی میں جکڑے ماتھے پر سے بال سمیٹ کر نرمی سے اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

''تم میرے بیٹے ہو اور اللہ سے کہنا کہ قیامت کے دن تمہیں تمہاری ماں کے نام سے نہیں بلکہ میرے نام سے پکارے۔'' وہ مسکراتا ہوا اس کے کان میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔

❁❁❁

مریم کو لگ رہا تھا، آج اس کی فتح کا دن ہے۔ آج اس نے ملیحہ کو شکست دے دی تھی۔ نورالہدیٰ کے بچے کو جنم دینے کا اعزاز ملیحہ کے نہیں بلکہ مریم کے حصے میں آیا تھا اور وہ اس اعزاز کو پا کر بہت خوش تھی۔ صبح اس نے ایک صحت مند بچی کو جنم دیا تھا۔ وہ شام کو ہی ہاسپٹل سے گھر آئی تھی اور خوشی سے بے حال وہ دیر تک نورالہدیٰ سے اپنی بیٹی کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ نورالہدیٰ آنکھیں بند کیے بیڈ کراؤن سے سر ٹکائے نیم دراز تھے۔ اپنے خیالات کی رو سے چونکے تو احساس ہوا بہت دیر سے مریم کی آواز نہیں آ رہی۔ انہوں نے سر جھکا کر اپنے سینے پر سر رکھ کر لیٹی مریم کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں وہ کب سو گئی تھی۔ انہوں نے اسے بہت آرام سے تکیے پر لٹا دیا۔ پھر گھوم کر بیڈ کے دوسری طرف رکھے بے بی کاٹ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ اپنی بیٹی کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں ملیحہ کی تشنگی بھری زندگی پر افسوس ہوتا تھا، تکلیف ہوتی تھی...... لیکن آج انہیں خوف آ رہا تھا۔ بابا جان کی طرح وہ بھی ایک بیٹی کے باپ بن گئے تھے اور انہیں اس خیال سے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں انجانے میں ان سے بھی اپنی بیٹی کے ساتھ وہ زیادتیاں نہ سرزد ہو جائیں جو بابا جان سے ملیحہ کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ ان کا دل کانپ رہا تھا پر وہ کسے اپنے خوف کے بارے میں بتاتے۔ انہوں نے سنبھال کر بچی کو بازو میں لے کر یوں خود میں بھینچ لیا جیسے کوئی غیبی طاقت ان کی بیٹی کو ان سے چھین لے گی۔ پھر وہ اسے سینے میں چھپائے کمرے سے نکل گئے۔ مریم کی آنکھ کھلی تو نورالہدیٰ کمرے میں نہیں تھے اور لائٹ بھی جل رہی تھی۔ پر وہ دھیان دیئے بغیر ذرا سا اوپر ہو کر کاٹ میں دیکھنے لگی۔

ٹ کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا پھر خیال آیا نورالہدیٰ بچی کو ساتھ لے گئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھی اور بچی کو دیکھنے نیچے آ گئی۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا مگر بابا جان کے کمرے کے ے کے نیچے روشنی کی لکیر کو دیکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ بابا جان جاگ رہے ہیں تو نورالہدیٰ بھی ہوں گے۔ ویسے بھی ابھی دس ہی تو بجے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر بابا جان کے دروازے پر دستک دی۔

"آجاؤ!" کی آواز پر دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ بابا جان بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اسے ا اٹھ بیٹھے۔

"ارے یہ کیا بیٹا! ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ کے لئے کہا ہے نا۔ پھر نیچے کیوں آئیں؟"

"میں نے سوچا، تانیہ کو چیک کرلوں۔ کہیں اس کی فیڈ کا ٹائم نہ ہو گیا ہو..... نورالہدیٰ یہاں نہیں ہے؟"

ے میں نوالہدیٰ کو نہ پا کر اس نے پوچھا۔ بابا جان نے تھکے تھکے انداز میں سانس بھر کر کہا۔

"وہ یہاں کیوں آئے گا؟"

"مگر نورالہدیٰ اور تانیہ دونوں کمرے میں نہیں ہیں تو میں نے سوچا....." پریشانی سے بولتی وہ ایک دم چپ ا۔ اسے یہ سوچنے میں بس ایک سیکنڈ لگا تھا کہ نورالہدیٰ کہاں ہوں گے اور اس متوقع جگہ کو سوچ کر اس کی یاں چڑھ گئیں۔ وہ بندوق سے نکلی گولی کی طرح ملیحہ کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

"کیا ہوا مریم؟" بابا جان اس کے بدلتے تیور دیکھ کر پریشانی سے بولے پر وہ اَن سنی کرتی کمرے سے ئی تو بابا جان بھی پریشان سے اس کے پیچھے آ گئے۔ کمزوری کے باوجود کس طرح اس نے تیز قدموں سے یاں چڑھ کر زینے پر قدم رکھے تو آگے بے قفل دروازہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ غصے میں کھولتے ہوئے اس دھاکے سے دروازہ کھول دیا۔ نورالہدیٰ کارپٹ پر ٹانگیں پھیلائے صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ار بچی ان کے بازوؤں میں تھی۔ یہ بھی اچھا تھا کہ مریم نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا ورنہ اگر وہ کھلے زے سے سننے کی کوشش کرتی تو اسے پتہ چل جاتا کہ پچھلے آدھے گھنٹے سے نورالہدیٰ، بچی کے ساتھ ملیحہ کی ا کر رہے تھے۔

وہ خونخوار نگاہوں سے انہیں گھور رہی تھی۔ پھر وہ آگے بڑھی اور بچی کو ان کی گود سے جھپٹ لیا۔ وہ جس ا سے پلٹی تھی، نورالہدیٰ کو ڈر ہوا، وہ سیڑھیوں پر گر نہ پڑے اور وہ فوراً اُٹھ کر بھاگے۔ ان کا خدشہ صحیح نکلا۔ ہر آئے تو بچے کو ایک بازو میں سنبھالے وہ ریلنگ تھام کر جھکی جا رہی تھی۔ اسے بہت زور سے چکر آئے مگر بابا جان نے اسے سنبھال لیا تھا۔

"مریم! کام ڈاؤن۔" نورالہدیٰ پاس آ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے رسان سے بولے تھے۔ مریم نے کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ساتھ ہی بابا جان سے بازو چھڑاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھی مگر نورالہدیٰ نے اس کا بازو

جکڑ کر روک دیا۔

''فار گاڈ سیک مریم! اپنی کنڈیشن کا تو خیال کرو۔ ابھی تمہاری ڈلیوری کو چوبیس گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے۔''

''تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے بھڑک کہا تو نورالہدیٰ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

''ٹھیک ہے۔ مگر مجھے اپنی بیٹی کی فکر تو کرنی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ تم اسے بھی اپنے ساتھ سیڑھیوں پر گرا لو، اسے مجھے دے دو۔''

وہ جانتی تھی کہ نورالہدیٰ، بچی لئے بغیر اس کا بازو نہیں چھوڑیں گے اس لئے اُس نے بچی ان کی طرف بڑھا دی۔ نورالہدیٰ نے بچی کو پکڑتے ہی اس کا بازو چھوڑ دیا اور وہ ان کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں اُترنے لگی تو اس کی حالت کے پیشِ نظر بابا جان نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ مریم ان کے سہارے ایک ایک کر کے سیڑھیاں اُترتی لاؤنج میں آ گئی۔ بابا جان نے آرام سے اسے صوفے پر بٹھا کر نورالہدیٰ کو دیکھا جو بچی کو صوفے پر لٹا رہے تھے۔ بابا جان ابھی تک صورتِ حال کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ وہ حیران پریشان دونوں میاں بیوی کی شکلیں دیکھنے لگے۔ بچی کو لٹا کر نورالہدیٰ، مریم کی طرف آئے جو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔

''دیکھو مریم!'' نورالہدیٰ نے اس کی کلائیاں تھام کر کچھ کہنا چاہا پر وہ ان کے ہاتھ جھٹک کر اپنی جگہ سے اُٹھتی دُور جا کھڑی ہوئی۔

''اب اور کیا دکھاؤ گے نورالہدیٰ! جو دیکھا کیا وہ کافی نہیں تھا؟''

''تم اوور ری ایکٹ کر رہی ہو۔'' وہ انگلی اٹھا کر بولے۔ مریم غرائی۔

''میرا شوہر غیر لڑکی کے کمرے میں راتیں گزارتا ہے اور تمہیں لگتا ہے، میں اوور ری ایکٹ کر رہی ہوں؟'' اس کے انداز پر نورالہدیٰ دنگ رہ گئے پھر تیز لہجے میں بولے۔

''ہاں۔ مگر اس کمرے میں کوئی لڑکی نہیں ہوتی۔''

وہ پھٹ پڑی۔ ''یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ لڑکی کمرے میں نہیں، تمہارے دل و دماغ میں رہتی ہے۔ اگر کمرے میں ہوتی تو ہاتھ پکڑ کر نکال دیتی۔ مگر اسے تمہارے دل سے کس طرح نکالوں؟ صرف اس کی وجہ سے میرا ہر پل عذاب میں گزرتا ہے۔ وہ تمہاری محبت میں میری حصے دار ہے۔ تمہاری سوچوں میں میری حصے دار ہے۔ اور تو اور میری راتوں میں بھی اس کا حصہ بنتا ہے...... نورالہدیٰ! تم کہیں تو مجھے پورے ملے ہوتے۔'' آخر میں اس کی آواز دُکھ میں ڈوب گئی تھی جسے محسوس کر کے نورالہدیٰ نرم پڑ گئے۔

''میں نے تمہیں دھوکا تو نہیں دیا ہے۔ تم جانتی تھیں میں بٹا ہوا انسان ہوں۔ اب چاہے عذاب ہی سہی پر اس عذاب کو تم نے اپنی مرضی سے قبول کیا تھا۔ پھر اب شکایت کیوں؟''

ان کی بات کاٹ کر مریم کاٹ دار لہجے میں بولی۔ ''اس وقت میں نے سوچا تھا کہ تم کب تک یادوں کی قبر

کے مجاور بنے رہو گے۔ مجھے پا کر آخر ایک دن اسے بھول ہی جاؤ گے۔ مگر نہیں، میرے ساتھ ہو کر بھی تمہیں اس کی کمی ستاتی ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، میں محسوس نہیں کر سکتی؟.....ان ڈیڑھ سالوں میں ایک پل کے لئے بھی تم مجھے میرے ہو کر نہیں ملے۔ تمہارا جسم میرے ساتھ ہوتا ہے پر روح اس کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے۔ تمہاری آنکھیں مجھے دیکھتی ہیں پر نظر کو اس کی تلاش رہتی ہے۔ میری آواز صرف تمہارے کانوں تک پہنچتی ہے مگر سماعت میں اس کی آواز گونجتی ہے۔ سب بتایا تھا تم نے، پر یہ کب کہا کہ مجھے سوکن برداشت کرنی ہوگی؟''

بابا جان اتنا تو سمجھ چکے تھے کہ وہ دونوں ملیحہ کے نام پر جھگڑ رہے ہیں پر جس طرح سے مریم بول رہی تھی، انہیں بہت برا لگ رہا تھا لیکن انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح میاں بیوی کے درمیان دخل اندازی کر کے مریم کو چپ ہو جانے کے لئے کہہ دیں۔

نورالہدیٰ کو بھی اس کا انداز ناگوار گزر رہا تھا۔ انہیں شدید غصہ آیا۔

''شٹ اپ مریم! کم از کم اتنا خیال تو کر لو، یہ سب ایک مری ہوئی لڑکی کے بارے میں کہہ رہی ہو۔''

''مری ہوئی لڑکی۔'' وہ کہہ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ''تمہارے دل پر اس کا قبضہ ہے، تمہارے دماغ پر، تمہاری روح پر، تمہارے احساس پر اس کی حکومت ہے اور تم اسے مری ہوئی لڑکی کہتے ہو۔ کیا فائدہ ایسے مرنے کا اگر وہ تمہاری زندگی سے نہیں ٹلتی؟ اینی وے تم شوق سے اس کی یاد میں آنسو بہاؤ لیکن اگر تم نے دوبارہ میری بیٹی کو اس مقبرے میں لے جانے کی جرأت کی تو یاد رکھنا میں بہت برا کروں گی۔'' زہر بھرے لہجے میں بول کر اس نے بچی کو اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھتی اپنے رُوم میں چلی گئی۔ مریم کے الفاظ پر نورالہدیٰ کو بہت تکلیف ہوئی تھی۔ مگر بابا جان کو دیکھ کر وہ شرمندہ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کسی نے انہیں بہت اذیت دی ہو۔ وہ آہستہ سے گویا ہوئے۔

''آئی ایم سوری بابا جان!'' تین سال میں پہلی بار نورالہدیٰ کے لہجے میں بابا جان کے لئے اتنا گداز آیا تھا۔ مگر بابا جان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ کچھ محسوس کر پاتے۔ انہوں نے نورالہدیٰ کے شرمندہ چہرے کو دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

''تمہاری کیا غلطی ہے؟'' پھر سست قدموں سے چل کر اپنے کمرے میں آ گئے اور نورالہدیٰ لاؤنج میں تنہا کھڑے رہ گئے۔ مگر ان کا کمرے میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انہوں نے وہیں صوفے پر لیٹ کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

صبح آفس کے لئے تیار ہونے وہ کمرے میں گئے تو بھی مریم کی طرف دیکھا تک نہیں جو رات بھر ان کی منتظر رہی تھی اور منہ پھیر کر تیار ہوتے رہے۔ پھر جاتے جاتے وہ بیڈ کے پاس آئے اور جھک کر اپنی بیٹی کو پیار کیا اور باہر نکل گئے۔ اپنا یوں نظر انداز ہونا مریم کو بری طرح سے کھلا تھا۔ ان کی گاڑی گیٹ سے باہر جاتے ہی وہ اُٹھ کر نیچے آ گئی۔

''بہادر!'' اس کی بلند آواز پر بہادر سارے کام چھوڑ کر لاؤنج میں بھاگا آیا۔
''جی بیگم صاب!''
''ملیحہ کے کمرے کی چابی دو۔''
بہادر گڑبڑاہٹ میں کچھ دیر چپ سارہ گیا۔ کل رات کا جھگڑا تو اس کے علم میں نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا کہ مریم، ملیحہ کو ناپسند کرتی ہے۔ پھر اس کے تیور بھی ایسے تھے کہ وہ مشکوک ہو گیا۔
''میرے پاس تو نہیں ہے۔ صاب کے پاس ہوتی ہے۔ آپ ان سے مانگ لیں۔'' وہ سوچ کر بول رہا تھا۔
''اُفوہ! کوئی ڈپلیکیٹ چابی تو ہو گی۔''
''ضرور ہو گی بیگم صاب! پر ہمیں نہیں معلوم۔'' اس بار وہ پُراعتماد تھا۔ مریم کو یقین کرنا پڑا۔ اس نے سوچا تھا، ملیحہ کے کمرے کو تہس نہس کر دے گی۔ مگر چابیاں نہ پا کر اس پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی۔ سامنے دیوار پر لگی تصویروں پر نظر پڑی تو وہ جنونی انداز میں آگے بڑھی، پھر ہر اُس فریم کو اُتار کر پھینکنے لگی، جس میں ملیحہ نظر آ رہی تھی۔
''یہ آپ کیا کر رہی ہیں بیگم صاب؟'' بہادر گھبرا کر بولا۔ پل بھر کو ہاتھ روک کر اس نے پلٹ کر دیکھا، پھر غراہٹ بھری آواز میں بولی۔
''ملیحہ کا نام اس گھر کی دیواروں سے کھرچ کر مٹا رہی ہوں۔'' اور ہاتھ میں پکڑا فریم سامنے دیوار پر دے مارا۔ گھر کے سب نوکر جمع ہو گئے تھے پر کسی میں ہمت نہیں تھی مریم کو روکنے کی۔ وہ سب سٹپٹائے ہوئے تھے اور بہادر کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے۔ توڑ پھوڑ کی آوازوں پر بابا جان کمرے سے نکل کر آئے تھے پھر مریم کو تصویریں اتار کر پھینکتے دیکھ کر وہ اُلجھن بھرے انداز میں بولے۔
''یہ تم کیا کر رہی ہو مریم؟'' ان کا پیر کسی چیز پر پڑا تھا۔ قدم پیچھے کر کے انہوں نے نیچے دیکھا، وہ ملیحہ کے بچپن کی تصویر تھی جس کا شیشہ اب ٹوٹ چکا تھا۔ جھک کر تصویر اٹھاتے انہوں نے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرا، پھر باقی تصویروں پر نظر ڈالی۔ بابا جان کی رگیں تن گئیں۔ انہوں نے سرد نظروں سے مریم کو دیکھا جو خونزدہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر پتھریلے لہجے میں بولے۔
''اگر تم نے دوبارہ میری بیٹی کی تحقیر کی جرأت کی تو وہ تمہارا قصرِ فاروقی میں آخری دن ہو گا۔'' بہادر کو اس پل ان میں پرانے اظہر فاروقی کی جھلک نظر آئی تھی۔ مریم کے ہاتھ پہلے ہی انہیں دیکھ کر رک چکے تھے اور اب ان کی وارننگ سن کر اس نے وہاں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بہادر سے بولے۔
''ان تصویروں کو لے جا کر ان کی حالت ٹھیک کرواؤ پھر انہیں ملیحہ کے کمرے میں رکھ دینا۔ بلکہ میرے رُوم کے علاوہ جہاں جہاں بھی ملیحہ کی تصویریں لگی ہیں، انہیں اُتار کر ملیحہ کے کمرے میں رکھ دو۔''
''جی کرنل صاب!'' اس نے ان کے ہاتھ سے ٹوٹا ہوا فریم پکڑ کر کہا تھا۔

نورالہدیٰ ہر روز کے مقابلے میں آج جلدی آ گئے تھے حالانکہ آج تو ان کا آفس جانے کا ارادہ ہی نہیں تھا، سوچا تھا، پورا دن مریم اور تانیہ کے ساتھ گزاریں گے پر رات کے ہنگامے کے بعد ان کا مریم سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا اس لئے انہیں یہ بہتر لگا کہ آفس چلے جائیں۔
لاؤنج میں قدم رکھتے ہی انہیں کسی تبدیلی کا احساس ہوا پر انہوں نے دھیان نہیں دیا اور کمرے میں چلے آئے۔ مریم چادر لئے بیڈ پر لیٹی تھی، انہیں دیکھ کر بھی نہیں اُٹھی۔ نورالہدیٰ نے بھی اسے نظرانداز کر دیا اور تانیہ کو پیار کرنے کے بعد فریش ہوئے اور لاؤنج میں آ بیٹھے جہاں بابا جان پہلے سے موجود اخبار پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے آواز دے کر بہادر کو پانی لانے کو کہا۔ پانی کا گلاس اُنہیں پکڑا کر جانے کے بجائے وہ وہیں کھڑا رہا اور بولا۔

"آج اس گھر میں اتنا ہنگامہ ہوا جتنا کبھی نہیں ہوا۔"
"بہادر! تم جاؤ۔" بابا جان اخبار چھوڑ کر بولے۔
"ایک منٹ۔" نورالہدیٰ کی چھٹی حس نے اشارہ دیا کہ ہنگامے کا تعلق مریم سے ہے۔ "ہاں بولو، کیا ہوا تھا؟"

اور بہادر شروع ہو گیا۔
"آپ کے جانے کے بعد بیگم صاب نے بی بی صاب کی تصویریں لاؤنج کی دیوار سے اُتار اُتار کر پھینک دیں اور ان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بھی کیں۔ پھر کرنل صاب نے آ کر اُنہیں روکا پر تب تک بہت ساری تصویریں پھینک چکی تھیں۔ کئی کے تو فریم بھی ٹوٹ گئے۔"
اب نورالہدیٰ نے نوٹ کیا کہ دیوار پر سے کئی تصویریں غائب تھیں اور ان کی یادداشت کے مطابق ان سب تصویروں میں ملیحہ تھی۔
"وہ تصویریں کہاں ہیں جن کے فریم ٹوٹ گئے؟"
"وہ تو صاب! نئے لگوا لئے اور بی بی صاب کے کمرے میں بھی رکھ دیئے۔"
"اس کے کمرے میں کیوں رکھے؟ واپس دیوار پر کیوں نہیں لگائے؟" نورالہدیٰ ناگواری سے بولے۔
"کرنل صاب نے کہا تھا، بی بی صاب کی تصویریں سارے گھر سے اُتار کر ان کے کمرے میں رکھ دو۔"
"کیوں؟" وہ بہادر کی بات سن کر حیرت سے بابا جان سے بولے۔
"کیونکہ میں مریم کو دوبارہ اس بات کا موقع نہیں دینا چاہتا۔ اس جھگڑے کو یہیں ختم ہو جانا چاہیئے۔"
قطعیت سے بولتے ہوئے انہوں نے بہادر کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا اور وہ سر ہلا کر چلا گیا۔
"میں ملازموں سے بھی کہہ دوں گا اور خود بھی خیال رکھوں گا۔ تم بھی ذرا احتیاط کرنا کہ ملیحہ کا نام نہ لو۔ کیونکہ اگر مریم نے سنا تو مشتعل ہو سکتی ہے اور میں اپنے ہی گھر میں اپنے سامنے اپنی بیٹی کے لئے مغلظات

نہیں سن سکتا۔'' نورالہدیٰ ان کی آواز میں غصہ محسوس کر رہے تھے مگر انہیں یہ سب بالکل پسند نہیں آیا اور ناراضی سے بولے۔

''وہ مرتو چکی ہے، اب اس کی یاد بھی مٹانا چاہتے ہیں۔ بھلا یہ جھگڑا ختم کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟''

ان کی بات پر بابا جان نے سر جھکا لیا، پھر خود کو کمپوز کر کے بولے۔ ''ملیحہ کا نام زندہ رکھنے کے لئے ہمیں سب یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جانتے ہو کہ ہم دونوں سو بار بھلا کر بھی اسے نہیں بھول سکتے...... یادیں دل میں ہوتی ہیں، دیوار پر نہیں۔ چاہے دیوار پر ملیحہ کی تصویر لگی رہے، یا نہ رہے، مجھے یا تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر مریم کو فرق پڑے گا۔ ذرا سوچو! کل جو کچھ ہوا، اس وقت تو تانیہ بھی وہاں موجود تھی۔ آج وہ ناسمجھ ہے، کل سمجھ دار ہو جائے گی۔ کیا تم اپنی بیٹی کے سامنے اس نوعیت کا جھگڑا افورڈ کر سکتے ہو؟ میں یہ سب مریم کے لئے نہیں، تانیہ کے لئے کر رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کا ذہن خراب ہو۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ میری ملیحہ لوٹ آئی ہے...... میں دوسری بار اپنی بیٹی کو تکلیف نہیں دے سکتا۔'' انہوں نے نم لہجے میں کہا تھا

نورالہدیٰ خاموش رہے مگر ان کی خاموشی میں متفق ہونے کا اشارہ تھا اور اس طرح اپنے انتقال کے صرف تین سال بعد ملیحہ کا ذکر قصرِ فاروقی میں شجرِ ممنوعہ بن کر رہ گیا۔

قت اپنی دھیمی رفتار سے آگے بڑھتا رہا، یہ دیکھے بغیر کہ پیچھے کیا کچھ رہ گیا۔ ان گزرتے سالوں میں
لہ گاؤں والوں کے لئے ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ حالانکہ گاؤں والوں کو اب بھی اُس کا مجذوب کی سی حالت
اؤں آنا یاد تھا مگر اُس یاد میں بھی تعظیم تھی۔ اب مولوی عبدالخالق تہجد کے لئے خود نہیں اُٹھتے بلکہ عبداللہ
جگاتا تھا۔ پھر اُن کے ساتھ ہی تہجد کی نماز ادا کرتا۔ اس کے بعد مولوی صاحب جائے نماز پر بیٹھے ذکر
تے رہتے اور جب فجر کی اذان دینے مسجد پہنچتے، عبداللہ جھاڑو لگا کر دریاں بچھا چکا ہوتا۔ نماز کے بعد
ت عبداللہ کا معمول تھی۔ وہ خوش الحانی سے تلاوت کرتا۔ مولوی صاحب پاس بیٹھے جذب کے عالم میں
جاتے۔ اس کی آواز میں بہت سوز تھا۔ جس کے کانوں میں بھی اس کی آواز جاتی، وہ رُک جاتا۔ پھر جب
وہ تلاوت ختم نہ کر لیتا، اپنی جگہ سے ہل نہیں پاتا۔ پھر وہ دونوں اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کی طرف لوٹ
، مگر ان میں اُلجھ کر نماز سے غافل نہ ہوتے۔

صر کی نماز کے بعد عبداللہ، حیدر لوہار کی دکان پر جانے کے بجائے گھر آ جاتا۔ کیونکہ گاؤں کے بچوں کو
اور دنیاوی تعلیم دینا اب مکمل طور پر اس کی ذمہ داری تھی۔ انہی بچوں کے درمیان وہ بچہ بھی بیٹھا فیض پایا
، جسے اب عبداللہ اپنا بیٹا کہتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی تربیت کے لئے بہت فکر مند رہا کرتا۔ بہت پیار اور
وجہ کے ساتھ ایک بہترین انسان کے ہاتھوں اس کی پرورش ہو رہی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد عبداللہ گاؤں
کی روزانہ بیٹھک میں بھی شامل ہوتا۔ مگر وہ اتنا کم سخن ہو گیا تھا کہ اس کی آواز اس بیٹھک میں کم کم ہی
تھی۔ پانچوں وقت کی نماز میں اس کا بیٹا بہت شوق سے اس کے ساتھ جماعت میں شامل ہوتا۔ مگر یہ
اُسے بور کر دیتی تھی اور وہ اکثر بیٹھک کے دوران عبداللہ کی گود میں لیٹ کر سو جاتا...... زندگی ایک
ل ڈھب پر چل پڑی تھی۔ خوشی کا احساس تو ہمیشہ کے لئے مٹ چکا تھا مگر زندگی میں اب سکون تھا۔ اب
کا سودا، عبداللہ کو نڈھال نہیں کرتا تھا۔

رد تو اب بھی ساتھ ساتھ تھا پر اس درد کے ساتھ جینا آ گیا تھا۔ مگر کبھی کبھی یہ درد ضبط کو توڑنے لگتا جب وہ
، ہی سامنے آ جاتی۔ مگر اس کے بعد وہ پھر سے پُرسکون ہو جاتا۔ وقت کے سیدھے راستے پر زندگی کی

ہموار رفتار کو دیکھ کر عبداللہ کو یقین ہونے لگا تھا کہ اب کوئی موڑ نہیں آئے گا۔ لیکن جب ہمیں لگتا ہے کہ زندگی میں کوئی موڑ نہیں آئے گا تو اگلے قدم پر ہی ایک موڑ ہمارا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔

عبداللہ معمول کے مطابق دکان پر آیا تو وہاں آج کافی ہلچل تھی۔ دو لڑکے مل کر لوہے کے بڑے سے گیٹ کو سوزوکی کے پچھلے حصے میں لاد رہے تھے۔ دکان کے اندر حیدر لوہار اس کا منتظر تھا جس کے بازوؤں کی طاقت عمر بڑھنے کے ساتھ گھٹ گئی تھی۔

''آجا پتر! تیرا ہی انتظار ہے۔'' وہ عبداللہ کو دیکھ کر بولے۔ ''چودھری نواز نے گیٹ اُٹھانے کے لئے بندے بھیجے ہیں۔ تُو ان کے ساتھ جا اور گیٹ اپنے ہاتھوں سے لگا کر آنا۔ منور کے ہاتھ میں ہتھوڑی نہ دینا۔ وہ دیوار ہی توڑ دے گا۔''

عبداللہ مسکرا کر سر ہلاتا باہر آ گیا۔ گیٹ لادا جا چکا تھا۔ وہ سوزوکی کے پچھلے حصے میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ سوزوکی چل پڑی تو منور خوشامدی لہجے میں بولا۔

''ماسٹر جی! آج تو ابا ساتھ نہیں۔ گیٹ میں لگا لوں؟''

''نہیں۔''

عبداللہ کی بات پر وہ خفگی سے بولا۔ ''یہ کیا ماسٹر جی! کام کروں گا نہیں تو سیکھوں گا کیسے؟''

عبداللہ نے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا جو نوعمر لڑکے سے جوان مرد بن چکا تھا مگر اس کا لاابالی پن اب بھی وہی تھا۔ ''تمہارے ابا نے کہا ہے کہ منور علی کے ہاتھ میں ہتھوڑی نہ دی جائے۔ اب اس میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟''

منور علی حسرت بھرا سانس کھینچ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

گیٹ چودھری نواز کی حویلی کے ساتھ خالی پلاٹ کی چار دیواری میں لگانا تھا جس پر کافی عرصے سے تنازع چل رہا تھا۔ سوزوکی پلاٹ کی حدود کے باہر جا رُکی تو چودھری نواز کی جیپ کے ساتھ گن مین بھی باہر موجود تھے۔ اس کا مطلب چودھری نواز پلاٹ میں موجود تھا۔ عبداللہ کے ساتھ منور نے گیٹ سوزوکی سے اُتروایا، پھر دونوں اسے اٹھائے اس جگہ پر لے آئے، جہاں گیٹ لگنا تھا اور کچھ دیر کے بعد اپنا کام شروع کر دیا۔

''میرا بیٹا شروع سے ہی شہر کے ہاسٹل میں رہا ہے۔ میرے کہنے پر وہ گاؤں آنے کو راضی تو ہو گیا مگر حویلی میں رہنے کے لئے تیار نہیں۔ کہتا ہے، اسے یہاں کا ماحول پسند نہیں، اپنے لئے شہری طرز کا بنگلہ بنوانا چاہتا ہے۔ یہ زمین اسی کے لئے خریدی تھی۔ پر وہ حرام خور نمبردار، نقد رقم وہ بھی یکمشت لے کر مکر گیا کہ پیسہ تو دیکھا تک نہیں۔''

''چھوڑیئے چودھری صاحب! اب تو عدالت نے آپ کے حق میں فیصلہ سنا دیا ہے اور یہ زمین بھی قانونی طور پر آپ کی ہوئی۔ مگر اگلی بار لین دین کرتے وقت کاغذی کارروائی کا خیال رکھئے گا۔ یہ آپ کے قانونی تحفظ کے لئے ضروری ہے۔''

"صحیح کہہ رہے ہیں وکیل صاحب! پکے کاغذ کے بغیر لین دین کرنا ہی نہیں چاہئے۔ حلق میں پھنس جاتا ہے۔ خیر ابھی تو میں نے پلاٹ کے گرد دیوار اٹھا کر پلاٹ بند کر دیا ہے۔ شہریار پڑھائی پوری کر کے آئے گا تو ہنا مرضی کا بنگلہ بنوا لے گا۔"

عبداللہ ہتھوڑی کی مدد سے گیٹ دیوار میں فٹ کر رہا تھا اور وہ لوگ باتیں کرتے اس کے پاس سے گزر ئے مگر ایک شخص سر جھکائے آہنی فریم کو دیوار میں ٹھونکتے عبداللہ کے چہرے کی ذرا سی جھلک پا کر ہی ساکت ہو گیا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلائے عبداللہ کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کی کیفیت تھی۔ پھر اس نے سرسراتی آواز میں ایک نام پکارا۔

"وجدان!"

عبداللہ کا ہتھوڑی والا ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا۔ اُسے یہ نام جانا پہچانا سا لگا تھا۔ سوچتے ہوئے اس نے ہاتھ نیچے کیا اور سر اُٹھا کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ عبداللہ کا چہرہ اب اس کے سامنے تھا۔ بے یقینی، یقین میں بدلا تو آنکھوں میں نمی آ گئی۔ بڑے جذباتی انداز میں اُس نے بڑھ کر عبداللہ کا بازو تھامتے ہوئے اپنے مقابل کھڑا کیا اور اس سے لپٹ گیا۔ عبداللہ بت کی طرح اس کے حلقے میں کھڑا تھا۔ نہ اُس نے اس شخص کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی، نہ اس کے گرد اپنے بازو پھیلائے۔

"کہاں کہاں تمہیں نہیں ڈھونڈا اور تم یہاں چھپے بیٹھے ہو۔" وہ عبداللہ کے گلے لگا کہہ رہا تھا۔ پھر الگ ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "پتہ ہے کتنا پریشان کیا تم نے...... اور تم یہاں آرام سے بیٹھے ہو؟"

عبداللہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا، جو اس کا چہرہ ہاتھوں میں لئے شکایت کر رہا تھا۔ اب اسے بھی عبداللہ کی بے گانگی کا احساس ہوا۔ اس کے چہرے پر سے ہاتھ ہٹاتے اس نے گہری نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ پاس کھڑا منور علی حیرت سے باری باری ان دو لوگوں کو دیکھ رہا تھا، جو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ شخص ایک دم سے حیران نظر آنے لگا۔

"وجدان! تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں آفاق ہوں۔ تمہارا دوست۔"

منور علی کو دوست سے دوست کا اپنا تعارف کرانا عجیب لگا تھا۔

"آفاق۔" عبداللہ نے اس طرح یہ نام لیا جیسے کوئی بھولی بات یاد آئی ہو۔ پھر اس طرح سے پوچھا "کیسے ہو؟" جیسے کل کے بعد آج مل رہا ہو۔

ایک قدم پیچھے لے کر اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے آفاق کی آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس سوال کا جواب دینے کے لئے بہت کچھ کہنا ہے اور بہت کچھ سننا ہے اس لئے فی الحال اس سوال کو

رہنے دو، میں تمہیں پاپا سے ملاتا ہوں۔'' پھر اس نے کچھ دُور چودھری نواز کے ساتھ کھڑے باتیں کرتے منیر حسن کو آواز دی۔ ''پاپا!''

انہوں نے آفاق کی طرف دیکھا۔ وہ عبداللہ کی پشت پر تھے، اس لئے وہ اسے دیکھ نہ پائے مگر ان کے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے دھیرے سے عبداللہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ان کی طرف گھما دیا۔ انہیں وجدان کو پہچاننے میں بس ایک پل لگا تھا اور اگلے ہی پل وہ شاکڈ رہ گئے۔ وہ تیزی سے آگے آئے اور وجدان کو گلے لگا لیا مگر فوراً ہی الگ ہو کر اس طرح اسے دیکھنے لگے جیسے یقین نہ آیا ہو کہ انہوں نے وجدان کو گلے لگایا ہے۔

''آپ ماسٹر عبداللہ کو جانتے ہیں؟'' چودھری نواز نے انہیں جذباتی انداز میں عبداللہ کے چہرے کو ہاتھ سے چھوتے دیکھ کر پوچھا۔ ان کی آواز میں استفسار کے بجائے حیرت تھی۔ منیر حسن بولے۔

''نہیں۔ مگر میں وجدان مصطفیٰ کو جانتا ہوں اور یہ ہے وجدان۔'' انہوں نے وجدان کے شانے پر بازو پھیلاتے ہوئے چودھری نواز سے کہا جو منور علی کی طرح اپنی حیرت کو چھپا نہ پائے تھے۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ماسٹر عبداللہ ہے۔ مولوی عبدالخالق کا...... ہوں......'' یوں پُرسوچ انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئے جیسے سوچ رہے ہوں، مولوی عبدالخالق سے عبداللہ کا کیا رشتہ بتائیں۔ آفاق نے کہا۔

''ہمیں غلط فہمی نہیں ہوئی چودھری صاحب! مگر لگتا ہے آپ طویل مدت سے کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ جسے آپ ماسٹر عبداللہ کہہ رہے ہیں، وہ میرا دوست وجدان مصطفیٰ ہے۔ ہم دونوں لاء کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ کافی سال پہلے یہ لاپتہ ہو گیا تھا۔ سب نے اسے بہت تلاش کیا مگر یہ ملا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ اس کی تلاش روک دی گئی۔''

منیر حسن مزید بولے۔ ''میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں چودھری صاحب! جو آپ نے خاص طور پر مجھے کراچی سے بلوا لیا۔ ورنہ ہمیں کیسے پتہ چلتا کہ جسے دس سال سے ڈھونڈ رہے ہیں، وہ آپ کے گاؤں میں ہے۔'' وہ لوگ وجدان کے بارے میں بات کر رہے تھے مگر وجدان ایسے کھڑا تھا جیسے اس معاملے سے تعلق ہی نہ ہو۔ وہ تو کسی کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن جب منیر حسن نے دس سال کا ذکر کیا تو چونک گیا۔

''دس سال......'' اس نے آہستہ سے دہرایا پھر افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ''ابھی صرف دس سال گزرے ہیں؟''

منیر حسن اسے دیکھ کر بولے۔ ''صرف دس سال نہیں کہو وجدان! دس...... سال..... کہو۔'' وہ دس سال پر زور دے کر بولے۔ آفاق باتیں کرنے کو بے تاب ہو رہا تھا، فوراً منیر حسن سے بولا۔

''پاپا! باقی باتیں وجدان کے گھر چل کر کریں گے۔ چلو وجدان!'' آخر میں وہ وجدان سے بولا۔

"میں پہلے گیٹ لگا لوں، پھر چلتے ہیں۔" اپنا نام سن کر وجدان نے نارمل انداز میں کہا تھا۔ اس کا "نارمل" ہونا ہی تو آفاق کو چونکا رہا تھا پھر بھی اس نے شکر ادا کیا کہ کم از کم وہ اپنے نام کو تو قبول کر رہا ہے۔ اب منیر حسن بھی اس کے نپے تلے انداز کو نوٹ کر رہے تھے۔

"معذرت چاہتا ہوں چودھری صاحب! مگر اب وجدان کے پاس سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہے گا۔ بہر حال آپ کا بہت شکریہ۔ آخر ہمیں بلایا تو آپ ہی نے تھا۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں وکیل صاحب! ہم نے تو آپ کو اپنے کام سے بلایا تھا...... آپ کا بندہ مل گیا، اچھی بات ہے۔ مگر اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔" وہ انکساری سے بولے، پھر کہا۔ "ڈرائیور آپ کو مولوی صاحب کے گھر چھوڑ دے گا۔ لیکن کوشش کیجئے گا، جانے سے پہلے ملاقات ہو جائے۔"

"ضرور۔" ان سے کہہ کر وہ وجدان کی طرف مڑے۔ "چلو وجدان! تمہارے گھر چلتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ پھر پہلے گیٹ لگانے کی بات کرتا، منور علی جلدی سے بولا۔

"آپ جائیں ماسٹر جی! کام ہو جائے گا۔"

"تم اکیلے کیسے کرو گے؟" عبداللہ بولا۔

"میں فٹافٹ جا کر دکان سے کسی کو لے آتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو کر مہمانوں کے ساتھ جائیں۔" اس نے چٹکی بجا کر کہا اور فوراً نکل گیا۔

آگے راستہ تنگ تھا۔ وجدان نے جیپ گلی سے پہلے ہی رُکوا لی۔ چودھری کی جیپ سے ماسٹر عبداللہ کو اُترتے دیکھ کر گاؤں کے لوگ حیران رہ گئے۔ مزید حیرت تب ہوئی جب اس کے ساتھ اپنی وضع قطع سے شہری نظر آنے والے مہمان، مولوی صاحب کے گھر میں داخل ہوئے۔

ملانی جی صحن میں چارپائی پر بیٹھیں دوپہر کے کھانے کے لئے سبزی کاٹ رہی تھیں۔ وجدان کو گھر میں آتے دیکھ کر حیرت سے بولیں۔

"بڑی چھیتی آ گیا عبداللہ! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جی۔" اس نے مختصراً جواب دیا مگر تب تک ملانی جی کی نظر اس کے پیچھے اندر داخل ہوتے سوٹڈ بوٹڈ مردوں پر پڑ چکی تھی۔ انہیں فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہی دونوں عبداللہ کے جلدی گھر آنے کی وجہ ہیں۔ عبداللہ ان کا تعارف کرائے بغیر ہینڈ پمپ پر جا کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ ملانی جی نے اس سے پوچھنے کا قصد کیا مگر فوراً ہی ارادہ بدل بھی لیا۔ اس کے "ہوں ہاں" میں بات کرنے کی عادت کی وجہ سے جتنی دیر میں اس کی زبان سے پوری بات نکلتی، آگے والا سوال کر کے تنگ آ جاتا۔ اس لئے وہ براہِ راست ان دونوں سے بولیں۔

"آپ لوگ کون ہیں؟"

منیر حسن نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔ "مولوی عبدالخالق سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا پھر چارپائی سے اُٹھتی اُن سے بولیں۔ ''آپ لوگ بیٹھیں، میں مولوی صاحب کو بلا کر لاتی ہوں۔'' پھر چلتی ہوئیں دروازہ کھول کر دکان میں چلی گئیں۔

چارپائی پر بیٹھ کر آفاق نے وجدان کو دیکھا۔ تولیے سے ہاتھ خشک کرتا وہ بظاہر پُرسکون لگ رہا تھا مگر آفاق اس کے اندر کے اضطراب کو محسوس کر رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' مولوی صاحب کے سلام کرنے کی آواز کو سن کر آفاق ان کی طرف متوجہ ہوا، پھر منیر حسن کے ساتھ فوراً ہی اس بزرگ شخص کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں سے باری باری ہاتھ ملایا۔ مولوی صاحب نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور خود بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

''آپ حضرات اپنا تعارف کروا دیجئے۔''

وہ دونوں سوچ ہی رہے تھے کہ کہاں سے بات شروع کریں کہ مولوی صاحب نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ آفاق نے منیر حسن کی طرف دیکھا پھر مولوی عبدالخالق کو دیکھ کر بولا۔

''یہ میرے والد ہیں، ایڈووکیٹ منیر حسن۔ اور میرا نام آفاق ہے۔ میں وجدان کا پرانا دوست ہوں۔'' پھر اُن کو اچنبھے میں پڑتا دیکھ کر فوراً بولا۔ ''میرا مطلب ہے، عبداللہ کا۔'' وہ رُکا، پھر گویا ہوا۔ ''اصل میں مولوی صاحب! بات یہ ہے کہ جسے آپ عبداللہ کہتے ہیں، وہ دراصل وجدان مصطفیٰ ہے۔''

مولوی صاحب نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ ایک دن کوئی عبداللہ سے شناسائی کا دعویٰ کرتا ان کے گھر چلا آئے گا۔ وہ پہلے تو حیران ہوئے، پھر خوش۔ اس کے بعد ان کا دل بیٹھنے لگا۔

انہوں نے دس سال تک عبداللہ کو اپنا بنا کر اپنے ساتھ رکھا تھا۔ مگر ایک پل میں ہی وہ عبداللہ سے وجدان ہو کر پرایا ہو گیا تھا..... وہ پرائے کو اپنا کیسے کہہ سکتے تھے؟

رات گہری ہو چکی تھی۔ چنگ والی کی گلیوں میں اندھیرا اور خاموشی اپنا راج پاٹ سنبھالے ہوئے تھی۔ گہری نیند نے گاؤں کے سب لوگوں کو دبوچ رکھا تھا، ہاں مگر مولوی عبدالخالق کے گھر کی چوکھٹ پر رت جگا پہرہ دے رہا تھا۔ مولوی صاحب، ملانی جی، منیر حسن اور آفاق اندر کمرے میں زمین پر دری بچھائے بیٹھے تھے۔ درمیان میں لالٹین جل رہی تھی، جس کی زرد روشنی میں ان کے سائے دیوار پر تھرکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ چاروں خاموش تھے مگر اس خاموشی سے پہلے محفل میں قصہ گوئی چل رہی تھی۔

وجدان کی داستان سنائی گئی، پھر عبداللہ کی کہانی بیان ہوئی..... کہانی ختم ہوئی تو الفاظ بھی ختم ہو گئے۔ وجدان کی زندگی کے دس سالوں کا زیاں آفاق کو تھکا رہا تھا۔ آفاق نے ہلکے سے گردن کو موڑ کر دروازے سے باہر صحن میں پھیلے گھپ اندھیرے کو دیکھا اور گویا ہوا۔

''کہتے ہیں کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آتا ہے جو اسے بدل کر رکھ دیتا ہے۔ مگر وجدان کی زندگی میں ایسا ایک نہیں بلکہ کئی موڑ آئے ہیں اور ہر بار کی تبدیلیوں نے اسے اتنا بدل دیا ہے کہ ڈھونڈنے سے

کہ مجھے اس میں وہ وجدان نہیں ملتا جو کالج میں میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ میرا وہ کھویا ہوا دوست مجھے بہت یاد آتا ہے۔'' آفاق کی آواز بوجھل ہو گئی۔ مولوی صاحب نے اسے دیکھا، پھر یوں لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن انہوں نے خاموشی سے نظریں پھیر لیں۔

''مولوی صاحب! آپ کا یہ احسان، تعریف کے لائق ہے کہ آپ نے اتنے برسوں تک وجدان کو سہارا دیا۔ لیکن پھر بھی آپ سے ایک شکایت ہے۔''

''کیسی شکایت منیر حسن؟'' وہ ان کی طرف دیکھ کر بولے۔

''آپ کو وجدان کے ماں باپ کی حالت کا اندازہ تو ہو گا ہی۔ آپ کے پاس دس سال کا وقت تھا، آپ نے کیوں وجدان سے اس کے گھر بار کے بارے میں سوال نہیں کیا؟ اُس کی ذہنی حالت تو اس قابل ہی نہیں تھی کہ گھر لوٹ جاتا۔ لیکن آپ تو اس کے گھر والوں سے رابطہ کر سکتے تھے۔''

''یہ کوتاہی تو ہوئی ہے ہم سے۔'' وہ سرد آہ کھینچ کر بولے۔ ''لیکن اس کی بھی وجہ تھی۔ وجدان جب یہاں آیا تو اس کی ذہنی حالت آپ کے اندازے سے کئی گنا بدتر تھی۔ وہ حقیقتاً پاگل ہو چکا تھا۔ بھلا ایک پاگل شخص اپنے بارے میں کیا بتاتا؟ اکثر وہ زور زور سے چلّانے لگتا اور نہ جانے کیا کیا بولتا چلا جاتا...... میں بہت غور سے سنتا کہ شاید کچھ اخذ کر سکوں۔ مگر اس کی بے ربط باتوں میں ملیحہ کے سوا ماضی کی کوئی یاد نہیں ملی۔'' پھر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ پھر سے بولے۔

''آج سے پہلے مجھے ملیحہ کا نام نہیں معلوم تھا مگر بے خودی کے عالم میں وہ اکثر ملیحہ کا ذکر کرتا جاتا...... دھیرے دھیرے میں اس کی باتوں سے بہت کچھ سمجھ گیا۔ یہ بھی کہ اسے ملیحہ کے سوا کچھ یاد نہیں۔ یہاں تک کہ وہ خود کو بھی بھول چکا ہے۔ اسی لئے دانستہ میں نے اس سے کبھی اس کے بارے میں نہیں پوچھا..... اپنے وجود کا بوجھ اٹھانے کے لئے اس کی طاقت کم پڑ گئی تھی، اس کے ذہن پر نیا بوجھ کیا ڈالتا؟...... ڈر لگتا تھا کہ ساز کے تار کی طرح اس کے اعصاب آخری حد تک تنے ہوئے ہیں۔ کہیں ہاتھ لگانے سے ٹوٹ نہ جائیں۔ بھرے گلاس کو ٹھیس پہنچانا عقلمندی نہیں۔ پھر اب تو وہ خود میں سمٹ گیا ہے۔ پہلے ملیحہ کے لئے بڑے جھگڑے کرتا تھا، اب تو کئی سال ہو گئے، کبھی دورے کی حالت میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔''

''وجدان کو دورے پڑتے ہیں؟'' آفاق کے کان کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب نے تذبذب سے اس کی طرف دیکھا جیسے سوچ رہے ہوں، بتائیں یا نہ بتائیں۔ پھر کچھ سوچ کر بتانے لگے۔

''وہ کہتا ہے، اسے ملیحہ نظر آتی ہے۔''

آفاق اور منیر حسن کو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''اس کا مطلب تمہارا شک صحیح ہے۔ وہ اب تک تباہ حال ہے۔''

آفاق کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ وہ اُٹھا اور باہر نکل گیا۔

اندھیرے میں سفید شلوار قمیض کی جھلک دیکھ کر آفاق، پیپل کے درخت کے پاس آ گیا۔ فاصلہ کم ہوا تو چاند کی ہلکی سی روشنی میں وجدان کے چہرے کے نقوش بھی دیکھنے لگا۔ لیکن آفاق کو بس اس کا چہرہ ہی وجدان کے جیسا لگا، باقی تو وہ اجنبی تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے آفاق کو شدت سے پچیس سال کا وجدان یاد آنے لگا جو بے فکرا سا نوجوان ہوا کرتا تھا۔ وہ سنجیدہ مگر خوش مزاج تھا۔ ہمہ وقت خود میں مگن رہنے والا۔ اس کی طبیعت کی سادگی سے لوگ بلاوجہ ہی اس کی طرف اٹریکٹ ہو جاتے، مگر اس کی ذات میں بہت گہرائی تھی۔ اس کے جذبات اندر ہی کہیں چھپے رہتے اور سطح پر کوئی ہلچل نہ ہوتی۔ وہ ہر وقت مطمئن سے انداز میں مسکراتا رہتا۔ لیکن اس وقت آفاق کے سامنے پینتیس سال کا ایسا مرد کھڑا تھا، جو خود سے تعلق توڑ چکا تھا اس کے اندر اضطراب کی لہریں اٹھا کرتی تھیں لیکن اس نے چہرے پر سکون اوڑھ رکھا تھا۔ ایسا سکون، جس میں جامد چپ تھی۔ اسے دیکھ کر ہر بار لگتا کہ وہ گہری سوچ میں ہے لیکن آفاق کو پتہ تھا، اب اس کے دماغ کو سوچنے کی عادت نہیں رہی۔ وہ دس سال سے زندگی کو اس طرح سے جی رہا تھا جیسے آخری پل بچے ہوں۔

آفاق اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا مگر اسے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وجدان کو اس کی موجودگی کا علم ہے بھی یا نہیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر زمین کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے، تمہارے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟''

وجدان کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی، وہ یوں ہی خاموش رہا۔

''جس طرح تمہیں ڈھونڈا ہے، اگر دریا میں سے سُوئی تلاش کرتے تو شاید وہ بھی مل جاتی۔ لیکن تم نہیں ملے۔ ایک بار ایک مبہم سی خبر آئی تھی کہ تمہیں شہر سے باہر جانے والے راستے پر دیکھا گیا ہے مگر میں نے وہ خبر تمہارے گھر والوں سے چھپا لی۔ کیونکہ اس خبر میں تمہارے پاگل پن کی تصدیق تھی۔ لیکن میں نے اور ساجد نے تمہیں سندھ میں ہر جگہ تلاش کر لیا۔ پولیس کی مدد لی...... اخباروں میں اشتہار چھپوائے، یہاں تک کہ مزمل بھائی نے تو اپنی نوکری تک چھوڑ دی۔ تین سال وہ تمہاری تلاش میں در در بھٹکے ہیں۔ وہ تو افغانستان کے بارڈر تک ہو آئے۔ پھر جیسے جیسے تمہارے ملنے کی امید کم ہوتی گئی، ان کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ انکل تو پہلے ہی ان کے آسرے پر تھے، بالکل ہی ڈھے گئے۔ آنٹی کو ہمیشہ یہ گلٹ پریشان کرتا رہا کہ تم ان سے ناراض ہو کر چلے گئے۔ میں کبھی انہیں ملیحہ کے انتقال کے بارے میں بتانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ ڈرتا تھا، کہیں وہ سچ مچ نہ مر جائیں۔'' پھر لمبی خاموشی کے بعد پوچھنے لگا۔ ''کیا ہم تمہیں کبھی یاد نہیں آئے؟''

وجدان نے آہستہ سے سر دائیں بائیں گھما کر انکار میں جواب دے دیا۔

''کمال ہے۔'' آفاق کو غصہ آ گیا۔ ''ہم نے وہاں اپنی زندگیاں حرام کر لیں اور تم یہاں عبداللہ بنے آرام سے جی رہے ہو۔''

''میں آرام سے نہیں ہوں آفاق!'' آفاق کو اس کے چہرے کے تاثرات کا تو اندھیرے کی وجہ سے ٹھیک

اندازہ نہیں ہوا مگر یہ کہتے ہوئے اس کی آواز کا ٹھہراؤ، آفاق کو سُوئی کی طرح چبھا تھا۔ بے اختیار اسے گلے لگا کر تھپکتے ہوئے آفاق کہنے لگا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا وجدان! تم فکر مت کرو۔" آفاق کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

❁❁❁

تہجد کا وقت ہو چلا تھا۔ چارپائی پر کھلی آنکھوں سے چت لیٹا وجدان اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے ایک نظر سوئے ہوئے منیر حسن اور آفاق پر ڈالی، پھر اُٹھ کر مولوی صاحب کی چارپائی کے پاس آ گیا اور انہیں جگانے کے لئے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔ وہ بھی جاگ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ رکھتے ہی آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اسے دیکھنے لگے۔ انہیں جاگتا دیکھ کر وجدان پلٹنے لگا تو مولوی صاحب نے ہاتھ پکڑ کر اسے روکا، پھر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"بیٹھ جا عبداللہ! تجھ سے دو باتیں کرلوں۔ پھر تو تُو نے چلے جانا ہے۔"

"میں کہاں چلا جاؤں گا؟" اس نے حیرت سے پوچھا تو مولوی صاحب جھنجلا گئے۔

"تیرا دھیان بھی پتہ نہیں کدھر رہتا ہے۔ کھانے پر منیر حسن بتا تو رہا تھا کہ کل کراچی کے لئے روانہ ہو جائے گا۔ ویسے یہاں اس کا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ پر کہہ رہا تھا، بعد میں آ کر نمٹا لوں گا۔ ابھی تو اسے تجھے تیرے ماں باپ سے ملانے کی جلدی ہے۔"

"میں کیسے جا سکتا ہوں مولوی صاحب؟" اس کی آواز میں تذبذب تھا۔ وہ اُس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"کیوں، تیرا ماں باپ سے ملنے کو دل نہیں کر رہا؟"

"ہاں لیکن......" بات ادھوری چھوڑ کر وہ کمرے کے بند دروازے کو دیکھنے لگا جس کے پار ملّانی جی، بچے کو ساتھ لئے ہوئے کمرے میں تھیں۔ پتہ نہیں وہ بھی سوئی تھیں یا ان دونوں کی طرح جاگ رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا پھر جیسے اُس کی اُلجھن کو پا گئے۔

"تُو ہاجرہ کی پروا مت کر۔ تیری سگی ماں نے تیرے بغیر دس سال کاٹے ہیں، یہ بھی گزارہ کر لے گی۔"

"پر مولوی صاحب......"

"چل رہنے دے عبداللہ! مجھے پتہ ہے، تُو نفلوں کا بھوکا ہے۔ پہلے فرض پورے کر لے، نفلوں کی باری تو بعد میں آئے گی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولے تو وجدان نے دھیرے سے کہا۔

"میرا نام وجدان مصطفیٰ ہے مولوی صاحب!"

"اور میں عبدالخالق ہوں۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "خیر ہو وکیل صاحب! دس سال بعد تعارف کا خیال آیا ہے۔" پھر یکدم سنجیدہ ہو گئے۔ "چلو آیا تو سہی۔ کرم ہے مالک کا۔ جس نے آج تک تیرے لئے راستہ بنایا ہے، وہ آگے بھی راہیں کھولے گا۔ تُو بس دیکھتا جا۔" پھر آسمان پر نظر

ڈالی۔ ''چل اُٹھ وجدان مصطفیٰ! تہجد کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

فجر کی نماز کے بعد منیر حسن اور آفاق بھی مسجد میں بیٹھے وجدان کی تلاوت سن رہے تھے۔ تلاوت ختم ہوئی مولوی عبدالخالق مسجد میں موجود لوگوں سے منیر حسن اور آفاق کا تعارف کرانے لگے۔ اس کے بعد جب انہوا نے وجدان کا تعارف کرایا تو سب کے سب حیرت میں پڑ گئے۔ انہوں نے تو عبداللہ کو اپنا حصہ مان لیا تھا آج اس کی اپنوں میں واپسی تھی۔ خوشی اور غم کی ملی جلی سی کیفیت تھی۔

ان کے مسجد میں بیٹھے بیٹھے ہی یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ تصدیق کے لئے مسجد میں آنے لگے۔ وہ لوگ وہاں سے اُٹھ کر گھر آئے تو یہاں بھی عورتیں جمع تھیں۔ عبداللہ تو جانا پہچانا تھا پر وجدان اجنبی تھا۔ سب عورتیں اس اجنبی کے بارے میں سوال کر رہی تھی۔ مولوی صاحب کی ہدایت پر ملیحہ کا نام لئے بغیر ملّانی جی نپے تلے جواب دیتی جا رہی تھیں اور پاس کھڑا نو سال کا بچہ ان معلومات کو تیزی سے دماغ میں فیڈ کرتا جا رہا تھا۔ ان معلومات میں سب سے جان لیوا خبر تھی۔

''آج عبداللہ اپنے گھر چلا جائے گا۔''

اس خبر نے بچے کو سہما دیا۔ وجدان کو اندر آتے دیکھ کر وہ بھاگتا ہوا اس سے لپٹ گیا، پھر معصومیت سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وجدان کو اُس کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو بچہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

''ابو! ملّانی جی کہہ رہی ہیں، آپ چلے جائیں گے۔'' اُس کے بالوں میں گردش کرتی وجدان کی انگلیاں ساکت ہوگئیں۔ اسے چپ دیکھ کر بچے نے پھر سوال کیا۔ ''بتائیں نا ابو! آپ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے؟''

وجدان گھٹنا زمین پر ٹکا کر اس کے مقابل بیٹھا، پھر اپنے ساتھ لگا کر اس کے گال چومتے ہوئے بولا۔

''میں کبھی تمہیں خود سے الگ نہیں کروں گا۔''

اس ایک جملے نے بچے کو پُرسکون کر دیا اور اس نے اپنی بانہیں وجدان کے گلے میں ڈال دیں۔ وجدان کو شرارت سوجھی، اس نے ایک دم سے بچے کو گدگدایا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ مولوی صاحب ہنس کر بولے۔

''دیکھ رہے ہیں منیر حسن! باپ کون سا کم ہے پر بیٹا تو باپ سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔'' پھر ان دونوں کی طرف آئے اور بچے کو ہاتھ پکڑ کر وجدان کے حلقے سے نکال کر اپنے سامنے کیا اور بولے۔

''بھلا یہ کوئی پوچھنے کی بات تھی جو تم نے پوچھی ہے؟ بچے تو ماں باپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اب جہاں تمہارے ابو جائیں گے، تم بھی وہیں جاؤ گے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب؟'' ملّانی جی تڑپ اُٹھیں۔ ''عبداللہ کے تو وارث آئے ہیں، ان کو کیسے انکار کریں؟ حق بنتا ہے۔ پر اسے کیوں مجھ سے دُور کر رہے ہیں؟''

مولوی صاحب نے بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر اُنہیں دیکھا، پھر وجدان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے

لے۔ ''اس کا وارث یہ بیٹھا ہے۔ حق بنتا ہے اس کا۔ اگر انکار کر سکتی ہے تو کر دے۔''

اور ملانی جی نے بے ساختہ روتے ہوئے چادر کا پلّو منہ پر رکھ کر چہرہ چھپا لیا۔

آفاق نے اپنے پاپا کی طرف دیکھا پھر دونوں وجدان کو دیکھنے لگے جو سر جھکا کر کھڑا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ مولوی صاحب ایک نظر اس کے بے چین چہرے پر ڈال کر بولے۔

''تجھے پتہ ہے، عبداللہ تیرے گھر میں کیوں ہے؟'' ملانی جی سے پوچھ کر وہ خود ہی کہنے لگے۔ ''کیونکہ تیرے آنگن میں اس کے نام کا تعویذ گڑا ہے۔ اور یہ ہے اس کا تعویذ۔'' انہوں نے بچے کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ نہیں گیا تو عبداللہ نہیں جائے گا۔ اس کا جانا ضروری ہے ہاجرہ! اس کے جانے میں رکاوٹ نہ ڈال۔ ماں باپ کی آنکھیں ترس گئی ہوں گی۔ دس سال کم نہیں ہوتے۔''

''میرا آنگن خالی ہو جائے گا مولوی صاحب!'' وہ سِستی ہوئی آواز میں بولیں۔

''تجھے پتہ تو تھا، جس نے دیئے ہیں، وہ لینے پر بھی قادر ہے۔ پھر دل کیوں لگایا ہاجرہ؟'' ان کی آزردگی بتا رہی تھی کہ دل تو وہ بھی لگا چکے تھے۔ وہ اُٹھ کر وجدان کے پاس آئے۔

''پہلے لگتا تھا، اسے اس کی ماں اپنے لئے پیدا کر کے چھوڑ گئی۔ پر اب یقین ہو چلا ہے، اُس کی ماں نے اسے پیدا ہی تیرے لئے کیا تھا۔ سوہنے رب کا یہی کھیل ہے۔ بندہ، بندے سے جڑا رہے اس لئے تقدیریں جوڑ دیتا ہے۔ اب اگر اس کی تقدیر ہی تیرے کھاتے میں لکھی ہے تو کوئی کیا روکے؟...... جا اسے بھی اپنے ساتھ لے جا۔''

''شکریہ مولوی صاحب!'' کل سے جو بے چینی اس میں پھیلی تھی، وہ ایک دم سے ختم ہو گئی۔ اب وہ پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے جا کر پیچھے سے ملانی جی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''دل چھوٹا کیوں کرتی ہیں ملانی جی! میں کوئی ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں؟ میں آپ سے ملنے آیا کروں گا۔''

ملانی جی نے اس کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ''جلدی جلدی آنا عبداللہ! تیرے بغیر جی اُداس رہے گا۔''

''اب یہ سب چھوڑ اور جلدی جا کر ہانڈی روٹی کا کر۔ دوپہر کے کھانے کے بعد چودھری صاحب کی گاڑی آ جائے گی انہیں لاہور لے جانے۔ وہاں سے کل صبح انہیں کراچی کی فلائٹ پکڑنی ہے۔'' وہ ان کا دھیان ہٹانے کے لئے تیز تیز بولنے لگے۔

کمرے میں آ کر اس نے بیگ الماری پر سے اُتار کر بستر پر رکھا، پھر الماری میں سے اپنے اور اپنے بیٹے کے کپڑے نکال کر پیک کرنے لگا۔ منیر حسن اور آفاق دوپہر کے کھانے پر چودھری نواز کی حویلی میں مدعو تھے۔ کھانے کے بعد وہ دونوں رخصت لے کر چل پڑے۔

آفاق نے کل والی جگہ پر ہی جیپ رُکوا لی اور باقی کا راستہ پیدل طے کر کے باپ بیٹے مولوی صاحب کے

گھر پہنچے تو وہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ سب گھر والے وجدان کو اللہ حافظ کہنے دروازے پر جمع تھے۔ سب سے ذرا فرداً ملتے وجدان نے ان دونوں کو آتے دیکھا تو باقی سب کو چھوڑ کر مولوی صاحب کے گلے لگ گیا۔ پھر الگ ہو کر کہنے لگا۔

''میں ان لوگوں میں سے تھا جن کا ایمان مشروط ہوتا ہے۔ جب تک دعائیں قبول ہوتی رہتی ہیں، اللہ کی حمد و ثناء کرتے رہتے ہیں۔ پر جہاں اپنی مرضی میں اُنیس بیس کا فرق آیا، اللہ پر سے یقین ہی اُٹھ گیا۔ مانتے ہیں وہ قادرِ مطلق ہے، پر اس کی قدرت کو اپنی خواہشات کے تابع بھی کرنا چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ وہ، وہی کرے جو ہماری مرضی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو جھگڑنے لگتے ہیں جیسے نعوذ باللہ وہ ہماری مرضی کا پابند ہے اور ہماری منشا سے ہٹ کر اس نے کوتاہی کی ہے۔ اللہ پر اعتراض اُٹھانا کفر کی نشانی ہے اور وہ بدنصیب لوگ کفر کی پستیوں میں اُترتے چلے جاتے ہیں مگر بے خبری ایسی کہ سر اٹھا کر فخر سے کہتے ہیں، ہم صاحب ایمان ہیں۔ میں کفر کے گڑھے میں گردن تک دھنس چکا تھا اور قریب تھا کہ وہ میرے دل پر کفر کی مہر لگا دے، لیکن آپ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے ان پستیوں سے نکال لیا۔''

مولوی صاحب یوں مسکرائے جیسے کسی بچے نے نادانی کی بات کہہ دی ہو۔

''او جھلّیا! کسی دل میں ایمان کی روشنی کسی کے ڈالے سے نہیں ڈلتی۔ یہ معجزہ تو اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ جب اس نے ہی تیری آخرت سنوارنے کا بیڑا اٹھا لیا تو پھر تُو کون ہوتا ہے اپنی عاقبت خراب کرنے والا؟ کبھی کبھی دل کرتا ہے، تجھ سے حسد کروں.... ایسا کیا ہے تجھ میں جو اُس نے تیرے دل میں اپنی لو کو بجھنے نہیں دیا۔''

''میں بس اس کا بندہ ہوں مولوی صاحب! اور اپنے بندوں پر احسان کرنا اس کی عام عادت ہے۔ اس کے احسان تو کوئی بھی نہیں چکا سکتا، پر آپ کے احسان بھی مجھ پر کم نہیں ہیں۔ آپ کے پاس خالی ہاتھ آیا تھا مگر جاتے ہوئے میرا دامن بھرا ہوا ہے...... پختہ ایمان، کامل یقین اور صبر سے استقامت سے...... یہ سب میں نے آپ سے سیکھا ہے۔ آپ کا احسان کیسے چکاؤں گا مولوی صاحب؟''

''جو کچھ بھی یہاں سیکھا ہے، اسے عمر بھر یاد رکھنا اور عمل بھی کرنا، احسان اُتر جائے گا۔'' مولوی صاحب بڑی متانت سے احسان اُتارنے کا طریقہ بتا رہے تھے۔ پھر اس کا شانہ تھپتھپا کر بولے۔

''اللہ حافظ!''

اور وہ اللہ حافظ کہتا دوبارہ ان کے گلے سے لگ گیا۔ پھر ان سے مل کر ملّانی جی کے پاس آیا جو بچے کو ساتھ لگائے کھڑی تھیں۔

''اللہ حافظ ملّانی جی!'' ملّانی جی کو بازو میں لے کر اس نے کہا پھر اپنا سر اُن کے آگے جھکا دیا۔ وہ وجدان کے سر پر ہاتھ پھیر کر بوسہ دے کر بولیں۔

''اللہ کے سپرد۔''

"چلو وجدان! دیر ہو رہی ہے۔" آفاق اس کے پاس آ کر بولا۔
"میں بس بیگ لے کر آتا ہوں۔" وہ سر ہلا کر کہتا دروازے سے اندر صحن میں آ گیا۔ اس نے کندھے سے
انے کے لئے بیگ کا اسٹریپ ہاتھ میں پکڑا ہی تھا کہ کسی نے بیگ پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اسے روک دیا۔
اس نے پلٹ کر اس نازک ہاتھ کو دیکھا پھر سر اُٹھا کر سامنے دیکھتے ہی اس کے اندر ہلچل مچ گئی۔
ملیحہ دونوں پاؤں اوپر رکھے چارپائی پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر بیگ پر رکھا ہوا تھا۔ اس
کی آنکھوں کی گہری جھیلوں میں طغیانی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک خوف سا تھا اور گداز ہونٹوں کی کپکپاہٹ
خاموشی کی زبان سے وجدان کو رک جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ وہ یقیناً بے بسی کی انتہا ہوتی ہو گی جہاں ایک
لڑکی آنکھیں ڈبڈبا جائیں۔ وجدان اسٹریپ والا ہاتھ نیچے گراتا چارپائی پر بیٹھ گیا۔
"میں کیا آپ کو بھول جاتا ہوں جو بار بار یاد دلانے چلی آتی ہیں؟...... کیسے یقین دلاؤں کہ آپ یہاں
ہیں؟...... چاہوں تو بھی مرتے دم تک آپ کو بھلا نہیں سکتا۔" کہتے کہتے اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔
سرگوشیوں میں کہا۔
"کون جانے زندگی کا موت سے کتنا فاصلہ ہے۔ پر آپ کا یوں آنا جانا مجھے مرنے سے پہلے ہزار بار مار
دے گا۔ اللہ کے لئے مجھ پر رحم کریں۔ جب تک سانسیں ہیں، تب تک تو جی لینے دیں۔" یہ التجا گراں گزری
تھی۔ ملیحہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ وجدان میں اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں تھی، دھیرے
سے بولا۔
"مجھے اجازت دیجئے۔"
ملیحہ نے سختی سے پلکوں کو بند کیا اور سارے آنسو ایک ساتھ گرا دیئے۔ پھر دھیرے سے اپنا ہاتھ سمیٹ کر
ہٹا لیا۔
آج شاید ملیحہ کو سچ مچ وجدان پر رحم آ گیا تھا۔ وجدان نے بے یقینی سے اسے دیکھا جو چہرے کو ذرا سا
موڑے یوں دوسری طرف دیکھ رہی تھی، جیسے اس کا جانا دیکھا نہ جائے گا۔ وجدان کا اس کے پاس سے اُٹھنے کو
دل نہیں چاہ رہا تھا، جانتا تھا اس کا جانا ملیحہ سے سہا نہیں جائے گا۔ لمحہ لمحہ کسی کو خود سے دُور ہوتے دیکھنا آسان
نہیں۔ اور یہ مشکل کام ہمیشہ وجدان نے کیا تھا۔ ملیحہ کو بس ایک بار اسے خود سے دُور جاتے دیکھنا پڑا تھا اور
اس دن وجدان کے جانے سے ملیحہ کی جان چلی گئی تھی...... مگر جانا مجبوری تھی۔ وجدان نے نظر چرا کے
اسٹریپ کندھے پر رکھا اور آہستگی سے اُٹھ گیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا،
وہ جا چکی تھی۔ وجدان کو شکایت سی ہونے لگی۔
"خود سے میرا جانا دیکھا نہیں جاتا اور مجھے بار بار اس امتحان میں ڈالتی ہیں۔" پھر وہ مڑا اور دروازے
سے نکل گیا۔ آفاق کو مولوی صاحب کی بات پر یقین نہیں آیا تھا پر جو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اسے کیسے جھٹلاتا؟

وہ دم بخود سا وجدان کی تقلید میں گھر سے باہر آ گیا۔

❀❀❀

زندگی کا یہ نیا موڑ یوٹرن ثابت ہوا تھا۔ وجدان عجیب نظروں سے اپنے گھر کے گیٹ کو دیکھ رہا تھا، جہاں سے دس سال پہلے ایک قیامت کی رات کو اس نے ایک دل دہلا دینے والے سفر کا آغاز کیا تھا...... آج وہ سفر ختم ہوا۔ آفاق نے ٹیکسی کی ڈگی میں سے بیگ نکال کر پیسے دے کر ڈرائیور کو فارغ کیا، پھر گیٹ کے پاس آ کر گھنٹی بجا دی۔ گیارہ بارہ سال کے بچے نے چھوٹا گیٹ کھول کر باہر گردن نکالی، پھر پورا باہر آ گیا۔

''آفاق انکل! آپ آ گئے۔ اور لاہور سے میرے لئے چاکلیٹس لے کر آئے ہیں نا؟''

''اونو!'' آفاق نے اپنا ماتھا پیٹا۔ ''سوری زوار بیٹا! تمہیں چاکلیٹس ابھی نہیں مل سکتیں۔ وہ میرے سامان میں ہیں اور سامان میں نے ایئرپورٹ سے ہی پاپا کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ چلو خیر، شام میں لے آؤں گا۔'' بچے کو اُداس ہوتے دیکھ کر آفاق جلدی سے بولا۔

''پرامس؟'' اُس نے انگلی دکھا کر مشکوک انداز میں کہا۔

''پکا پرامس۔''

''تو ٹھیک ہے۔ مگر مناہل کو پتہ نہیں چلنا چاہئے۔ نہیں تو وہ موٹی، ساری چاکلیٹس کھا جائے گی۔'' اس نے فوراً رازداری کا وعدہ لیا۔

''ٹھیک ہے، نہیں بتاؤں گا۔''

''یہ کون ہیں؟'' اب اس کی نظر سر اٹھا کر اپنے گھر کو دیکھتے وجدان پر پڑی تھی۔ آفاق کے ہونٹ مسکرانے لگے۔ پھر وہ بچے کے پاس آ کر سرگوشی سے بولا۔

''جا کر دادی سے کہو، وجدان چاچو آئے ہیں۔''

''یہ وجدان چاچو ہیں؟'' وہ اتنی زور سے بولا کہ آفاق کانوں پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کو ہٹ گیا۔ وجدان بھی اس طرف دیکھنے لگا تھا۔

''یہ سرپرائز میرے لئے نہیں ہے۔ اندر جا کر دادی کو بتاؤ۔ اور ہاں، آواز اس سے دوگنی ہونی چاہئے۔'' وہ کان مسلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''ارے جا نا یار!'' آفاق نے آنکھیں پھاڑ کر وجدان کو دیکھتے بچے کو زبردستی اندر کی طرف دھکیلا۔ وہ بھی جیسے ہوش میں آ گیا اور چلاّتا ہوا اندر بھاگا۔

''دادی!...... دادی! وجدان چاچو آ گئے۔''

اسے بھیج کر آفاق نے بیگ اٹھا کر کندھے پر رکھا، پھر جیسے بچے کی انگلی پکڑ کر وجدان سے کہا۔ ''جناب! آپ کو آپ کے گھر میں آنے کا دعوت نامہ میں تو دوں گا نہیں۔ اس لئے خود ہی اندر آ جائیں۔''

اور وہ بچے کو لئے اندر چلا گیا۔ زوار کے لاؤڈ اسپیکر نے کام دکھا دیا تھا۔ عائشہ مصطفیٰ اور انیقہ آگے پیچھے

ئے چہروں کے ساتھ برآمد ہوئی تھیں مگر آفاق کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔ تبھی وجدان سر ائے چھوٹے گیٹ سے اندر آیا تھا۔ وہ سیدھا ہوا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی عائشہ مصطفیٰ دیوانی ہو ہیں۔ وہ تیزی سے اس کی طرف آئیں اور اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ساون بھادوں کی طرح ان کی آنکھیں جاری تھیں۔ پھر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لئے، پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"کیسے ہو بیٹا؟"

"تھک چکا ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا اور عائشہ مصطفیٰ کی ممتا اُمڈ آئی۔

"ماں واری۔" کہہ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ بے تحاشا اس کے سر اور شانوں کو چوم رہی تھیں۔

نہیں، اسے ماں کا چہرہ یاد آیا تھا یا نہیں مگر ممتا نے اپنی پہچان کرا دی تھی۔

بچپن میں جب وہ کھیلتے کھیلتے تھک جاتا تو ماں کی گود میں آ کر سو جاتا۔ آج تو اس کے ساتھ برسوں کی تھکن تھی اس نے اپنے بازو ان کے گرد پھیلا لئے اور آنکھیں سکون سے بند کر لیں۔

"عائشہ! یہ زوار کیا کہہ رہا ہے؟" مصطفیٰ اعظم کی کانپتی آواز پر وہ ان کی طرف مڑیں اور وجدان ان کی نظروں کے سامنے آ گیا۔

"وجدان......!" انہوں نے سرگوشی میں اس کا نام لیا پھر وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف چلے آئے۔ ان کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور ان کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے رہے، پھر کھینچ کر اسے گلے لگا لیا۔ کتنی ہی دیر وہ اسے سینے سے لگائے کھڑے رہے۔ آخر آفاق آگے آیا۔

"آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی انکل! آئیں اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ چلیں بھابی! سب کو اندر لے چلیں۔" اس نے گم صم کھڑی انیقہ سے کہا جو رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔

"ہوں۔" وہ چونکی، پھر جلدی جلدی کہنے لگی۔ "ہاں ہاں، اندر چلو۔ آئیں امی!.....ابو! آپ بھی چلیں۔" پھر وجدان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "بہت انتظار کیا ہے تمہارا۔ اب آئے ہو تو دروازے پر نہ کھڑے رہو۔" سب کو بٹھا کر لاؤنج کے پنکھے چلاتی وہ خود بھی بیٹھ گئی مگر فوراً ہی اُٹھ گئی۔

"ارے، مزمل کو بتانے کا خیال ہی نہیں۔ میں اُنہیں فون کر کے آتی ہوں۔"

وہ فون کر کے لوٹی تو ہر کوئی خاموش تھا۔ بڑے صوفے پر مصطفیٰ اعظم، وجدان کو پہلو میں لئے بیٹھے تھے جو خالی نظروں سے ٹیبل کو گھور رہا تھا۔ دوسری طرف اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھی عائشہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے آنسو بھی پونچھتی جا رہی تھیں۔ آفاق الگ وجدان کے بیٹے کو ساتھ لئے گم سم بیٹھا تھا اور خود انیقہ کے دونوں بچے کونے میں چھپے آنے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ انیقہ اس خاموشی پر حیران ہوئی۔

"یہ کیا بھئی۔ اتنے سالوں بعد وجدان لوٹا ہے، پھر بھی گم سم بیٹھے ہیں۔ کچھ بولیں امی!......اور ابو آپ بھی......ذرا صاحبزادے کے کان تو کھینچیں آخر اس نے ہمیں اتنا پریشان کیوں کیا؟"

''سوال تو بہت سے کرنا چاہتا ہوں، پر سمجھ نہیں آ رہا، کہاں سے شروع کروں۔ مجھے تو آج بھی یقین نہیں
رہا کہ وجدان مجھے چھوڑ کے جا سکتا ہے۔ یہ میرے بغیر دس دن نہیں رہ سکتا تھا، آج دس سال گزار کر آیا ہے۔''
''میں نے دس سال نہیں گزارے ابو! دس سالوں نے مجھے گزار دیا۔'' ان کی بات پر وجدان عجیب
لہجے میں بولا۔
''کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' عائشہ مصطفیٰ کو اس کا ٹھہرا ہوا لہجہ خوف زدہ کر رہا تھا۔ ''کچھ تو ماں باپ کا خیال
کرو وجدان! تم نے پہلے ہی بہت دکھ دیئے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگیں تو انیقہ اُٹھ کر اُنہیں چپ کرا
لگی۔ گیٹ پر کسی نے بیل بجائی۔
''کیا بات ہے..... مزمل تو بھائی کے آنے کا سن کر اُڑ کے آ گئے۔'' مزمل کی آمد کا اندازہ لگا کر انیقہ
ہوئی اُٹھ گئی۔ کچھ سیکنڈ پر مزمل دوڑتا ہوا لاؤنج میں آیا تھا۔
''مزمل! دیکھو ذرا کون آیا ہے؟'' مصطفیٰ عظیم اب سنبھل چکے تھے، مسکرا کر بولے۔
''آپ نے اس سے پوچھا، یہ اب یہاں کیوں آیا ہے؟'' اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وجدان کو دیکھ کر
سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں مگر لہجہ اجنبیت لئے ہوئے تھا۔ پھر چٹکی بجا کر وجدان کو اُٹھنے کا اشارہ کر
ہوئے وہ سخت آواز میں بولا۔ ''اُٹھو اور ابھی، اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ کسی کو تمہاری ضرورت نہیں۔''
''کیا کہہ رہے ہو مزمل! اتنے سالوں بعد تو وہ آیا ہے اور تم اسے جانے کو کہہ رہے ہو؟'' عائشہ بے چ
بولیں۔ باقی بھی ہر کوئی اس صورتِ حال پر گھبرا گیا تھا۔
مزمل دھاڑا۔ ''یہ یہاں نہیں رہ سکتا۔''
مصطفیٰ عظیم بھڑک گئے۔ ''بس کرو مزمل! تمہیں یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے۔''
''اس نے جانے کا فیصلہ کیا آپ سے پوچھ کر کیا تھا؟'' سکون سے بیٹھے وجدان کو اپنی طرف دیکھتا پا
غصے سے بولا تو انیقہ پریشان ہو اُٹھی۔
''چھوڑیئے مزمل! اب تو وہ لوٹ آیا ہے۔''
مزمل نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''ارے اس کا کیا بھروسہ، کل پھر اُٹھ کر نکل پڑے۔ مجھے کیا
ڈھونڈنے کے سوا اور کوئی کام نہیں؟ جب دل چاہا چلے گئے، جب دل چاہا آ گئے..... کوئی مذاق ہے؟ دل
کا، محبت اس کی، جذبات اس کے۔ باقی ہم سب تو بے حس ہیں۔'' بولتے بولتے وہ ایک دم آنکھوں پر
رکھ کر پلٹ گیا۔ پھر ایک دم مڑا اور وجدان کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔
نے دیکھا اس کی پلکیں نم ہو رہی تھیں۔ پھر وہ وارننگ دینے کے انداز میں بولا۔
''اب اگر تم بتائے بغیر کہیں گئے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔'' وہ اسے گلے لگائے کہہ رہا تھا۔
''آئندہ پر کیوں چھوڑتے ہیں مزمل بھائی! ابھی توڑ دیں۔ نہ ٹانگیں ہوں گی نہ کہیں جا سکے گا۔

یہ تو واقعی نہیں کرنا چاہیئے۔ اب تو یہ ہسٹری شیٹر ہو گیا ہے۔'' آفاق ہنس کر بولا۔

''وجدان تمہیں کہاں ملا؟'' کچھ دیر بعد جب سب نارمل ہو کر بیٹھ چکے اور ایقہ سب کو اسکوائش سرو کرنے
ذمزل نے باتوں کے دوران آفاق سے پوچھا۔ آفاق، گلاس ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر آگے ہوتے ہوئے
نے لگا۔

''آپ کو پتہ تو ہے، میں لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں لاہور ہائی کورٹ میں پاپا کسی چودھری نواز کے حق میں
ں لڑ رہے تھے، جن کا بارڈر کے پاس واقع گاؤں چنگ والی میں اپنے ہی گاؤں کے بارسوخ شخص کے
ہ زمین کے مسئلے پر تنازع چل رہا تھا۔ پاپا کی طبیعت پچھلے دنوں کافی خراب رہی تھی، اس لئے جب فیصلے
تاریخ آئی تو میں پاپا کے ساتھ چلا گیا۔ فیصلہ چودھری نواز کے حق میں ہوا اور انہوں نے خوش ہو کر پاپا کو
ں آنے کی دعوت دے دی۔ میں نے سوچا، اچھا ہے گاؤں کی کھلی فضا میں ان کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا
و تین دن کے لئے پاپا کو لے کر گاؤں چلا گیا۔ وہیں مجھے وجدان ملا۔ پچھلے دس سال سے یہ گاؤں کے
وی صاحب کے ساتھ رہ رہا تھا۔'' مولوی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے آفاق کو وجدان کے متعلق ان کی
ں یاد آئیں اور وہ ایک ہاتھ سے پیشانی مسلتے سوچ میں ڈوب گیا۔

وجدان کا بیٹا اب تک تو چپ کر کے بیٹھا آنکھیں گھما گھما کر ایک ایک کو دیکھ رہا تھا مگر مولوی صاحب کا
م سن کر دہ مچل گیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر دوڑتا ہوا وجدان کے بازو سے آلگا۔

''ابو! گھر چلیں۔''

''بیٹا! اب ہم یہیں رہیں گے۔'' وجدان نے پیار سے سمجھایا۔ پر وہ مانا ہی نہیں اور کہتا رہا۔

''نہیں ابو! یہ گھر اچھا نہیں ہے۔ مولوی صاحب کے پاس چلیں۔''

ابھی تک کسی نے بچے کی موجودگی کو اہمیت نہیں دی تھی اور اب وہ منہ بسورتا بچہ، وجدان کو ''ابو'' کہہ رہا
تھا۔ آفاق کو چھوڑ کر ہر کوئی اس طرف متوجہ ہو گیا جو ابھی تک اپنی سوچ کے تانے بانے بُن رہا تھا۔

''یہ تمہارا بیٹا ہے؟'' مصطفیٰ اعظیم حیرت کے ساتھ وجدان سے گویا ہوئے۔ وجدان نے ان کی طرف دیکھ
کر کہا۔

''ہاں۔'' اور سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ادھر آؤ میرے پاس۔'' مصطفیٰ اعظیم نے ہاتھ پکڑ کر بچے کو خود سے قریب کر لیا۔ ''ہم تمہارے دادا ہیں۔
ہمیں بتاؤ، ابو سے کیا کہہ رہے تھے؟''

''مولوی صاحب کے گھر جانا ہے۔'' اس کی فرمائش پر وہ بولے۔

''تمہیں یہ گھر پسند نہیں ہے؟''

بچے نے منہ بناتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔ مصطفیٰ اعظیم مسکرا کر بولے۔ ''لیکن آپ کو یہ گھر تو اچھا لگنا

چاہئے۔ یہ آپ کے دادا کا گھر ہے، آپ کے ابو کا گھر ہے۔''

''میرا نہیں ہے؟'' بچہ کافی ہوشیار تھا۔ لسٹ میں اپنا نام نہ پا کر پوچھنے لگا۔ معصومیت سے پوچھے گئے اس سوال کی چالاکی پر سب ہنس پڑے تو وہ پزل سا ہو گیا۔ مصطفیٰ اعظیم اسے پیار کرتے ہوئے بولے۔

''سب سے زیادہ تو یہ گھر آپ کا ہی ہے۔ بلکہ صرف آپ کا ہے۔ اگر میں اور ابو تمہارا ٹھیک سے خیال نہ رکھیں تو ہمیں گھر سے باہر نکال دینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس کے سعادت مندی سے کہنے پر ایک بار پھر سب ہنس پڑے۔

''مجھے تو اپنے پوتے سے مل لینے دیں۔'' عائشہ بے تاب ہوئی جا رہی تھیں، جلدی سے بول کر بچے کو اپنے پاس بلا کر گود میں بٹھا لیا۔ مزمل بھی اُٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور بچے کو پیار کرنے لگا۔

''میں تمہاری دادی ہوں اور یہ تمہارے تایا ابو ہیں۔'' انہوں نے اپنا اور مزمل کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم ہمارے پاس رہو گے تو تایا ابو روز تمہیں سیر پر لے کر جائیں گے۔''

''روز......؟'' وہ روز کو لمبا کھینچ کر بولا۔

''ہاں روز۔ زوار اور مناہل کو بھی میں روز سیر پر لے کر جاتا ہوں، تمہیں بھی لے کر جاؤں گا۔'' پھر وہ اپنے بچوں سے بولا۔ ''زوار!..... مناہل! اِدھر آؤ بیٹا! دیکھو وجدان چاچو کا بیٹا آیا ہے۔''

بچے کونے سے نکل کر باپ کے پاس آ گئے۔ مزمل اور انیقہ ان کا آپس میں تعارف کرانے لگے تو عائشہ وجدان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''بیٹے کو تو لے آئے وجدان! پر بیٹے کی ماں کہاں ہے؟'' ان کی شوخی کے جواب میں وجدان پل بھر کو چپ سا ہو گیا، پھر آہستہ سے کہا۔

''وہ تو اسے پیدا کر کے چھوڑ گئی۔'' وجدان کی جھکی ہوئی آنکھیں، رُکا ہوا لہجہ......ان سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہنستے مسکراتے چہرے پل بھر میں بجھ گئے تھے۔ ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لئے مصطفیٰ اعظیم مصنوعی بشاشت کا سہارا لے کر بولے۔

''انیقہ بیٹے! بچہ لمبے سفر سے آیا ہے۔ ذرا اسے نہلا دُھلا کر کپڑے بدلواؤ تا کہ ہمارا پوتا شہزادہ لگنے لگے۔''

وہ فوراً اُٹھ گئی۔ ''چلو، تائی امی نہلا کر پالا پالا سا بچہ بنا دیں گی۔''

''آپ رہنے دیں۔ میں نہلا دیتا ہوں۔'' وجدان فوراً بولتا ہوا اُٹھ گیا۔ انیقہ ہنس دی۔

''یہ کام عورتوں کے کرنے کے ہیں۔''

وجدان نے متانت سے جواب دیا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر اس کے پاس ماں ہی نہیں جو اس کے کام کرتی۔ اس لئے یہ سب مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔''

''اچھا چلو، مجھے اس کے کپڑے تو نکال دو۔ میں پریس کر دیتی ہوں۔''

وجدان نے آفاق کے پیروں کے پاس رکھا بیگ اٹھایا اور انیقہ کی تقلید میں چل پڑا۔ ان کے جانے کے بعد مزمل نے سوچ میں ڈوبے آفاق کو دیکھا، پھر اُٹھ کر اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا اور اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے زور سے چٹکی بجائی تو آفاق ہڑبڑا گیا۔

"کیوں بھائی! یہ تم دونوں دوستوں کو گم ہونے کی بیماری ہے؟ وہ چلتے چلتے گم ہو جاتا ہے، تم بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتے ہو۔"

"مزمل بھائی! مجھے آپ سے وجدان کے بارے میں ایک اہم بات کرنی ہے۔" اس کے مذاق کے جواب میں آفاق سنجیدگی سے بولا۔

"کیا بات ہے؟" مزمل بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"دیکھیں بات کچھ اس قسم کی ہے کہ آپ کو حوصلے سے سننی ہو گی۔"

"ایسا کیا ہو گیا آفاق؟" عائشہ نے تو بات سننے سے پہلے ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے۔ آفاق جلدی سے بولا۔

"اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آنٹی! اس میں کوئی شک نہیں، بات پریشانی کی ہے مگر ایسا نہیں کہ اس پریشانی کو حل نہ کیا جا سکے۔"

"تم بات بتاؤ آفاق!" مصطفیٰ عظیم کو اس کے پہیلیاں بجھوانے سے اُلجھن ہو رہی تھی، دوٹوک انداز میں کہہ کر وہ خود کو کسی بری خبر کے لئے تیار کرنے لگے۔ آفاق نے کہنا شروع کیا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ ملیحہ کا انتقال ہو چکا ہے۔" اتنا بول کر وہ کسی ردِعمل کے انتظار میں رُکا مگر وہاں تاثرات بے جان ہی رہے بلکہ اسے رُکتا دیکھ کر مزمل سپاٹ لہجے میں بولا۔

"ہاں پھر......؟"

آفاق نے افسوس سے اسے دیکھا۔ اتنے سال بعد بھی ان کے دلوں میں ملیحہ کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اپنے افسوس کو جھٹک کر کہنے لگا۔

"پھر یہ کہ وجدان اس صدمے کو سہہ نہیں سکا اور اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ یا عام لفظوں میں آپ یوں سمجھ لیں کہ وہ پاگل ہو گیا تھا۔"

اب آفاق نے ان کے چہروں پر جان کنی کے تاثرات دیکھے تھے۔ آفاق کا دل خراب ہونے لگا۔

'اپنے بیٹے کو صحیح سلامت دیکھ کر بھی اس کے گزرے ہوئے حال کو سن کر اتنی پریشانی...... اور میری بہن کی موت سے بھی فرق نہیں پڑتا۔' معاملہ اگر اس کے عزیز دوست کا نہ ہوتا تو شاید وہ اُٹھ ہی جاتا۔ پر کڑوا گھونٹ بھر کر کہتا گیا۔

"وجدان، مولوی صاحب کے پاس اسی پاگل پن کی حالت میں پہنچا تھا مگر پھر ان کی کوششوں اور کچھ بچے کی خاطر آہستہ آہستہ اس نے خود کو سنبھال لیا اور نارمل انسان کی لائف گزارنے لگا۔ مگر اصل مسئلہ یہی ہے کہ

وہ بظاہر نارمل نظر آتا ہے، مگر ابھی تک اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہوئی۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسے دس سال پہلے کی اپنی زندگی یاد نہیں رہی۔''

مصطفیٰ عظیم جلدی سے بولے۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو جبکہ تم نے خود دیکھا ہے، وہ ہم سے نارمل انداز میں بات کر رہا ہے۔''

''آپ کو اگر اس کا انداز نارمل لگ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اس کے روّیے کو محسوس نہیں کیا۔ انکل! آپ محسوس کرنے کی کوشش کریں تو پتہ چلے گا کہ اس کے روّیے اور آنکھوں میں کتنی غیریت ہے۔''

عائشہ بولیں۔ ''وہ غیریت نہیں، ناراضی ہے۔ ناراض تو وہ پہلے سے تھا، ملیحہ کے بعد ناراضی اور بڑھ گئی ہو گی۔ اسی لئے وہ ٹھیک طرح سے بات نہیں کر رہا۔''

''آپ سمجھ نہیں رہیں۔ جب میں گاؤں میں وجدان سے ملا تو وہ مجھے پہچان نہیں پایا۔ مجھے اس سے اپنا تعارف کروانا پڑا تھا۔''

''لیکن اگر وہ تمہیں نہیں پہچانا تو تمہارے ساتھ یہاں کیوں چلا آیا؟'' مزمل نے نکتہ اُٹھایا۔

''میں اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ روزمرہ زندگی کے واقعات ہمارے شعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب ہم کوئی بات بھول جاتے ہیں تو دراصل وہ ہمارے شعور سے نکل کر لاشعور میں چلی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے، وجدان کے لاشعور میں میری پہچان ہو لیکن اس کا شعور مجھے پہچان نہیں پا رہا۔ اور اسی کنفیوژن میں نہ تو وہ مجھے ریجیکٹ کر پا رہا ہے اور نہ ایکسیپٹ کر رہا ہے۔ اس کے محتاط روّیے سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ بہرحال یہ بات تو کوئی ذہنی امراض کا ماہر ہی صحیح طور پر بتا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم ایک مفروضے کی بنیاد پر وجدان کو پاگل قرار دے کر سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جائیں؟'' وجدان عظیم کے لہجے میں ناگواری تھی۔ آفاق برا منہ بنائے بغیر رسان سے بولا۔

''بات صرف ایک مفروضے کی نہیں انکل! وجدان کو الوژن بھی ہوتے ہیں۔''

''کیسے الوژن؟'' مزمل نے پوچھا۔

''اسے ملیحہ نظر آتی ہے۔'' آفاق نے جواب دیا۔ وہ تینوں کچھ بولنے کے قابل نہیں رہے مگر آفاق کہتا گیا۔

''پہلے مجھے بھی مولوی صاحب کی بات پر یقین نہیں آیا تھا پر میں نے اپنی آنکھوں سے وجدان کو اکیلے بیٹھ کر باتیں کرتے دیکھا ہے۔ وہ بولتے ہوئے اس طرح سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے وہاں پر کوئی موجود ہو۔''

پھر وہ توقف کے بعد ہمدردی سے بولا۔

''میں آپ لوگوں کی فیلنگز کو سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے بھی اس طرح سوچ کر بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ لیکن اگر وجدان کو کوئی ذہنی مرض لاحق ہے تو فوراً علاج ضروری ہے۔ پہلے ہی دس سال کی تاخیر ہو چکی ہے۔'' پھر تسلی دینے کے لئے کہنے لگا۔ ''لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ذہنی مریض کبھی ٹھیک نہیں ہوتے۔ مگر یہ سوچ غلط ہے۔ ذہنی

بھی نزلہ زکام کی طرح ہوتے ہیں، علاج کرانے سے ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن علاج نہ کرانے سے مرض بھی ہو، بگڑ سکتا ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ اگر ایک بار وجدان کو سائیکاٹرسٹ سے ملوا لیا جائے تو بہتر ہو وہ آہستگی سے کہہ کر چپ ہو گیا پھر کچھ دیر کے بعد جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"میں چلتا ہوں۔" وہ جانے کے لئے مڑا، پھر پلٹ کر بولا۔ "آپ چاہے میری باتوں پر یقین نہ کریں لیکن احتیاط ضرور کیجئے گا کہ وجدان سے اس کے ماضی کے بارے میں ایسی کوئی بات نہ پوچھیں جو اسے ڈسٹرب کرسکتی ہو۔ خاص طور پر ملیحہ کے بارے میں۔" پھر وہ اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا اور وہ تینوں اس کی باتوں میں اتنا الجھ گئے تھے کہ اسے کھانے پر روکنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

"کیا بات ہے، جتنی بار آتی ہوں آپ لوگ کھوئے ہوئے ملتے ہیں۔" اریقہ لاؤنج میں آئی تو ان کے چہروں پر سوچ کی پرچھائیاں دیکھ کر بولی۔

"وجدان کہاں ہے؟" مزمل نے پوچھا۔

"بچوں کے ساتھ باتھ روم میں اپنے بیٹے کو نہلا رہا ہے۔ صاحبزادے نے اودھم مچا رکھا ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بول کر مسکرانے لگی تو مزمل نے اسے دیکھ کر کہا۔

"ادھر آ کر بیٹھو۔" اپنے شوہر کے لہجے کی سنگینی کو محسوس کر کے اس نے غور سے ساس سسر کا جائزہ لیا۔ ان کے چہرے بھی ستے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بیٹھ کر پوچھا۔ پھر مزمل نے آفاق کی کہی ساری باتیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ وہ سن کر خاموش ہو گئی، پھر کہا۔

"اگر وجدان، ملیحہ کے لئے گھر چھوڑ سکتا ہے تو مجھے حیرت نہیں ہو گی اگر وہ ملیحہ کی موت کے صدمے سے پاگل ہو جائے۔"

"تم یقین کرتی ہو؟" مزمل بولا۔

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں۔ ملیحہ کے لئے اس کی فیلنگز کس سے چھپی ہیں؟"

"اور یادداشت والی بات؟" مزمل نے اب کے ذرا ٹیڑھا سوال کیا۔ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"کہنا مشکل ہے لیکن میں نے وجدان میں غائب دماغی کی کیفیت محسوس کی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یادداشت کھو چکا ہے۔" وہ چپ ہوئی تو مزمل بولا۔

"تم سے یہ ساری باتیں کہنے کا مقصد ہے کہ تم اس بات کا خیال رکھو کہ گھر میں ایسی کوئی بات نہ ہونے دو جو اُسے ڈسٹرب کر دے۔ پتہ نہیں، آفاق کا اندازہ صحیح ہے یا غلط۔ لیکن احتیاط کرنا بہتر ہے۔"

"میں خیال رکھوں گی۔" پھر مزید کہا۔

"آپ امی ابو کو لے کر آ جائیں، میں کھانا لگواتی ہوں۔"

وجدان اپنے بیٹے کے ساتھ کھانے کے ٹیبل پر آیا۔ وجدان نے پہلے بچے کو کرسی پر بٹھایا، پھر اپنے لئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ بیٹے کی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگا تو انیقہ نے اس کے ہاتھ سے سالن کا چمچہ لے کر کہا۔

''تم آرام سے اپنا کھانا کھاؤ۔ اسے میں کھلا دوں گی۔'' اور بچے کے لئے کھانا نکالنے لگی۔ وجدان نے اس بار کوئی تعرض نہیں کیا اور اپنی پلیٹ میں کھانا نکال کر کھانے لگا۔ انیقہ نے بس کھانا نکال کر دیا، اس کے بعد وہ خود ہی نوالے بنا بنا کر صفائی سے کھانے لگا۔ انیقہ اس کے برابر والی چیئر پر بیٹھ گئی اور سالن کا ڈونگا اپنی طرف کرتے ہوئے اس سے بولی۔

''باتھ روم میں تم نے اودھم مچا رکھا تھا، پر اب کیسے شرافت سے کھانا کھا رہے ہو۔''

''ابو کہتے ہیں، کھانے کے وقت شرارتیں نہیں کرتے۔'' چھوٹے بچے کی سنجیدگی بڑی پُر لطف لگی۔ وہ مسکرا کر بولی

''باتیں بڑی بڑی کرتے ہو۔ پر تم نے ابھی تک اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔''

''آپ نے پوچھا کب؟''

مصطفیٰ اعظیم کو پانی پیتے ہوئے اچھو لگ گیا۔ ''سنبھل کر انیقہ! آخر وکیل کا بیٹا ہے۔'' پھر اُس سے بولے۔

''چلو اب پوچھ رہا ہوں۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''کاکا۔''

انہوں نے اس کا معصومیت بھرا چہرہ غور سے دیکھا۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بچہ بہت ہوشیار ہے۔ انہیں شک ہوا، وہ مذاق کر رہا ہوگا۔

''کاکا تو ابو کہتے ہوں گے، اصل نام کیا ہے؟''

''نام تو یہی ہے۔'' ہچکچا کر بولتے وہ وجدان کو دیکھنے لگا تو مصطفیٰ اعظیم اس سے بولے۔

''وجدان! اپنے بچے کا نام تو بتا دو۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''نام تو کوئی نہیں ہے۔''

''کیا......؟'' عائشہ حیران رہ گئیں۔ ''حد ہو گئی وجدان! بچہ اتنا بڑا ہو گیا اور تم نے ابھی تک اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔''

''کبھی خیال ہی نہیں آیا۔'' وہ جز بز ہونے لگا تو مزمل جلدی سے بولا۔

''اِٹس اوکے یار! نہیں رکھا تو اب رکھ لیتے ہیں۔ بلکہ ابو! میرے بچوں کے بھی نام آپ نے رکھے ہیں تو وجدان کے بیٹے کا نام بھی آپ ہی رکھ دیں۔''

مصطفیٰ اعظیم کھانا چھوڑ کر نام سوچنے لگے۔

"شایان مصطفیٰ کیسا رہے گا؟" عائشہ بولیں۔ "ایک دم میرے پوتے کے شایانِ شان۔ کیوں وجدان! نام پسند آیا؟"

"ہاں، شایان اچھا نام ہے۔" اسے بھی دلچسپی ہوئی۔

"اس کا مطلب شایان مصطفیٰ فائنل ہے۔" مزمل نے پوچھا۔

"بالکل۔" انیقہ نے کہا تو مزمل بچے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب بتاؤ بھتیجے! تمہارا نام کیا ہے؟"

اُس نے ایک پل سوچا، پھر مسکرا کر بولا۔ "میرا نام شایان مصطفیٰ ہے۔"

وجدان کو کھانے میں ذرا بھی رغبت نہیں تھی۔ بس شایان کے انتظار میں بڑی دیر کے بعد نوالہ منہ میں رکھتا اور آرام آرام سے چبانے لگتا۔ شایان کھا چکا تو اس نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے یہ کیا وجدان! تم نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔" عائشہ ٹوک کر بولیں۔

"بس امی! اور دل نہیں چاہ رہا۔ ویسے بھی کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ پھر شام میں باتیں کریں گے۔" انہوں نے خوش دلی سے اجازت دیتے ہوئے کہا مگر وجدان کرسی سے اُٹھا ہی نہیں۔ اسے سر جھکا کر سوچ میں ڈوبے دیکھ کر مصطفیٰ بولے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

اسے لگا جیسے وہ جھجک رہا ہے۔ پھر دھیرے سے بولا۔ "میرا کمرہ کہاں ہے؟"

سب نے دم سادھ لئے۔ دس کیوں، بیس سال بھی گزر جائیں تب بھی کوئی اپنے کمرے کا راستہ نہیں بھولے گا۔

"تم چلو، میں بتاتی ہوں۔" انیقہ نے سچویشن کو سنبھال لیا تھا۔ وجدان نے شایان کا ہاتھ پکڑا اور انیقہ کے پیچھے پیچھے ڈائننگ روم سے نکل گیا۔ مزمل ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں رکھ کر اٹھ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو مزمل! پہلے کھانا تو ختم کر لو۔" متفکر سے مصطفیٰ عظیم اسے کھانے کے بیچ میں اٹھتا دیکھ کر بولے۔ مزمل نے پلٹ کر دھیرے سے کہا۔

"ایک دوست کو فون کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے تایا بہت اچھے سائیکاٹرسٹ ہیں۔" اس کا مطلب سمجھ کر مصطفیٰ اور عائشہ چپ کے چپ رہ گئے۔ پھر مصطفیٰ عظیم پست آواز میں بولے۔

"کوشش کرنا کل کی ہی اپائنٹمنٹ مل جائے۔"

مزمل نے ان کی طرف دیکھا اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ مل گیا تھا۔ مزمل نے اس کی خبر آفاق کو بھی دے دی۔ ایک وہی تو تھا وجدان کے روز و شب کا ساتھی۔ اسے وجدان کے بارے میں سب معلوم تھا۔

''آفاق! تم آٹھ بجے تک کلینک پہنچ جانا۔'' مزمل نے یاد دہانی کروائی۔

''ضرور مزمل بھائی!......وجدان کے لئے میں بھی بہت پریشان ہوں۔''

مزمل نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا اور نظریں ایک نقطے پر مرکوز کر لیں جیسے گہری سوچ میں ہو۔

❀❀❀

آفاق آٹھ بجے کلینک پہنچا تو اسے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ اور ڈاکٹر رحمت ساتھ ساتھ ہی کلینک میں داخل ہوئے تھے۔ آفاق نے جب اپنا تعارف کرایا تو وہ بہت تپاک سے ملے۔

''اوہ، تو آپ ہیں وجدان کے دوست۔ مزمل سے فون پر آپ کے بارے میں بات ہوئی تھی۔'' وہ بولے۔ وہ ڈیل ڈول کے درمیانی قامت والے شخص تھے، جن کی عمر ساٹھ کے پیٹے میں تھی۔ بچوں جیسے معصوم چہرے پر سفید داڑھی تھی۔ سر کے بال بھی سفید تھے جو اتنے ہلکے ہو چکے تھے کہ تقریباً گنجے نظر آتے تھے۔ موٹے عدسوں کی عینک پہنے ان کی آنکھیں چمکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ آفاق کو ساتھ لئے اپنے روم میں آ گئے۔ اپنی چیئر پر بیٹھ کر انہوں نے سامنے کرسی پر بیٹھے آفاق کو مسکرا کر دیکھا تو یوں لگا جیسے کوئی بچہ شرارت پر آمادہ ہو، پھر دلچسپی سے بولے۔

''تو بتائیں آفاق! مجھے سنانے کے لئے آپ کے پاس کیا ہے؟''

''سنانے کے لئے اتنا کچھ ہے ڈاکٹر صاحب! کہ مجھے لگا کہ اس داستان کی طوالت میں اُلجھ کر کہیں کوئی اہم بات بتانے سے نہ رہ جائے۔ اس لئے میں اپنی ان یادداشتوں کو لکھ لایا ہوں جو وجدان سے متعلق ہیں۔'' آفاق نے فائل ٹیبل پر رکھ کر ان کی طرف کھسکا دی۔

''ارے یہ تو آپ نے کمال کا کام کیا ہے۔ واقعی طویل گفتگو کے دوران بہت سی باتیں ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔'' بچوں کی طرح خوش ہو کر اُچھلتے ہوئے انہوں نے فائل پکڑ لی، پھر اس کے اندر صفحوں کو ہاتھ میں لے کر تیزی سے گراتے دیکھا۔ پھر فائل بند کر کے کہا۔ ''بس پھر آپ جائیں تاکہ میں ان صفحوں کو پڑھ سکوں۔''

''جی بالکل۔'' ان کے جملے کے ساتھ ہی آفاق کھڑا ہو گیا۔

''جاتے جاتے اپنا نمبر ضرور دیتے جائیے گا۔ تاکہ اگر میرے ذہن میں کوئی سوال آ جائے تو براہ راست آپ سے کونٹیکٹ کر سکوں۔''

''شیور۔'' آفاق نے اپنا کارڈ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

❀❀❀

سب رات کا کھانا کھا رہے تھے جب فون بجنے لگا۔ مزمل ''میں دیکھتا ہوں'' کہہ کر نوالہ پلیٹ میں رکھ کر اُٹھا اور فون کا ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف ڈاکٹر رحمت اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں بولے۔

''برخوردار! ہیلو ہائے سے کام نہیں چلے گا۔ بھائی کو لے کر کلینک آ جاؤ۔ اب اس سے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔''

''آپ وقت بتا دیں، میں اسے لے کر آ جاؤں گا۔''

''دیکھو میاں! ویسے تو ہمارے پاس دو ہفتے تک ٹائم نہیں تھا مگر وجدان کا کیس پڑھنے کے بعد مجھے لگتا ہے، دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اب اگر تم صبح نو بجے آ سکتے ہو تو میں اپنی کل صبح کی اپائنٹمنٹس کینسل کر دیتا ہوں۔''

ان کی بات سن کر مزمل جلدی سے بولا۔ ''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں اسے لے کر صبح نو بجے پہنچ جاؤں گا۔''

''پھر ایسا ہے کہ وجدان کو کلینک لانے سے پہلے ایک خاص چیز تمہیں مجھ تک پہنچانی ہو گی۔'' مزمل نے دھیان سے ان کی بات سنی اور چونکہ کھانے کے ٹیبل پر وجدان موجود تھا اور فون ڈائننگ ٹیبل سے بہت دور نہیں تھا، اس لئے محتاط انداز میں کہا۔

''آپ فکر مت کریں انکل! آپ کی مطلوبہ چیز ابو کے پاس ہے اور میں ان سے وہ لے کر آدھے گھنٹے میں آپ کے گھر پہنچ رہا ہوں۔''

فون رکھ کر وہ مصطفیٰ عظیم سے بولا۔ ''ابو! آپ ذرا اپنے کمرے میں آئیں گے؟''

انہیں مزمل کے لہجے میں غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔ وہ فوراً اُٹھ گئے۔ ''چلو!''

ان کے ساتھ بیٹھا شایان جو ان تھوڑے سے دنوں میں ہی ان سے ہل گیا تھا، انہیں جاتے دیکھ کر وہ بھی کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا۔

''شایان! کھانا کھا کر جاؤ'' انیقہ نے اسے اٹھتے دیکھ کر ٹوکا بھی مگر وہ ''کھا لیا تائی امی!'' کہہ کر مصطفیٰ عظیم کے کمرے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ جب وہ اُچھلتا کودتا ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ اسٹڈی ٹیبل کا دراز کھول کر کھڑے تھے۔ پھر انہوں نے دراز میں سے ایک لفافہ نکال کر مزمل کو دیا۔ مزمل نے لفافہ لے کر اس میں سے تصویریں نکالیں اور دیکھنے لگا۔ پھر ایک تصویر الگ کر کے بولا۔

''ہاں یہی تصویر چاہیے۔'' پھر باقی تصویریں اور لفافہ اپنے ابو کو تھما کر چلا گیا۔ مصطفیٰ عظیم ان تصویروں کو دوبارہ لفافے میں ڈال رہے تھے کہ شایان اپنی پُرتجسس فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیزی سے ان کے پاس آ گیا اور اُچک کر تصویروں کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

''یہ کیا ہے؟'' پھر ان تصویروں کو دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

''تمہیں نہیں پتہ کون ہیں؟'' وہ اس کی لاعلمی کو شرارت سمجھ کر مسکراتے ہوئے بولے تو شایان اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو جھپک کر سر دائیں بائیں ہلانے لگا۔

''نہیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' وہ ہنس کر بولے اور تصویریں لفافے میں ڈالنے لگے تو شایان ان کا بازو دبوچ کر بولا۔ ''بتائیں نا دادا ابو! یہ کون ہیں؟''

اب وہ اس کی بچکانہ سی اُلجھن کو محسوس کر کے چونکے۔

''کیا تمہیں ابو نے کبھی ان کے بارے میں نہیں بتایا؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیا تم نے کبھی ان کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی؟''

شایان نے ایک نظر غور سے تصویر میں نظر آتے چہرے کو دیکھا اور پھر دوبارہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ مصطفیٰ عظیم کی پیشانی پر لکیریں اُبھر آئیں۔

''وجدان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔'' وہ بڑبڑائے پھر ہاتھ مار کر دراز بند کرتے ہوئے شایان سے بولے۔ ''ابو نے نہیں بتایا تو کیا ہوا؟ میں تمہیں بتاتا ہوں یہ کون ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔'' پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ اسے ساتھ لئے صوفے پر جا بیٹھے۔ پھر وہ ساری تصویریں اسے ایک ایک کر کے دکھاتے ہوئے دھیرے دھیر اسے کچھ بتانے لگے۔

''میں یہ تصویریں اپنے پاس رکھ لوں؟'' ان کی بات ختم ہوئی تو شایان بولا۔

''ہاں۔ لیکن ابو سے ذکر مت کرنا۔ انہیں ان کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ٹھیک ہے؟'' انہ نے رسان سے سمجھایا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

❁❁❁

اگلے دن نو بجے سے کچھ منٹ پہلے ہی مزمل اپنے ساتھ وجدان اور مصطفیٰ عظیم کو لئے ڈاکٹر رحمت کلینک پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر رحمت اسے کل بتا چکے تھے کہ آج وہ وجدان کے ساتھ سٹنگ رکھیں گے۔

وہ لوگ رُوم میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر رحمت ان کے استقبال کے لئے اپنی سیٹ سے اٹھ گئے۔ یہ گرمج غالباً ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ ان تینوں کو کرسیاں پیش کر کے وہ خود بھی جا کر اپنی چیئر پر بیٹھ گئے۔

''ہاں تو بتایئے، کیا لیں گے؟ چائے یا ٹھنڈا؟'' مصطفیٰ عظیم کو لگا، وہ کلینک نہیں آئے بلکہ کسی عزیز ملنے اس کے گھر جا پہنچے۔ ان کی بے تکلفی پر عجیب سا محسوس کرتے ہوئے انہوں نے جلدی سے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب!'' مگر انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں، سر ہلا کر اپنے آپ سے بولے ''چائے ہی منگوا لیتا ہوں۔'' اور انٹر کام اٹھا کر چائے لانے کو کہا۔ جب چائے آئی تو انہوں نے ایک عجیب حرکت کی۔ انہوں نے چائے لانے والے لڑکے کو جانے کا اشارہ کیا اور خود اپنی جگہ سے اٹھ کر چا بنانے لگے۔

''کتنی چینی لیتے ہیں مصطفیٰ صاحب!'' وہ چہرے پر عجیب سے تاثرات کے ساتھ بولے۔

''ڈیڑھ چمچ۔''

پھر انہوں نے مزمل سے بھی یہی سوال کیا۔ مصطفیٰ عظیم کے برعکس اس کے چہرے پر اچنبھے کا کوئی تاثر نہ تھا۔ اسے معلوم تھا، ڈاکٹر رحمت اپنے مریضوں سے اسی طرح پیش آتے ہیں۔

"دو چمچے۔" اس نے کہا۔

ڈاکٹر رحمت نے چینی ملا کر ان کے کپ ان کے سامنے رکھے پھر تیسرے کپ میں چائے ڈال کر شوگر پاٹ ہاتھ میں لیا اور وجدان سے پوچھا۔

"کتنے چمچے؟" پھر فوراً ہی بولے۔ "لیکن میں تم سے کیوں پوچھ رہا ہوں جبکہ مجھے معلوم ہے تم میٹھی چائے پیتے ہو۔ تین چمچے کافی ہوں گے۔" ان کی خود کلامی سن کر بے ساختہ وجدان کی زبان سے نکلا۔

"میں چائے بنا شکر کے پیتا ہوں۔"

ڈاکٹر رحمت نے ہاتھ میں پکڑا چینی کا چمچہ شوگر پاٹ میں اُلٹ کر وجدان کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بغیر چینی کے چائے کا کپ اسے پکڑا دیا۔

مصطفیٰ عظیم کو اچانک ہی ان کے اب تک کے روّیے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ وجدان کی یہ عادت خود انہیں بھول چکی تھی بلکہ شاید کسی کو بھی اس کی یہ عادت یاد نہیں رہی تھی کیونکہ جب سے وہ واپس آیا تھا، اسے چینی ملی چائے ہی مل رہی تھی۔ اور وجدان بھی آرام سے پی لیتا۔ ورنہ دس سال پہلے وہ چینی والی چائے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ ڈاکٹر رحمت کو یقیناً یہ بات آفاق نے بتائی ہوگی اور اب انہوں نے غیر محسوس انداز میں وجدان کو اس کی ایک بھولی ہوئی عادت یاد کرا دی تھی۔ مصطفیٰ عظیم اچانک ان سے بہت متاثر نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے مزمل کو دیکھا جو ان کے تاثرات کی تبدیلی کو محسوس کر کے مسکرا رہا تھا۔ پھر جتنی دیر میں چائے پی گئی، انہوں نے وجدان سے کوئی بات نہیں کی۔ چائے ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر رحمت اس کے دائیں بائیں بیٹھے، اس کے والد اور بھائی سے بولے۔

"آپ دونوں کے ساتھ کافی باتیں کر لیں۔ اب میرا جی چاہ رہا ہے کہ وجدان سے بھی کچھ گپ شپ ہو جائے۔ مزمل! والد صاحب کو لاؤنج میں لے جاؤ۔" اور مزمل فوراً اُٹھ کر مصطفیٰ عظیم کی طرف آ گیا۔

"چلیں ابو! باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔" پھر انہیں ساتھ لئے کمرے سے باہر آ گیا۔

"وجدان ٹھیک تو ہو جائے گا مزمل؟" وہ آس بھرے لہجے میں بولے۔

"ان شاء اللہ! آپ اچھی امید رکھیں۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ پھر ڈاکٹر صاحب بھی تو وجدان کو پرسنل اٹینشن دے رہے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وجدان ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھیں اور بالکل پریشان نہ ہوں۔" انہیں تسلی دیتے ہوئے مزمل نے انہیں اپنے ساتھ ہی صوفے پر بٹھا لیا۔

ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی ڈاکٹر رحمت، وجدان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں تو برخوردار! اپنے بارے میں کچھ بتاؤ...... کچھ بھی..... جیسے کہ تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے؟ کون سا موسم اچھا لگتا ہے؟...... یا اسپورٹس کے بارے میں ہی کوئی بات کر لو۔ آفاق نے مجھے بتایا تھا، تم کالج میں فٹ بال ٹیم کے کپتان تھے۔ تمہارا فیورٹ فٹ بال پلیئر کون ہے؟" وہ سوال پہ سوال کئے جا رہے تھے اور

کہیں بھی جواب لینے کے لئے رُکے نہیں۔ چوکور پیپر ویٹ کو ہاتھ میں لے کر گھماتے وجدان کو دیکھتے ہو
انہیں جواب ملنے کی اُمید بھی نہیں تھی حالانکہ وہ اس وقت سوچ میں ڈوبا لگ رہا تھا پر اس کی آنکھوں کی اُلجھ
بتا رہی تھی کہ وہ اپنی سوچ کو مرتکز نہیں کر پا رہا۔ ڈاکٹر رحمت نے چپ ہو کر اسے دیکھا، پھر بولے۔

''بلیو کلر تمہارا فیورٹ ہے۔'' وجدان نے ان کی طرف دیکھا تو وہ اپنے اندازے کی وضاحت کر
بولے۔ ''دراصل میں سوچ رہا تھا کہ ٹیبل پر وائٹ اور براؤن کلر کے پیپر ویٹ بھی رکھے ہیں مگر تم اپنے سا
رکھے ان پیپر ویٹس کو چھوڑ کر دُور رکھے بلیو پیپر ویٹ کو اُٹھا کر اس سے کھیل رہے ہو۔''

''یہ پیپر ویٹ بلیک کلر کا ہے۔'' وجدان نے پیپر ویٹ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''ارے ہاں، یہ تو بلیک ہی ہے۔'' وہ چونک کر بولے جیسے پہلے کبھی اس کے کلر پر دھیان نہ دیا ہو۔ وجدا
کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی کہ وہ ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ اس نے پیپر ویٹ نیچے رکھا اور دونوں بازو سینے
باندھتے ہوئے کرسی پر پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر رحمت پھر سے شروع ہو گئے۔

''اچھا تمہاری ہابیز کیا کیا ہیں؟...... بک رِیڈنگ؟'' انہوں نے ٹیبل کی طرف دیکھتے وجدان کو دیکھ کر قیا
کیا، پھر خود ہی کہنے لگے۔ ''آف کورس، بک رِیڈنگ ہی ہو گی۔ تمہاری عمر تک پہنچتے پہنچتے عام طور پر لوگ ا
میچور ہو چکے ہوتے ہیں کہ فارغ وقت کو بھی گنوانا پسند نہیں کرتے اور ایسی ہی کوئی ہیلدی ایکٹیوٹی ڈھونڈ لیتے
ہیں۔ ویسے مجھے بھی بُک رِیڈنگ کا شوق ہے۔ کبھی کبھار کچھ وقت نکال کر لائبریری بھی چلا جاتا ہوں۔ ا
معاملے میں میری عادت بالکل ملیحہ جیسی ہے۔'' انہوں نے اتنے اچانک ملیحہ کا نام لیا تھا کہ وجدان نے کر
کھا کر انہیں دیکھا۔ وہ اس کی کیفیت کو نوٹ کرنے کے باوجود بولتے رہے۔

''مشتاق یوسفی میرے فیورٹ رائٹر ہیں اور ان کی یہ کتاب تو مجھے خاص طور پر پسند ہے۔ چلو میں تمہیں ا
کی کچھ لائنز سناتا ہوں۔'' بولتے بولتے وہ اٹھے اور وجدان کے سامنے رکھی کتاب اٹھالی۔ انہوں نے ا
ہاتھوں کی حرکت اتنی نمایاں رکھی کہ وجدان ضرور متوجہ ہوتا۔ پھر جیسے ہی وہ کتاب اُٹھاتے، اس کی نظر کتا
کے نیچے رکھی ملیحہ کی تصویر پر بھی پڑتی جو انہوں نے مزمل سے خاص طور پر منگوائی تھی اور ہدایت کی تھی کہ تصو
ایسی ہو، جس میں ملیحہ کا چہرہ واضح نظر آ رہا ہو۔ ان کے ہاتھ کی حرکت پر وجدان بے ساختہ متوجہ ہوا تھا اور
اُس کی نظر بندھ گئی۔ ڈاکٹر رحمت سرسری سی نظر اس پر ڈال کر کتاب کھولتے ہوئے اس میں سے کچھ لائنز پڑھ
کر سنانے لگے۔ گاہے بگاہے وہ اسے بھی دیکھ لیتے، جس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت نظر آ رہی تھی اور ذرا
دیر میں ہی اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ وجدان ان کی آواز نہیں سن رہا تو کتا
بند کر کے ٹیبل پر رکھتے وہ اس کے ساتھ والی چیئر پر آ بیٹھے۔ اس کے بعد انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ملیحہ کی تصو
اس کے سامنے سے اٹھالی۔ وجدان ہڑبڑا کر چونکا، پھر اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ ڈاکٹر رحمت نے اس
بازو پر ہاتھ رکھ کر تصویر اس کے سامنے لہرائی۔

''دل چاہ رہا ہے تو کچھ دیر اور دیکھ لو۔''

وجدان نے گردن موڑے بغیر ہی انکار میں سر ہلا دیا تو وہ قصداً مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ہاں بھئی، تمہیں تصویر کی کیا ضرورت جب بالمشافہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ ویسے باتیں تو خوب ہوتی ہوں گی۔ کیا باتیں ہوتی ہیں؟'' ان کے پوچھنے کے انداز میں اتنی شوخی تھی، جیسے کالج بوائے اپنے دوست سے ''ڈیٹ'' کا احوال معلوم کر رہا ہو۔ وجدان نے سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''میں ان کی آواز سننے کو ترس گیا ہوں۔''

اب وہ ایک دم سے سنجیدہ نظر آنے لگے۔ ''تم اس سے کیا سننا چاہتے ہو؟''

وجدان نے آنکھیں بند کر لیں۔ ''میں بس اتنا چاہتا تھا کہ ایک دن وہ خود میرے پاس چلی آئیں اور کہیں، لو میں تمہاری ہوئی۔'' اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ''ایک بار انہوں نے بھی چاہا تھا کہ میں ان کے پاس آ جاؤں اور وہ مجھ سے سب کہہ دیں جو انہوں نے کبھی نہیں کہا..... پھر میں ان کے پاس گیا بھی، مگر انہوں نے منہ پھیر لیا..... خود بلا کر منہ پھیر لیا۔'' وجدان ہونٹ کاٹنے لگا۔

''بہت تکلیف ہوئی تھی۔ اب بھی ہوتی ہے۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ جس سے محبت کی، اسے رحم کی عادت نہیں۔ جیتے جی بھی سراب دکھائے اور مر کر بھی سراب دکھاتی ہیں۔''

اب ڈاکٹر رحمت کو کچھ پوچھنے یا کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بنا رُکے بولتا ہی چلا گیا۔

دو گھنٹے بعد جب وہ ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا تو اس کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ جذباتی معرکوں سے گزر کر آ رہا ہے۔ مصطفیٰ عظیم اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے پھر تیزی سے اس کے پاس چلے آئے۔

''تم ٹھیک ہو بیٹا؟''

''جی ابو'' اس نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

''ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

''آپ دونوں کو اندر بلوایا ہے۔'' اس نے مزمل کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا تو مزمل بولا۔

''ٹھیک ہے۔ تم بیٹھو، ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔'' پھر وجدان کو چھوڑ کر وہ دونوں، ڈاکٹر کے کمرے میں چلے آئے۔

''مجھے ان کی بیماری کا پتہ چل گیا ہے۔ یہ شیزوفینیا میں مبتلا ہیں۔'' وہ دونوں بیٹھ چکے تو ڈاکٹر رحمت نے کسی سوال سے پہلے ہی کہہ دیا۔ اپنے پچھلے روّیے کے برخلاف وہ اس وقت پروفیشنل انداز میں بات کر رہے تھے۔ مصطفیٰ عظیم نے ان کی بات سنی، پھر قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''وہ سمجھانے لگے۔ ''شیزوفینیا ایسی نفسیاتی بیماری ہے جس میں مریض اپنی سوچوں اور خواہشات کی اُلجھی دنیا میں جیتا ہے اور حقیقی دنیا اور اس کے لوگ یہاں تک کہ مریض کی اپنی شخصیت تک پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اگر آپ کسی ایسے مریض سے بات کریں گے، اس کے جواب آپ کے سوالوں سے میل نہیں کھاتے۔ اس کی حرکات وسکنات بھی عجیب ہوتی ہیں، ساتھ ہی اس میں جذباتی بے حسی بھی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی وہ چیزیں جن پر دوسرے لوگ خوش یا اُداس ہوتے ہیں، یہ اس پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کرتا۔ آپ کی رائے میں یقیناً وہ شخص پاگل ہوگا۔ لیکن ٹیکنیکلی شیزوفینیا کے مریض پاگل نہیں ہوتے۔ کیونکہ پاگل اسے کہا جاتا ہے جو سوجھ بوجھ نہ رکھتا ہو۔ لیکن شیزوفینیا کے مریض سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ وہ باتوں کو سنتے بھی ہیں اور ٹھیک سے سمجھتے بھی ہیں۔ بس اس پر ردِعمل کا اظہار نہیں کرتے۔

دراصل وہ بیرونی دنیا کے مقابلے میں اپنے اندر کی دنیا کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ ان کی اس پرائیویٹ ورلڈ تک رسائی پاسکیں تو پتہ چلے گا کہ ان کی باتیں اور حرکات سو فیصد معنوی ہیں۔ اس حالت کو عام الفاظ میں Self absorption کہہ سکتے ہیں۔ یہ اس حد تک بڑھ سکتی ہے کہ مریض کے لئے وقت کا احساس مٹ جاتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کس جگہ موجود ہے۔ اور بعض اوقات تو مریضوں کی بھوک پیاس تک ختم ہو جاتی ہے۔ وہ لگاتار کئی دنوں تک بنا کھائے پیئے زندہ رہ سکتے ہیں۔ بلکہ اگر آپ کھلانا بھی چاہیں تو وہ نہیں کھائیں گے۔ بعض Acute cases میں تو مریض پرسنل ہائی جین اور حاجت تک سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اکثر ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا جو گرد آلود چہروں اور خستہ لباس میں سڑک کے کنارے پر بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی یوں ہی خلا میں گھورنے لگتے ہیں، کبھی سر جھکا کر کچھ بڑبڑانے لگتے ہیں اور کبھی اچانک ہی ان پر جنون طاری ہو جاتا ہے تو وہ چیخنے چلاّنے لگتے ہیں۔ ان میں اکثر لوگوں کو شیزوفینیا کا مرض لاحق ہوتا ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر اُنہیں پاگل سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بعض تو پتھر پھینکنے سے بھی نہیں چوکتے۔ شیزوفینیا کی ابتدائی اسٹیج سے گزرتے ہوئے وجدان کو بھی ان حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا جب لوگوں نے اس پر آوازیں کسیں اور اس پر پتھر پھینکے۔''

اپنے لاڈلے بیٹے کے لئے ان الفاظ پر مصطفیٰ عظیم کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔ مزمل نے فوراً ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تھپکتے ہوئے انہیں ریلیکس کرنا چاہا مگر اپنے بیٹے کے اس گزرے ہوئے دور کو بھی برداشت کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ ڈاکٹر رحمت اسی سنجیدگی سے کہتے رہے۔

''ویسے آپ کے بیٹے کی پرسنل ٹریجڈی سے ہٹ کر بھی یہ کیس بہت انوکھا ہے۔ عام طور پر شیزوفینیا کا کسی جذباتی صدمے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر وجدان کے مرض کا براہِ راست تعلق ملیحہ کی موت سے ہے۔ ملیحہ کی اچانک موت نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ آج تک اس صدمے سے اُبھر نہیں سکا۔ بہرحال میرے تجربے کے مطابق تو وجدان میں شیزوفینیا کی تمام علامات پائی جاتی ہیں۔ اس کی کیس ہسٹری بتاتی ہے کہ ملیحہ کی موت کے

بعد وجدان self absorption کے فیز سے گزرا تھا۔ حالانکہ وہ جلد ہی کسی پراپر علاج کے بغیر اس فیز سے باہر بھی آ گیا تھا، جس کے لئے آپ کو شایان کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔ اس بچے کے ساتھ جذباتی وابستگی نے ہی اسے حقیقی دنیا کی طرف لوٹنے پر مجبور کیا ورنہ شیزوفینیا کے مریضوں میں وِل پاور کے استعمال کی مثالیں بہت کم ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اس میں کسی دوسرے مریض کی طرح ہی ذہنی انتشار اور ارتکاز کی کمی پائی جاتی ہے۔ گو کہ یہ علامات شدید نہیں اور وہ کئی سالوں سے ان علامات کے ساتھ کسی حد تک نارمل لائف گزار رہا ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں خیالات کی رو ہر وقت بہتی رہتی ہے اور Affect flat کی علامت تو آپ نے بھی نوٹ کی ہو گی۔ دس سال بعد لوٹنے پر اس کے انداز میں نہ تو گرم جوشی ہے اور نہ ہی وہ کسی ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔''

''لیکن وہ یہ کیوں کہتا ہے کہ اسے ملیحہ نظر آتی ہے؟'' وہ چپ ہوئے تو مزمل جلدی سے بولا۔

''That's hallucination...... اور یہ شیزوفینیا میں بہت کامن ہے۔ حالانکہ زیادہ تر تو Auditory experience کی رپورٹ کرتے ہیں لیکن بہت سے مریض ایسی چیزوں کو بھی دیکھتے ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتیں۔ وجدان کو ملیحہ نظر آتی ہے کیونکہ وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اسی شدید خواہش کے پیش نظر اس کے ذہن نے ملیحہ کی شبیہہ تراش لی ہے۔''

''اور اس کی یادداشت..... کیا وہ واقعی یادداشت کھو چکا ہے؟'' ایک اور سوال ہوا۔ ڈاکٹر رحمت نے ترحم آمیز نظروں سے مصطفیٰ اعظیم کو دیکھا۔

''بدقسمتی سے شیزوفینیا کے اکثر مریضوں کو یادداشت کھونی پڑتی ہے۔ کبھی جزوی اور کبھی مکمل طور پر۔ دراصل ان مریضوں کے دماغ میں کسی شعوری کوشش کے بغیر خیالات کا ریلا بہتا چلا جاتا ہے۔ یہ کسی مچھلی بازار کی طرح ہی ہے، جہاں ہر آواز آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ نتیجتاً آپ کسی کو بھی توجہ نہیں دے پاتے۔ اس کو ذہنی ارتکاز کی کمی کہتے ہیں۔ یہ کمی صرف سوچوں پر ارتکاز کی نہیں ہوتی بلکہ وہ یادوں پر بھی ارتکاز نہیں کر پاتے۔ اور اتنا تو سبھی جانتے ہیں کہ جب ہم کسی چیز کو یاد نہیں رکھ پاتے تو اسے بھول جاتے ہیں۔''

پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔

''لیکن ہماری یادداشت اور ہمارے جذبات کے بیچ گہرا تعلق ہوتا ہے اس لئے یہ بھی ممکن ہے وجدان کی یادداشت شیزوفینیا سے نہیں بلکہ جذباتی صدمے سے متاثر ہوئی ہو۔ اس سچویشن کو fugue state کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ amnesia کی اس قسم میں خاص طور پر جذباتی دھچکا یادداشت کے کھونے کا سبب بنتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی کچھ یادیں محفوظ رہ جاتی ہیں حالانکہ ضروری نہیں کہ ان یادوں میں کوئی ربط ہو۔ لیکن وجدان کے ذہن میں وہی یادیں تازہ رہیں جو ملیحہ سے متعلق تھیں اور fugue state میں کبھی کبھار مریض اپنی اصلی شخصیت کو کھو کر نئی شخصیت بنا لیتے ہیں جیسے وجدان نے خود کو عبداللہ کی شخصیت میں ڈھال لیا تھا۔''

''وہ ٹھیک تو ہو جائے گا نا؟'' مصطفیٰ عظیم کی آواز میں اس کے ساتھ ساتھ اندیشے بھی بول رہے تھے۔ ڈاکٹر رحمت سنجیدگی کو ترک کر کے مسکرائے۔

''کیوں نہیں؟ میں نے آپ کو بتایا نا کہ ایسے مریضوں کا علاج مشکل نہیں ہوتا۔ اصل مسئلہ ان کا اعتماد حاصل کرنا ہے کیونکہ اکثر مریض کبھی نہیں مانتے کہ جو وہ دیکھ رہے ہیں، وہ موجود ہی نہیں۔ لیکن وجدان کے ساتھ ایسی کوئی دقت نہیں۔ وہ قبول کرتا ہے کہ ملیحہ کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور hallucinations کو بھی سراب کہتا ہے۔ اس صورت میں علاج کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔''

''اور اس کی یادداشت؟'' ان کے تسلی دینے پر مزمل کی فکرمندی کم تو ہوئی تھی، ختم نہیں ہوئی۔ ان کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوگئی۔

''وہ توری اسٹور ہونا شروع بھی ہو چکی بلکہ حقیقتاً تو وجدان کی یادداشت گئی ہی نہیں...... بات صرف اتنی ہے کہ دس سال تک وہ ہر پل ملیحہ کو سوچتا رہا ہے۔ کسی اور یاد کو اس کے ذہن میں جگہ نہیں ملی تو وہ فرنٹ سائیڈ سے ہٹ کر بیک سائیڈ پر چلی گئی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ہم کسی چیز کو کہیں رکھ کر بھول جائیں مگر یاد کرنے پر یاد آ جاتا ہے کہ فلاں چیز کہاں رکھی تھی۔ وجدان کچھ بھی بھولا نہیں ہے۔ بس اسے یاد نہیں رہا۔ جبکہ یادداشت کا گم ہونا تو اسے کہتے ہیں، جب کوشش کے باوجود کسی کو کچھ یاد نہ آئے۔ لیکن وجدان جیسے جیسے اپنی پچھلی زندگی کی طرف لوٹے گا، اسے دھیرے دھیرے سب یاد آ جائے گا۔ لیکن اس دوران آپ لوگوں کو وجدان کا بہت خیال رکھنا ہے کیونکہ یادداشت کی بحالی کے عمل کے دوران اکثر لوگ ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔''

کچھ دیر تک وہ انہیں وجدان کے متعلق ہدایات دیتے رہے، پھر مزمل ان سے دواؤں کا پرچہ لے کر اگلی سٹنگ کی اپائنمنٹ سیٹ کرتے ہوئے اپنے ابو کے ساتھ جانے کے لئے کھڑا ہوا اور ان سے ہاتھ ملا کر دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔

❁❁❁

'ایک اور بے خواب رات' بیڈ پر دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹے وجدان نے سوچا۔ وہ بہت دیر سے سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا ذہن یادوں کی آماجگاہ بنا تھا۔ اس کے ذہن کی سطح پر تیرتی بھولی بسری یادوں کا کوئی نقش اچانک ہی واضح ہو جاتا، پھر اگلے ہی پل یادوں کے نقوش دھندلا سے جاتے اور اس کا ذہن انہیں کریدنے لگتا۔ کبھی یہ جدوجہد لاحاصل ہو جاتی اور کبھی کوئی سرا اُس کے ہاتھ لگ جاتا تو کئی منظر ایک ساتھ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتے۔ اس کے بعد پھر یادوں کی اسکرین سیاہ ہو جاتی اور اس کا ذہن پھر سے کسی گوہرِ نایاب کی تلاش میں یادوں کے سمندر میں غوطے لگانے لگتا...... اس مشقت نے اسے تھکا دیا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ پھر بھی پلکیں جھپکنے کو تیار نہیں تھیں۔ اس نے ایک نظر ساتھ سوئے بیٹے پر ڈالی، پھر اُٹھ بیٹھا۔ اپنے کمرے سے نکل کر چلتا ہوا وہ کوریڈور کے اینڈ والے دروازے کے سامنے جا

اس کمرے کے مکین بھی رت جگا منا رہے تھے، جبھی پہلی دستک پر دروازہ کھل گیا۔

"سوئے نہیں ابھی؟" عائشہ اسے دیکھ کر اچنبھے سے بولیں پھر اسے چپ دیکھ کر اندر آنے کے لئے کہتے ہوئے کہا۔ "اندر آجاؤ۔"

اندر آیا تو کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور مصطفیٰ اعظیم سر تک چادر اوڑھے، کمر کے پیچھے تکیہ ٹکائے بیڈ پر تھے۔ وجدان کو کمرے میں آتا دیکھ کر انہوں نے فوراً ٹٹول کر سائیڈ ٹیبل پر سے عینک اٹھائی اور اسے لگا کر وجدان کو دیکھنے لگے جو کمرے کے وسط میں کھڑا چپ چاپ انہیں دیکھ رہا تھا۔ عائشہ دروازہ بند کرتی خود بیڈ کے کونے پر جا ٹکیں۔ مصطفیٰ اعظیم کو اس کی خاموشی سے بے چینی ہونے لگی تھی۔ نہ جانے کیسا خوف تھا جو ہر وقت وجدان کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا۔ چادر ہٹا کر دونوں پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہوئے وہ خود کو سنبھال کر بولے۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

"میں آپ سے اور امی سے معافی مانگنے آیا ہوں۔" وہ دھیمے لہجے میں نظر جھکا کر بولا۔

"کیسی معافی؟"

وجدان نے ان کی طرف دیکھا پھر ندامت سے بولا۔ "آپ مجھے معاف کر دیں کہ میں آپ کی اجازت بغیر گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ آپ کو بتایا تک نہیں۔ ایک بار آپ لوگوں کے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی نہ کی..... آپ مجھے معاف کر دیں کہ میں نے ایک طویل عرصے تک آپ کو اذیت میں رکھا۔ آپ مجھے اس لئے بھی معاف کر دیں کہ میں نے دس سال میں ایک بار بھی آپ دونوں کو یاد کرنے کی کوشش نہیں کی..... لوٹ آنے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آیا۔"

عائشہ مصطفیٰ کے لئے اپنے بیٹے کا ٹوٹتا بکھرتا لہجہ ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ وہ تڑپ کر اُٹھیں اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دینے لگیں۔

"ایسی باتیں نہ کرو بیٹے! میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ جو ہوا، سو ہوا...... اب اسے بھول جاؤ۔ ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں۔ اور کریں بھی کیسے؟ تمہاری دی ہوئی چوٹ گہری ہی سہی، پھر اس زخم کے ساتھ ہم یہاں عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ کبھی دل میں خیال تک نہ گزرا کہ میرے جگر کا ٹکڑا لوگوں کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔" وہ رونے لگیں۔ وجدان ان کے آنسو پونچھنے لگا۔

"آپ روتی کیوں ہیں امی؟ دیکھیں تو، آپ کو سراب کی خواہش میں دکھ دینے والا، سراب کے پیچھے بھاگتے اپنی روح تک زخمی کر چکا ہے۔"

"ایسی بات مت کرو وجدان!" وہ دہل گئیں پھر پلٹ کر شوہر سے بولیں۔ "سن رہے ہیں، آپ کا بیٹا کیا کہہ رہا ہے؟..... اسے ٹوکتے کیوں نہیں؟" وہ بڑی مشکل سے خود پر ضبط کئے بیٹھے تھے، آہستگی سے اُٹھ کر اس

کے پاس آ گئے۔

''خود کو سنبھالو وجدان! جوان اولاد کی شکستگی بوڑھے ماں باپ کو اور بھی بوڑھا کر دیتی ہے۔ اور اب ہمارے گھاؤ کا ذکر نہ کرو۔ ہمارا بیٹا لوٹ آیا تو ہمارے زخم بھی بھر گئے۔''

''لوٹ آیا ہے تو اسے میرا پتہ کیوں نہیں دیتے؟ خود کو دیکھے مدت بیت گئی۔ اب تو یاد کرنے پر بھی اپنے چہرے کے نقش ٹھیک سے یاد نہیں آتے۔'' وجدان دکھ سے بولا۔ وہ اس کی کیفیت کو سمجھ رہے تھے۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولے۔

''تم اپنے باپ کے چہرے کو تو پہچانتے ہونا؟''

وہ بولا۔ ''آپ کے گلے لگتے ہی آپ کو پہچان گیا تھا۔''

''تو بس اتنا ہی کافی ہے۔'' وہ مضبوط آواز میں بولے۔ ''تمہارے دکھ درد سمیٹنے کے لئے ماں باپ ہیں، تمہارا بڑا بھائی ہے جو ہر مقام پر تمہارا ساتھ دے گا۔ پھر بھلا تمہیں پریشان ہونے یا اُلجھنے کی کیا ضرورت ہے؟ بعض چیزیں وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سدھر جاتی ہیں اور بیٹے! اب تم ملیحہ پر بھی صبر کر لو۔ جس خوشی کی عمر تھوڑی ہو، اس پر بڑا دکھ نہیں کرتے۔''

''صبر آ چکا ہے ابو!...... چین نہیں آتا۔'' اس نے ہلکے سے کہا پھر اپنی امی سے بولا۔

''میں مدت سے سو نہیں پایا امی! آج سونے کو دل کر رہا ہے۔ آپ کے پاس سو جاؤں؟'' اس نے بچوں کی سی معصومیت سے فرمائش کی تھی۔ عائشہ مصطفیٰ نم آنکھوں سے مسکرا اُٹھیں پھر اسے ساتھ لئے بیڈ پر آ گئیں اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وجدان بھی چپل اتار کر آرام سے بیڈ پر لیٹ گیا تھا اور ان کی گود میں سر رکھے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ عائشہ مصطفیٰ کبھی اس کے گھنے بال سہلاتیں، کبھی جھک کر اس کے چہرے پر پیار کرنے لگتیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پینتیس سال کا مرد، ماں کی آغوش میں گہری نیند سو گیا تھا۔ ایک عرصے بعد وجدان کو اتنے سکون کی نیند آئی تھی۔ پھر بھی تہجد کے وقت اپنے آپ اس کی آنکھ کھل گئی۔

عائشہ ابھی تک اس کا سر گود میں لئے جاگ رہی تھیں۔ سامنے صوفے پر بیٹھے مصطفیٰ عظیم بھی رات بھر نہ سوئے تھے۔ وجدان بالوں میں ہاتھ پھیرتا اُٹھ بیٹھا تو وہ بولیں۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''تہجد کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔'' اس نے وال کلاک کی طرف دیکھ کر خمار آلود آواز میں کہا، پھر اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کے ہی اٹیچڈ باتھ روم میں وضو کر کے اس نے قبلہ رو جائے نماز بچھائی اور اس پر کھڑے ہو کر نیت باندھتے ہوئے تکبیر کے لئے اپنے ہاتھ کانوں تک اٹھا دیئے۔

فجر کی اذانیں ہونے لگی تھیں جب مصطفیٰ عظیم ٹوپی ہاتھ میں پکڑے اس کے کمرے میں آئے۔ وہ جائے نماز پر بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ مصطفیٰ عظیم مبہوت ہو گئے۔ ان کا دل چاہا کہ وہ وجدان کو تلاوت

کرتا ہوا سنتے رہیں۔ لیکن اذان کی آواز پر وجدان نے قرآن پاک بند کیا اور جزدان میں لپیٹ کر الماری کے ریک پر رکھ کر پلٹتے ہوئے ان سے بولا۔

''خیریت؟''

''ہاں بھئی، خیریت ہی ہے۔ بس آج دل چاہ رہا ہے، فجر کی جماعت میں شامل ہوں۔ کافی عرصے سے فجر اور عشاء کی باجماعت نماز چھوڑ رکھی ہے۔ اس عمر میں نظر اس قابل نہیں رہی کہ اندھیرے میں مسجد تک جا سکوں۔ پر اب تو تم آ گئے ہو، ہاتھ پکڑ کر لے جایا کرو گے۔ مزمل تو فجر کی نماز کے لئے اُٹھتا ہی نہیں، نالائق۔'' وجدان نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں چلتے ہیں۔'' اور شایان کو جگانے لگا۔ وہ نیند میں تھا لیکن زبردستی اٹھائے جانے پر اس نے منہ بسورا اور بند آنکھوں کے ساتھ ہی وضو کرنے باتھ روم میں گھس گیا۔ نماز کے بعد تینوں قریبی پارک میں چہل قدمی کے بعد لوٹے تو زوار اور مناہل اسکول یونیفارم پہنے ناشتہ کر رہے تھے۔ پاس ہی مزمل ہاتھ میں گاڑی کی چابی لئے انہیں اسکول چھوڑنے جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ وجدان کو ایک خیال آیا تو اس سے کہنے لگا۔

''مزمل بھائی! شایان کی پڑھائی کا کافی حرج ہو رہا ہے۔ اسے اسکول میں داخل کرا دینا چاہئے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ اسے یہاں آئے کافی دن ہو گئے۔ اب تک تو اس کا ایڈمیشن ہو جانا چاہئے تھا۔ تم ایسا کرو، میں بچوں کو چھوڑ کر آتا ہوں تب تک تم دونوں تیار ہو جاؤ۔ پھر زوار کے سکول چلیں گے اور اس کی پرنسپل سے شایان کے ایڈمیشن کی بات کریں گے۔'' وہ اثبات میں سر ہلا کر ناشتے کے لئے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''یہ لو، تمہاری بنا شکر کی چائے۔'' انیقہ بچوں کو چھوڑ کر واپس آئی تو چائے کا کپ وجدان کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ وجدان نے مسکرا کر کہا۔

''چینی ڈال کر دیں گی تو بھی پی لوں گا۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''ہاں ہاں، پتہ ہے سدھر گئے ہو۔ ورنہ یاد ہے امی! غلطی سے بھی اگر چائے میں چینی ڈل جاتی تو یہ کتنا ہنگامہ کرتا تھا۔'' اس نے اپنی ساس سے کہا تو وہ مسکرانے لگیں۔

''یاد ہے۔ لیکن دیکھو ذرا، ماں ہو کر بھی مجھے اس کی عادت بھول گئی۔ مجھے بھی ڈاکٹر رحمت سے علاج کرا لینا چاہئے۔''

''اس کی ضرورت نہیں امی! آپ کے بیٹے کی عادت ہی اتنی عجیب ہے کہ کسی کے بھی ذہن سے محو ہو سکتی ہے۔ اب دیکھیں تو ویسے یہ میٹھے کا شوقین ہے بس چائے میٹھی نہیں ہونی چاہئے۔'' سر جھٹک کر وہ شایان کی طرف مڑی۔ ''تم ناشتے میں کیا لو گے؟''

''آلو کا پراٹھا۔'' اس نے زور و شور کے ساتھ جواب دیا۔ انیقہ اس کے لئے آلو کا پراٹھا بنانے لگی۔

ناشتہ ختم کر کے دونوں مزمل کے ساتھ زوار کے سکول پہنچے۔

''آپ کا بچہ بہت ذہین ہے۔'' دبلی پتلی سی ادھیڑ عمر خاتون نے شایان سے سوال جواب پوچھنے کے بعد مسکراتے ہوئے وجدان سے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی باپ کی طرح ہی تفاخر کی چمک آئی تھی لیکن پھر پرنسپل صاحبہ معذرت کرتے لہجے میں بولیں۔ ''لیکن ہم اسے ایڈمیشن نہیں دے سکتے۔''

''کیوں؟'' مزمل نے بے ساختہ پوچھا۔

''کیونکہ چند مہینوں میں اینول ایگزام شروع ہو جائیں گے۔ اور ایگزامز کے اتنے نزدیک ہم ایڈمیشن نہیں لیتے۔ یہ ہمارا رُول ہے۔''

مزمل بولا۔ ''آپ خود دیکھ چکی ہیں کہ شایان کتنا ذہین بچہ ہے۔ دو تین مہینے میں تو وہ بہت آرام سے کورس کور کر لے گا۔''

''مجھے اس پر کوئی شک نہیں۔'' انہوں نے مزمل کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''لیکن اس کے باوجود میں مجبور ہوں۔''

وجدان پریشانی سے گویا ہوا۔ ''اس طرح تو اس کا سال ضائع ہو جائے گا اور اگلے سال بھی اسے فورتھ کلاس دوبارہ ریپیٹ کرنی پڑے گی۔ آپ کو نہیں لگتا، یہ ایک ذہین بچے کے ساتھ زیادتی ہے؟''

''سوری وجدان صاحب! لیکن اصول تو اصول ہوتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔ ''لیکن میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ شایان ہمارا اسٹوڈنٹ بنے اور آپ اپنے بیٹے کو ایڈمیشن اوپن ہونے کے بعد دوباہ ہمارے پاس لے کر آئیں۔ اس کے لئے میں آپ کو ایک گولڈن آفر دینا چاہتی ہوں۔''

وہ دونوں ہمہ تن گوش ہوئے۔

''آپ شایان کو فورتھ کلاس کے لئے نہیں بلکہ ففتھ اسٹینڈرڈ کے کورس کے لئے تیار کریں۔ پھر میں اسی کورس میں سے اس کا ٹیسٹ لوں گی اور اگر یہ کلیئر ہو گیا تو ہم اسے سکس اسٹینڈرڈ میں ایڈمیشن دیں گے۔ اس طرح شایان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی بلکہ اسے ایک سال کا بونس ملے گا جو کہ وہ اپنی ذہانت کے مطابق Desirve کرتا ہے۔ کہیئے، آپ کو یہ آفر قبول ہے؟''

وہ دونوں سوچنے لگے۔ پھر مزمل نے شایان کی طرف دیکھا جو ان دونوں کے درمیان صوفے پر دبکا بیٹھا تھا اور سر اُٹھا کر کبھی ایک تو کبھی دوسرے کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''کیا کہتے ہو بھتیجے! ففتھ اسٹینڈرڈ کا ٹیسٹ پاس کر لو گے؟''

''ہنڈرڈ آؤٹ آف ہنڈرڈ مارکس لوں گا تایا ابو!'' وہ جوش سے بولا تو مزمل مسکرا کر اس کے بال سہلاتے ہوئے وجدان کو دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ ہمارے بیٹے کو آپ کی آفر پسند ہے، اس لئے انکار نہیں کر سکتے۔''

''تو پھر آپ آج سے اسے ففتھ کلاس کے کورس کی تیاری شروع کروا دیں اور ایگزامز ختم ہونے کے بعد

اسے لے آیئے گا۔''

''شکریہ!'' وجدان اور مزمل، شایان کو ساتھ لئے کھڑے ہو گئے۔ پرنسپل کے رُوم سے نکل کر وہ لوگ سکول کی بک شاپ میں آ گئے۔ شایان اپنے لئے اتنی ڈھیر ساری نئی رنگ برنگی کتابیں، کاپیاں دیکھ کر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ واپسی میں وہ پچھلی سیٹ پر سارا وقت اپنے اسکول بیگ کو بازوؤں میں دبوچے بیٹھا رہا۔ جیسے ہی وہ لوگ گھر پہنچے، شایان فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر اترا، ساتھ ہی اپنا بیگ بھی گھسیٹ کر نکال لایا اور اسے لئے اندر بھاگ گیا۔

مصطفیٰ عظیم لاؤنج میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ سیدھا ان کے پاس آیا اور بیگ ان کے گھٹنوں پر رکھ کر ساتھ ہی صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

''دیکھیں دادا ابو! میری نئی کتابیں کتنی اچھی ہیں۔ اور ابو میرے لئے کلر پنسل بھی لے کر آئے ہیں۔'' وہ بیگ کھول کر انہیں اپنی کتابیں اور کلر پنسل دکھانے لگا۔ وجدان اور مزمل ساتھ ساتھ چلتے اندر آئے تھے۔

''پاپا! کیا شایان میرے ساتھ سکول جائے گا؟''

''ہاں۔'' مزمل کی بات پر وہ خوشی سے اُچھلنے لگا۔

''کتنا مزا آئے گا شایان! ہم دونوں ساتھ سکول جائیں گے اور سکول میں کرکٹ بھی کھیلیں گے۔ پتہ ہے وہاں سب بڑے بڑے لڑکے بیٹنگ نہیں دیتے، بس باؤلنگ کرواتے رہتے ہیں۔ تم آ جاؤ گے تو ہم دونوں مل کر کھیلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ پہلے تم بیٹنگ کرنا میں باؤلنگ کراؤں گا۔ پھر تم باؤلنگ کرنا، میں بیٹنگ کروں گا۔'' وہاں تو بیٹنگ آرڈر تک سیٹ ہو گیا تھا۔ زوار نے منظوری دی۔

❀❀❀

منیر حسن اپنے آفس میں بیٹھے تھے کہ ان کے آفس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ کم اِن کی آواز کے ساتھ ہی بلیک پینٹ کوٹ کے ساتھ وائٹ شرٹ پر بلک ٹائی پہنے وجدان دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ منیر حسن بے اختیار اسے دیکھنے لگے۔ اسے دیکھتے ہوئے ہر بار ان کا دل پگھلنے لگتا تھا۔ وہ اپنے اس احساس کو کوئی نام نہ دے پاتے۔

''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟'' وہ ان کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

''بیٹھو۔'' انہوں نے کہا اور وہ ہاتھ میں پکڑی فائل ٹیبل پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میرا نام وجدان مصطفیٰ ہے۔ بات بہت پرانی ہے، لیکن شاید آپ کو یاد ہو کہ دس سال پہلے میں آپ کی لیگل فرم میں وکیل کی حیثیت سے جاب کرتا تھا۔ ثبوت کے طور پر یہ اپائنٹمنٹ لیٹر ہے جو آپ کے آفس کی طرف سے مجھے دیا گیا تھا۔'' اس نے فائل میں سے ایک لیٹر نکال کر ان کے سامنے ٹیبل پر رکھا مگر منیر حسن

نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور اسے دیکھتے رہے جو کہہ رہا تھا۔

''دس سال تک کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے میں آفس میں حاضری نہیں دے سکا۔ لیکن اب میں اپنی جاب کو ری جوائن کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں اپنی جاب پر واپس آنے کا قانوناً حق رکھتا ہوں کیونکہ دس سال میں نہ تو میں نے جاب سے ریزائن کیا اور نہ آپ نے مجھے نوکری سے برطرف کرنے کے لئے لیٹر جاری کیا۔ لیکن پھر بھی میں اپنی سیٹ پر واپس آنے کے لئے آپ سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔''

وہ چپ ہو کر ان کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگا تو وہ بولے۔

''تمہیں اپنا تعارف دینے کی ضرورت نہیں۔ تم جیسا لاپروا اور غیر ذمہ دار وکیل میری لیگل فرم میں کوئی اپائنٹ نہیں کیا گیا اور اپنی اس اکلوتی غلطی کو میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ تم انتہا درجے کے نان پروفیشنل شخص ہو۔ ایک لڑکی کی خاطر تم مہینوں آفس کو نظرانداز کرتے رہے اور پھر کوئی اطلاع دیئے بغیر دس سال کی چھٹی پر چلے گئے۔ تم نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس وقت تمہارے دو کیسز عدالت میں چل رہے تھے، جنہیں تم بیچ میں ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ تم نے اپنے کیریئر کے ساتھ جو کیا سو کیا، مگر میری اور میری فرم کی ریپوٹیشن کو جو نقصان پہنچا، وہ کیا؟...... لوگ کہتے ہیں، جو ہو جائے، ایڈووکیٹ منیر حسن کے پاس کیس لے کر مت جانا۔ اس کے وکیل تو کلائنٹ کو عدالت کے کمرے میں چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ تم کس بیس پر اپنی جاب واپس لینے کی بات کرتے ہو جبکہ تمہاری لاپروائی اب بھی وہی کی وہی ہے۔ تمہیں واپس آئے تین مہینے سے زیادہ ہو چکے ہیں اور تم اب ری جوائننگ کی اپلی کیشن دینے آئے ہو...... اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ جاب واپس ملتے ہی تم پہلے جیسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں نہیں کرو گے؟'' وہ کسی باس کی طرح ہی ڈپٹ کر بولے۔ وجدان نے آہستہ سے کہا۔

''اب آپ کو کبھی مجھ سے غیر ذمہ داری کی شکایت نہیں ہوگی سر! کیونکہ آپ کی بھانجی جیسی اور کوئی نہیں جس کے لئے میں اس حد تک چلا جاؤں۔''

منیر حسن نے افسردگی سے اپنی نظر جھکا لی۔ پھر دراز میں سے ایک فائل نکال کر اس کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کیس کو اچھی طرح اسٹڈی کر کے اس کے پوائنٹس بناؤ۔ ہم لنچ کے بعد اس پر بات کریں گے۔''

''رائٹ سر!'' وہ فائل لے کر اُٹھ گیا تو منیر حسن دھیرے سے بولے۔

''کیا ہو جاتا وجدان! جو تم بتا دیتے۔''

وجدان اپنا پاؤں نہیں اٹھا سکا، گردن موڑ کر ان سے بولا۔ ''کیا ہو جاتا جو میں بتا دیتا......''

منیر حسن بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے۔ ''شام کو گھر آ جانا۔ افتخار بھائی تمہیں یاد کر رہے تھے۔ اور ہاں، شایان کو بھی ساتھ لے کر آنا۔ بہت پیارا بچہ ہے۔''

"جی انکل!'' وہ کہہ کر آفس سے نکل گیا۔

شام کو وہ آفاق کے گھر پہنچا تو گاڑی خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ بیرونی گیٹ جو اکثر کھلا رہتا تھا، اس وقت بھی کھلا تھا۔ شایان گاڑی رُکتے ہی دروازہ کھول کر اُترتا اندر بھاگ گیا تھا۔ وجدان نے کار لاک کی اور اطلاعی گھنٹی بجاتا کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس کی نظر دالان میں بچھے تخت پر اُٹھ گئی تھی۔ ایک یاد نے چپکے سے آ کر وجدان کا دامن تھام لیا۔ وجدان کو ایک شام یاد آ گئی اور شام کا سحر۔ مگر اصل سحر تو ان آنکھوں کا تھا جن پر جھکی سنہری پلکیں بے خبری میں ہی اُٹھ گئی تھیں۔ پھر ان آنکھوں میں وہ حیرت کا اُترنا..... اُس پل کو یاد کر کے ہی وجدان کا دل تھم گیا تھا۔

دل میں اسی خواہش کا وِرد کرتا وجدان بے اختیار اس کے پاس چلا آیا تھا اور دالان میں بچھے تخت پر بیٹھی ملیحہ اُسے اپنے سامنے زمین پر گھٹنا ٹکا کر بیٹھتے دیکھ کر پلکیں جھکاتے ہوئے اپنے آپ میں سمٹ گئی تھی۔ اُسے سمٹتے دیکھ کر وجدان پر بے خودی سی طاری ہو گئی تھی۔ اور اسی بے خودی میں اس کے لبوں نے سرگوشی کی۔

مجھے یقین تو نہیں ہے مگر یہی سچ ہے
میں تیرے واسطے عمریں گزار سکتا ہوں
یہی نہیں کہ تجھے جیتنے کی خواہش ہے
میں تیرے واسطے خود کو بھی ہار سکتا ہوں

'میں عمریں گزار آیا ہوں ملیحہ!..... میں خود کو ہار آیا ہوں۔' وجدان نے خالی تخت کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

❀❀❀

وہ رات بہت بھاری تھی۔ نیند آنا تو دُور، وجدان کی پلک بھی نہ جھپکی۔ وہ بے قرار سا لان میں ٹہلتا رہا پھر تھک کر لان سے چھت تک جاتی سیڑھیوں پر جا بیٹھا اور دُور خلا میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اپنی مرضی تھی تو دس سال میرا صبر آزمایا..... آج میں چاہ رہا ہوں کہ آ جائیں تو آ کیوں نہیں جاتیں؟ پھر دل کی جو حالت ہو گی، دیکھا جائے گا۔ کم از کم آنکھوں کو سکون مل جائے..... بس ایک بار ملیحہ!..... بس ایک بار۔'' آج پھر ٹوٹنے کی رات تھی۔

کیا جھگڑا سود خسارے کا
یہ کام نہیں بنجارے کا
سب سونا روپیہ لے جائے
سب دنیا، دنیا لے جائے
تم ایک مجھے بہتیری ہو
اِک بار کہو تم میری ہو

اور وہ ٹوٹتا چلا گیا۔

"یہ خواہش بھی تو آپ کی موت کے ساتھ نہیں مر سکی......لگتا ہے میری موت کے ساتھ ہی ختم ہوگی۔"

دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھکتے ہوئے وہ ہاتھوں کو بالوں میں سے گزار کر سر کے پیچھے لے گیا پھر اُنگلیوں کو آپس میں پھنسا کر سیڑھیوں پر لیٹ گیا۔

❀❀❀

آفاق اور سمیرا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ وجدان کے گھر کے لاؤنج میں آئے بیٹھے تھے۔ وجدان اور اس کے امی ابو، اس کے بھائی، بھابی کے ساتھ ہی لاؤنج میں موجود تھے۔ سبھی بچے وہیں آس پاس ہی قالین پر دائرہ بنائے بیٹھے اپنا گروپ الگ کیے ہوئے تھے اور جب وجدان کو پتہ چلا، وہ اِرم کی شادی کا دعوت نامہ لے کر آئے ہیں تو حیرت سے بولا۔

"اِرم! تُو اتنی بڑی ہوگئی؟"

سمیرا مسکرادی۔ "ہاں ہوگئی ہے۔ تبھی تو اس کی شادی کر رہے ہیں۔"

"مجھے تو نہیں لگتی۔ ہاں قد کچھ لمبا ہوگیا ہے اور بال بھی بڑھا لئے ہیں۔ مگر پھر بھی بچی سی لگتی ہے اور حرکتیں تو ذرا نہیں بدلیں۔ بات بات پر چڑتی ہے۔"

"تم جو چڑانا نہیں چھوڑتے۔" آفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آفاق نے خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وجدان کو اشارہ کیا اور دونوں اُٹھ کر باہر آ گئے۔

"تم ٹھیک ہو؟" پودے کے پتے کو نوچتے ہوئے آفاق نے بظاہر سرسری سا پوچھا تھا۔ وجدان اُس کی بات پر ذرا سا مسکرایا اور بولا۔

"تمہیں میرے ٹھیک ہونے پر شک کیوں رہتا ہے؟ پورے پانچ مہینے کا کورس کر چکا ہوں اور اب تو میرے پاس مینٹل ہیلتھ کا سرٹیفکیٹ بھی ہے۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے کہ اب تم ٹھیک ہو۔ ہم سبھی چاہتے تھے کہ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ۔" آفاق نے کہا پھر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن وجدان! میں اکثر سوچتا ہوں کہ کاش تم ملیحہ کی اس ایک جھلک کو بھول جاتے تو شاید وہ سب نہ ہوتا جو ہوا۔ ملیحہ مرتی نہ تمہارے حصے میں اتنی بربادیاں آتیں۔ مجھے بتاؤ وجدان! آخر تم نے محبت کر کے کیا پایا؟"

وجدان خاموش ہی رہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ لیکن اگر تم محبت نہ کرتے تو آج عمر کے اس حصے میں جب تمہارے ساتھ کے لوگ اپنے کیریئر کی اونچائی پر پہنچ چکے ہیں، تمہیں صفر سے شروعات نہ کرنی پڑتی۔ تم ان دس سالوں میں بہت کچھ پا سکتے تھے۔ عزت، شہرت، دولت اور ان گنت کامیابیاں۔" وہ چپ ہوا تو وجدان نے بولنا شروع کیا۔

"ملیحہ کی اس ایک جھلک کو بھول جاتا تو اپنی تنہائیوں میں کس چہرے کو یاد کرتا؟...... محبت میں صرف پانا کھونا ہی نہیں ہے۔ یہ انسان کو اپنی رمز بھی سکھاتی ہے۔ جسے سیکھنے کی دو ہی شرطیں ہیں۔ ایک محبت کو پانے سے مشروط نہ کرنا...... دو، کھونے پر محبت کو ترک نہ کرو۔ اور اگر کوئی سمجھے تو یہی دو شرطیں محبت کی رمز ہیں۔ اور جو اس رمز کو سمجھ گیا، اُس کی محبت خالص ہو گئی۔ اور خالص محبت، سچے ایمان کی طرح ہے۔ کیونکہ اس کی بھی یہ صفت ہے کہ پانے اور کھونے سے مشروط نہیں ہوتا۔ اب جس کے دل میں سچا ایمان ہو، محبت اُس کی عادت بن جائے گی۔ اور جس کے دل میں خالص محبت ہو، ایمان اس کے دل میں گھر کر لے گا۔" وجدان نے خاموش ہو کر چند لمحے آفاق کا چہرہ دیکھا، پھر مسکرا دیا۔

"آج میرے دل میں محبت بھی ہے اور ایمان بھی...... اب ذرا سوچ کر بتاؤ، کیا واقعی میں نے محبت میں کچھ نہیں پایا؟"

لیکن آفاق نے جواب نہیں دیا۔ ایسا لگ رہا تھا، اُس کے پاس کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ وجدان ذرا سا آگے سر کو جھکا اور کہا۔

"جانے دو۔ تم جواب نہیں دے پاؤ گے۔ کیونکہ زیادہ تر لوگوں کی طرح تمہارے لئے بھی اسی چیز کو پانا کہتے ہیں جس سے دنیاوی اور مادی فائدہ حاصل ہو سکے۔ تمہاری نظر بس عزت، دولت، شہرت اور کامیابیوں تک ہی جاتی ہے۔ تمہارے نزدیک میں جو نہیں پا سکا، ایک دن اُسے پالوں گا۔ مگر میں جو کھو چکا ہوں، اُس کے افسوس کرنے کے لئے دس سال بہت کم ہیں۔ لیکن مجھے تمہارے خلوص پر بھی کوئی شک نہیں۔ اس لئے تسلی رکھو! میں اب کیریئر کو پوری توجہ دے رہا ہوں۔ شایان میری ذمے داری ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس کے محفوظ مستقبل کے لئے میری کامیابیاں ضروری ہیں۔"

"یعنی یہ کریڈٹ بھی شایان کو جاتا ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بول کر مسکرایا، پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "لیکن وجدان! تمہیں نہیں لگتا، تم نے اس بچے کو اپنی کمزوری بنا لیا ہے؟"

"پتہ نہیں آفاق! اس بچے میں کیا ہے جو میرا دل اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ اپنے آپ ہی میں اس کے لئے باپ کی طرح سوچنے لگا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے، میں اسے دنیا کی ہر وہ خوشی دوں جو میرے اختیار میں ہے۔ اور میں ایسا ہی کروں گا۔ اور اگر ضرورت پڑی تو اُس کی خوشی کی خاطر اپنے اختیار کی آخری حد سے بھی گزر جاؤں گا۔" اُس کا لہجہ مضبوط تھا۔ "چلو چھوڑو، یہ بتاؤ بابا جان کیسے ہیں؟"

"کون بابا جان؟" آفاق فوری طور پر سمجھا نہیں تو اُس کی شکل دیکھنے لگا۔

"ملیحہ کے بابا جان۔" وجدان نے کہا۔

"اچھا وہ۔" آفاق نے لفظوں کو لمبا کھینچا۔ "تمہیں اُن کا خیال کیسے آ گیا؟"

"وہ ملیحہ کے بابا ہیں تو میرے لئے بھی باپ کی جگہ ہوئے۔ پھر کیا مجھے اُن کا خیال نہیں آنا چاہئے؟ بلکہ

میں تو جب بھی ملیحہ کو سوچتا ہوں، ساتھ ہی بابا جان اور ہادی بھائی کا خیال آ جاتا ہے۔ پتہ نہیں، ملیحہ کے بعد کس طرح جی پائے ہوں گے۔ خاص طور پر ہادی بھائی......وہ تو شروع سے ہی لاعلم تھے۔ اور آخری وقت تک لاعلم رہے۔ پتہ نہیں، سب جان کر اُن کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ میرے بعد وہ دنیا کے دوسرے شخص ہیں جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اُنہیں خود سے زیادہ ملیحہ کی پروا ہے۔''

''ان دونوں کا کیا پوچھتے ہو؟'' آفاق سانس بھر کر بولا۔ ''ملیحہ کے سوئم پر اُنہوں نے خود تایا جان اور پاپا کے سامنے تمہارے اور ملیحہ کے تعلق کے بارے میں انکشاف کیا تھا۔ اور اعتراف کیا تھا کہ ملیحہ کی شادی زبردستی کرائی جا رہی تھی۔ ہم نے اُنہیں ہمیشہ سخت گیر انسان کے روپ میں دیکھا ہے۔ مگر اس وقت تم اُن کی حالت دیکھتے۔ ملیحہ کی موت نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ اوپر سے یہ پچھتاوا کہ ملیحہ کی موت کے ذمے دار وہ خود ہیں......ان کے پچھتاوے کا یہ عالم تھا، خود کو ملیحہ کا قاتل کہہ رہے تھے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر تایا جان اور پاپا سے معافی بھی مانگی۔ مگر جب ملیحہ ہی نہ رہی تو بھلا کیسی معافی؟......نورالہدیٰ بھی کچھ کم برہم نہیں تھا۔ مگر اُس کی مجبوری یہ ہے کہ اُسے پھوپھا جان سے بہت محبت ہے۔ وہ کچھ بھی کر لے، ان سے تعلق نہیں توڑ سکتا۔ پھر بھی یہی وہاں سے اطلاع ملتی رہتی ہے کہ اُس کے روّیے میں پھوپھا جان کے لئے سرد مہری آ گئی ہے۔ اور ملک انکل کی ڈیتھ کے بعد سے تو وہ بالکل گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ اُن کی حالت کا سن کر تو ہاتھ اپنے آپ کانوں کو چھونے لگتے ہیں۔'' آفاق نے محسوس کیا کہ بابا جان کی حالت کا سن کر وجدان مضطرب ہو گیا تھا۔

''تو کیا تمہارا ان سے بالکل بھی تعلق نہیں رہا؟''

''نہیں۔ ہماری ان سے آخری ملاقات ملیحہ کے سوئم پر ہی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک بار نورالہدیٰ اپنی شادی کا انوی ٹیشن دینے آیا تھا۔ تایا جان اور پاپا نے تو صاف منع کر دیا، لیکن ہمیں اجازت دے دی تھی۔ مگر کوئی نہیں گیا۔ قصرِ فاروقی نے دو ایسے بڑے صدمے دیئے ہیں کہ اب اُس کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی نورالہدیٰ کا نام سنائی دیتا رہتا ہے۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین ہے۔ اور اگر تم بزنس میگزین پڑھو تو اُن میں اکثر نورالہدیٰ اور فاروقی گروپ آف انڈسٹریز کے بارے میں چھپتا رہتا ہے۔''

''چلو یار! اندر چلتے ہیں۔ یہاں دھوپ بہت تیز ہے۔'' اُس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ لہجے میں بیزاری صاف جھلک رہی تھی

آفاق بھی اُس کے پیچھے پیچھے اندر آیا تو بچے سینٹرل ٹیبل پر البم کھول کر اُس کے اردگرد قالین پر بیٹھے تھے اور تصویریں دیکھتے ہوئے تبصرے کر رہے تھے۔ لیکن اُن کے بچکانہ تبصرے اتنے مزیدار تھے کہ سب اپنی باتیں چھوڑ کر صوفوں پر آگے جھکے تصویروں کو دیکھتے ہوئے ان کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔ البم دیکھتے دیکھتے ایک تصویر کو دیکھ کر چھ سات سال کی فائزہ دونوں ہاتھ البم پر رکھ کر جھکتے ہوئے تصویر کو قریب سے دیکھ کر بولی۔

''واؤ مناہل! تمہاری ممی کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔''

"میری ممی تو ہیں ہی اچھی۔" وہ اِٹھلا کر بولی۔

"مگر میری ممی زیادہ اچھی ہیں۔" فائزہ کو جیسے اپنے بے ساختہ اظہار پر افسوس ہوا تھا۔ زوار کو اُس کی بات بُری لگی تھی۔ تیز لہجے میں کہا۔

"جی نہیں۔ میری ممی زیادہ اچھی ہیں۔"

فائزہ اپنے سے بڑے زوار کے لہجے پر سہم گئی۔ جواد نے جو اپنی بہن کو کمزور پڑتے دیکھا تو فوراً میدان میں کود پڑا۔

"غلط...... میری ممی سے زیادہ اچھا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

مناہل کافی صلح جو بچی تھی۔ اُس نے جو سب کے بگڑے تیور دیکھے تو فوراً بولی۔ "ایک منٹ...... لڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم شایان بھائی سے پوچھ لیتے ہیں کہ کس کی ممی زیادہ اچھی ہیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" سب کو یہ آئیڈیا پسند آیا تھا۔ پھر جواد سب کی نمائندگی کرتے ہوئے شایان سے بولا۔

"بتاؤ شایان! ہماری ممی زیادہ اچھی ہیں یا زوار اور مناہل کی؟"

ننھے جج نے مدبرانہ انداز میں دونوں پارٹیوں پر نظر ڈالی، پھر سب بڑوں کو دیکھا جن کے ہونٹوں میں مسکراہٹیں دبی تھیں اور آرام سے فیصلہ سنایا۔

"تم سب کی ممی اچھی ہیں۔ مگر سب سے اچھی تو صرف میری امی ہیں۔"

وجدان، آفاق اور سمیرا ہی اُس کی بات سن کر اچنبھے میں گھر گئے تھے۔ ورنہ باقی سب تو ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ لیکن بچے ایک نئے حریف کو پا کر خاصے بددل ہو گئے تھے۔ زوار تو تنک کر بولا۔

"جھوٹ مت بولو۔ تمہاری تو کوئی امی ہیں ہی نہیں۔"

شایان جھٹ سے بولا۔ "میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ میری امی ہیں۔"

"ہیں تو دکھاؤ۔" جواد نے بڑھ کر چیلنج کیا تو شایان اُداس سا ہو کر بولا۔

"وہ تو اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔" مگر پھر جوش سے کہنے لگا۔ "لیکن میرے پاس اُن کی تصویریں ہیں۔"

فائزہ بولی۔ "تو تصویریں ہی دکھا دو۔"

"ابھی لایا۔" وہ اُٹھا اور بھاگ گیا۔ وجدان اُلجھ گیا تھا کہ آخر شایان نے اپنی ماں کہاں سے تلاش کر لی۔ آفاق اور سمیرا بھی حیران سے تھے۔ تبھی وہ واپس آیا۔

"یہ رہی میری امی کی تصویریں۔" اُس نے کہتے ہوئے لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر جھاڑ دیا اور ٹیبل پر پہلے سے کھلے البم کے اوپر ملیحہ کی تصویریں بکھر گئیں۔ وجدان کے تو ہوش اُڑ گئے تھے۔ آفاق اور سمیرا بھی سٹپٹا گئے۔ دونوں نے ایک ساتھ اس کی طرف وضاحتی نگاہوں سے اسے دیکھا، پھر اُس کے متغیر چہرے کو دیکھ کر احساس

ہوا کہ وہ بھی حیرت میں ہے۔ مناہل، ملیحہ کی ایک تصویر ہاتھ میں لے کر مزمل سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھیں پاپا! شایان بھائی کی امی کتنی پیاری ہیں۔"

وہ سمجھانے لگا۔ "شایان بھائی کی امی نہیں، انہیں چچی کہو۔"

"چچی سچ مچ بہت پیاری ہیں۔" زوار بولا۔ بچے اختلاف بھلا کر تصویروں میں کھو گئے تھے۔ اور شایان اُن کے تعریفی جملوں کو سن کر فخر سے مسکرا رہا تھا۔

آفاق تو ملیحہ کے لئے چچی کا خطاب سن کر بھی خود کو سنبھالے رہا پر سمیرا کے چہرے پر ناگواری جھلک آئی تھی۔ لیکن وہ لوگ ہمیشہ ملیحہ سے لاتعلقی کا اظہار کرتے آئے تھے، اس لئے کچھ بول نہ سکے اور وجدان جو کچھ بولنے کے لائق نہیں رہا تھا، مگر چچی کا لفظ سنتے ہی اس کے اعصاب جھنجنا گئے۔

"یہ کیا لگا رکھا ہے؟" وہ سخت آواز میں بولا۔ "شایان! یہ تصویریں تمہیں کہاں سے ملیں؟"

شایان نے پہلے کبھی وجدان کو غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں مصطفیٰ عظیم کے پیچھے جا چھپا تو انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس کر لیا اور وجدان کو دیکھ کر ناراضی سے بولے۔

"بچے کو کیوں ڈانٹتے ہو؟..... جو کہنا ہے مجھ سے کہو۔ ملیحہ کی تصویریں اسے میں نے ہی دی تھیں۔"

"آپ نے؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ حالانکہ یہ کام تمہیں کرنا چاہئے تھا۔ ایک تو اس معصوم نے اپنی ماں کو کھو دیا، اوپر سے تم نے بھی اسے اس کی ماں سے انجان رکھا۔ اس کا نام تک شایان کو نہیں بتایا۔ ماں کا حوالہ بچے کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے وجدان! قدرت پیدائش کے وقت ہی ہر بچے کے دل میں ماں کے لئے محبت ڈال دیتی ہے۔ اس محبت کو کنارہ ملنا ضروری ہے جو اگر نہ ملے تو بچے کے اندر خلا رہ جاتا ہے۔ تم کیسے باپ ہو جو اپنے ہاتھوں اپنے بچے کو خلا میں دھکیلنا چاہتے ہو؟"

"ابو پلیز!" وہ کوفت بھرے انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا تو وہ تاسف سے کہنے لگے۔

"مجھے تم پر افسوس ہو رہا ہے وجدان! تمہارے لئے اپنا دکھ اپنی اولاد سے بڑھ کر ہے۔ ذرا سوچو! تم اس عمر میں بھی ماں کے آنچل کی چھاؤں تلاش کرتے ہو اور اس معصوم نے تو ماں کی گود دیکھی ہی نہیں، وہ ماں کے لئے کتنا ترستا ہوگا؟ اس کی یہ محرومی تو ختم نہیں ہو سکی پر کم از کم اس کے پاس اپنی ماں کی شناخت تو ہو۔"

"آپ کی ہر بات صحیح لیکن اس حوالے سے ملیحہ کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"حد کرتے ہو وجدان!" عائشہ ملامتی لہجے میں کہنے لگیں۔ "اگر ملیحہ کا ذکر نہ ہو تو کس کا ہو؟ وہ صرف تمہاری بیوی ہی نہیں تھی، ہمارے پوتے کی ماں بھی تھی۔ بہو تھی ہماری۔"

وجدان کے تو جیسے سر پر دھماکا ہوا تھا۔ اس نے ایک دم سے ہاتھ اُٹھا کر اُنہیں چپ کرا دیا پھر اُنگلی دکھاتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ "نہ تو شایان آپ کا پوتا ہے اور نہ ملیحہ آپ کی بہو تھی۔ ان دنوں سے آپ کا

ارشتہ نہیں۔ آئندہ یہ بات یاد رکھئے گا۔"
وجدان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اپنی بات کہہ کر اس نے ٹیبل پر سے فوٹو گرافس اٹھائیں پھر ہاتھ
شایان کی طرف بڑھایا جس کے ہاتھوں میں ملیحہ کی تصویر تھی اور کہا۔
"یہ تصویر مجھے دے دو۔"
وہ اپنا ہاتھ پیچھے کر کے نفی میں سر ہلانے لگا تو وجدان نے ہاتھ بڑھا کر وہ تصویر اس کے ہاتھ سے نکالی پھر
مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ وہ مچل کر روتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا مگر مزمل نے اس کا بازو تھام کر اسے اپنی گود میں
بٹھالیا اور چپ کرانے لگا۔ مگر وہ روتا ہی گیا۔ آفاق اور سمیرا اب پُرسکون ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں ایک
دوسرے کو اشارہ کر کے اُٹھ گئے۔
"ہم چلتے ہیں۔" آفاق نے سکتے میں گھری عائشہ سے کہا۔ پر کسی نے جیسے سنا ہی نہیں اور وہ دونوں اپنے
بچوں کے ساتھ باہر آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی سمیرا، آفاق سے بولی۔
"یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ نہ کسی سے پوچھا، نہ سوال کیا اور سب کچھ خود ہی فرض کر کے بیٹھ گئے۔"
"مگر اب تو وجدان صاف صاف کہہ چکا ہے۔ بس بات ختم ہو گئی۔ لیکن گھر میں کسی سے ذکر نہ کرنا۔"
سمیرا کو ہدایت کرتے ہوئے آفاق نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔
مگر بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ عائشہ کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ انیقہ فٹا فٹ جا کر گلوکوز بنا لائی، جسے پی کر
ان کے حواس کچھ واپس آئے۔
"آپ نے دیکھا مصطفیٰ صاحب! وہ کیسے کہہ کر گیا ہے کہ شایان سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ اس کا دل میری
طرف سے صاف نہیں ہوا حالانکہ اس نے بھی تو ملیحہ سے شادی کر کے اپنی مرضی پوری کر لی تھی۔ پھر اگر وہ نہ
رکی تو میری کیا غلطی ہے؟" انیقہ ان کے پاس بیٹھ کر پیار سے ان کے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔
"وہ جو بھی کہے مگر سچ تو یہی ہے نا کہ شایان آپ کا خون ہے۔ پھر دل چھوٹا کیوں کرتی ہیں؟" مزمل بھی

"انیقہ ٹھیک کہہ رہی ہے امی! شایان ہمارا خون ہے۔ اور یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ اور ابو! آپ بھی شایان
ہمیشہ سمجھاتے رہے کہ وجدان کے سامنے ملیحہ کا نام نہ لے، وہ ڈسٹرب ہو جائے گا اور خود وہی غلطی کر دی۔"
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح سے ری ایکٹ کرے گا۔" وہ افسردہ ہو گئے۔ عائشہ نے دوپٹے سے
آنکھیں خشک کر کے شایان کو دیکھا جو ابھی تک رو رہا تھا اور اس کی طرف اپنے بازو پھیلا دیئے۔
"ادھر میرے پاس آ جاؤ۔" اور وہ روتے روتے ہی مزمل کے بازوؤں سے نکل کر ان کی آغوش میں سما گیا۔

✿✿✿

وجدان دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیڈ پر بیٹھ تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شایان کے

حوالے سے اس کے گھر والے کیا سوچ رہے تھے۔ اپنی ناکام تمنا کو اس روپ میں دیکھ کر اس کے سارے زخم رِسنے لگے تھے۔ وہ خود کو سمیٹنے میں لگا ہوا تھا کہ ابیقہ اچانک ہی بنا دستک دیئے گھبرائی سی کمرے میں چلی آئی۔

''کیا بات ہے بھابی؟'' وہ اُس کی حواس باختگی پر چونک گیا۔

''باہر آکر دیکھو وجدان! شایان روتے روتے بے ہوش ہو گیا ہے۔''

وجدان گھبرا کر اُٹھا اور بھاگتا ہوا لاؤنج میں آ گیا۔ مصطفیٰ عظیم، بے ہوش شایان کو گود میں لئے بیٹھے تھے۔ پاس ہی حواس باختہ سی عائشہ ہاتھ میں پانی کی بوتل لئے بیٹھیں اس کے چہرے پر چھینٹے مار مار کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وجدان کی جان پر بن آئی تھی۔ اس نے تیزی سے شایان کو اپنی گود میں لے لیا۔

''شایان!'' وہ اس کے گال تھپک کر آوازیں دینے لگا۔ ''آنکھیں کھولو بیٹا!......میری طرف دیکھو۔'' مگر اُس کی صدائیں بے کار گئیں۔ وجدان گھبرا ہی تو گیا تھا۔

''اسے ہوش نہیں آرہا ابو! چلیں اسے ہاسپٹل لے کر چلتے ہیں۔''

''مزمل ڈاکٹر کو بلانے گیا ہے۔''

وجدان پریشانی سے لب کاٹنے لگا۔ پھر اسے گود میں اٹھا کر کمرے میں لے آیا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ چند منٹ بعد ہی ڈاکٹر صاحب مزمل کی معیت میں چلے آئے۔ انہوں نے اچھی طرح شایان کو چیک کیا، پھر پوچھا۔

''یوں تو سب ہی ٹھیک لگ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے بچے کو کچھ زیادہ ہی ڈانٹ دیا ہو؟''

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' مزمل نے وجدان کو دیکھ کر کہا۔

''آپ کو اتنی سختی نہیں کرنی چاہئے۔ بچہ سہم گیا ہے۔ بہر حال میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔ دو گھنٹے میں اسے ہوش آجائے گا۔ لیکن آئندہ احتیاط کیجئے گا۔ بعض بچوں کے ساتھ خاص طور پر نرمی برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سختی برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ آپ کا بچہ بھی بہت حساس ہے۔'' ڈاکٹر نے شایان کو انجکشن لگا دیا

وجدان پریشان سا بیڈ پر بیٹھ کر اس کے بال سہلانے لگا۔

عشاء کی نماز کے بعد دعا مانگ کر بھی وجدان گھر آنے کے بجائے گم سم سا وہیں مسجد میں بیٹھا رہا۔ کافی دیر بعد جب احساس جاگا کہ سب نمازی چلے گئے ہیں تو وہ بھی سست قدموں سے چلتا مسجد سے باہر آ گیا۔ اسے شدت سے غم گسار کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ گھر جانے کے بجائے وہ آفاق کے گھر آ گیا۔

''تم اس وقت؟......سب ٹھیک تو ہے؟ پریشان سے لگ رہے ہو۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ آفاق کو سمجھ نہیں آیا کہ یہ اُس کے کس سوال کا جواب ہے؟ اس لئے اُلجھ سا گیا۔

''اچھا اندر تو آؤ۔''

''نہیں باہر ہی ٹھیک ہے۔''

آفاق کا ماتھا ٹھنکا مگر خاموش رہا۔ دونوں کچھ قدم دُور الیکٹرک پول کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔
"کیا ہوا ہے؟" اُسے خاموش دیکھ کر آفاق نے اُسے بولنے پر اُکسایا تو وہ کہنے لگا۔
"مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے میں برف میں دفن ہو چکا ہوں اور جسم کے ساتھ میرا ذہن بھی سُن ہو گیا ہے۔
مجھے یقین نہیں آ رہا آفاق! کہ میرے گھر والوں نے ملیحہ کے بارے میں یہ سوچا بھی کیسے کہ ان کا مجھ سے یا
شایان سے کوئی رشتہ رہا ہو گا؟"
آفاق چپ سا رہ گیا پھر بولا۔ "اگر انہوں نے ایسا سوچا تو کچھ غلط نہیں کیا۔ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ شایان
تمہارا اپنا بیٹا ہے اور تمہارے بیٹے کی ماں، ملیحہ کے سوا کون ہو سکتی ہے؟"
"ان کے ساتھ میرا ایسا رشتہ نہ جوڑو۔" وجدان کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔
"میں کب جوڑ رہا ہوں؟" آفاق جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "ویسے اگر تم پہلے ہی اپنے گھر والوں کو
شایان کے بارے میں سچ بتا دیتے تو آج یہ سب نہ ہوتا۔" اُس کی بات پر وجدان وضاحت دینے لگا۔
"میں نے کبھی اپنے گھر والوں کو دانستہ اس بات کے لئے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ شایان کو میری سگی اولاد
سمجھیں۔ لیکن آج جب میں نے محسوس کیا کہ وہ ایسا ہی سمجھ رہے ہیں تو مجھے چپ رہنا بہتر لگ رہا ہے اور اس
کی وجہ صاف ہے۔ شایان کو جو محبت اور مقام میرے بیٹے کی حیثیت سے ملی ہے، وہ کسی گمنام بچے کو نہیں ملے
گی۔ بلکہ یہ جان کر کہ اس کے پیدا کرنے والے اسے غلاظت کی طرح خود سے الگ کر کے پھینک گئے تھے،
اس کی ذات تضحیک و تحقیر کا نشانہ بن جائے گی۔ لوگ اسے گناہ کی پیداوار کہہ کر دھتکار دیں گے۔ ہمارے
معاشرے میں انہی ظالم رسوم کا رواج ہے کہ گناہگار سے کوئی نہیں پوچھتا کہ اس نے گناہ کا ارتکاب کیوں کیا؟
بلکہ بے گناہ کو سزا دینے سبھی چلے آتے ہیں۔ میں شایان کو طنز کا نشانہ بننے نہیں دے سکتا۔ ایسے سچ کا کیا فائدہ
کہ لوگ اسے ذلت کے گڑھے میں اتار کر عمر بھر تحقیر کے پتھروں سے سنگسار کرتے رہیں۔ کسی اور کو سچ بتانا تو
دور، میں بھی شایان کو بتانے کی ہمت بھی نہیں کر پاؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ اپنی
نظروں میں گر جائے گا۔ نہیں آفاق! یہ بات کسی کو پتہ نہیں چلنی چاہئے۔" نم آنکھوں کے ساتھ وہ بے ساختہ
نفی میں سر ہلاتا ہوا کہہ رہا تھا۔
"وعدہ کرو یہ راز ہمیشہ راز رہے گا۔ میرے مرنے کے بعد بھی تم کسی قیمت پر اس راز سے پردہ نہیں اُٹھاؤ
گے۔ شایان میرا بیٹا ہے اور اس کا یہ بھرم ہمیشہ قائم رہنا چاہئے۔ بلکہ میں تو یہ دعا کرتا ہوں کہ قیامت کے دن
بھی اس کا یہ بھرم نہ ٹوٹے۔"
"میں وعدہ کرتا ہوں کبھی یہ بات میری زبان پر نہیں آئے گی۔" آفاق نے وعدہ کیا تھا پھر قصداً ماحول میں
بسے تناؤ کو کم کرنے کے لئے مسکرا کر بولا۔ "تم صرف یہ وعدہ لینے کے لئے اس وقت چلے آئے؟"
لیکن وجدان کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

''نہیں۔ میں تو اس خیال سے پریشان ہو کر تمہارے پاس آیا تھا جو ملیحہ کے لئے میرے گھر والوں کے ذہن میں ہے۔''

''لیکن وہ بات تو صاف ہو گئی تھی۔'' آفاق اچنبھے سے بولا۔

''نہیں ہوئی۔ لیکن انہیں تو میں کوئی بھی کہانی سنا کر سمجھا لوں گا۔ اصل مسئلہ شایان کا ہے جس کے دل میں ملیحہ ماں کی حیثیت سے نقش ہو چکی ہیں۔ صرف ان کی تصویریں چھن جانے پر اس کا ردِعمل اتنا شدید ہے کہ تمہارے جانے کے بعد روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔ کافی دیر بعد ہوش آیا بھی تو ابھی تک بخار میں پھنک رہا ہے۔ لیکن دوپہر سے پانی کی ایک بوند بھی حلق سے نہیں اُتاری۔ دوا لینے کی تو بات ہی کیا ہے؟ سوچتا ہوں اگر ملیحہ کا خیال اس سے چھن گیا تو کیا کرے گا؟'' اس کی آواز کی پریشانی سے حالات کی سنگینی کا اندازہ کر کے آفاق بھی پریشانی میں گھر گیا تھا لیکن اس کے پاس بھی اس پریشانی کا کوئی حل نہیں تھا۔ دونوں کتنی ہی دیر خاموش بیٹھے اپنی سوچوں سے اُلجھتے رہے، پھر تھک کر وجدان اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اب چلتا ہوں۔ شایان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ مجھے اس کی فکر ہو رہی ہیں۔''

آفاق نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وجدان گھر پہنچا تو مصطفیٰ عظیم اس کے انتظار میں بے چینی سے گیٹ کے پاس ٹہل رہے تھے۔ اسے دیکھ کر تیزی سے اس کے پاس آئے۔

''حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔ بیمار بچے کو چھوڑ کر کئی گھنٹوں سے غائب ہو۔ کسی اور کا احساس نہ سہی، انسان اپنی اولاد کا احساس تو کر ہی لیتا ہے۔''

''کیا شایان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے؟'' ان کے انداز سے سمجھ کر وہ پریشان ہوا تو وہ اور بھی بھڑک گئے۔

''خود ہی جا کر دیکھ لو۔''

کمرے میں آیا تو بیڈ پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا گیا۔ شایان بے سدھ پڑا تھا۔ مزمل پریشان سی صورت لئے اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ دوسری طرف متفکر سی بیٹھی انیقہ اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے ہی عائشہ بیٹھی تھیں اور ٹھنڈے پانی میں بھیگا تولیہ کبھی شایان کے تلووں پر رگڑتیں اور کبھی نم تولیے سے اس کا سینہ مسلنے لگتیں تو لگتا بھاپ اُڑ رہی ہو۔ لیکن شایان کے دہکتے چہرے کو دیکھ کر لگ نہیں رہا تھا کہ ان کی کوششیں سودمند ثابت ہو رہی ہیں۔ وجدان بوکھلایا سا شایان کے پاس چلا آیا۔ عائشہ مصطفیٰ نے اسے بیڈ کے دوسری طرف آ کر بیٹھتے دیکھا تو غصے سے بولیں۔

''تم اب آ رہے ہو؟''

وہ انہیں نظرانداز کرتا شایان کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر بخار کی شدت محسوس کر کے پریشانی سے بولا۔

"بخار تو بہت تیز ہو گیا ہے۔" تو وہ تڑخ کر بولیں۔

"تمہیں کیا؟ تم جا کر مری بیوی کا دکھ مناؤ۔ زندہ اولاد چاہے تڑپتی رہ جائے۔ پر یاد رکھو جس کی یاد میں صبح شام اُداس پھرتے ہو۔ اسے پیدا کرنے والی بھی وہی تھی۔ تم ملیحہ پر صرف اپنا حق سمجھتے ہو مگر یہ بھی اس حق میں شامل ہے۔ اور مت بھولو کہ عورت پر شوہر سے زیادہ حق اولاد کا ہوتا ہے اور جس نے یہ حق چھینا، اسے معافی نہیں ملے گی۔"

"بس کریں امی!" مزمل نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تو وہ اسی پر چڑھ دوڑیں۔

"خبردار جو تم نے اس کی طرف داری کی تو۔ غضب خدا کا کیا حالت ہو گئی ہے بچے کی۔ دوپہر سے رات میں نچڑ کر رہ گیا ہے مگر باپ کو پرواہی نہیں۔"

"کیا ہو گیا ہے امی! کچھ تو خیال کریں۔ اس کا بچہ بیمار ہے اور بھلا باپ سے زیادہ کسے پروا ہو سکتی ہے؟ بلکہ یار! اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بچے تو بیمار پڑا ہی کرتے ہیں۔" مزمل کی تسلی کے جواب میں بھی وجدان خاموش ہی رہا۔ شایان کے تپتے ہاتھ کی پشت پر ہونٹ رکھتے ہوئے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں وجدان کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کر رہا تھا۔

"رات کافی ہو گئی ہے مزمل بھائی! جائیں آپ بھابی کو بھی لے جائیں اور خود بھی آرام کریں۔ اور ابو! آپ بھی تو تھک گئے ہوں گے۔ آپ شایان کی فکر نہ کریں۔ میں اس کے پاس ہوں۔ اور امی کو بھی سمجھائیں یوں پریشان ہونے سے ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" اس نے مصطفیٰ عظیم سے کہا تو انہوں نے سر اثبات میں ہلا دیا اور اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ وقفے وقفے سے سب اُٹھ کر اپنے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔

آٹھ سال میں پہلی بار ایسا ہوا کہ وجدان نے جماعت چھوڑ دی ہو۔ فجر کی نماز اس نے کمرے میں ہی پڑھی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد وہ جائے نماز پر بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔

"یہ تو میں جان چکا کہ تُو کبھی لے کر اور کبھی دے کر آزماتا ہے۔ مگر یہ نہ جان پایا تھا کہ کبھی کبھی تُو پرانے زخموں کو اُدھیڑ کر بھی نئی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اللہ! مجھے اتنی طاقت دینا کہ اس آزمائش سے گزر جاؤں۔"

منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سجدہ ریز ہو گیا پھر جائے نماز تہ کر کے الماری میں رکھتا وہ بیڈ پر بیٹھ کر شایان کا ٹمپریچر چیک کرنے لگا۔ رات بھر وجدان نے کمر بستر سے نہ لگنے دی تھی۔ اب کہیں جا کر کچھ تسلی ہوئی تو وہ تکیہ اونچا کر کے نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ وجدان کو اپنے بائیں ہاتھ کی پشت پر شایان کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ دائیں بازو سے آنکھیں ڈھک کر لیٹا تھا، چونکتے ہوئے بازو ہٹا کر شایان کو دیکھنے لگا۔ اسے ہوش آ گیا تھا اور بار بار پلکیں جھپکتا وہ کسمسا رہا تھا۔ وجدان تیزی سے اس کی طرف جھکا اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بے تابی سے کہا۔

''بیٹا! تم ٹھیک ہو نا؟''

وہ خالی خالی نگاہوں سے وجدان کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔''امی کی تصویر دے دیں ابو!'' وجدان بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا پھر تھکن بھرے انداز میں سیدھا ہو بیٹھا۔ شایان بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی آستین مٹھی میں پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا۔

''بیٹا! ضد چھوڑ دو۔ میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ اور ذرا اپنی حالت دیکھو! خود کو بیمار کر لیا ہے۔ پھر ان تصویروں کو پاس رکھنے سے ملیحہ تو تمہارے پاس نہیں آ جائے گی۔'' وجدان بڑی عاجزی سے منت کر رہا تھا مگر شایان کے لئے تو بس یہی بات اہم تھی کہ وجدان اسے ملیحہ کی تصویریں دینے سے انکار کر رہا ہے۔ پل بھر میں اس کے تاثرات بدلے اور سنجیدگی کو ہٹا کر اس کی صورت رونی ہو گئی۔ وہ ایک دم سے وجدان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا کر اس کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد ہی اس کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ پتہ نہیں اس کے پاس اتنے آنسو کہاں سے آ گئے تھے کہ کل سے ابھی تک خشک ہی نہیں ہوئے۔ رونے سے اس کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے جنھوں نے وجدان کو زلزلوں میں دھکیل دیا تھا۔ کوئی بے بسی سی بے بسی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ شایان کو کیسے سمجھائے۔ وجدان کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔ وہ اس سے زیادہ شایان کا رونا بلکنا نہیں سہہ سکتا تھا۔ وہ اُٹھا اور الماری میں سے تصویروں کا لفافہ نکال کر ایک تصویر ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔

'میں نے ہمیشہ ان فاصلوں کی عزت کی جو آپ نے کبھی اپنے اور میرے درمیان مٹنے نہیں دیئے۔ مگر اب شاید میں ان کا بھرم نہ رکھ پاؤں۔ یہ جرم آپ کے نزدیک بہت بڑا ہو گا لیکن مجھے معاف ضرور کر دیجئے گا۔' وہ دل ہی دل میں کہتا تصویر ہاتھ میں لئے بیڈ پر آ بیٹھا۔ لفافہ سائیڈ میں رکھ کر اس نے ملیحہ کی تصویر شایان کے چہرے کے سامنے کر دی۔ اس نے روتے روتے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا تھا پھر ''میری امی!'' کہتے اس نے تصویر جھپٹ لی اور اُٹھ بیٹھا۔ وہ سارا رونا بھول کر مسکرانے لگا تھا جیسے کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔

''میری پیاری امی۔'' وہ تصویر پر ہاتھ پھیر کر اسے چوم رہا تھا۔ پھر اسے سینے سے لگا لیا۔ وجدان اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ جی بھر کے ملیحہ کی تصویر کو پیار کر چکا تو وجدان نے پیالہ اُٹھا کر یخنی میں چمچہ بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''اب تو یخنی پیو گے؟''

''ساری پی جاؤں گا اور دوا بھی پیوں گا۔'' وہ مگن سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ مگر وجدان جواب میں مسکرا بھی نہ سکا۔ پھر واقعی اس نے پورا پیالہ ختم کر کے سیرپ پیا اور اس کے بعد آرام سے سو گیا۔ مگر سوتے ہوئے بھی ملیحہ کی تصویر اس کے گال کے نیچے دبی تھی۔

❁❁❁

شام میں آفاق، شایان کی خیریت دریافت کرنے آیا تو وجدان اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا شایان کو پڑھا رہا تھا۔ وہ آتے ہی صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

"السلام علیکم!" وجدان کی آواز میں تنبیہہ تھی۔ آفاق بے تحاشا ہنستے ہوئے "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" کہتا سیدھا ہو بیٹھا اور کہنے لگا۔

"یار! یہ چنگ والے تجھے ماسٹر عبداللہ کیوں کہتے تھے؟ انہیں تو تیرا نام مولوی عبداللہ رکھنا چاہئے تھا۔"

وجدان ذرا سا مسکرا دیا۔

"ارے صاحب! یہاں تو زوروں پر پڑھائیاں چل رہی ہیں۔ لگتا ہے شایان ٹاپ کرے گا۔ ویسے ٹیسٹ کی کیا ڈیٹ اناؤنس ہوئی ہے؟" اس نے وجدان سے پوچھا۔

"اگلے مہینے کی دو تاریخ۔" آفاق نے سر ہلا کر شایان کو دیکھا جو منہ میں پنسل دبائے کبھی اس کا تو کبھی وجدان کا چہرہ دیکھنے لگتا۔ آفاق نے محسوس کیا کہ وہ واقعی ایک دن میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت تو وہ ہشاش بشاش بیٹھا تھا۔ آفاق کو شرارت سوجھی۔ وہ ایک دم سے شایان کے بیگ میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں انکل؟"

"بھئی تمہارے ابو کہہ رہے تھے تمہیں بخار ہے۔ پر مجھے نظر نہیں آ رہا۔ کہاں گیا؟ تم نے ضرور دوا کھا لی ہو گی تبھی تو وہ بھاگ گیا۔"

"وہ ایسے تو نہیں بھاگا انکل! وہ تو ابو نے امی کی تصویر دے دی تو وہ امی کے ڈر سے بھاگ گیا۔"

آفاق جو بچے کے ساتھ مذاق کو انجوائے کر رہا تھا ٹھٹک کر بولا۔ "امی کی تصویر؟"

"ہاں یہ دیکھیں میری امی کی تصویر۔" اس نے سائیڈ میں رکھا فریم اٹھا کر آفاق کی طرف بڑھایا تو آفاق نے اب کہیں جا کر نوٹ کیا کہ ملیحہ کی تصویر وجدان کے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر فریم ہوئی رکھی تھی۔ فریم ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس نے وجدان کو دیکھا جس نے نظریں جھکا لیں پھر آہستہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ آفاق کی نظریں بھی اس کے تعاقب میں دروازے تک گئی تھیں جبکہ ناسمجھ بچہ ان دونوں کی کیفیتوں سے بے خبر معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"انکل! میری امی اچھی ہیں نا؟"

"میں ابھی آتا ہوں۔" آفاق عجلت میں اس سے کہہ کر باہر آ گیا۔ وجدان اُسے ٹیرس میں مل گیا تھا۔ وہ ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے سر جھکا کر نیچے دیکھ رہا تھا۔ آفاق اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"وہ بہت ضد کر رہا تھا آفاق!" وجدان نے مڑے بغیر کہا جیسے اس کی آہٹ پہچان گیا ہو۔ آفاق چلتا ہوا اس کے برابر ریلنگ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ وجدان کو اس کی خاموشی شرمندہ کر رہی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"یہ سب وقتی ہے۔ کچھ دن گزر جانے دو، پھر میں اسے سمجھا بجھا کر ملیحہ کی تصویر واپس لے لوں گا۔"

''لیکن اس تصویر کا کیا جو اس کے ذہن میں فٹ ہو چکی ہے؟''

اس کی بات سن کر وجدان نے لب بھینچ لئے۔

''بچہ ہی تو ہے۔ بہل گیا تو بھلا بھی دے گا۔''

''محض خیال ہے تمہارا۔ اس کے اندر ماں کا احساس جاگ چکا ہے۔ وہ بہلے گا نہیں، سوال کرے گا کہ اگر ملیحہ اس کی ماں نہیں تھی تو پھر اس کی ماں کون تھی؟''

''اس نے تو نو سال میں کبھی مجھ سے یہ سوال نہیں پوچھا۔''

''اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں، کہ نو سال بعد تم سے یہ سوال نہیں پوچھے گا۔ آج اگر بہل بھی گیا تو آئندہ کسی وقت وہ ہر صورت اپنے سوال کا جواب جان کر رہے گا۔''

''کہہ دوں گا، تھی کوئی۔ اور اس کی پیدائش کے وقت مر گئی۔'' وجدان جھنجلا کر بولا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے وہ یہ سن کر مطمئن ہو جائے گا؟''

''ہو جانا چاہئے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''لیکن ہوگا نہیں۔ وہ پوچھے گا، اس کی ماں کس کی بیٹی تھی؟ کہاں رہتی تھی؟ کدھر دفن ہوئی؟ اور اگر تم اسے اس کی ماں کی شناخت نہ دے پائے تو وہ یقیناً اس تلاش میں چنگ والی کا رخ کرے گا۔ وہاں کے لوگ اسے اس کی شناخت تو نہیں بتا سکیں گے لیکن شایان کو اس کی پہچان ضرور کرا دیں گے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ تم اسے خود ہی سچ بتا دو...... ہماری سوسائٹی میں ایسے کئی بچے پیدا ہوتے ہیں جنہیں ان کی مائیں پولیتھین بیگ میں ڈال کر کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیتی ہیں۔ ان میں سے کئی تو اپنے ماں باپ کے طفیل جرمِ بے گناہی میں سزائے موت پا جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں، آخر کار اس تلخ حقیقت کو قبول کر لیتے ہیں...... ایک دن شایان بھی اس تلخ حقیقت کے ساتھ کمپرومائز کر لے گا۔''

''کمپرومائز...... ہونہہ۔'' وجدان نے طنز سے کہا۔ ''کمپرومائز کے اس دلاسے میں کتنا سچ ہے، جاننا ہو تو ریکارڈ اٹھا کر دیکھو۔ ایسے بچے آگے چل کر اینٹی سوشل ایکٹوٹیز کا حصہ بن جاتے ہیں۔ میں نے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ایسے کئی مجرموں کے چہرے دیکھے ہیں جن کی کہانی کچرے کے ڈھیر سے شروع ہوتی ہے اور ختم یا تو جیل کی سلاخوں پر ہوتی ہے یا کسی پولیس والے کے ریوالور سے نکلی گولی پر...... یا پھر وہ خود ہی اپنے ہاتھوں زندگی کا بوجھ اُتار پھینکتے ہیں اور جو اس کی ہمت نہ کر سکیں، وہ چرس اور افیون کا زہر رگوں میں اُتارتے کسی گندے جوہڑ کے کنارے پڑے موت کے انتظار میں سسکتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سب کے ذمہ دار صرف ان کے ماں باپ ہی نہیں ہیں، میں بھی ہوں...... تم بھی ہو...... ہماری یہ سوسائٹی ہے جو ایسے لوگوں کو پروڈیوس کرتے ہیں، جو گناہ کو عیب نہیں سمجھتے اور پھر جب وہ اپنے ماتھے پر لگے راتوں کے گناہ کے سیاہ داغوں کو دن میں نیک نامی کی چادر سے ڈھک کر معصوم چہرہ بنائے انجان سے ہمارے درمیان اُٹھتے بیٹھتے

ہاتو مزید معزز کہہ کر انہیں پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں۔
ہم میں سے کوئی راتوں کو جاگ کر کچرے کے ڈبوں کی چوکیداری نہیں کرتا تا کہ ان گناہ گاروں کو دوسرے
گناہ سے روکا جا سکے۔ لیکن صبح جب چوہے ان معصوم بچوں کے نرم گوشت کتر چکے ہوتے، کتے رات بھر میں
انہیں بھنبھوڑ ڈالتے ہیں تو پورا محلّہ گہری نیند سے جاگ کر ان مسخ شدہ لاشوں کے آخری دیدار کو آ پہنچتا ہے۔ پھر
بڑے اہتمام سے ان کی تدفین ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی بدنصیب نوکیلے دانتوں کی کاٹ سہہ گیا ہو تو اس کیمرہ ہم
اٹھا کی جاتی ہے تا کہ وہ زندہ رہ کر زندگی بھر یہ طعنہ سنے کہ اسے ڈوب مرنا چاہئے۔ ہر ایک بے گناہ چہرے
کے پیچھے دو گناہ گار چہرے چھپے ہوتے ہیں۔ مگر بے گناہ تو چلتے پھرتے نظر آتے ہیں لیکن گناہ گاروں کی دوگنا
اکثریت کہاں چلی جاتی ہے؟'' وہ ماتھے پر سلوٹیں لئے سوال کر رہا تھا۔ لیکن جواب خود اس کے پاس بھی نہیں
تھا۔ اس نے اپنے لب بھینچتے ہوئے آفاق کے چہرے سے نظریں ہٹالیں پھر یوں بولا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔
''اللہ کہتا ہے، باپ کا کیا اولاد سے نہیں پوچھا جائے گا۔ لیکن انسان اولاد سے ماں باپ کے اعمال کا
حساب لیتا ہے اور پھر سزا بھی سناتا ہے۔ تو کیا اللہ کا عدل ناقص ہے یا ہمارے انصاف کے پیمانے اس کے
پیمانوں سے بہتر ہیں؟ لیکن نہیں، جسے خود انصاف سے گزرنا ہو، وہ منصف کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ اچانک آفاق
کی طرف دیکھ کر پلٹا۔

''تم چاہتے ہو میں بھی اس صف میں کھڑا ہو جاؤں۔ جب میں نے شایان کے ماں باپ کا چہرہ نہیں دیکھا
تو اسے وہ آئینہ کیوں دکھاؤں جس میں اس کے ادھورے وجود کی بگڑی ہوئی تصویر نظر آئے گی۔ اگر وہ اپنی
نظروں سے گر گیا تو چوٹ مجھے آئے گی۔ سوال صرف شایان کی زندگی کا نہیں ہے آفاق! دھیان سے دیکھو تو
میری زندگی بھی جڑی ہے۔ اور میں تو زندہ ہی اس کے لئے ہوں۔ اگر وہ مجھ سے کھو گیا تو میں زندہ رہ کے کیا
کروں گا؟'' آفاق کو سچ مچ یوں لگا کہ وجدان اس سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ وہ سر جھکا کر رہ گیا۔ پھر
پلٹ کر جانے لگا لیکن چند قدم چل کر ہی وہ اچانک مڑ کر وجدان کو دیکھنے لگا جو ساکت نظروں سے اسے دیکھ
رہا تھا۔ پھر ہموار لہجے میں کہا۔
''اس بار میں تمہیں کچھ کھونے نہیں دوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں ایک خیال کی پرچھائیں تھی۔

✿✿✿

جب اس نے سمیرا کو اپنا خیال بتایا تو وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''مجھے حیرت ہو رہی ہے آفاق! آپ دوستی میں اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ آپ کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ملیحہ سے آپ کا بھائیوں جیسا رشتہ تھا۔ اور کسی بھائی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی بہن کے بارے میں ایسی بات کرے۔'' جب وہ اپنی بات کہہ چکی تو آفاق نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''مجھے سب یاد ہے۔ وہ محبت تھی جو ملیحہ نے وجدان سے کی تھی اور میرے دل میں ان کی محبت کا بہت احترام ہے۔ جب کسی کا اتنا احترام کر لیا جائے تو انسان اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ تم یقین کرو، میں وجدان کے سامنے اتنا ہی بے بس ہوں۔ کہنے کو وہ میرا دوست ہے مگر میں اس کے سامنے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اب تم اسے چاہے جو بھی کہو۔'' پھر اُسے گم سم دیکھ کر پوچھا۔ ''چپ کیوں ہو گئیں؟''

وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''آپ نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے، کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' سمیرا کے چہرے سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔ ''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ابا اور چاچو، وجدان کا ایسا لحاظ کریں گے۔''

''اگر ہم دونوں مل کر انہیں سمجھانے کی کوشش کریں تو شاید بات بن جائے۔ ملیحہ کے حوالے سے ان کے دل وجدان کے لئے بہت گداز ہیں۔ بلکہ ایسا کون سا شخص ہے جو ملیحہ سے محبت رکھتا ہو اور اس کی موت کے بعد اس نے وجدان کو دل میں جگہ نہ دی ہو۔''

''پھر صرف ہم دونوں کیوں؟...... فون کر کے سب کو بلوا لیتے ہیں۔ ہم تمام کزنز کا رشتہ ملیحہ کے ساتھ ایک جیسا ہے۔ اس لئے انہیں ساتھ ملانا آسان ہو گا۔ پھر امی، چچی اور پھپھو کو ہم خیال بنا کر ابو اور چاچو سے بات کریں گے تو انہیں منانا قدرے آسان ہو جائے گا۔''

''ویسے تمہارا آئیڈیا ہے تو زبردست۔ جاؤ جا کر فون لے کر آؤ۔ میں ابھی جنید کو فون کر کے کہہ دیتا ہوں، پہلی فلائٹ سے گوہر اور پھپھو کو ساتھ لے کر کراچی آ جائے۔ اس کے بعد ہم صائمہ اور عظمٰی کو بھی بلوا لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ پر صمد اور زارا سے آپ آج ہی بات کر لیں۔'' وہ کہہ کر فون لانے کے لئے اُٹھ گئی۔

آفاق کو اپنے کزنز کو اپنا ہم خیال بنانے میں وقت نہیں ہوئی۔ ان سب نے ملیحہ اور وجدان کو ایک دوسرے کے لئے برباد ہوتے دیکھا تھا اور شاید اسی کا اثر تھا کہ سب نے آفاق کی بات پر اتفاق کیا اور اس کی ہدایت پر ہال میں جمع ہو گئے۔ پھر آفاق، صمد اور جنید جا کر بڑوں کو ان کے کمروں سے بلا لائے۔ انہوں نے جو ہال میں مجمع لگا دیکھا تو حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''کیا بات ہے آفاق! سب ٹھیک تو ہے نا؟'' منیر حسن اُلجھ سے گئے۔ آفاق نے کہنا شروع کیا۔

''اصل میں بات یہ ہے پاپا! کہ میں نے اتنے سالوں تک وجدان کے گھر والوں سے اپنا اور ملیحہ کا رشتہ چھپا کر رکھا، اسی لئے وہ ملیحہ کی موت کے بارے میں بھی کبھی نہ جان سکے۔ اور اب ان کی بے خبری کنفیوژن پیدا کر رہی ہے۔''

''کیسی کنفیوژن؟'' اس کی امی نے ٹوکا۔

''ملیحہ کے جینے مرنے سے تو پہلے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اور اب تو ان کا بیٹا لوٹ آیا ہے۔''

''یہیں سے تو کنفیوژن شروع ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا اکیلا نہیں لوٹا۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہے جسے وہ اپنی دانست میں وجدان کی حقیقی اولاد سمجھ رہے ہیں۔''

''تو اس سے ملیحہ کا کیا تعلق؟'' آمنہ ناسمجھی سے بولیں۔

''تعلق یہ ہے آمنہ پھپھو! کہ وہ کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ وجدان، ملیحہ کے انتقال کے بعد ذہنی توازن بگڑ جانے کے باعث گھر سے چلا گیا تھا، اس لئے ان کا خیال ہے کہ وجدان نے ملیحہ سے شادی کرنے کے لئے گھر چھوڑ دیا تھا اور پھر اس سے شادی بھی کر لی اور شایان ان دونوں کی اولاد ہے۔''

''کیا؟'' بیک وقت سب کی زبانوں سے نکلا۔ پھر افتخار حسین ناگواری سے بولے۔ ''کسی کی بیٹی کے بارے میں وہ لوگ اتنی بڑی بات کیسے سوچ سکتے ہیں؟ اور کیا وجدان نے بھی انہیں نہیں روکا؟''

''اسے پتہ چلتا تو وہ روکتا۔ اسے تو چند دن پہلے اتفاقاً یہ بات معلوم ہوئی جب شایان نے سب کے بیچ بیٹھے ہوئے ملیحہ کی تصویر یہ کہہ کر دکھائی کہ وہ اس کی امی ہے۔ اس وقت میں بھی وہاں پر تھا۔ وجدان تو شاکڈ رہ گیا تھا۔ پھر اس نے فوراً ہی ملیحہ کی تصویر شایان سے لے لی مگر ملیحہ کے ساتھ وہ بچہ اتنا اٹیچڈ ہو گیا ہے کہ صرف تصویر چھن جانے پر بیمار پڑ گیا اور جب تک اسے ملیحہ کی تصویر واپس نہ کر دی گئی، کھانا پینا تو دُور اس بچے نے دوا تک لینے سے انکار کر دیا۔''

وہ سانس لینے کو رکا تو منیر حسن نے حیرت سے سوال کیا۔ ''لیکن ملیحہ کی تصویر، شایان کو کہاں سے مل گئی؟''

آفاق بے اختیار جھجک سا گیا، پھر سنبھل کر بولا۔

''وجدان نے کبھی ملیحہ کی کچھ تصویریں کھینچی تھیں جو اس کے جانے کے بعد اس کے گھر والوں کے ہاتھ لگ گئیں۔ پھر جب وجدان لوٹا تو اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر خود ڈاکٹر نے بھی منع کر دیا کہ اس سے ملیحہ کا

ذکر نہ کیا جائے، وہ ڈپریسڈ ہو جائے گا۔ اور مجھ سے پوچھنے کی شاید انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی اور ان کے ذہنوں نے حالات و واقعات کو جوڑ کر ایک کہانی تیار کر لی جو بظاہر سچ ہی لگتی ہے۔ مگر مسئلہ یہ نہیں۔ انہیں تو سمجھایا جا سکتا ہے، مسئلہ شایان کا ہے۔ ان پانچ مہینوں میں یہ کہانی اسے اتنی بار سنائی گئی ہے کہ ملیحہ کا تصور اس کے دماغ میں راسخ ہو چکا ہے۔ اوّل تو وہ بچہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے سمجھانا ممکن نہیں۔ لیکن اگر اسے کسی طرح سمجھا بھی لیا جائے تو وہ یہ فطری سوال ضرور پوچھے گا کہ پھر اس کی ماں کون ہے؟ اور وجدان اسے سچ بتانا نہیں چاہتا۔ لیکن اس کے متوقع سوال کا جواب بھی اس کے پاس نہیں۔ شایان کے ذہن میں تجسس بیدار ہو جائے گا۔ پھر اگر اس نے خود سے اپنی ماں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تو اسے زیادہ سفر کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اسے صرف اس گاؤں تک سفر کرنا پڑے گا، جہاں وہ پیدا ہوا اور اب ایک تکلیف دہ سچ وہاں اس کا منتظر ہے اور یہی خیال وجدان کو پریشان کر رہا ہے۔ اس کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا ہے کہ اگر شایان کو پتہ چلا تو وہ اسے کھو دے گا۔ میں نے وجدان کی آنکھوں میں یہ خوف ایک بار پہلے بھی دیکھا تھا، جب اسے ملیحہ کی انگیج منٹ کا پتہ چلا تھا۔ لیکن اس نے ملیحہ کو کھو دیا۔ ذرا سوچیں، ملیحہ کو کھو کر وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اگر شایان کو بھی کھو دیا تو مر جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے۔" سمیرا کی امی بے اختیار اپنے کلیجے کو تھام کر رہ گئیں۔ افتخار حسن بھی ایک پل کو بے قرار ہوئے تھے پھر تفکر سے گویا ہوئے۔

"اب اس پریشانی کا کیا حل؟"

آفاق نے انہیں دیکھا۔ "ایک حل ہے۔ لیکن شاید اسے قبول کرنا آپ لوگوں کے لئے مشکل ہو۔" وہ رکا اور بہن بھائیوں کے چہرے دیکھے جو اس کی ہمت بندھا رہے تھے۔ "کیوں نہ ہم شایان کو ملیحہ کے بیٹے کی حیثیت سے قبول کر لیں۔" اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ منیر حسن دھاڑے۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" پھر انہیں اچانک احساس ہوا کہ آفاق عمر کے اس حصے میں ہے کہ اب انہیں اس سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہئے تو وہ چپ ہو کر اپنا غصہ ضبط کرنے لگے۔

"تم نے ایسی بات کہنے کی جرأت بھی کیسے کی؟ تمہیں ذرا شرم نہیں آئی۔" اس کی امی ملامت کر رہی تھیں۔ آمنہ بھی ناراضی سے بولیں۔

"کیا ہو گیا ہے آفاق! اپنے دوست کی محبت میں اتنے اندھے ہو گئے ہو کہ بہن کے نام پر من گھڑت کہانیاں بناتے تمہیں ذرا احساس نہیں ہوا۔"

دور بیٹھے جنید نے جو دیکھا کہ آفاق پر چڑھائی ہو رہی ہے تو فوراً اٹھ کر ان کے پاس آیا۔

"امی پلیز! اور ممانی جان! آپ بھی ذرا سوچیں تو یہ من گھڑت کہانیاں وجدان کے جینے کا بہانہ بن گئی ہیں۔"

اب کونے میں دبکا صمد بھی آگے آیا۔ ''شایان کی زندگی کو بھی رخ ملے گا اور چاہے ہمارا اس سے کوئی تعلق ہو، پر وہ ایک معصوم بچہ ہے۔ اس کی گردن کے گرد کسی تلخ حقیقت کا پھندا کس کے ہمیں کیا مل جائے گا؟''

''اور اللہ بھی تو کہتا ہے، دوسروں کے عیب ڈھکو۔ ہمیں تو خوش ہونا چاہئے کہ ہماری ملیحہ کتنی قسمت والی ہے۔ ورنہ لوگوں کے اچھے عمل ان کی موت کے ساتھ ہی رک جاتے ہیں۔ پر ملیحہ مر جانے کے بعد بھی کسی کا بنی رہے گی۔'' سمیرا پست لیکن مستحکم آواز میں بولی تو اس کی امی اسے گھورنے لگیں۔

''یہ بھلا کیا تُک ہوئی؟ کسی کا پردہ رکھنے کے لئے ملیحہ کے سر سے چادر اُتار دیں؟ وہ ہماری بیٹی جیسی تھی۔ ہم کیسے اپنی کنواری بیٹی کے لئے کہہ دیں کہ وہ کسی کی بیوی، کسی کے بچے کی ماں تھی؟''

صائمہ ان کی بات سن کر رسان سے بولی۔ ''اگر ملیحہ آپ کی بیٹی تھی تو وجدان کو بھی تو آپ اور ابو اپنا بیٹا مانتے ہیں۔ بلکہ اس گھر میں اس کا جو بھی مقام ہے وہ آفاق کی وجہ سے نہیں، آپ دونوں کی وجہ سے اسے ملا ہے۔ پھر آخر اس نے کیا، کیا تھا؟ صرف محبت۔ جس کے لئے وہ دس سال سے سزا کاٹ رہا ہے اور آخری سانس تک کاٹتا رہے گا۔ کیا اس کا دکھ آپ کا دل نہیں دہلاتا؟ اس کی عمر رائیگاں گئی ہے۔ کم از کم ایک سکھ اسے مل جانے دیں۔'' صائمہ کی آواز میں اُداسی گھل گئی تھی، جس نے اس کی امی کو بھی دل گرفتہ کر دیا تھا۔ پھر جب بولیں تو ان کی آواز میں بھی پہلے جیسی تیزی نہیں تھی۔

''ایسا نہیں ہے کہ وجدان کی بربادی ہمیں نظر نہیں آتی۔ لیکن جھوٹ کیسے بولیں؟''

''اس جھوٹ پر تو اللہ بھی گناہ نہیں دیتا جو کسی کے فائدہ کے لئے بولا جائے۔ جبکہ یہاں تو ایک بے گناہ کی زندگی کا سوال ہے۔'' گوہر نے دھیرے سے کہا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ پھر کب سے خاموش بیٹھے افتخار حسن سے بولیں۔

''آپ کیوں چپ بیٹھے ہیں بھائی جان! ذرا دیکھیں تو، بچے کیا کہہ رہے ہیں؟''

وہ سنجیدگی سے کہنے لگے۔ ''بچے اب بڑے ہو گئے ہیں آمنہ! اور خود بھی بچوں والے بن گئے ہیں۔ مگر افسوس ابھی تک یہ رشتوں کی نزاکت نہیں سمجھ سکے۔ وجدان سے کیا شکایت، اس کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ مگر آفاق! تم بتاؤ کسی اور کا گناہ اپنی بہن کے سر ڈالنے کے لئے تمہیں ہمت کہاں سے ملی؟''

آفاق گناہ کے لفظ پر اُچھل ہی تو پڑا تھا۔

''میں ملیحہ کے سر کوئی گناہ نہیں ڈال رہا اور نہ میں کچھ ایسا سوچ سکتا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم وجدان کے گھر والوں کے خیال کی تصدیق کر دیں کہ واقعی ملیحہ اور وجدان کی شادی ہوگئی تھی۔ پھر شایان کی پیدائش پر ملیحہ کا انتقال ہو گیا، جیسا وہ سمجھتے ہیں۔ اور اس میں تو گناہ کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔''

''اس کہانی کا سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ یہ جھوٹی ہے۔ تم خود شادی شدہ ہو اور اس رشتے کی نزاکتوں اور تقاضوں سے واقف ہو۔ نکاح کے بندھن میں بندھے دو لوگوں کے درمیان یہ نزاکتیں قابل احترام ہیں۔

مگر جن کے بیچ یہ تعلق ہی نہ ہو، ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ میاں بیوی تھے، بذاتِ خود ایک الزام ہے۔ اور تم اس الزام سے بھی آگے نکل کر دنیا سے کہلوانا چاہتے ہو کہ ملیحہ، شایان کی ماں تھی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولے کہ آفاق پہلو بدل کر رہ گیا۔

''میں ان گہرائیوں کے بارے میں دانستہ سوچنا نہیں چاہتا۔'' وہ پیشانی مسلتے ہوئے دھیمے لہجے میں نظریں چراتا ہوا بولا تو افتخار نے دبے دبے غصے سے کہا۔

''تم نے تو کسی بھی گہرائی کے بارے میں نہیں سوچا۔ جو جھوٹ تم دنیا کو سنانا چاہتے ہو، اسے سچ کرنا ملیحہ کے اختیار میں تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیا کہو گے وجدان کے گھر والوں سے کہ ملیحہ نے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی؟ کیونکہ بھائی صاحب تو اس کھیل میں شامل کیے نہیں جا سکتے۔''

''میں ملیحہ کے لیے یہ الفاظ کبھی استعمال نہیں کروں گا۔ بلکہ کہوں گا کہ ملیحہ، پھوپھا جان کو منا نہ سکی تو ہمارے گھر آ گئی۔ تاکہ ہم انہیں منا لیں۔ پھر جب وہ نہیں مانے تو آپ نے اور پاپا نے اپنے ہاتھوں سے رخصت کیا تھا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا، کوئی بھی نہیں کہہ سکے گا کہ ملیحہ گھر سے بھاگی تھی۔ بلکہ کہیں گے، باپ کے گھر سے نہ سہی، ماموں کے گھر سے سہی لیکن وہ بزرگوں کی چھاؤں میں وداع ہوئی تھی۔'' آفاق کی بات سے وہ غمزدہ سے ہو گئے تھے۔ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

''سچ کہوں آفاق! تو واقعی اگر ملیحہ کے دل کی بات مجھے اس کی زندگی میں پتہ چل جاتی تو میں بھائی صاحب کی مخالفت مول لے کر بھی ملیحہ کو وجدان کے ساتھ رخصت کر دیتا۔ وہ مجھے اتنی ہی عزیز تھی۔ اور اسے بھی اندازہ ہوگا کہ میں اس کی خواہش کا احترام کروں گا۔ پھر بھی اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تو اس لیے کہ وہ اس مان کو توڑنا نہیں چاہتی تھی جو ہر باپ کو اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔ اس نے خود پر جبر کر لیا مگر باپ کی چوکھٹ پار نہیں کی۔ مجھے اُس کی اس سعادت مندی پر فخر ہوتا ہے کہ مرتے دم تک اس نے باپ کی عزت سنبھالی اور اس کے مر جانے کے بعد تم لوگوں سے کہو گے، وہ ان خود غرضوں میں سے تھی جو اپنے دل کی خوشی کے لیے ہر حد توڑ دیتے ہیں۔ کیا یہ ملیحہ کے ساتھ زیادتی نہیں؟''

''شاید۔'' وہ اقرار میں سر کو ذرا سا ہلا کر کہہ رہا تھا۔ ''لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر ملیحہ کہیں سے آ جائے تو وجدان کی محبت میں جان دینے والی، وجدان کی خاطر اس زیادتی کو ہنستے ہنستے برداشت کر لے گی۔ آپ کو معلوم ہے، وجدان کون ہے؟''

افتخار حسن چپ سے رہ گئے۔ اب آفاق روانی سے بول رہا تھا۔

''وجدان وہی شخص ہے، جس نے ملیحہ کی محبت میں اپنے دس سال پھونک ڈالے۔ اور میں جانتا ہوں، اپنی باقی کی زندگی بھی وہ اسی فیاضی سے لٹا دے گا۔ لوگ کہتے ہیں، ہم اس کی محبت میں دیوانے ہیں...... اور وجدان کو لوگوں نے دیوانہ کہا، ہاتھوں میں پتھر لیے پاگل پاگل کی صدائیں لگاتے اس کے پیچھے بھاگے، اسے

نثار کیا...... بے رحمی سے پھینکے گئے پتھر اسے لہولہان کر دیتے مگر پھر بھی ملیحہ کا تصور نہیں ٹوٹتا۔ وجدان کی اس حالت کو سوچ کر میری روح کانپ جاتی ہے۔ اور وہ یہ سب سہتا رہا۔ بھلا کس نے محبت میں دنیا بھلائی ہے؟ لیکن وجدان اپنا آپ بھول گیا۔ کہاں ایسے لوگ ملیں گے کہ ایک محبت میں مر جائے اور دوسرا زندہ بھی ہو تو مُردوں سے بدتر۔ میں ملیحہ کا بھائی ہوں مگر میرے ہی سامنے وجدان، ملیحہ کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اُسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور میں محسوس کر کے بھی اسے ٹوک نہیں پاتا۔ ٹوکوں بھی کیسے جب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے ہر حد سے گزر گئے۔ تو پھر میں حد کس طرح لگاؤں؟''

آفاق کی سرگوشیوں میں ڈھلی آواز سن کر سمیرا کی آنکھیں بھر گئیں۔ افتخار حسن کی حالت ایسی تھی، جیسے آفاق نے ان کی شہ رگ پر ہاتھ دھر دیا ہو۔

''پاپا!...... تایا جان!'' آفاق نے ان دونوں کو مخاطب کیا تو وہ شکستگی سے اسے دیکھنے لگے۔ ''آپ دونوں ملیحہ سے بہت محبت کرتے ہیں نا۔ ملیحہ کی خاطر وجدان کے لئے کچھ ایسا کر دیں، اُس کے لئے ہوا میں گھٹن کم ہو جائے...... وہ سانس نہیں لے پاتا۔''

افتخار حسن بے ساختہ نظریں چراتے اُٹھ گئے اور کسی نے بھی انہیں جانے سے نہیں روکا۔ ان کے جانے کے بعد آفاق، منیر حسن کے ہاتھ تھام کر منت سے بولا۔ ''پاپا پلیز!'' تو وہ بے بسی سے بولے۔

''تم جو بات کہہ رہے ہو، وہ بہت بڑی ہے۔''

''وجدان کی خاطر نہ سہی، ملیحہ کی خاطر۔ اسے اسی ملال نے تو مار ڈالا تھا کہ پھوپھا جان نے اس کی محبت کو قبول نہیں کیا۔ آج آپ تو اس کا لحاظ کرتے ہوئے وجدان کو اس خوف سے چھڑا لیں کہ ایک دن وہ شایان کو کھو دے گا۔ پاپا پلیز! شایان، وجدان کی زندگی کی آخری خوشی ہے۔ اس خوشی کو اس کے پاس رہنے دیں۔ کہیں یہ خوشی بھی اس سے کھو گئی تو اس کی عمر رائیگاں ہو جائے گی۔''

آفاق کی باتیں انہیں جھنجوڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دم ہی اس کی بات کاٹ کر بولے۔

''بس آفاق! اب اور کچھ مت کہنا۔''

''پاپا! وجدان......'' آفاق نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔ ان کو جاتا دیکھ کر جنید، تائی سے مخاطب ہوا۔

''آپ تو شایان والی بات کے لئے راضی ہیں؟''

انہوں نے کچھ کہا تو نہیں مگر نم آنکھوں سے اسے تکنے لگیں۔ خواتین کو اُداس دیکھ کر ان سب کو امید ہو چلی تھی کہ تین مہرے تو پٹ گئے۔ سمیرا کی امی دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے ہار ماننے کے انداز میں بولیں۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں افتخار سے بات کرتی ہوں۔''

''سچ؟'' خوش تو سب ہوئے تھے پر ان کی بیٹیاں تو کھل اُٹھیں اور ایک زبان ہو کر بولیں تو انہوں نے وارننگ دینا بھی ضروری سمجھا۔

''ہاں۔ لیکن میں صرف بات کروں گی، منانا تمہارا کام ہے۔ میں اس عمر میں میاں کی جھڑکیاں نہیں سن سکتی۔''

''بھابی! آپ ان کی باتوں میں کیوں آ رہی ہیں؟''

''بس آمنہ! رہنے دو۔'' وہ عاجزی سے بولیں۔ ''ملیحہ مر چکی مگر وجدان زندہ ہے۔ اگر ایک جھوٹ اس کے دل کو تسلی دے سکتا ہے تو کیا غلط ہے؟ مجھ سے اس کی اُداسی دیکھی نہیں جاتی۔ اگر شایان کو کھونے کا دھڑکا اس کے دل سے نکل جائے تو شاید اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ جائے۔ میں دل سے چاہتی ہوں وہ ملیحہ کو بھول جائے اور شایان ہی وہ مشغلہ ہے جو وجدان کے ذہن سے ملیحہ کا خیال جھٹک سکتا ہے۔''

''بھابی! کیا ہو گیا ہے؟'' اب کے آفاق کی امی ان سے اُلجھیں۔ پھر تینوں میں دھواں دھار بحث چھڑ گئی۔ کام بن گیا تھا۔ وہ سارے ایک دوسرے کو اشارے کرتے اُٹھ گئے۔

❁❁❁

صبح ناشتے کی تیاری کے دوران سمیرا اور اس کی بہنیں، سمیرا کی امی سے رپورٹ لے رہی تھیں۔

''آپ نے ابو سے بات کی؟'' سمیرا نے پوچھا تو وہ منہ بنا کر بولیں۔

''کہاں؟...... میرے کمرے میں جانے سے پہلے ہی وہ سونے کے لئے لیٹ گئے تھے۔'' پھر جوش سے مگر راز داری کے انداز میں کہنے لگیں۔ ''تمہاری چچی تو رات میں مان گئیں لیکن آمنہ ابھی تک ٹکی ہوئی ہے۔ اصل مسئلہ ہے بھی انہی بہن بھائیوں کا۔ کوئی ایک بھی مان جائے تو باقی دو اپنے آپ کمزور ہو جائیں گے۔''

ان کا جوش سرد ہو چکا تھا کہ پھر کسی خیال نے اسے اُبھار دیا۔ وہ عظمٰی کا بازو دبوچ کر کہنے لگیں۔

''تم سارے افتخار کے پیچھے پڑے ہو۔ منیر سے کیوں نہیں کہتے؟''

''کیونکہ ابو، ہی بھائیوں میں بڑے ہیں۔ اگر وہ مان گئے تو باقی دو راضی نہ ہوں، فرق نہیں پڑے گا۔ وہ کبھی ابو کے فیصلے کے آگے نہیں بولیں گے۔'' عظمٰی کہہ کر تائید چاہنے کے انداز میں اپنی بہنوں کو دیکھنے لگی تو سب نے اس کی تائید کی۔

صائمہ کی نظریں کچن کی کھڑکی سے باہر گئیں اور وہ سمیرا کا کندھا ہلا کر بولی۔ ''سمیرا! ابو ناشتے کے لئے آ گئے۔ یہ آفاق کدھر ہے؟''

سمیرا نے فوراً کھڑکی سے باہر دیکھا۔ افتخار حسن ڈائننگ ٹیبل کی چیئر گھسیٹ کر بیٹھ رہے تھے۔

کچھ دیر گزری تو منیر حسن اور صمد ساتھ ساتھ ہی آ کر بیٹھ گئے۔

ماحول میں تناؤ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ہر کوئی گرد و پیش سے نظر چرائے خاموشی سے ناشتہ کر رہا تھا۔ منیر حسن اور افتخار حسن کو اندازہ تھا کہ وہ تینوں رات والا ٹاپک دوبارہ ضرور شروع کریں گے۔ اس ٹاپک سے بچنے کے لئے ہی وہ اپنے بیٹوں کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہے تھے۔

''تایا جان! آپ نے کیا سوچا؟''

"کس بارے میں؟" انہوں نے تجاہل عارفانہ برتا۔

"وہی جو رات میں بات ہوئی تھی۔" افتخار حسن کپ ٹیبل پر رکھ کر برہمی سے بولے۔

"وہ بات ایسی نہیں تھی کہ اس کے بارے میں سوچا جائے۔"

"ہمیں آپ سے اجازت چاہئے ماموں جان! اور اگر آپ سوچیں گے نہیں تو ہمیں اجازت کیسے دیں گے؟" جنید کے لہجے میں اصرار تھا۔ افتخار حسن کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"اجازت مانگنی ہے تو مجھ سے نہیں، بھائی صاحب سے مانگو۔"

"ان کا یہاں کیا ذکر؟" بنا سوچے ہی صمد کے منہ سے نکلا پھر اسے فوراً ہی اپنی بات کے بے تکے ہونے کا احساس بھی ہو گیا تھا۔ افتخار حسن اس کی بات سن کر بولے۔

"ملیحہ ان کی بیٹی تھی اور اگر کل تم کسی کو ملیحہ کی اولاد کہتے ہو تو یہ ان کے خون میں ملاوٹ کے برابر ہے۔ جس پر اعتراض وہ ہی کریں گے، میں نہیں۔ حسب نسب خاندانی وراثت ہوتی ہے، جسے یوں ہی نہیں بانٹا جاتا۔ وجدان اگر شایان کو اپنی ولدیت دے رہا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔ پھر وہ ایسا اپنے والدین کے علم میں لائے بغیر کر رہا ہے۔ اگر مصطفیٰ عظیم کو پتہ چل جائے تو وجدان کی خاطر وہ ایک لے پالک کی حیثیت سے تو شایان کو شاید برداشت کر ہی لیں مگر وہ کبھی اسے اپنا وارث تسلیم نہیں کریں گے، اظہر فاروقی کی تو بات دور ہے۔ کبھی جاؤ ان کی زمینوں پر، وہاں جانوروں کی منڈی جیسا ایک بڑا باڑا ہے جس میں ہر نسل کا چوپایہ موجود ہے سوائے خچر کے...... کیونکہ اس کی نسل دوغلی ہے۔ جس شخص کو جانوروں کی نسل میں ملاوٹ پسند نہیں، وہ اپنی نسل میں آمیزش کیا برداشت کر لے گا؟ اظہر فاروقی کو اپنے اعلیٰ نسب کا غرور ہے...... وہ اپنے غرور کا تاج کبھی بھی کسی کی ناجائز اولاد کے سر پر نہیں سجائیں گے۔"

"آپ کیا صرف ان کی وجہ سے اعتراض کر رہے ہیں؟" جنید کے سوال پر وہ رخ بدل کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ "آپ کو یاد ہے، خالو جان سے ہماری آخری بار ملاقات کب ہوئی تھی؟" اس نے ایک اور سوال کیا، پھر ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔ "ملیحہ کے سوئم پر۔ اور آج ملیحہ کو گزرے ہوئے دس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران نور الہدیٰ بھی آیا تو بس ایک بار۔ اس کے علاوہ ان دونوں خاندانوں کے بیچ دس سال سے کوئی رابطہ نہیں ہوا اور آئندہ بھی ایسا ہونے کی کوئی امید نہیں۔ پھر انہیں کیسے پتہ چلے گا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو ملیحہ کو ماں کہتا ہے...... ماں۔" اس نے مٹھاس سے اس لفظ کو ادا کیا۔ "یہ لفظ کتنا مقدس، کتنا قابل احترام ہے۔ ملیحہ کو اس سے اچھا خطاب اور کیا ملے گا؟"

افتخار حسن نے کوئی جواب ہی نہیں دیا اور منیر حسن جو پہلے لاتعلق سے ناشتے میں مصروف تھے، اب چہرے پر عجب سے تاثرات لئے خاموش تھے اور ان کے سامنے پڑا ناشتہ یوں ہی ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ تینوں ہی محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی تائید میں ابھی تک کچھ نہیں کہا۔ انہیں یہ خاموشی اپنے حق میں

محسوس ہو رہی تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تھا جسے آخر آفاق نے توڑا۔

”آپ دونوں پھوپھا جان کو صرف ملیحہ کی موت کے لئے ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا وجدان کی بربادی ان کے ذمے نہیں؟...... یہ دونوں الزام لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن پھوپھا جان اکیلے ملزم نہیں، میرا ضمیر مجھے بھی ان الزاموں میں ان کے ساتھ شامل رکھتا ہے۔“

افتخار حسن اور منیر حسن نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا۔ صمد اور جنید بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگے جو سر کو جھکائے نیچی نگاہ کئے کہہ رہا تھا۔

”آپ کو بے خبری کا فائدہ حاصل ہے۔ مگر میں وہ شخص ہوں جو ملیحہ کی زندگی میں ہی پورا سچ جان گیا تھا۔ میرے پاس تین دن کی مہلت تھی اور میں ان تین دنوں میں بہت کچھ کر سکتا تھا مگر میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے کچھ کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں ساحل پر کھڑا ان دونوں کے ڈوبنے کا نظارہ کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ دونوں ڈوب گئے۔“ یقیناً آفاق کی آنکھوں میں نمی آ گئی جسے اس نے اندر ہی اندر روکتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

”میری غلطی یہ تھی کہ میں ان کے جذبوں کی گہرائی کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ سمجھتا بھی کیسے؟ ایک انگوٹھی نے ملیحہ کو باندھ لیا اور گریز کے اشارے نے وجدان کے راستے بدل دیئے تو میں نے سوچا، انہیں اگر محبت تھی بھی تو وہاں تک نہیں پہنچی جہاں ایک دوسرے کے لئے چوٹ سہی باقی ہے۔ مگر ان کی محبت تو وہاں تک پہنچ چکی تھی، جہاں چاہے جانے والے شخص کے احترام میں اپنے ہاتھوں ؟ د کو مٹا دیا جاتا ہے۔ وجدان، ملیحہ کے لئے مٹتا رہا اور ملیحہ، نورالہدیٰ کے لئے مٹتے مٹتے وجدان کے لئے ... گئی۔ وہ اپنے آپ اس بھنور میں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ انہیں کسی تیسرے کی ضرورت تھی جو انہیں اس بھنور سے نکالتا۔ مگر میں وہ تیسرا شخص کیسے بنتا؟...... نہ کوئی اعتراف...... نہ کوئی وعدہ۔ محض چند ملاقاتیں اور کوئی اپنی زندگی خیرات کر دے...... ایسی کوئی مثال کانوں نے سنی کب تھی؟ مگر میں پھر بھی شرمندہ ہوں پاپا!“ اس نے سر اٹھا کر منیر حسن کو پکارا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ شایان کی صورت میں مجھے وہ موقع دیا گیا ہے کہ میں اپنی غلطی کا ازالہ کر سکوں۔ پھر شاید وجدان کا سامنا کرتے ہوئے مجھے ندامت نہ ہو۔ میں اس بار ساحل پر بیٹھ کر وجدان کے ڈوبنے کا نظارہ نہیں کروں گا۔“

منیر حسن اُس کی آنکھوں میں پھیلی سرخی کو دیکھتے رہ گئے۔

”آج آفس سے ہاف ڈے لے لینا۔“

آفاق اس غیر متعلق جملے پر اچنبھے سے بولا۔ ”کیوں؟“

وہ اس کا جواب دینے کے بجائے بولے۔ ”میں وجدان کو بھی لنچ کے بعد آف کر دوں گا۔ تم اس کے گھر جا کر شایان کو کچھ دنوں کے لئے یہاں لے آنا۔“

"ایک تو اس کا ایڈمیشن ٹیسٹ ہونے والا ہے۔ دوسرا وجدان تو شاید اعتراض نہ کرے لیکن اس کے گھر والے، شایان کو ہمارے گھر کچھ دن رہنے کی اجازت کیوں دیں گے؟" منیر حسن بولے تو ان کے لہجے میں سکون تھا۔

"ایڈمیشن ٹیسٹ کی تیاری یہاں بھی ہو سکتی ہے۔ اور وجدان کے گھر والے تمہیں شایان کو ساتھ لے جانے سے کیسے روک سکتے ہیں؟ آخر تم اس کے ماموں ہو۔"

جب اس کی بات آفاق کی سمجھ میں آئی تو وہ، صمد اور جنید ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ سمیرا کے ہونٹوں پر بھی آسودہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔ مگر افتخار حسن فوراً اسے ٹوکتے ہوئے بولے۔

"منیر حسن!" لیکن ان کی آواز میں تیزی نہیں، حیرت بھرا استفسار تھا۔

"میں جانتا ہوں افتخار بھائی! آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ سوچ میرے ذہن میں بھی ہے لیکن میں وجدان کے لئے بھی سوچ رہا ہوں۔ اگر ہم اس جھوٹ کی تصدیق کر دیں تو نقصان کوئی نہیں لیکن یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ وجدان کے ذہن سے بوجھ ہمیشہ کے لئے اُتر جائے گا۔ لیکن اگر ہم تردید کرتے ہیں تو آج یا کل وجدان کو ایک اور خسارے سے گزرنا ہو گا۔ آپ صحیح غلط کے چکر سے نکل آئیں۔ ہمیشہ اور ہر معاملے میں صحیح اور غلط کا ٹیگ لگانا ممکن نہیں ہوتا۔ بعض چیزیں اس لئے ہوتی ہیں کہ انہیں کسی ٹیگ کے بغیر قبول کر لیا جائے۔ ان کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ خود وقت کرتا ہے۔"

افتخار حسن نے پھر کچھ نہیں کہا اور سامنے رکھے کپ میں بچی ٹھنڈی چائے کے آخری گھونٹ حلق سے اتارنے لگے۔ لیکن منیر حسن ٹھنڈے ناشتے پر قناعت نہیں کر سکے اور بلند آواز میں کچن کے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا۔

"سمیرا بیٹا! ناشتہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اور لے آؤ۔"

وہ دونوں ہی ناشتہ کر کے جا چکے تو آفاق پُرسوچ انداز میں بولا۔ "یار! اس کہانی میں بہت جھول ہیں، محنت کرنی پڑے گی۔"

"کیسے جھول؟" جنید نے حیرت سے پوچھا تو آفاق نے کہا۔

"ہمیں ہر صورت اس بات پر قائم رہنا ہے کہ ملیحہ کی شادی ہماری سرپرستی میں ہوئی تھی جس کا مطلب ہوا کہ جب وجدان لاپتہ ہوا تو اس کا اتہ پتہ ہمارے پاس تھا اور میں نے جان بوجھ کر سالوں سال وجدان کی فیملی کو لاعلم رکھا۔ اس کے ساتھ ہی وجدان کی اتفاقاً واپسی بھی دھوکہ ہی لگے گی۔ پھر شاید وہ وجدان کی مینٹل کنڈیشن والی بات کو بھی من گھڑت کہانی سمجھیں۔"

"ہوں۔" زارا پُرسوچ انداز میں بولی۔ "اگر وجدان کی فیملی کا ہم پر سے اعتبار اُٹھ گیا تو واقعی شکوک و شبہات کا کوئی انت نہیں۔"

''اور اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ میں کسی بھی چیز کی وضاحت نہیں دے پاؤں گا۔'' آفاق کا انداز ایسا تھا جیسے دیر تک اس مسئلے کو سوچتے وہ تھک گیا ہو مگر حل پھر بھی نہ ملا۔

''یہ واقعی بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ اگر ہم ان کی نظروں میں مشکوک ہو گئے تو وہ ہماری کہانی پر بھی آسانی سے اعتبار نہیں کریں گے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تصدیق کرنے کی کوشش میں وہ سچ تک پہنچ جائیں۔'' فکرمندی سے کہتا صمد چپ ہوا تو سب پریشان صورت بنائے سر ہلانے لگے۔ سمیرا نے ان کے چہروں کو دیکھا اور کہا۔

''اس میں اتنا سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو بات ناقابل اعتبار ٹھہرے، وہ بات ہی نہ کریں۔''

''کیا مطلب؟'' آفاق سمجھا نہیں۔

''ارے بھئی جھوٹ بولنے کے بجائے سچ بولیں کہ وجدان نے جب گھر چھوڑا، ملیحہ کے انتقال کو چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔''

''تو شایان کہانی میں کیسے شامل ہوگا؟''

''خفیہ شادی کے ذریعے۔'' سمیرا نے کہا۔

''مطلب؟'' اس بار عظمیٰ نے وضاحت چاہی تو سمیرا سمجھانے لگی۔

''دیکھیں، ملیحہ کی شادی تو ماموؤں کی سرپرستی میں ہی ہوگی۔ یعنی خفیہ شادی۔'' وہ بول کر داد طلب نظروں سے سب کو دیکھنے لگی۔ پر ان کے چہرے بدستور ہونق بنے دیکھ کر سمیرا نے کہا۔

''کیوں بھئی، کیا ہوا؟ سمجھ نہیں آیا؟''

سب نے کورس میں سر نفی میں ہلائے تو سمیرا کہنے لگی۔

''کوئی بات نہیں۔ میں سمجھاتی ہوں۔ دیکھو، ملیحہ کی ڈیتھ سے ایک سال پہلے وجدان اور ملیحہ کی شادی ہوئی، وہ پریگننٹ ہوئی، پھر 21 دسمبر 1981ء کی رات شایان کو جنم دیتے ہوئے ملیحہ کی ڈیتھ ہو گئی اور 22 دسمبر کو وجدان اپنے بیٹے کو لے کر چلا گیا۔ کہاں؟ بھلا ہم کیسے جان سکتے تھے؟'' وہ چپ ہوئی تو جنید بے ساختہ بولا۔

''زبردست۔ آفاق، سمیرا کی بنائی کہانی پر کوئی سوال نہیں اُٹھ سکتا۔ بس اس رف آئیڈیا کو تھوڑا پالش کرنے کی ضرورت ہے۔''

اور پھر اس کہانی کی نوک پلک سنواری جانے لگی۔ جب ہر زاویے پر غور کر لیا گیا تو آفاق اپنی جگہ سے اُٹھا۔

''چلو تیار ہو جاؤ۔'' شایان کو لینے جانا ہے۔''

''بس ہم دونوں جائیں گے؟...... میرا مطلب ہے امی یا چچی جان میں سے کوئی ساتھ نہیں ہوگا؟'' سمیرا نے کہا۔

''نہیں، آج جھوٹ بولنے کا دن ہے۔ اجازت دینا اور بات ہے لیکن جب ان کے سامنے ملیحہ اور شایان کے بیچ جھوٹے رشتے کا پل باندھا جائے گا تو ان کے لئے چپ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر کیوں ہم انہیں

اس مشکل میں ڈالیں؟ شایان کو لینے کے لئے بس میں اور تم ہی جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ چلیں۔ میں آتی ہوں۔'' وہ آفاق سے کہتی اُٹھ گئی۔

❁❁❁

ان دونوں کو وجدان کے گھر کے لاؤنج میں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی مگر دونوں میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں کہ اچانک شایان باہر سے بھاگتا ہوا آیا اور آفاق کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔

''انکل! آپ جواد کو کیوں نہیں لائے؟ میں نے اس کے ساتھ کرکٹ کھیلنی تھی۔'' آج آفاق اسے ملیحہ کے حوالے سے دیکھ رہا تھا، شاید اسی لئے معصومانہ خفگی سے منہ پھلاتا وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگا تھا۔ آفاق کو اس پر ڈھیروں پیار آ گیا تو جواب دیئے بغیر مسکراتا ہوا اس کے گال چومنے لگا۔

''بیٹا! پہلے سلام کرتے ہیں۔'' وجدان نے ٹوکا تو شایان نے لہراتا ہوا سلام کیا۔

''السلام علیکم انکل!''

''وعلیکم السلام۔'' آفاق نے اسی کے انداز میں جواب دے کر وجدان سے کہا۔ ''اب اسے یہ بھی کہہ دو کہ مجھے انکل نہ کہا کرے۔ غیریت سی محسوس ہوتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ انکل کا لفظ تو غیروں کے لئے بنا ہے۔'' عائشہ فوراً اس کی تائید کرتی بولیں پھر شایان کو مخاطب کیا۔ ''شایان! تم آفاق کو چاچو کہا کرو۔ آخر یہ وجدان کے بھائیوں جیسا ہے۔'' اور آفاق کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ سوچ کر بولا۔

''چاچو نہیں آنٹی! آپ مجھے اس سے ماموں کہلوائیں۔ کیونکہ وجدان میرے بھائی جیسا ہے۔ لیکن ملیحہ کا تو میں بھائی ہی تھا۔''

''کیا؟'' عائشہ کے ساتھ مصطفیٰ عظیم اور انیقہ بھی بری طرح چونکے۔ وجدان بھی ٹھٹک گیا تھا۔

''جی ہاں۔'' آفاق ان کے حیران چہروں پر نظر ڈالتا آرام سے کہہ رہا تھا۔ ''ملیحہ میری پھپھوزاد بہن تھی۔'' ایک انکشاف تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اس انکشاف پر کس ردِعمل کا اظہار کریں۔ لیکن وجدان کی چھٹی حس نے اسے کوئی اشارہ کیا تھا۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔

''بس آفاق! اس کے بعد کچھ مت کہنا۔''

''لیکن کیوں؟ میں پاپا اور تایا جان کی اجازت لے کر اسی لئے آیا ہوں کہ انکل اور آنٹی، ملیحہ اور میرے رشتے کے بارے میں جان جائیں۔ اور میں انہیں یہ بھی بتا دوں کہ شایان میرا بھانجا ہے۔'' آفاق نے پاپا اور تایا جان کا حوالہ اسی لئے دیا تھا کہ وجدان خاموش ہو جائے۔ وہ واقعی چپ سا ہو گیا تھا۔ پھر لب بھینچ کر اُٹھا اور لاؤنج سے چلا گیا۔ آفاق اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر وہ اس کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا کیونکہ مصطفیٰ عظیم حیرت سے سنبھل کر سوالوں کا سلسلہ شروع کر چکے تھے اور آفاق کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا جو کہہ رہے تھے۔

''ملیحہ تمہاری کزن تھی، اتنی بڑی بات تم نے ہم سے چھپا کر رکھی۔ کیوں؟''

''کیونکہ وجدان گمشدہ تھا اور آپ اس کی گمشدگی کا تعلق ملیحہ...... سے جوڑ رہے تھے۔ اگر اس وقت میں کہتا کہ ملیحہ میری کزن تھی تو بدمزگی ضرور ہوتی۔ مگر اب حالات میں ٹھہراؤ آ چکا ہے۔ پھر وقت بھی اتنا بیت چکا ہے کہ اس بات کو ظاہر کر دینے میں اب کوئی حرج نہیں۔''

مصطفیٰ عظیم لب بھینچنے لگے، پھر مشکوک انداز میں دیکھتے ہوئے بولے۔

''ملیحہ تمہاری کزن تھی اور وجدان دوست۔ اور جہاں تک میرا اندازہ ہے، تم ان کے رازدار تھے۔ سچ بتانا آفاق! کیا وجدان نے گھر سے جانے کے بعد تم سے کبھی کونٹیکٹ نہیں کیا؟''

''نہیں۔ لیکن آپ کا یہ اندازہ درست ہے کہ میں ان دونوں کا رازدار تھا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' انہوں نے اس کی لاعلمی کو رد کر دیا۔ ''ملیحہ کو تم بہن کہہ رہے ہو۔ اور دوست چاہے کتنا ہی قابلِ اعتبار ہو، کوئی غیرت مند شخص اپنی بہن، دوست کے حوالے نہیں کر سکتا جب تک وہ اس کے نکاح میں نہ آ جائے۔ اور اس کے بعد بھی وجدان نہ سہی، ملیحہ تو تم سے رابطہ کرتی رہی ہوگی۔''

آفاق نے انہیں اطمینان سے اپنی بات کہنے کا موقع دیا۔ پھر جب وہ چپ ہوئے تو کہا۔

''اب بھی آپ کے سارے اندازے درست ہیں۔ مگر ایک بات کی تصحیح کر لیجئے کہ وجدان نے گھر سے جانے کے بعد ملیحہ سے شادی نہیں کی تھی بلکہ جس وقت اس نے گھر چھوڑا، اس وقت تک ملیحہ کی ڈیتھ ہو چکی تھی۔''

''کیا......؟'' حیرت کے ایک اور جھٹکے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ آفاق اسی سنجیدگی سے کہتا رہا۔

''آپ کو شاید یاد ہو، جس رات وجدان نے گھر چھوڑا اس دن میں صبح وجدان کو لینے آیا تھا اور آپ کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ پچھلی رات میری کزن کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور میں وجدان کو جنازے میں شرکت کے لئے لے جا رہا ہوں۔'' وہ رکا، پھر کہا۔ ''وہ کزن ملیحہ تھی۔''

''مجھے سمجھ نہیں آ رہا، تم کیا کہہ رہے ہو؟'' عائشہ بری طرح الجھ رہی تھی۔ آفاق انہیں دیکھ کر کہنے لگا۔

''ٹھہریں، میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔ ملیحہ کی ڈیتھ سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور چند ملاقاتوں میں ہی انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن جب ملیحہ نے اپنے بابا جان سے بات کی تو وہ چراغ پا ہو گئے۔ ملیحہ نے انہیں منانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ کسی صورت اس رشتے پر تیار نہیں ہوئے اور ملیحہ کے لئے وجدان کو بھولنا ناممکن تھا۔ بات اتنی بڑھی کہ ملیحہ احتجاجاً گھر چھوڑ کر ہمارے گھر آ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اکلوتی بیٹی کی جدائی پر ان کا دل پسیج جائے گا۔ مگر ان کا غصہ اور بھی بڑھ گیا اور انہوں نے ملیحہ کو اپنی زندگی سے ہی بے دخل کر دیا۔ اب ملیحہ واپس نہیں جا سکتی تھی، ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں تھا کہ ملیحہ کی وجدان کے ساتھ شادی کر دی جائے۔ پھر میرے پاپا اور تایا نے ملیحہ کے سرپرستوں کی حیثیت سے اسے وجدان کے ساتھ رخصت کر دیا وجدان نے آپ لوگوں سے چھپ کر شادی کی۔ کیونکہ اسے

خدشہ تھا کہ ملیحہ کے بابا جان کی طرح آپ لوگ بھی اس معاملے کو ایشو بنالیں گے۔ جبکہ اس شادی کو ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ ملیحہ کو پھوپھا جان سے بہت محبت تھی اور ان کی طرف سے تعلق توڑ لئے جانے کے بعد وہ ڈپریشن کا شکار رہنے لگی تھی۔ اسے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی جو اسے وجدان کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے وجدان نے کچھ وقت کے لئے اپنی شادی کو خفیہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ پھر شادی کے کچھ مہینوں بعد......'' آفاق گھر سے رٹ کر آئے جملوں کو روانی سے ادا کرتا جارہا تھا کہ بولتے بولتے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اس کے لئے بات کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا تو چپ ہونے کے ساتھ ہی سر کو جھکاتے ہوئے اس نے غیرمحسوس انداز میں اپنا چہرہ چھپالیا جو ایک دم ہی سرخ ہو گیا تھا۔ سمیرا بھانپ چکی تھی کہ یہ غیرت کی سرخی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ آفاق کی زبان کس بات نے پکڑ لی ہے۔ اس لئے اس کے چپ ہوتے ہی سمیرا نے بولنا شروع کر دیا۔

''جب ملیحہ اُمید سے ہوئی تو وجدان کو لگا کہ اسے شادی کا اعلان کر دینا چاہئے۔ مگر پھر بھی اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اچانک ایک دن ملیحہ کو آپ کے سامنے لے آتا۔ پھر اس نے سوچا کہ ایک دم دھماکا کرنے کے بجائے وہ پہلے آپ لوگوں کو اس بات کے لئے راضی کر لے کہ آپ اس کی شادی ملیحہ کے ساتھ کرنے پر تیار ہو جائیں پھر وہ آپ کو بتا دے گا کہ وہ شادی کر چکا ہے۔ لیکن اس کی توقع کے عین مطابق آنٹی نے ملیحہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اب وجدان دوہرے عذاب میں گرفتار تھا۔ ایک طرف اسے آپ کو منانا تھا، دوسری طرف ملیحہ کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ وجدان کے لئے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ فی الفور اسے گھر لے آئے تاکہ چوبیس گھنٹے اس کے پاس رہ سکے۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جس رات شایان پیدا ہوا، ملیحہ کی طبیعت اچانک ہی بگڑ گئی تھی۔ اسے ہسپتال لے کر گئے لیکن......'' سمیرا نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ مصطفیٰ عظیم ہونٹوں پر مٹھی جمائے خاموش بیٹھے تھے اور عائشہ مصطفیٰ پُرنم آنکھوں کے ساتھ بولیں۔

''تو یہ وجہ تھی۔ میں اکثر سوچتی کہ میں نے تو وجدان سے کہہ دیا تھا کہ ملیحہ سے شادی کر لے، پھر وہ کیوں چلا گیا؟ آج پتہ چلا، میں نے اجازت دینے میں دیر کر دی۔ میں نے اس وقت اسے ملیحہ سے شادی کرنے کی اجازت دی، جب وہ ملیحہ کو دفنا کر آ رہا تھا۔ اُف میرے اللہ!'' انہوں نے کرب سے آنکھیں بھینچ لیں اور آنسو ٹپ ٹپ ان کے گالوں پر بہنے لگے۔

''کیسے برچھی کی طرح میرے لفظ وجدان کے سینے کے آر پار ہوئے ہوں گے۔ کیسی ماں ہوں، اس کی حالت نہیں پہچان سکی۔ مجھے آج بھی یاد ہے، اس رات وجدان اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا کہ خود سے بکھر گیا تھا، ٹوٹ رہا تھا وہ اور میں نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ کاش مجھے پہلے پتہ چل جاتا تو ملیحہ کو خود جا کر گھر لے آتی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کا خیال رکھتی۔ بھلا وجدان اسے اس حالت میں کہاں سنبھال پاتا ہو گا؟'' پھر وہ آنسو پونچھتی مصطفیٰ عظیم سے بولیں۔

''یاد ہے مصطفیٰ صاحب! ملیحہ کے انتقال سے کچھ مہینے پہلے وجدان نے اچانک گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ آفس بھی نہیں جاتا تھا۔ صبح کا نکلا آدھی رات کے بعد گھر میں گھستا تھا اور ہم ناراض ہوتے تھے۔ اب سمجھ آیا اس کی بیوی، ماں بننے والی تھی۔ پھر وہ کیسے گھر اور آفس کی پروا کرتا؟ اس کا دھیان تو ملیحہ میں اٹکا رہتا ہو گا۔'' پھر جیسے انہیں کسی بات کا دھیان آیا تھا، انہوں نے پکارا۔ ''انیقہ!''

''جی امی!'' وہ چونک کر بولی۔

''تم نے بتایا تھا کہ وجدان کے جانے سے دو تین دن پہلے جب اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، ملیحہ، وجدان سے ملنے گھر آئی تھی۔''

وہ ان کی بات کا مفہوم سمجھ کر سہمی آواز میں بولی۔ ''جی بتایا تھا''

عائشہ مصطفیٰ کے تیور بگڑ گئے۔ ''مگر تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ملیحہ پورے دنوں سے تھی۔''

آفاق اور سمیرا اُن کی بات سن کر گھبرا گئے۔ آفاق کے ذہن سے یہ بات ہی محو ہو چکی تھی کہ انیقہ کی ملیحہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی ملاقات ہوئی تھی اور اب اسے لگ رہا تھا، اُس کا بھانڈا پھوٹنے والا ہے اور شایان کا بھی......وہ سٹپٹائی نظروں سے انیقہ کو دیکھنے لگا۔ مگر آفاق کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انیقہ اس سے بھی زیادہ بری طرح سٹپٹائی ہوئی تھی، تیزی سے پلکیں جھپکتی وہ بار بار کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتی لیکن کوئی جواب جیسے بن نہیں پا رہا تھا۔

''بولو انیقہ! اب چپ کیوں ہو؟...... جواب دو'' اس کی چپ سے جھنجلا کر مصطفیٰ عظیم بولے تو ان کی آواز میں دبا دبا غصہ تھا۔ انیقہ روہانسی ہو گئی۔

''کیا بولوں ابو! جب میں نے کچھ محسوس ہی نہیں کیا تھا۔''

آفاق کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

''کیا بات کر رہی ہو؟'' عائشہ پہلے سے بھی تیز لہجے میں بولیں۔ ''جس عورت کے ہاں دو چار روز میں ولادت ہونے والی ہو، اسے تو کنواری بھی پہچان لے۔ اور تم جو اس وقت بھی ایک بچے کی ماں تھیں، اتنا بھی نہ دیکھ سکیں کہ ملیحہ امید سے ہے؟''

انیقہ اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکی تھی، بولی۔ ''امی! میں سچ کہہ رہی ہوں، میں نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ اصل میں، میں پہلے ہی وجدان کی طرف سے پریشان تھی۔ پھر جب ملیحہ نے بتایا کہ وہ ملیحہ فاروقی ہے اور وجدان سے ملنا چاہتی ہے تو مجھے فطری طور پر غصہ آ گیا۔ شاید اسی لئے میں نے اُسے ٹھیک سے دیکھا ہی نہیں۔ یا شاید دیکھا بھی ہو تو دھیان نہ دیا ہو گا۔ کیونکہ وجدان تو یہی کہہ رہا تھا کہ ملیحہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ کب کہا تھا کہ کر چکا ہے جو اس طرف دھیان جاتا۔ اور پھر ملیحہ نے شال لے رکھی تھی۔ حالانکہ دس سال پرانی بات ہے، پھر بھی مجھے یاد ہے کہ ملیحہ کالے رنگ کی ساڑھی میں تھی اور اس نے اپنے گرد میرون کلر

بال خوب پھیلا رکھی تھی۔ ہوسکتا ہے اس لئے بھی میں دیکھ نہیں پائی۔''
آفاق اور سمیرا سکون کا سانس لیتے ایک دوسرے کو دیکھ کر مبہم سا مسکرائے تھے۔ حالانکہ انیقہ ''چشم دید گواہ''
پر اس کا وہ حال تھا کہ ''مجھے خود اپنی نگاہوں پر اعتبار نہیں'' اُس کا عذر سن کر بھی عائشہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔
''بہو تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہو تو گئے گزرے بھی اُس کے ناز اُٹھاتے ہیں۔ اور ہمارے پوتے کی
شوہر کی خبر لینے چوکھٹ پر آئی بھی تو تم نے اسے دروازے سے لوٹا دیا۔ تم نے بہت زیادتی کی انیقہ!
ان کو پتہ چلا ہوگا تو کتنا برا لگا ہوگا اسے کہ آج تک ناراض ہے۔ ٹھیک ہی تھا پھر جو وہ اپنے بچے کو لے کر
گیا۔ بھلا وہ اپنے بچے کو اس گھر میں لے کر کیوں آتا جس گھر میں اس کے بچے کی ماں کو پاؤں رکھنے کی
اجازت نہیں ملی۔''
''بیتی باتوں کا دکھ کرنے سے کیا ہوگا؟'' انہیں ماضی کا افسوس کرتے دیکھ کر مصطفیٰ عظیم نے دھیرے سے
کہا پھر آفاق کی طرف مڑے۔ ''تم یقین کرو، ہم سب کو ملیحہ کی جواں مرگی کا بہت افسوس ہے۔ میں تمہارے
والد اور تایا سے بھی خود جا کر تعزیت کروں گا۔ بے شک ملیحہ کے انتقال کو طویل مدت گزر چکی ہے، مگر ہمیں تو آج
ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ تمہاری بہن تھی۔ بلکہ تم مجھے ملیحہ کے والد کا بھی پتہ بتا دو۔ میں ان سے ملنے جاؤں گا۔''
''ایسا سوچیں بھی مت۔'' آفاق گھبرا کر بولا۔
''کیوں؟''
''میں نے بتایا نا، وہ اس رشتے پر خوش نہیں تھے۔''
''وہ تو تب کی بات تھی۔'' مصطفیٰ عظیم اُلجھ کر بولے۔
''بات اب بھی یہی ہے۔''
''کیا بیٹی کی موت بھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں کر سکی؟'' وہ حیرت سے بولے۔ پھر ایک خیال کے تحت پوچھا۔
''وہ ملیحہ کی وفات کے بارے میں تو جانتے ہیں نا؟''
''ہاں۔ بلکہ وہ ملیحہ کی آخری رسوم میں شامل تھے۔ لیکن انہوں نے ایک بار بھی شایان کی طرف نہیں
دیکھا۔'' آفاق اس خیال سے جلدی سے بولا کہ کہیں وہ ملیحہ کے جنازے میں بابا جان کی شمولیت کو ان کی
طرف سے نرمی نہ سمجھ بیٹھیں۔
''حد ہو گئی۔'' مصطفیٰ عظیم کو یقیناً برا لگا تھا۔
''ٹھیک ہے، بچوں سے غلطی ہو گئی تھی۔ مگر اب تو انہیں معاف کر دینا چاہیے۔ پھر جب بیٹی ہی نہیں رہی تو
ناراضی کس بات کی؟''
''آپ نہیں جانتے انکل! پھوپھا جان کی سخت مزاجی بے مثال ہے۔ اگر وہ اتنے ضدی نہ ہوتے تو ملیحہ ان
کی مرضی کے بغیر شادی کیوں کرتی؟ اور آپ کو کیا لگتا ہے، کیا ملیحہ نے ان کے بعد انہیں منانے کی کوشش نہیں

کی؟ ملیحہ نے بہت جتن کیئے کہ وہ وجدان کو قبول کر لیں مگر پھوپھا جان ٹس سے مس نہ ہوئے۔ موت برحق ہے اور ایک دن سب کو مرنا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے، ملیحہ کو پھوپھا جان کی ناراضی نے موت سے پہلے مار دیا تھا۔ اسے اپنے بابا جان سے بہت محبت تھی۔ وہ ان کی ناراضی کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر سکی۔ ان کی انا پرستی کا اندازہ لگائیں کہ وجدان کے ساتھ ان کی پہلی ملاقات ہی ملیحہ کے جنازے پر ہوئی تھی اور اس دن بھی انہوں نے وجدان کو مخاطب کرنا گوارا نہیں کیا اور اس دن سے لے کر آج تک انہوں نے ایک بار بھی وجدان سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔''

آفاق یہ سب اس لئے کہہ رہا تھا تا کہ مصطفیٰ اعظیم، بابا سے ملنے کا خیال ہی ذہن سے جھٹک دیں۔

''وجدان نہ سہی، شایان سے ملنے کو تو دل چاہتا ہوگا۔ آخر ان کا نواسہ ہے، ان کا خون ہے۔''

''دل چاہتا تو کبھی ملنے نہ آتے؟'' آفاق کی بات نے انہیں چپ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر آزردگی سے بولے۔

''اگر غلطی ہوئی بھی تھی تو ملیحہ اور وجدان سے ہوئی تھی۔ پر سمجھ نہیں آتا، اس بچے کو کس چیز کی سزا مل رہی ہے کہ وہ سارے رشتوں سے دُور رہے؟ مجھ سے پوچھتا ہے، زوار اور مناہل تو ہمیشہ سے آپ کے ساتھ رہتے ہیں، میں کیوں نہیں رہتا تھا؟ کبھی جو دونوں اپنے نانا کے گھر چلے جائیں تو یہ ضد کرنے لگتا ہے کہ مجھے بھی نانا کے پاس جانا ہے۔ اب میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ اس کی قسمت میں ادھورے رشتے ہیں۔ معصوم بچے کا ذہن اُلجھنوں کا گڑھ بن کر رہ گیا ہے۔''

ان کی بات سن کر آفاق نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میں اسے رشتے ہی دینے آیا ہوں۔'' پھر وہ کچھ دُور بیٹھے شایان سے بولا۔ ''نانا کے گھر چلو گے؟''

شایان کا ذہن آس پاس ہو رہی بات چیت کو یاد کرنے اور اس سے نتیجے اخذ کرنے میں لگا تھا، وہ فوری طور پر کچھ نہیں بولا تو آفاق اسے ہاتھ پکڑ کر پاس بلاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں امی کی تصویریں دیکھنا اچھا لگتا ہے نا؟'' شایان نے زور زور سے سر ہلایا تو آفاق نے جیسے اُسے لالچ دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس تمہاری امی کی بہت ساری تصویریں ہیں۔''

''آپ امی کے بھائی ہیں؟'' اب اس نے اپنے ذہن کی بیٹری اسٹارٹ کی۔ ''آپ مجھے امی کے بارے میں بتائیں گے؟''

''ہاں۔ لیکن اگر تم میرے گھر چل کر رہنے پر تیار ہو جاؤ، تو......'' آفاق کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اُچھل کر بولا۔

''میں آپ کے گھر جاؤں گا۔'' پھر سست ہو کر بولا۔ ''لیکن ابو سے پوچھنا ہوگا۔''

''تو چلو، ان سے پوچھتے ہیں۔'' آفاق اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا تو عائشہ بولیں۔

''پوچھنا کیا ہے؟ بس جا کر وجدان کو بتا دو۔ تب تک میں اسے تیار کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' آفاق اس کا ہاتھ چھوڑ کر باہر آ گیا۔

وجدان سر دونوں ہاتھوں پر گرائے سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ آفاق اس کے برابر آ کر بیٹھا تو وجدان سر اٹھائے بغیر بولا۔

''یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ضرورت کو تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔''

وجدان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کہا۔ ''میں اسے سمجھا لیتا۔''

''مان لو وجدان! کہ شایان کے ذہن سے ملیحہ کا تصور جدا کرنا تمہارے بس میں نہیں تھا۔''

وجدان بے بسی سے چہرہ موڑ کر سامنے دیکھنے لگا، پھر تھکن بھری آواز میں بولا۔ ''اب میں منیر انکل اور افتخار انکل کا سامنا کیسے کروں گا؟''

''عادت ہو جائے گی۔'' اس کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' وجدان نے ملامت کی۔

''تو اور کیا کرتا؟'' آفاق چڑ گیا۔

''اس دن جب شایان، ملیحہ کو امی کہہ کر اس کی تصویریں دکھا رہا تھا تو وہاں جواد اور فائزہ بھی تھے جو ملیحہ کو دوسرے حوالے سے جانتے ہیں۔ وہ تو شکر تھا کہ انہوں نے ملیحہ کو نہیں پہچانا لیکن شکر کرنے کا یہ موقع ہمیشہ نہیں ملتا۔ پھر تم کیا کرتے؟''

وجدان نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ خاموشی کی اس دیوار کو شایان کی آواز نے توڑا جو ''ابو، ابو'' پکارتا ان دونوں کی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ قریب آنے پر وہ اپنی اسپیڈ کم کئے بغیر وجدان کے سینے میں گھس گیا تو وجدان ہلکے سے دھکے سے پیچھے ہو گیا۔ پھر اس کے سر پر چپت لگا کر بولا۔

''بریک تو لگا لیا کرو۔''

مگر وہ اپنی ہی کہنے لگا۔ ''پتہ ہے ابو! ماموں کہہ رہے ہیں، وہ مجھے نانا کے گھر لے کر جائیں گے۔''

وجدان ہکا بکا رہ گیا۔ پھر حواس باختہ سا آفاق سے بولا۔ ''تم اسے بابا جان کے گھر لے کر جا رہے ہو؟''

آفاق بدکا۔ ''میری شامت آئی ہے؟ اسے وہاں لے کر گیا تو پھوپھا جان مجھے جان سے مار دیں گے۔''

''مجھے ان کے گھر جانا بھی نہیں۔'' شایان کے ناراضی سے کہنے پر وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔

''کیوں بھئی؟'' آفاق نے دلچسپی سے پوچھا تو وہ بدستور منہ پھلائے کہنے لگا۔

''انہوں نے امی کو ڈانٹا تھا۔ وہ گندے ہیں۔''

''ایسا نہیں بولتے۔'' وجدان نے فوراً ٹوکا جبکہ آفاق نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب یہ اس طرح سے باتیں کرتا ہے تو مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ یہ ملیحہ کا ہی بیٹا ہے۔"

وجدان دانستہ تبصرے سے گریز کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا سنو! تم اسے لے کر جا رہے ہو تو واپس کب تک چھوڑنے آؤ گے؟"

"پہلی بار ملیحہ کا بیٹا بن کر میرے گھر جا رہا ہے۔ دس بارہ دن تو رُکے گا ہی۔"

"میں شایان کے بغیر اتنے دن نہیں رہ سکتا۔" وجدان تیزی سے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ دو دن۔ پرسوں شام میں اسے واپس چھوڑ جانا۔"

"دیکھیں گے۔" آفاق نے بے نیازی سے کہا تو وجدان اُنگلی دکھا کر بولا۔

"اگر تم اسے چھوڑنے نہیں آئے تو میں خود اسے لینے آ جاؤں گا۔"

"کہا نا، دیکھیں گے۔" آفاق کا انداز ہنوز وہی تھا۔

پھر سارا وقت وجدان اسے یہی تاکید کرتا رہا کہ ایک دو دن کے بعد وہ شایان کو بھیج دے اور آفاق بھی لاپروائی سے سر ہلاتا رہا۔

رات کے کھانے کے بعد جب وہ جانے لگے تو سب انہیں گاڑی تک چھوڑنے باہر آ گئے۔ رخصت کے لئے ہاتھ ملاتے ہوئے وجدان پھر سے تاکید کرنے لگا۔

"بس کل کا دن کافی ہے، پرسوں اسے لے آنا۔"

آفاق چڑ کر عائشہ سے بولا۔ "آنٹی! اس کا بیگ بھی تیار کر دیں۔" تو وجدان نے بے بسی سے کہا۔

"مذاق مت کرو۔ میں واقعی شایان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے کبھی ایک دن کے لئے بھی اسے خود سے الگ نہیں کیا اور وہ میرے بغیر اُداس ہو جائے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ بلکہ دیکھو، وہ ابھی سے اُداس ہو گیا ہے۔" اس نے گاڑی کی طرف دیکھا، جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر شایان بیٹھا تھا۔

"تم بہت ہی بدتمیز انسان ہو۔" اور گاڑی کے پاس آ کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر پاؤں باہر رکھے اندر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے شیان کو بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے لگا کے پیار کرتے ہوئے بولا۔

"وہاں جا کر شرارت مت کرنا۔ اور اُداس ہو جاؤ تو ماموں سے کہہ دینا۔ وہ تمہیں میرے پاس لے آئیں گے۔" پھر سمیرا سے کہنے لگا۔ "بھابی! ذرا خیال رکھیں۔ یہ سارا وقت کھیلتا نہ رہے۔ اس کا ایڈمیشن ٹیسٹ ہونے والا ہے۔ کھانے کا بھی دھیان رکھیں۔ یہ ٹائم پر کھانا نہیں کھاتا اور دودھ سے تو بھاگتا ہے۔ آپ کو زبردستی پلانا پڑے گا۔"

"تم بالکل فکر مت کرو۔ میں شایان کا پورا خیال رکھوں گی۔" سمیرا نے اسے مطمئن کرنے کو کہا۔ تبھی آفاق جو دروازے میں جھک کر کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا، وجدان کے کندھے پر ہاتھ مار کر متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"جیسے سکھا رہے ہو، اسے دو بچے پالنے کا تجربہ ہے۔ اور اب آپ باہر آیئے۔" آفاق نے اسے بازو پکڑ کر باہر نکالا، پھر لے جا کر مصطفیٰ عظیم کے برابر کھڑا کر دیا۔ "ذرا اسے پکڑ کر رکھئے تاکہ میں جا سکوں۔" پھر وجدان کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مذاق اُڑاتا ہوا بولا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ پھر انجن اسٹارٹ کرتے گاڑی کو گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔

مصطفیٰ عظیم نے وجدان کی طرف دیکھا جو کچھ سوچتا ہوا گیٹ سے باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

"زندگی میں یہی ایک اُلجھن بچی تھی، وہ بھی سلجھ گئی۔ اب تمہیں فیصلہ کر لینا چاہئے۔"

وجدان چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ "کیسا فیصلہ؟"

"دوبارہ گھر بسانے کا فیصلہ۔"

واپس گردن موڑتے ہوئے وجدان سامنے دیکھنے لگا۔

"زندگی میں ایسے شخص کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے جو دُکھ سُکھ بانٹ سکے، تھک جاؤ تو تھکن سمیٹ لے، لڑکھڑاؤ تو ہاتھ تھام لے۔ پھر ابھی تمہاری عمر بھی اتنی نہیں ہوئی کہ تنہائی کو عادت بنا لو۔ اب بھی تمہارے سامنے زندگی کا لمبا سفر باقی ہے۔ یہ سفر اکیلے نہیں کٹ سکے گا۔"

"میں اکیلا کہاں ہوں؟..... میرے پاس شایان ہے۔"

اس کی بات پر مصطفیٰ عظیم بولے۔ "یہ فیصلہ تمہاری ہی نہیں، شایان کی بھی ضرورت ہے۔ اسے ماں مل جائے گی۔ تم کب تک اسے اکیلے سنبھالتے رہو گے؟ بچے پالنا مردوں کے بس کی بات نہیں۔"

وجدان بولا۔ "میں نے اُس وقت بھی شایان کو سنبھالا تھا، جب اس کی ماں پیدائش کے فوراً بعد ہی اسے چھوڑ گئی تھی۔ پھر اب کیوں نہیں سنبھال سکتا؟ پھر کچھ سالوں کی بات ہے، وہ جوان ہو جائے گا، تب تو مجھے اسے سنبھالنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔"

وہ اسے بے بسی سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "شادی مرد کی ضرورت ہوتی ہے وجدان! تم کب تک اس ضرورت سے آنکھ چراؤ گے؟"

"لیکن مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

"تم ملیحہ کو بھول نہیں سکتے؟" کچھ توقف کے بعد انہوں نے پوچھا تو وجدان نے نظر جھکاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "بھول بھی جاؤں تو یاد آتی رہیں گی۔" اور مصطفیٰ عظیم مایوسی سے سر جھٹک کر پلٹ گئے۔ مگر اندر جانے سے پہلے انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وجدان پورچ کی تیز روشنیوں میں گم سم کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر آہ بھرتے وہ اندر چلے گئے۔

❀❀❀

شایان آیا تو سب ہال میں جمع ہو گئے۔

''آؤ تمہاری سب سے جان پہچان کرواؤں۔'' سب سے آفاق اس کا تعارف کروا رہا تھا اور شایان ان رشتوں کو ذہن میں نقش کر رہا تھا۔

رات میں وہ، گوہر اور زارا بچوں کو ان کے مشترکہ کمرے میں سلانے آئیں تو کچھ دیر بعد ہی ارم دودھ کا جگ اٹھائے کمرے میں آگئی۔ زارا کی بیٹی نے کچھ نخرہ تو کیا مگر دودھ بھی پی لیا۔ لیکن گوہر کے بیٹے اور سمیرا کے بچوں نے آرام سے اپنا اپنا دودھ کا گلاس ختم کر لیا تو ارم نے گلاس بھر کر شایان کی طرف بڑھایا اور وہ ناک بند کر کے ''میں نہیں پیوں گا۔'' کہہ کر تکیے میں منہ گھسا کر لیٹ گیا تو ارم پاس بیٹھ کر اسے گدگدانے لگی۔

''دودھ پیئے بغیر کوئی نہیں سو سکتا۔ اُٹھو۔'' اور وہ لیٹے لیٹے ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر انکار میں ہلانے لگا تو سمیرا، ارم کو اشارہ کر کے بولی۔

''دیکھا زارا! شایان، ملیحہ کا بیٹا ہو کر دودھ نہیں پیتا۔''

شایان کے کان کھڑے ہو گئے۔ زارا مسکراہٹ دبا کر بولی۔ ''واقعی، کتنی عجیب بات ہے۔ ملیحہ تو دودھ شوق سے پیتی تھی۔ مگر شایان......''

شایان نے ذرا سی گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا، تبھی ارم بھی بولی۔

''میں تب بہت چھوٹی تھی لیکن مجھے یاد ہے، ملیحہ آپی روز رات کو سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ پیا کرتی تھیں۔''

شایان اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بظاہر اس کی طرف سے انجان بنی خواتین سے بولا۔ ''امی کو دودھ اچھا لگتا تھا؟''

''ہاں۔'' وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر سرسری انداز میں بولیں تو شایان جلدی سے بولا۔

''مجھے بھی دودھ اچھا لگتا ہے۔'' اور خود ہی ارم کے ہاتھ سے گلاس لے کر غٹا غٹ چڑھا گیا۔ پھر گلاس واپس کر کے ہاتھ کی پشت سے منہ پونچھنے کے بعد آرام سے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان چاروں کے چہرے ہنسی روکنے کی کوشش میں سرخ ہو گئے تھے۔

❁❁❁

اگلی صبح افتخار حسن فجر کی نماز کے لئے گھر سے نکلنے لگے تو انہوں نے دیکھا کہ شایان گیٹ کے پاس بنے سنگی بینچ پر چڑھ کر بیٹھا ہے۔ رات تو انہوں نے شایان کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا مگر اس وقت حیرت کے زیر اثر اس کے پاس چلے آئے۔

''تم اتنی صبح جاگ گئے اور اتنی ٹھنڈ میں باہر کیوں آئے ہو؟''

''نماز پڑھنی ہے بڑے نانا! مگر مجھے پتہ ہی نہیں، مسجد کدھر ہے۔''

چھوٹے بچے کے منہ سے ایسی بات سن کر انہیں بے اختیار اس پر پیار آ گیا تھا۔ مگر اپنے انداز سے انہوں نے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا اور سپاٹ آواز میں بولے۔

"میں بھی نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ آ جاؤ۔"

اور وہ "جی بڑے نانا!" کہتا چھلانگ لگا کر بینچ سے اُترا اور پاس آ کے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ افتخار حسن اُسے
اتھ لے کر چل پڑے۔ جاتے ہوئے وہ پورا راستہ باتیں کرتا رہا۔ مگر جب نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آئے تو
ار حسن نے محسوس کیا کہ وہ چپ چاپ سا ہے۔ اسے دیکھ کر دل پر بوجھ آ پڑا تھا۔ اندرونی دروازے کے
ہنے دالان میں سمیرا کی امی تخت پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ شایان نے گیٹ سے اندر
تے ہی افتخار حسن کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چلتا ہوا تخت کے پاس آیا اور چپل اُتار کر تخت پر چڑھتا وہ بڑی نانی کی
د میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ انہوں نے آیت مکمل کی اور قرآن بند کرتیں اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ
یرنے لگیں۔

"کیا بات ہے، اُداس لگ رہے ہو۔"

"بڑے نانا مجھ سے ناراض ہیں۔" وہ اس طرح سے بولا کہ سمیرا کی امی مسکرانے لگیں۔

"وہ تم سے ناراض نہیں ہیں۔"

"مجھے پتہ ہے وہ ناراض ہیں۔ وہ مجھ سے بات نہیں کر رہے۔ اور مجھے گود میں لے کر پیار بھی نہیں کیا۔"

"میں جو تمہیں گود میں لے کر بیٹھی ہوں۔ اور چھوٹے نانا رات کو ہمارے بیٹے کے لئے جہاز بھی تو لائے
ہے۔ تمہیں اچھا لگا تھا نا؟" وہ اُسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ ضد سے بولا۔

"لیکن مجھے بڑے نانا کی گود میں بیٹھنا ہے۔"

"تو جاؤ، جا کر بیٹھ جاؤ۔"

شایان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ فوراً تخت سے اُترا اور اندر بھاگ گیا۔ دروازے پر رک کر اس نے
انکا۔ افتخار حسن چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے بیٹھے تھے۔ وہ دبے پاؤں چلتا آیا، پھر ایک دم سے اخبار
کے نیچے سے گھس کر ان کی گود میں جا چڑھا اور افتخار حسن "ارے ارے" ہی کرتے رہ گئے۔

"آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں بڑے نانا! میں نے تو کوئی شرارت بھی نہیں کی۔" وہ ان کے گلے میں
د حمائل کئے اتنے لاڈ سے بول رہا تھا کہ افتخار حسن خود ساختہ اجنبیت کو قائم نہ رکھ سکے اور مسکرا کر بولے۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں بلکہ تم اتنے اچھے بچے ہو کہ تم سے کوئی بھی ناراض نہیں ہو سکتا۔"

"میں بھی اخبار پڑھوں گا۔" اور ان کی گود میں پھیل کر بیٹھ گیا۔ ناچار انہوں نے اخبار سیدھا کیا مگر پڑھ نہ
ئے۔ کیونکہ شایان ٹوٹے پھوٹے ہجے کرتا بلند آواز میں غلط پڑھ رہا تھا۔ سمیرا کی امی، شایان کو دیکھنے اندر
یں تو شایان، افتخار حسین کی گود میں بیٹھا انہیں اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔

"یہ کیا چل رہا ہے؟"

"خبریں سنائی جا رہی ہیں۔" افتخار حسن نے کہا پھر ہنستے ہوئے بولے۔ "میں نے اخبار میں اتنے مزے کی

خبریں کبھی نہیں پڑھیں جیسی یہ سنا رہا ہے۔ تم بھی آکر سنو۔"

ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ بولیں۔

"آخر شایان نے آپ کو منا ہی لیا۔"

انہوں نے لب بھینچ کر مسکراہٹ روک لی، پھر اُلجھ کر بولے۔ "لگتا ہے اس میں کوئی مقناطیس فٹ ہے جو دل اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ اور کل سے تو ایک عجیب سی بات ہو رہی ہے۔ میں جتنی بار اس کا چہرہ دیکھتا ہوں، اس میں ملیحہ کی جھلک نظر آتی ہے۔"

وہ سانس بھر کر بولیں۔ "ملیحہ سے محبت بھی تو بہت کرتا ہے۔ اور انسان جس سے محبت کرے، اس کا عکس بن جاتا ہے۔ پھر ہمیں ملیحہ اور وجدان کے سوا اور کوئی حوالہ بھی تو معلوم نہیں۔ اس کے وجود میں تلاش کیا تو وہی دونوں نظر آئیں گے۔ اس میں عجیب کیا ہے؟" افتخار حسن کا دل ہی اچاٹ ہو گیا۔

❁❁❁

شایان کو یہاں آئے سات دن ہو چکے تھے۔ شروع کے دو تین دن تو اس کی شوخیوں کا وہی عالم رہا۔ پھر دھیرے دھیرے اُداس ہوتا چلا گیا۔ بات یہ تھی، ان سات دنوں میں وجدان ایک بار بھی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اور جب وہ آفاق سے گھر جانے کے لئے کہتا تو وہ بھی کوئی جواب نہ دیتا۔ آج سمیرا اسے رات کے کھانے کے لئے بلانے آئی تو وہ بستر پر بیٹھا رو رہا تھا اور سمیرا کے لاکھ چپ کرانے پر بھی چپ نہیں ہوا۔ وہ پریشان سی اُٹھ کر آفاق کے پاس آگئی جو سب کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تھا۔

"آفاق! کھانا بعد میں کھا لیجئے گا۔ پہلے شایان کو اس کے گھر چھوڑ کر آئیں۔ وہ بہت رو رہا ہے۔"

"لیکن رو کیوں رہا ہے؟" افتخار حسن نے حیرت سے پوچھا تو آفاق بولا۔

"وجدان کی یاد آرہی ہو گی۔ اس سے ملنے بھی تو نہیں آیا۔ پھر خود سے فون بھی نہیں کرتا۔ میں ہی شایان کی اس سے بات کرا دوں تو کرا دوں۔ لیکن آفس میں بار بار فون کر کے کہتا ہے، شایان کو بھیج دو۔"

اس کی بات پر منیر حسن بھی پریشانی سے گویا ہوئے۔

"کئی دن سے آفس بھی نہیں آرہا۔ کل تو میں نے اس سے فون پر بھی کہا تھا کہ آفس آجائے، ڈاکومنٹس اسے ہینڈ اوور کرنے ہیں۔ مگر وہ آیا ہی نہیں۔ آفاق! پتہ تو کرو، کہیں بیٹے کی جدائی میں بیمار نہ پڑ گیا ہو۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔" آفاق بولا۔ "لیکن میں جانتا ہوں وہ آپ دونوں کے سامنے آنے سے کترا رہا ہے۔ ورنہ وہ کبھی بھی شایان کے بغیر اتنے دن نہ گزارتا۔"

اس کی امی بولیں۔ "تم اسے چھوڑ ہی آؤ۔ بچہ کتنی بار کہہ چکا ہے، گھر جانا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں وجدان خود اسے لینے آئے تاکہ اس کا گریز ختم ہو۔" پھر اس نے سمیرا سے کہا۔ "جاؤ شایان کو لے کر آؤ۔ اور آتے ہوئے فون بھی لیتی آنا۔"

کچھ دیر بعد وہ شایان کے ساتھ لوٹی تو آفاق اس سے بولا۔ ”ابو یاد آ رہے ہیں؟“
اس نے ناک سڑکتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا اور رونے لگا۔ آفاق اسے کندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے بولا۔ ”ابھی میں ابو کو فون ملاؤں گا اور تم یہی بات ان سے کہنا۔“
شایان نے روتے روتے پھر سے سر ہلا دیا تو آفاق، سمیرا کے ہاتھ سے کارڈلیس لے کر نمبر ملانے لگا۔ پھر وجدان کی آواز سنتے ہی اس نے فون شایان کو پکڑا دیا جو فون پکڑتے ہی ”ابو!“ کہہ کر اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔

وجدان خود بہت بے چین تھا۔ پہلی بار شایان اس کی آنکھوں سے دُور ہوا تھا۔ روز ہی آفاق کو فون کر کے کہتا کہ شایان کو بھیج دے مگر آفاق سنی ان سنی کرتا رہا۔ خود اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی، آفاق کے پاپا یا تایا کا سامنا کر پاتا۔ بلکہ وہ تو آفاق کے گھر کے کسی بھی فرد سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ زبردستی ایسی چیز پر ملکیت کا حق جتا رہا ہو، جس پر اس کا کوئی استحقاق نہیں۔ مگر شایان کی آواز پر وہ پگھل گیا تھا۔
”آپ یاد آ رہے ہیں ابو!...... آ کر لے جائیں۔“
”تم بھی مجھے بہت یاد آ رہے ہو۔“ وجدان ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔
”ابو! مجھے یہاں سے لے جائیں۔“ وہ بار بار ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔
”میں آ رہا ہوں میری جان! بس تم رونا بند کر دو۔“ وجدان کی بے چینی کو محسوس کر کے شایان آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں بھرّائی آواز میں بولا۔
”جلدی آئیے گا۔“
”بس تم فون رکھو۔ میں دو منٹ میں آ رہا ہوں۔“ وجدان نے کہنے کے ساتھ ہی فون بند کر دیا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر تیزی سے باہر لپکا۔
شایان کی پکار اس کے سب احساسات پر بھاری تھی اور وہ فل اسپیڈ سے گاڑی بھگاتا آناً فاناً آفاق کے گھر آ پہنچا۔ وجدان نے ہال میں قدم رکھا تو سامنے ہی افتخار حسن اور منیر حسن، شایان کو ساتھ لئے صوفے پر بیٹھے تھے۔ باقی لوگ بھی وہیں موجود تھے اور شایان کو دلاسے دے رہے تھے جو ابھی تک رو رہا تھا۔
”شایان!“ وجدان نے اس پر نظر پڑتے ہی پکارا۔ شایان نے آواز کی سمت دیکھا، پھر ”ابو آ گئے۔“ کہتا بندوق سے نکلی گولی کی طرح اُٹھ کر وجدان کی طرف دوڑ پڑا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر گھٹنے زمین پر ٹکا کر بیٹھتے ہوئے وجدان نے اپنی بانہیں کھول دیں اور شایان دوڑتا ہوا آ کر ان میں سما گیا۔ دیکھنے والوں کو لگ رہا تھا جیسے دونوں برسوں بعد ملے ہوں۔ وجدان اسے بے تحاشا چوم رہا تھا اور شایان اس سے لپٹتا جا رہا تھا۔
پھر وجدان کا دھیان سب کی طرف گیا جو اس کے گرد گھیرا ڈالے مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''السلام علیکم!'' شایان کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوتے اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا تھا۔

''تم آفس کیوں نہیں آرہے؟'' منیر حسن کڑے تیور سے بولے تو وجدان سٹپٹاتا ہوا ''انکل! وہ میں.....'' کرنے لگا تو انہوں نے کہا۔

''بس رہنے دو۔ مجھے پتہ چل گیا ہے، تم کبھی نہیں سدھرو گے۔ میری بھانجی نہیں رہی تو کیا ہوا، اس کا بیٹا جو ہے جس کے نام پر تم جی بھر کے اوٹ پٹانگ حرکتیں کر سکتے ہو۔''

وجدان خفیف سا مسکراتے ہوئے گدی مسلنے لگا۔ تبھی اس کی نظر افتخار حسن پر پڑی اور بلا ارادہ ہی اُس نے رُخ پھیرتے ہوئے چہرہ چھپانا چاہا۔

''کیا ساری عمر چہرہ چھپاتے رہو گے؟''

وجدان نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر نرم سے تاثر نے اسے شرمندہ کر دیا۔

''میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس فسانے کو سن کر آپ کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔''

''اب اس ذکر کو جانے دو۔ یوں بھی تقدیر کی بس ایک لکیر ہی درمیان میں ہے۔ ورنہ یہ فسانہ ملیحہ کی داستانِ حیات بھی ہو سکتا تھا۔'' وہ متانت سے بول کر چپ ہوئے تو سمیرا کی امی، وجدان کا بازو تھام کر بولیں۔

''اب یوں کھڑے نہ رہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔''

وہ فوراً ہی معذرت کرنے لگا۔ ''سوری خالہ! بیٹھ نہیں سکتا۔ میں گھر میں کسی کو بتا کر نہیں آیا۔ سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''آئے ہو تو ڈاکومنٹس لے جاؤ۔'' اسے جاتے دیکھ کر منیر حسن جلدی سے بولے۔ ''آفاق کے ساتھ جاؤ۔ وہ تمہیں بتا دے گا۔'' ساتھ آفاق کو اشارہ کیا۔ وہ سر ہلاتا وجدان کو آنے کا کہہ کر اسٹڈی کی طرف چل پڑا۔ اندر آ کر وہ چلتا ہوا ٹیبل کے پاس آ رکا اور فائل میں سے کچھ کاغذات دیکھ کر نکالنے لگا۔ وجدان بھی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ آفاق نے ایک کاغذ نکال کر وجدان کی طرف بڑھاتے ہوئے سنجیدہ چہرے کے ساتھ کہا۔

''یہ شایان کا برتھ سرٹیفکیٹ ہے جس میں شایان کے ماں باپ کی حیثیت سے وجدان اور ملیحہ فاروقی کے نام درج ہیں۔ اور اس برتھ سرٹیفکیٹ میں شایان کی تاریخ پیدائش وہی درج کی گئی ہے جو ملیحہ کی اصل تاریخ وفات ہے۔''

وجدان نے سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ سرٹیفکیٹ آفاق سے لے کر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کے بعد آفاق نے ایک اور کاغذ اس کے ہاتھ میں دیا۔ وجدان نے اس کاغذ پر نظر ڈالی اور ہکلاتا ہوا بولا۔

''یہ...... یہ تو.......''

''نکاح نامہ ہے۔'' آفاق اس کی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔ ''اس پر ملیحہ کے دستخط بھی موجود ہیں جو

ہنڈ رائٹنگ ایکسپرٹ سے کروائے گئے ہیں اور انہیں جعلی ثابت کرنا آسان نہیں۔ گواہوں کے طور پر میں، پاپا، تایا اور صمد سائن کر چکے ہیں۔ تم بھی دستخط کر دینا۔ اس کے بعد اگر شایان کے اصل ماں باپ بھی کہیں سے آ گئے تو برتھ سرٹیفکیٹ اور نکاح نامے کی موجودگی میں تمہیں شایان پر اپنا حق ثابت کرنے کے لئے کسی بھی گواہی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کیونکہ اب قانونی طور پر ملیحہ تمہاری مرحومہ بیوی اور شایان تم دونوں کی اولاد ہے۔“

وجدان کے دماغ میں بگولے اُٹھ رہے تھے اور کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اسے ملیحہ کے ساتھ ہوئی پہلی ملاقات یاد آنے لگی۔ اور اپنا پہلا جملہ جو اس نے ملیحہ سے کہا تھا...... وہ جملہ جو ایک سوال تھا۔ ”آپ مجھ سے شادی کریں گی؟“

مگر اس سوال کو جواب نہ مل سکا اور اس ملال نے ایک عمر وجدان کے جنون کو سرگرداں کیئے رکھا...... یہ دکھ وجدان کو عزیز بھی بہت تھا۔ یہ دُکھ ہی تو اس کی چاہت کا صلہ تھا...... یہ دکھ ہی اس کی عمر کا حاصل تھا۔ اور آج جدان کے ہاتھ میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا کہہ رہا تھا کہ ملیحہ، وجدان کی بیوی تھی اور شایان سے اس کے تعلق کا ثبوت مذاق......اور ایسا مذاق وجدان کو لگ رہا تھا کہ اس کا ملال، اس کی جاگیر اس سے چھین لی گئی ہے۔ اب وہ کسے جا کر کہہ سکے گا کہ اس نے محبت میں خسارہ اُٹھایا ہے۔ لب آزاد ہوں تو درد کو جھیلنا کچھ سہل ہو جاتا ہے مگر وجدان کو درد کے دلدل میں اُتار کر طاقتِ فریاد چھین لی گئی تھی۔ وجدان کو لگا، اس کی ناکام آرزوؤں کو تماشا بنا دیا گیا ہے۔ یہ تضحیک اس کی برداشت سے باہر تھی۔ خالی ہاتھ رہ جانا ہمیشہ تکلیف دیتا ہے لیکن جس کے دامن میں صرف دکھ ہو، پھر اگر وہ بھی اس سے چھن جائے تو...... یہ چارہ گری کسے بھائے گی؟

ایک مدت سے وجدان نے آنسوؤں کو پلکوں کی سلاخوں میں قید کر رکھا تھا لیکن آج وجدان نے انہیں آزادی کی نوید دے دی۔ اب وہ پھوٹے چلے آ رہے تھے مگر وجدان ہنس رہا تھا۔ وہ تقدیر کے اس مذاق پر قہقہے لگا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھیگتا جا رہا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا، ہنستے ہنستے اس کے ہونٹوں سے قہقہوں کی جگہ آہ و بکا نکلنے لگیں۔ وہ اس کاغذ کو دیکھ دیکھ کر ٹوٹنے لگا۔ اس نے سر کو اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا جیسے اس کی نگاہیں سیدھی آسمان تک جا پہنچیں گی اور آنسوؤں کے بیچ پکارا۔

”اللہ......“ اُس کی آواز میں ڈھیروں شکوے تھے۔

مگر عرش سے وہی خاموشی سنائی دی، جیسے اللہ کہہ رہا ہو۔ ”جو میری رضا۔“

اور وجدان نے سر جھکا دیا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے درد برداشت کرنے کی کوشش میں بے دم ہو کر فرش پر بیٹھ گیا۔

”میرے زخم بھر جانے دے اللہ!...... میرے زخم بھر جانے دے۔“ دونوں بازو سر پر رکھے وہ پھوٹ

چھوٹ کر روتا ہوا کہتا جا رہا تھا۔

❁❁❁

سمیرا چپ ہوئیں تو اُنہیں بے تحاشا تھکن کا احساس ہوا۔ یہ تھکن صرف اس لئے نہیں تھی کہ وہ مستقل کئی گھنٹوں سے بول رہی تھیں بلکہ ماضی کے پُر خار راستوں پر ننگے پاؤں چلنے کا نتیجہ تھی۔ وہ راستے بے شک ان کا نصیب نہیں تھے مگر جن کے تھے، ان کے پاؤں کے زخم انہوں نے انگلیوں پر شمار کئے تھے۔ انہیں اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہوا تو بیڈ پر بیٹھے بیٹھے ہی انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور گلاس ہونٹوں سے لگا کر حلق تر کرنے کے بعد گلاس میں جھانکتی ہوئی بولیں۔

''آج دیکھنے والی آنکھیں جسٹس وجدان مصطفیٰ کو رشک سے دیکھتی ہیں۔ کون ایسا خوش نصیب ہوگا جسے زندگی میں اتنی کامیابیاں ملی ہوں کہ جو بھی چاہا، آخر اسے پا لیا۔ عزت، شہرت، دولت...... اور محبت بھی۔ کیونکہ دنیا تو یہی دیکھتی ہے کہ وجدان نے جس لڑکی سے محبت کی، وہ اس کی بیوی بن گئی۔ جی نہ سکی، یہ اور بات ہے۔ مگر وہ ان چند خوش نصیبوں میں سے ہے جن کی محبت تکمیل کو پہنچتی ہے اور اس محبت کی حسین یادگار ہے شایان مصطفیٰ۔

جوان بیٹے کا باپ ہونا اپنے آپ میں خوش بختی ہے۔ اور بیٹا اگر اے ایس پی شایان مصطفیٰ ہو تو کیا کہنے۔ ذہانت اور وجاہت تو اسے ماں باپ سے ورثے میں ملی ہے۔ اور اس کی سعادت مندی اور فرماں برداری یقیناً وجدان کی تربیت کا نتیجہ ہے جس نے صحیح معنوں میں محبوبہ بیوی کی نشانی کو سینے سے لگا کر رکھا۔ لوگ وجدان کو دیکھتے ہیں تو رشک سے سوچتے ہیں، کاش انہیں بھی ایسی قسمت مل جائے۔ مگر میں ہر بار وجدان کو دیکھ کر یہی دعا کرتی ہوں کہ اس جیسی قسمت اللہ کسی کو نہ دے۔'' انہوں نے سر اٹھا کر تانیہ کو دیکھا جو دیوار کے ساتھ کمر ٹکائے کارپٹ پر بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے اس کا چہرہ آنسوؤں سے دُھلا تھا۔

''وجدان کی زندگی میں قیامتیں بہت آئی ہیں۔ آج یومِ حساب بھی آ گیا۔ مجھے ڈر ہے کہیں اسے گناہ گار نہ ٹھہرا دیا جائے۔'' وہ خوفزدہ سی کہہ رہی تھیں۔ تانیہ نے کچھ بھی نہ کہا اور پیشانی ہاتھوں کی پشت پر ٹکا دی۔

❁❁❁

وجدان، بابا جان اور نور الہدیٰ کے سامنے ہاتھ باندھے یوں کھڑے تھے جیسے احتساب کے کٹہرے میں لائے گئے ہوں اور اعترافِ جرم کے بعد ان کے چہرے پر سزا کا انتخاب انتظار تھا۔ مگر محتسب ان کی زندگی کا حساب کتاب جو کرنے لگے تو مخمصے میں پڑ گئے۔ ان کے چہروں پر فیصلے کی ہچکچاہٹ تھی۔ وجدان نے جھکی نظر اُٹھا کر بابا جان کو دیکھا مگر ان کے چہرے پر کچھ پڑھ نہ سکے۔ پھر بھاری آواز میں بولے۔

''میں اپنی خطا کی کوئی وضاحت نہیں دوں گا، نہ اپنی عمر کی رائیگانی دکھا کر آپ سے کوئی رعایت مانگوں گا۔ مجھے سزا دیجئے بابا جان!''

بابا جان ایک گہری نگاہ ان پر ڈال کر بولے۔

"میں تمہیں سزا تو دینا چاہتا ہوں مگر پھر مجھے ملیحہ سے معافی کون دلائے گا؟ میری بیٹی میں انصاف کی خوبی نہیں۔ وہ تمہارے معاملے میں ہمیشہ جانبدار رہے گی۔"

وہ ایسے بولے جیسے ملیحہ کی اس کمزوری پر افسوس کر رہے ہوں۔ ان کی طرف سے نا اُمید ہو کر وجدان، نورالہدیٰ کی طرف مڑے۔

"آپ ہی سزا دے دیجئے ہادی بھائی! آپ کا تو حق بھی بنتا ہے۔ ملیحہ منگیتر تھیں آپ کی۔ زندگی نے بیوی بننے کی مہلت نہیں دی مگر وہ آپ کے لئے دُلہن تو بنی ہی تھیں۔"

نورالہدیٰ گمبھیر لہجے میں بولے۔ "مجھ سے سزا نہ مانگو وجدان! میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔ میں نے ملیحہ سے زیادہ محبت کسی سے نہیں کی۔ مگر میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا، ملیحہ نے سب سے زیادہ تمہیں چاہا تھا۔ تمہاری خطا تو وہ سنتے ہی معاف کر دے گی، مگر تمہیں سزا دینے والے کو معافی نہیں ملے گی۔"

پھر وجدان بولے تو ان کی آواز پہلے سے بھی بھاری ہو گئی۔ "ملیحہ وہ پہلی اور آخری لڑکی تھیں، جنہیں دیکھ کر ان کے ساتھ زندگی جینے کا خیال آیا تھا۔ مگر میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا کہ انہوں نے جسے ہم سفر بنانے کا فیصلہ کیا، وہ آپ تھے۔ آپ بے خوف ہو کر سزا سنائیے۔ کیونکہ جس دن معافی نامے جاری ہونے لگے، وہ مجھ سے پہلے آپ کو معاف کر دیں گی۔"

نورالہدیٰ نے نظر جھکا لی، پھر اُٹھ کر ان کے پاس آ گئے۔

"ضد کر رہے ہو تو سزا دے ہی دیتا ہوں۔ اور سزا یہ ہے کہ تم اپنے ٹوٹے خواب کی کرچیاں عمر بھر اپنے انہی ہاتھوں میں سمیٹتے رہو۔"

"ہادی بھائی!" وجدان نے حیرت میں گھر کر پکارا تھا تو نورالہدیٰ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر عاجزی سے کہا۔

"آج تک تم ہر کسی سے درخواست کرتے آئے ہو، یہ بات اپنی زبان پر نہ لائیں کہ شایان تمہارا بیٹا نہیں۔ آج میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ کبھی یہ بات اپنی زبان پر نہ لانا کہ شایان، ملیحہ کا بیٹا نہیں۔"

"نورالہدیٰ!" بابا جان نے ان کی بات سنی تو بل کھا کر رہ گئے۔ "یہ فیصلہ تم نہیں کر سکتے۔"

نورالہدیٰ ان کی طرف پلٹ کر بولے۔ "پلیز بابا جان! تانیہ نے کہا نہیں، مگر کل جب وہ کہہ رہی تھی کہ شایان کو بھول جائے گی، میں اسی وقت سمجھ گیا، وہ شایان کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ میرا ظرف اتنا بڑا نہیں ہے مگر تانیہ کی خوشی کی خاطر میں اس کا ہاتھ ایک بے نشان شخص کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ مگر یہ سچ دنیا کو سنا کر میں اپنی بیٹی کا تماشا نہیں بنا سکتا۔"

"نورالہدیٰ! تم....." وہ ناگواری سے کچھ بولنے لگے تھے کہ نورالہدیٰ نے انہیں بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''آپ کی بیٹی مرچکی ہے بابا جان! میری بیٹی کو نہ ماریں۔''

بابا جان چپ سے ہو گئے۔ پھر اُٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔ وجدان نے انہیں جاتا دیکھا تو دلگرفتہ سے ہو گئے۔ وہ یاسیت بھری نگاہوں سے اس دروازے کو دیکھ رہے تھے، جس سے بابا جان گزر کر گئے تھے کہ نورالہدیٰ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں شایان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' وجدان پلٹ کر انہیں دیکھنے لگے تو انہوں نے مزید کہا۔ ''کل اسے اپنے ساتھ لے آنا۔''

وجدان گم سم سے ہو گئے تو نورالہدیٰ نے کہا۔ ''کیا ہوا وجدان؟''

وہ بولے۔ ''آج جب میں نے قصرِ فاروقی میں قدم رکھا تھا تو لگا، میں مقتل میں آ گیا ہوں اور زندگی کچھ پلوں کی مہمان ہے۔ یہ تو سوچا بھی نہیں تھا، مقتل مجھے زندگی بخش دے گا۔ تھینک یو ہادی بھائی!''

نورالہدیٰ خفیف سا مسکرا کر بولے۔ ''اسی قصرِ فاروقی نے ایک بار تمہاری زندگی چھینی بھی تو تھی۔ آج اگر بخش دی تو شکریہ کس بات کا؟ یہ تمہارا ہم پر قرض تھا جو آج اُتر گیا۔ مگر ستائیس سالوں سے اس قرض پر جو سود چڑھتا رہا، وہ ابھی باقی ہے۔ وہ سود مجھے معاف کر دو۔ مجھ میں اسے چکانے کی سکت نہیں۔'' ان کی آواز میں ندامت اور ملال کی آمیزش تھی جس نے وجدان کو مضطرب کر دیا۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں ہادی بھائی؟ آپ تو شروع سے ہی لاعلم تھے۔''

''اس لاعلمی کی تو سزا کاٹ رہا ہوں، ستائیس سالوں سے ایک پھانس دل میں چبھ رہی ہے۔'' کرب سے ہونٹ کاٹتے انہوں نے سختی سے آنکھیں میچ کر پلکوں پر آئی نمی کو اندر اُتارا اور کہا۔ ''کاش! میں ہمیشہ لاعلم رہتا۔''

ان کی اذیت کو محسوس کر کے وجدان نے سر جھکا لیا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

تانیہ نے لاؤنج میں قدم رکھا تو سامنے عذیر اور عمیر سر جوڑے بیٹھے تھے اور آہٹ پر سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا کھسر پھسر کر رہے تھے؟'' تانیہ نے اردگرد نگاہ گھماتے محتاط انداز میں کہا۔ ''انکل چلے گئے؟''

''ہاں۔'' عذیر نے کہا پھر جوش میں کہنے لگا۔ ''آپ کو پتہ ہے آپی! وہ انکل کون تھے؟''

تانیہ نے ٹھٹک کر پوچھا۔ ''کون تھے؟''

عذیر اُٹھ کر ان کے پاس آتا بولا۔ ''ان کا نام وجدان مصطفیٰ ہے۔ اور وہ جو لڑکی ہے نا...... وہی، جن کی تصویر دادا جان کے کمرے میں لگی ہے، وہ دادا جان کی بیٹی تھیں۔ ان کا نام ملیحہ تھا اور وجدان انکل، ملیحہ آنٹی کے شوہر ہیں۔ اور دادا جان بھی ہمارے دادا نہیں ہیں، وہ پاپا کے چچا ہیں۔''

''واٹ ربش۔'' تانیہ ناگواری سے بولی۔ ''وہ پاپا کے بابا ہوں یا چچا، ہمارے دادا ہی ہیں۔''

"ہاں وہ تو ہے۔" عذیر ہکلایا پھر چڑ کر بولا۔ "اچھا نا، بات تو سن لیں۔" اور تانیہ مطمئن سی بولی۔

"ہاں بھئی سناؤ۔"

اور وہ کہنے لگا۔ "ملیحہ آنٹی نے وجدان انکل کے ساتھ لو میرج کی تھی، اسی لئے دادا جان ان سے ناراض ہوگئے۔ پھر آنٹی کی بھی ڈیتھ ہوگئی تو دونوں فیملیز میں رابطہ ہی ختم ہوگیا۔ لیکن اب وجدان انکل اچانک ہی دادا جان سے ملنے آ گئے۔ دراصل وہ چاہتے ہیں کہ اب دادا جان ان سے ناراضی ختم کر کے انہیں فیملی ممبر کے طور پر قبول کرلیں۔"

عذیر کی باتوں سے تانیہ کا اطمینان بڑھتا گیا۔ وجدان کی زندگی کا یہ طوفان دبے پاؤں گزر گیا تھا۔

"کاش یہ سکون مستقل ہو۔" اس نے دل سے دعا کی۔ تبھی عمیر پاس آ کر جھنجلاہٹ سے بولا۔

"بے کار کی باتیں کئے جاؤ، اصل بات تو بتاؤ۔"

"کون سی بات؟" تانیہ چونکی۔

"پاپا چاہتے ہیں کہ آپ کی شادی وجدان انکل کے بیٹے کے ساتھ کر دی جائے۔"

تانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اس خبر کی توقع بھی نہیں کر رہی تھی۔ نورالہدیٰ اور بابا جان کے سچ جان لینے کے بعد اسے اتنا تو اندازہ تھا کہ نورالہدیٰ، وجدان کو سپورٹ کریں گے مگر وہ سب جان کر بھی شایان کو قبول کرلیں گے، تانیہ کو اُمید بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوئے ہیں تو صرف اس کی خاطر..... اسے اپنے پاپا پر ڈھیروں پیار آ گیا۔ ہولے سے مسکرا کر اس نے پوچھا۔

"پاپا کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں۔ لیکن آپ وہاں مت جائیں۔" عمیر کی بات سنتے ہی وہ نورالہدیٰ کے کمرے میں جانے کے لئے پلٹی تو عمیر جلدی سے بولا۔

"کیوں؟" تانیہ نے اسے حیران ہو کر دیکھا۔

"آپ کی شادی والی بات پر ماما کا پاپا سے جھگڑا چل رہا ہے۔"

"کیوں؟" تانیہ نے پھر سے کہا۔ بعد میں اسے احساس ہوا کہ اسے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ عمیر بھی ان کے کیوں پر گڑبڑا کر سوچتا ہوا بولا۔

"شاید اس لئے، وہ شایان بھائی کو نہیں جانتی ہیں اور وہ پہلے سے ہی انصر بھائی کو آپ کے لئے پسند بھی کر چکی ہیں۔" پھر اس نے تانیہ کی طرف دیکھا اور شرارت سے بولا۔ "لیکن آپ تو انہیں جانتی ہیں۔ بابا بتا رہے تھے کہ آپ کی فرینڈ فائزہ کے پیرنٹس، ملیحہ آنٹی کے کزنز تھے اور وجدان انکل کا ان کی فیملی کے ساتھ کافی اسٹرونگ ریلیشن ہے۔ اور آپ ان کے گھر شایان بھائی سے مل چکی ہیں۔"

ہاں لیکن مجھے باقی باتوں کا علم نہیں تھا۔" اس نے جلدی سے کہا پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔

نورالہدیٰ کے کمرے سے جھگڑا کرنے کی دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں۔ تانیہ جانتی تھی کہ اس جھگڑے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس نے بس ایک پل کو سوچا، پھر دستک دیئے بغیر دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی۔

''بھول جاؤ نورالہدیٰ! میں تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے دوں گی۔'' مریم کسی بات پر تنفر سے کہہ رہی تھیں۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھیں، غصے کی زیادتی سے ان کا تنفس بگڑا ہوا تھا اور چہرے کے نقوش جن میں ہمیشہ نرمی گھلی رہتی تھی، کھردرے سے لگ رہے تھے۔ نورالہدیٰ ایک جانب رکھی کرسی پر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بے بس سے بیٹھے تھے۔ دونوں دروازہ کھلنے کی آواز پر بیک وقت تانیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسے دیکھتے ہی نورالہدیٰ تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

''تانیہ! تم یہاں سے جاؤ۔''

''سوری پاپا! مگر میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ دھیمی آواز میں کہہ کر مریم سے بولی۔ ''ماما! میں جانتی ہوں، آپ پاپا سے کیوں جھگڑا کر رہی ہیں۔ پلیز آپ پاپا کو ہرٹ مت کریں۔''

''تم کچھ نہیں جانتیں۔'' وہ قطعیت سے بولیں۔ ''تمہیں پتہ ہے، تمہارے پاپا، شایان مصطفیٰ کے ساتھ تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں ہرگز یہ نہیں ہونے دوں گی۔''

ان کا لہجہ اتنا اٹل تھا کہ تانیہ گھبرا اُٹھی اور نورالہدیٰ کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''پلیز ماما! پاپا نے اگر فیصلہ کیا ہے تو سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔''

مگر مریم ذرا متاثر نہیں ہوئیں۔

''شایان، ملیحہ فاروقی کا بیٹا ہے، جس کے نام پر نورالہدیٰ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ فیصلہ کیا سوچ سمجھ کر کرے گا؟''

''چپ ہو جاؤ مریم!'' تانیہ کی موجودگی میں نورالہدیٰ خجل ہو گئے تو مریم نے چمک کر کہا۔

''واہ! ابھی سے چپ ہونے کو کہہ رہے ہو۔ ابھی تو میں نے تانیہ کو یہ بتایا ہی نہیں کہ اس کا باپ شایان کی ماں سے ہمیشہ محبت کرتا رہا اور آج بھی کرتا ہے۔''

''فار گاڈ سیک مریم! بیٹی کے سامنے تو زبان قابو میں رکھو۔'' وہ جھنجلا کر بولے تو مریم طنز سے مسکرانے لگیں۔

''کمال ہے۔ میرے سامنے تو بے دھڑک ملیحہ سے عشق کا اعتراف کرتے ہو اور اگر یہی بات میں نے بیٹی سے کہہ دی تو تمہیں میری زبان کی فکر ہو گئی ہے۔'' تانیہ کے سامنے مریم کے طنز انہیں بے چین کر رہے تھے مگر وہ کسی طرح چپ نہ ہوئیں تو نورالہدیٰ ضبط کی انتہا پر تانیہ سے بولے۔

''تانیہ! تم اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔''

''جی پاپا!'' تانیہ ان کی خجالت محسوس کر کے جلدی سے کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ مریم نے اس کا بازو پکڑ لیا اور لفظ چبا چبا کر بولیں۔

''تانیہ کہیں نہیں جائے گی۔''

نورالہدیٰ نے خود کو بے چارگی کی انتہا پر محسوس کیا۔ ''میرے صبر کا امتحان مت لو۔''

''صبر کا امتحان تو تم لیتے آئے ہو نورالہدیٰ! پچیس سالوں سے میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں جو کسی اور کا دم بھرتا ہے۔ میں نے اپنا سب کچھ تمہیں بخش دیا، پھر بھی تم میرے نہ ہوئے، ہمیشہ اسی کے رہے جو تمہیں چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ نکل بھاگی تھی۔''

''شرم آنی چاہئے تمہیں اس طرح کی بات کرتے ہوئے۔'' نورالہدیٰ نے بھڑک کر کہا۔ جواباً وہ سرد لہجے میں بولیں۔

''کسی دوسرے کی بیوی، کسی کے بچے کی ماں سے عشق کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آنی چاہئے؟''

نورالہدیٰ نے کوفت سے انہیں دیکھا پھر تانیہ سے تیز لہجے میں بولے۔ ''میں تمہیں جانے کو کہہ رہا ہوں تو جاتی کیوں نہیں؟''

اس کا بازو ابھی بھی مریم کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے نورالہدیٰ کی بات سن کر جنونی گرفت اتنی سخت کر لی کہ ان کے ناخن تانیہ کی نرم کھال میں گھس گئے اور چلّا کر بولیں۔

''یہ یہاں سے نہیں جائے گی۔''

''ماما پلیز میرا بازو چھوڑ دیں۔'' تانیہ درد سے بلبلائی تو وہ اس کے بازو کو جھٹکا دے کر سختی سے بولیں۔

''کہہ دیا نا، تم یہاں سے نہیں جاؤ گی۔'' پھر وہ گردن موڑ کر نورالہدیٰ کو دیکھنے لگیں اور کہا۔

''آج مجھے تم پر ترس آ رہا ہے نورالہدیٰ! مجھے یاد ہے، سرکل کی کوئی ایک لڑکی ایسی نہیں تھی جو تم سے شادی نہ کرنا چاہتی ہو۔ مگر جس سے تم شادی کرنا چاہتے تھے، وہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور کی بیوی بن گئی۔ سو سیڈ۔'' وہ ہمدردی جتا کر بولیں تو نورالہدیٰ طیش میں آ گئے۔

''میں نے کبھی ملیحہ کو پانے کی خواہش نہیں کی۔''

وہ ایک دم مشتعل ہو گئیں۔ ''پھر تم کس لئے اُس ڈائن کا سوگ مناتے ہو؟''

تانیہ کو برا لگا تو وہ فوراً انہیں ٹوکنے لگی۔ ''ماما! اتنا تو خیال کر لیں کہ وہ مر چکی ہیں۔''

وہ تیز لہجے میں بولیں۔ ''اسے مرا ہوا مت کہو تانیہ! وہ مرتی ہی تو نہیں۔ اگر مر گئی ہوتی تو آج نورالہدیٰ میرا ہوتا۔ مگر اسے زندہ رہنے کا ایسا لالچ ہے کہ مر کر بھی نہیں مری۔ اس کا وجود اس دنیا سے اُٹھ گیا، پھر بھی وہ دنیا چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ وہ لڑکی نہیں، آسیب ہے جس نے ہر ایک کو اپنے دام میں گرفتار کر رکھا ہے۔ ایک باپ بیٹا میرے گھر میں اس کے عاشق ہیں، ایک باپ بیٹا اس کے گھر میں اس کے نام کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور جانے کون کون ہے جسے اس نے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہو گا۔'' پھر وہ اچانک نورالہدیٰ سے بولیں۔

''اس میں ایسا کیا تھا نورالہدیٰ! جو ہر کوئی اس کی محبت میں مرا جا رہا ہے؟ اس میں کون سی کشش تھی جو کم

نہیں ہوتی؟ کیوں میری محبت اس کی موت کے سامنے بے بس ہے؟'' پھر خود ہی سر جھٹک کر کہا۔

''جنتر منتر پھونکے ہوں گے اُس چڑیل نے۔ ورنہ کون اُس گری ہوئی لڑکی کو یاد کرتا، جو ایک طرف کزن کو اُلو بناتی رہی، دوسری طرف وجدان کو پھانس کر بیاہ رچا لیا۔''

''وہ ایسی نہیں تھیں، جیسا آپ بول رہی ہیں۔ اگر ہوتیں تو کوئی اُنہیں یاد نہ کرتا۔ ہاں، وہ نہیں مریں۔ کیونکہ جو دلوں میں جینے کا ہنر سیکھ لے، اسے موت نہیں مار سکتی۔''

مریم نے یوں تانیہ کو دیکھا جیسے یقین نہ آیا ہو، یہ سب اس نے کہا ہے۔ پھر طنز سے مسکراتیں نورالہدیٰ سے بولیں۔

''مبارک ہو نورالہدیٰ! ملیحہ کے عاشقوں کی فہرست میں نئے نام کا اضافہ ہوا ہے۔'' پھر وہ تانیہ کا بازو جھٹک کر پیچھے ہٹتیں خونخوار لہجے میں بولیں۔ ''تم دونوں اس سے جتنی بھی محبت کرلو، میری نفرت سے جیت نہیں سکتے۔ اور کان کھول کر سن لو! میں کسی قیمت پر ملیحہ کے بیٹے کو اپنی بیٹی کی زندگی میں برداشت نہیں کروں گی۔''

نورالہدیٰ نے سرد سپاٹ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کاٹ دار آواز میں بولے۔ ''تم بھی ایک بات سمجھ لو۔ میں تم جیسی کم ظرف عورت کے لئے اپنی بیٹی کی زندگی داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔'' وہ رُکے، پھر کہا۔ ''میں نے تم سے بہت محبت کی ہے مریم!...... اتنی کہ خود بھی ڈر گیا، کہیں ملیحہ کو نہ بھول جاؤں۔ مگر وہ تم تھیں جس نے کبھی مجھے ملیحہ کو بھولنے نہیں دیا۔ اس کی تصویر ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رکھی۔ لیکن تمہارے اس احسان کے باوجود آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم سے شادی کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔''

وہ اجنبیت سے بول کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے کمرے سے چلے گئے۔

آسمان پر اتنا اندھیرا نہیں تھا، جتنا مریم کی آنکھوں کے سامنے چھا گیا تھا۔ کسی عورت کے لئے اس سے بڑا طمانچہ اور کیا ہو گا کہ اس سے کہا جائے کہ اس کے ساتھ پچیس سال کی رفاقت غلطی تھی۔ وہ گرنے کو تھیں کہ تانیہ نے بڑھ کر انہیں تھام لیا، پھر سہارا دیتی انہیں بیڈ تک لے آئی اور انہیں آرام سے بٹھا کر ان کی کمر کے پیچھے تکیہ لگا دیا۔ وہ سراسیمہ سی تانیہ کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

''تم نے سنا، نورالہدیٰ نے کیا کہا؟ آج اسے مجھ سے شادی کرنا غلطی لگ رہا ہے۔ یہ شخص مجھے اور کتنی تکلیف دے گا؟'' تانیہ نے دیکھا، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ نرمی سے بولی۔

''آپ بھی تو ماما! ایسی بات کے لئے پاپا سے اُلجھتی ہیں جو اُن کے اختیار میں نہیں۔''

''میرا بھی تو خود پر اختیار نہیں۔'' وہ بے بسی سے بولیں۔ ''جتنی شدت سے میں نے نورالہدیٰ کو چاہا، اگر پتھر کو بھی پوجتی تو خدا ہو جاتا۔ لیکن نورالہدیٰ میرا نہ ہوا۔''

''ایسا کیوں سوچتی ہیں ماما! ملیحہ آپ سے پہلے پاپا کی زندگی میں آئی تھی اور آپ سے پہلے ہی پاپا کی زندگی سے نکل گئی۔ اب اگر وہ ان کے دل میں ہے تو کیا، ان کی زندگی میں تو آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر پاپا نے

کب آپ سے کچھ چھپایا؟"
"یہی تو تم نہیں سمجھتیں۔ اس کی زندگی میں کوئی اور ہوتی تو میں گوارا کر لیتی۔ مگر اس کے دل میں کوئی اور ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ ابھی بھی جا کر دیکھ لو، آج کے جھگڑے کا فائدہ اُٹھا کر وہ ملیحہ کے کمرے میں گیا ہوگا۔ جانتا ہے نا، جب تک وہ نہیں منائے گا، میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔ سوچا ہوگا، کیوں نہ اس سنہری موقع کا فائدہ اٹھا کر محبت کے مقبرے کی زیارت کر لی جائے۔ اور یہ وہ پہلی بار نہیں کرے گا۔ شادی کے شروع کے دنوں میں بھی وہ اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ میں نے روکا تو چھپ کر میری غیر موجودگی میں جانے لگا۔ میں نہیں چاہتی کہ دوبارہ ہمارا آمنا سامنا ملیحہ کے کمرے میں ہو، اس لئے میں نے گھر سے باہر مصروفیات ڈھونڈ لیں تاکہ نورالہدیٰ کو موقع ملتا رہے اور میں لاتعلق رہ سکوں۔ خود کبھی دوبارہ ملیحہ کے کمرے کی طرف نہیں گئی۔ اور تم لوگوں کو بھی روک کر رکھا۔ مگر نورالہدیٰ کی غلط فہمی ہے کہ مجھے پتہ نہیں چلتا۔ میں تو اس کی آنکھیں دیکھ کر پہچان جاتی ہوں کہ آج وہ محبت کے مقبرے پر یادوں کی چادر چڑھا کر آیا ہے۔"
بولتے بولتے وہ ایک دم چپ ہو گئیں اور سر تکیے پر ڈال کر ہانپنے لگیں جیسے لمبی دُوری کا سفر پیدل کیا ہو۔ اُن کی اُداسی تانیہ کو بھی اُداس کر رہی تھی مگر اس کے پاس اُن کی اُداسی دور کرنے کا کوئی حل نہیں تھا، اس لئے اُنہیں سمجھانے لگی۔
"حقیقت کتنی ہی تکلیف دہ ہو، اس کی خوبی یہی ہے کہ اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اور جس کو بدلا نہ جا سکے، اس کے ساتھ سمجھوتا کر لینا چاہیے۔"
مریم نے آنکھیں بند کر لیں۔ "کہنا بہت آسان ہے مگر کرنا مشکل ہے۔ کیا تم کبھی محبت میں سمجھوتا کر پاتیں؟"
'کر چکی ہوں۔' اس نے دل میں کہا۔
"جب محبت ترک کرنا بس میں نہیں ہو تو سمجھوتا تو کرنا پڑے گا۔" پھر ان کی بند آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو تو پاپا سے محبت کا دعویٰ ہے، پھر آپ نے انہیں اکیلا کیسے چھوڑ دیا؟"
مریم نے آنکھیں کھولیں، پھر سر تکیے سے اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں جو کہہ رہی تھی۔
"جسے چاہا جائے، اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ پر آپ نے تو کبھی پاپا کی تکلیف کو محسوس بھی نہیں کیا۔ پاپا جسے خوش دیکھنا چاہتے تھے، اسے ستائیس سال سے نہیں دیکھا اور قیامت تک نہیں دیکھ پائیں گے۔ آپ اگر انہیں اپنے کندھے پر سر رکھ کر رونے کی اجازت دے دیتیں تو وہ اکیلے خالی کمرے میں بیٹھ کر اپنا دکھ کیوں مناتے؟ آپ ہمیشہ انہیں اپنا بنانے کی ضد کرتی رہیں، خود ان کی کیوں نہ ہو گئیں؟ یہ کیوں نہ سوچا کہ وہ آپ کے نہ ہو سکے تو کیا شکایت، وہ خود اپنے بھی نہیں رہے۔ آپ خود ہی ان سے دُور رہیں تو وہ آپ کے پاس کیسے آتے ماما! لیکن پاپا نے کبھی آپ کے اور اپنے بیچ کی خلیج ہمیں محسوس نہیں ہونے دی۔ مگر میں جانتی ہوں، وہ

خوش نہیں اور خوش آپ بھی نہیں ہیں۔ تو اس لڑائی سے آپ نے کیا پایا؟'' تانیہ انہیں خاموش دیکھ کر ان کے پاس سے اُٹھ آئی۔

❁❁❁

کافی رات بیت چکی تھی۔ نورالہدیٰ ابھی تک کمرے میں نہیں آئے تھے۔ وہ ان کی تلاش میں پورشن کی طرف آنکلیں۔ ہال کی چھت سے لٹکتے جھومر کے نیچے کھڑے وہ سامنے سیڑھیوں کو دیکھ رہی تھی۔ تانیہ نے آج تک ان سیڑھیوں پر پاؤں نہیں رکھا تھا۔ ریلنگ کو تھام کر تانیہ نے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا تو اس نے محسوس کیا، اس کے دل کی دھڑکنیں معمول سے تیز ہوگئی ہیں۔ اس نے دوسری سیڑھی پر پیر جمایا تو اس کی سانسیں بھی اتھل پتھل ہونے لگیں۔ مگر وہ اپنے حواس کو مجتمع رکھے ایک ایک سیڑھی پر چڑھتی زینے تک آگئی۔ اس نے پلٹ کر نیچے دیکھا، پھر گردن موڑ کر اپنے سامنے منقش آبنوسی دروازے کو دیکھنے لگی۔ بھاری تالا کھلا ہوا، کنڈی سے لٹک رہا تھا اور زنجیر ایک طرف کو ہٹی ہوئی تھی۔ تانیہ نے دونوں پٹوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دھکیلا اور وہ کھلتے چلے گئے۔ تانیہ کو لگا، اس پر طلسم ہوشربا کا دروازہ کھل گیا ہو۔ سرد ہوا اس کے جسم سے ٹکرائی تو اس نے سانس روک لیا۔ پھر اس نے ایک قدم اٹھایا اور کمرے میں آگئی۔

نورالہدیٰ سامنے بیڈ پر دراز تھے۔ تانیہ کو دیکھ کر چونکتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ مگر تانیہ نے ان کی موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ کمرے میں ٹیبل لیمپ کی ہلکی سی روشنی تھی۔ تانیہ اس روشنی میں نظریں گھماتی کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ یہاں ستائیس سالوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ سب طرف دیکھتی نورالہدیٰ کے پاس چلی آئی۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کی نگاہ پائینتی کی طرف رکھے چھوٹے صوفہ سیٹ پر تھی، جس پر کچھ فریم ہوئی تصویریں رکھی تھیں اور ٹیبل پر زیورات کے ڈھیر کے ساتھ عروسی لباس تہ کیا پڑا تھا۔ تانیہ نے اسے دیکھ کر نگاہیں پھیر لیں۔

نورالہدیٰ بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ تانیہ نے گہرا سانس اندر اُتار کر کہا۔

''اس ہوا میں عجیب سی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔ شاید یہ ملیحہ فاروقی کی خوشبو ہو۔'' پھر اچانک ہی مڑ کر نورالہدیٰ کو دیکھا۔ ''آپ کو یہی خوشبو یہاں لے آتی ہے نا؟''

وہ چونک کر بولے۔ ''تم مریم کی باتوں کو سنجیدگی سے مت لو۔ وہ ایسے ہی بولتی رہتی ہے۔''

''میں سب جانتی ہوں پاپا!'' اس نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر ایک دم اس کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی اور وہ انگلیوں کو آپس میں اُلجھا کر بولی۔ ''وہ بھی، جو شایان نہیں جانتا۔''

اب کے نورالہدیٰ ٹھٹک گئے۔

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟''

''کیا فرق پڑتا ہے؟'' وہ کہہ کر دوبارہ مسکرانے لگی۔ نورالہدیٰ پُرسوچ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے

تھے۔

"کیا تم شایان کو قبول کر سکتی ہو؟"

"کیا دادا جان، شایان کو ملیحہ کا بیٹا قبول کر لیں گے؟" جواباً اس نے سوال کیا تو نورالہدیٰ چپ سے ہو گئے۔

"اگر دادا جان، شایان کو قبول کر لیتے ہیں تو ٹھیک۔ ورنہ جانے دیجئے گا۔ آج اسے اپنا ساتھ میرے لئے مناسب نہیں لگتا۔ کل اسے اپنا آپ میرے قابل نہیں لگے گا۔ میں نے پہلے بھی اسے کھونا تھا، بعد میں بھی کھو دوں گی۔ پھر اسے وہ سچ کیوں سناؤں جسے سن کر وہ اپنی ہی نظروں میں گر جائے۔" بات کرتے کرتے اس کا دل بھر آگیا اور اس نے خود کو رونے سے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی اور نورالہدیٰ کے بازو سے لگ کر رونے لگی۔ انہوں نے بھی اسے چپ نہیں کرایا اور اس کے گرد بازو پھیلا کر تھپکتے رہے۔ جب وہ روتے روتے تھک گئی تو خود ہی ان کے کندھے سے سر اٹھا کر آنسو پونچھنے لگی۔

"بس۔" نورالہدیٰ اسے دیکھ کر مسکرائے، پھر اس کے گال پر ہاتھ مار کر بولے۔ "اپنے پاپا پر اتنا سا بھی یقین نہیں ہے؟ میں تمہیں کبھی کچھ کھونے نہیں دوں گا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے یقین دلا رہے تھے۔

تانیہ بولی۔ "میں اپنے لئے نہیں رو رہی پاپا! میں تو آپ کے لئے رو رہی تھی۔ محبت بچھڑ جانے کے خوف سے میں نے تین سال تین صدیوں کی طرح گزارے ہیں اور آپ نے محبت سے بچھڑ کر ستائیس سال کیسے گزارے ہوں گے؟ محبت تو آباد کرتی ہے نا..... یہ محبت کا کون سا چہرہ ہے کہ آپ، ملیحہ آنٹی، وجدان انکل اور دادا جان چاروں نے ایک دوسرے سے محبت کی اور چاروں برباد ہو گئے۔"

نورالہدیٰ جبڑے بھینچ کر سامنے دیکھنے لگے۔

"خیر......" اس نے کہا۔ "جو ہوا، برا ہی سہی۔ مگر بدلنا ممکن نہیں۔ لیکن آپ کیوں دادا جان سے آج تک ناراض ہیں؟ انہوں نے کب چاہا تھا کہ ان کی بیٹی مر جائے؟ جو بھی غلطیاں ان سے ہوئیں، نادانستگی میں ہوئیں۔ وقت ہی خراب تھا شاید۔ ورنہ اتنے بچانے والے ہاتھ ہوں تو کوئی کیسے دریا برد ہو سکتا ہے؟ دادا جان کو اپنی خطا کا اعتراف بھی تو ہے۔ پھر بھی اگر آپ انہیں سزا دینا چاہتے ہیں تو تسلی رکھیں۔ انہیں سزا مل چکی ہے۔ ان کی بیٹی کی موت کو ستائیس سال گزر چکے ہیں اور ایک باپ کے لئے اس سے بڑا عذاب کوئی نہیں۔"

نورالہدیٰ بے بسی سے بولے۔ "مجھے ان کے زیاں کا احساس ہے۔ مگر جب ملیحہ کا خسارہ یاد آتا ہے تو ان کی تکلیف بے معنی سی لگنے لگتی ہے۔"

وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ "خسارے تو ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ ان میں کمی بیشی ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ دکھ کی کوئی مقدار نہیں ہوتی۔ بس احساس ہوتا ہے اور انہیں ملیحہ کے دکھ کا احساس ہے، اسی لئے تو پچھتاتے ہیں۔"

نورالہدیٰ تلخی سے بولے۔ "اب پچھتانے سے کیا، جب ملیحہ ہی نہیں رہی۔"

''دھیان رہے پاپا! کہیں ایسا نہ ہو، کل جب آپ پچھتائیں تو دادا جان نہ رہیں۔'' اس کی بات نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

''اُن کی عمر ستتر ہو چکی ہے۔ بیٹی سے ملنے کی خواہش انہیں اور کتنے دن آپ کی ناراضی ختم ہونے کا انتظار کرنے دے گی؟ ایک سال، دو سال، چار سال..... وقت تیزی سے گزر رہا ہے پاپا! کہیں دیر نہ ہو جائے۔'' وہ ضرب لگا کر چلی گئی اور نورالہدیٰ کے اندر بھونچال آ گیا۔

وہ رشتوں سے محبت کرنے والے شخص تھے، مگر بدقسمتی سے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی وہ کئی رشتوں کو کھو بیٹھے تھے۔ اپنے ماں باپ کو بھی۔ جب ہوش سنبھالا تو انہوں نے بابا جان، امی اور ملیحہ کو ہی اپنی زندگی میں پایا اور انہیں اپنی زندگی کی اساس بنالیا۔ مگر ان کی بدقسمتی ایک بار پھر ہاتھ دکھا گئی اور فریال کا انتقال ہو گیا۔ پھر ستائیس برس کی عمر میں غیر محسوس طور پر ہی ملیحہ کو دیکھ کر سحر زدہ رہ گئے..... وہ عام تو پہلے بھی نہ تھی، اب اور بھی خاص ہو گئی مگر یہ خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی۔ اب صرف تایا جان بچے تھے۔ وہ نورالہدیٰ کے لئے کیا تھے، سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن ملیحہ کی موت کبھی نہ بھلایا جانے والا صدمہ تھی جس نے ان کے اندر اس انتہائی ردِعمل کو تحریک دی کہ وہ بابا جان کو موردِ الزام ٹھہرا کر ان سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہو گئے۔ مگر ان سے محبت کرنا نہ چھوڑ سکے اور وہ محبت ہمیشہ ان کے اندر سر اُٹھاتی رہی مگر ملیحہ کو کھو دینے کا دکھ اس پر حاوی ہو جاتا۔

آج اچانک ہی تانیہ نے اپنی باتوں سے ملیحہ کے دکھ کو پس منظر میں دھکیل دیا تھا۔ اب وہ صرف بابا جان کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ جب انہوں نے باپ کی شفقت کو کھو دیا تھا تو بابا جان نے ان کی زندگی کی اس کمی کو آگے بڑھ کر پورا کر دیا۔ لیکن جب ان کی بیٹی چل بسی تو نورالہدیٰ ان کی تکلیف سے نظر چرا کر لاتعلق ہو گئے۔ آج جو سوچا تو نورالہدیٰ کو ندامت ہونے لگی۔

''انسان کو بہت سی چیزوں کا احساس وقت گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ ابھی بہت وقت باقی ہے۔ مگر کیا آپ نے ملیحہ کی موت سے سیکھا نہیں کہ وقت کی اُلٹی گنتی کبھی بھی شروع ہو سکتی ہے؟'' جانے سے پہلے انہوں نے تانیہ کی کہی آخری بات کو یاد کیا، پھر اپنی عرق آلود پیشانی کو مسلتے ایک فیصلہ کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

❁❁❁

آج وجدان سے مل کر کرنل اظہر فاروقی کا زخم ہرا ہو گیا تھا۔ وہ ملیحہ کی ڈائری کو مقدس صحیفے کی طرح سینے سے لگائے راکنگ چیئر پر نیم دراز ملیحہ کی تصویر کو نگاہوں میں قید کئے ہوئے تھے اور ان کا دل ملیحہ سے ہم کلام تھا۔

'بابا کی جان! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میری ملیحہ ایسی تو نہ تھی کہ اس کے بابا جان اس سے معافی مانگتے اور وہ بے نیاز بنی رہتی۔ ستائیس سال ہو گئے ہیں بیٹا! معاف نہیں کرنا تو سزا ہی دے دو۔ مگر تم تو اپنے باپ کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔ تم سے اچھا تو نورالہدیٰ ہے۔ معاف وہ بھی نہیں کرتا، نہ سزا سناتا ہے۔ مگر اس نے بے

ہی کا ہی سہی، کوئی رشتہ تو رکھا ہے۔ اور بیٹا! اب تو دل پر بوجھ بہت بڑھ گیا ہے۔ آج وجدان آیا تھا۔ جاتے جاتے اس بوجھ کا وزن کئی من بڑھا گیا۔ کوئی ایسی سبیل ہو کہ یہ بوجھ میرے دل سے اُتر جائے۔' انہوں نے یوں سانس بھرا جیسے واقعی سینے پر کوئی بوجھ دھرا ہو، جسے اُٹھانے کی اب طاقت نہیں رہی کہ کوئی دستک دیئے بغیر ہی اندر آیا تھا۔

آتش دان کی زرد روشنی میں انہیں نیم تاریک ہیولا نظر آیا تھا اور اس ہیولے میں نورالہدیٰ کا سراپا دیکھ کر بابا جان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بھلا وہ ان کے کمرے میں کیوں آتے؟ وہ بھی اس وقت۔ سنہری فریم کی عینک اتار کر آنکھوں کی نمی صاف کرتے انہوں نے دوبارہ سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ نورالہدیٰ ہی تھے جو نیم تاریکی سے نکل کر روشنی میں آ گئے تھے۔ پھر یوں ہی چلتے ہوئے وہ بابا جان کے سامنے دوزانو بیٹھے اور ان کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

''مجھے معاف کر دیجئے بابا جان!'' وہ جھکے سر کے ساتھ ندامت سے چور لہجے میں بولے۔

بابا جان نے حیرت سے کہا۔ ''کس بات کی معافی؟''

''اس بات کی معافی کہ میں آپ کا بیٹا نہیں بن سکا۔ اس بات کی معافی کہ آپ اپنی ساری زندگی میرے سکھ کی خواہش کرتے رہے اور میں نے اپنی آدھی عمر آپ کو دکھ دینے میں گزار دی۔ اس بات کی معافی کہ یہ جانتے ہوئے کہ آپ کو قصور وار ٹھہرانے کا حق صرف ملیحہ اور وجدان کے پاس ہے میں ستائیس سال تک آپ کو قصوروار ٹھہراتا رہا۔'' رک رک کر بولتے ہوئے وہ بابا جان کو وہی پرانے نورالہدیٰ لگ رہے تھے۔ انہوں نے آہستگی سے اپنے ہاتھ چھڑا لئے تو نورالہدیٰ نے سر اٹھا کے انہیں سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ بابا جان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انہوں نے اسی آہستگی سے نورالہدیٰ کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا اور جھک کر ان کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیئے۔ ستائیس سالوں کی دُوری اور ناراضی ایک پل میں ہی غائب ہو گئی تھی۔ بابا جان شفقت سے بھرپور آواز میں بولے۔

''کون کہتا ہے، تم میرے بیٹے نہیں بن سکے؟ تم میر ہی بیٹے ہو۔ بس ذرا ناراض ہو۔ تو کیا بیٹا، باپ سے ناراض ہو جائے تو بیٹا نہیں رہتا؟'' اب وہ ان کے بال سلجھا رہے تھے۔ ''تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ تمہارا غصہ، تمہاری ناراضی جائز ہے۔ ہاں، مگر دل دُکھتا ہے تو کیا، میں نے بھی تو بہت بار ملیحہ کا دل دُکھایا ہے۔ شاید اس طرح کفارہ ادا ہو جائے۔''

نورالہدیٰ بے تابی سے ان کے ہاتھ تھام کر بولے۔ ''کیوں اُس کا دل دُکھاتے تھے؟..... جانتے تھے، وہ کتنا اُداس ہو جایا کرتی تھی؟ ایک بار مجھ سے بھی کہا تھا کہ آپ سے پوچھوں، کیوں آپ اُس کی پروا نہیں کرتے؟ آپ آج مجھے ملیحہ کے سوال کا جواب دیجئے۔'' آج اچانک ہی انہیں ملیحہ کا سوال یاد آیا تو پوچھ بیٹھے۔

بابا جان نے جو سنا کہ یہ ملیحہ کا سوال تھا، انہیں دُکھ نے آ گھیرا۔ سسکتے ہوئے کہنے لگے۔ ''میں ڈرا ہوا

انسان ہوں نورالہدیٰ! موت نے مجھ سے ہر اُس شخص کو چھین لیا جس سے میں نے محبت کی۔ انسان دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے جس وجود سے محبت کرتا ہے، وہ ماں ہے۔ میں دس سال کا تھا جب اماں جی چل بسیں۔ آج ستتر برس کی عمر میں بھی مجھے اُن کی آغوش یاد آتی ہے۔ پھر ابا میاں بھی جلد ہی ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ پر چلو، اُن کی تو عمر ہو چلی تھی۔ سنبھالیا خود کو۔ مگر بھائی جی کی عمر تو مرنے کی نہیں تھی۔ وہ اٹھائیس سال کے تھے جب وہ ایکسیڈنٹ ہوا۔ ابھی تو بہت زندگی باقی تھی اور وہ اچانک ہی دنیا سے اُٹھ گئے۔ تمہاری ہر خوشی مناتے ہوئے میرے دل میں ان کی موت کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے تمہارے حوالے سے کتنے خواب دیکھے تھے...... ایک ایک کر کے وہ سارے خواب پورے تو ہو گئے مگر ان کی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ بہت بڑا جھٹکا تھا نورالہدیٰ! فریال مجھے نہ سنبھالتی تو میں کبھی اس جھٹکے سے نہ سنبھل پاتا۔ فریال آئیڈیل بیوی تھی۔ سمجھنے والی، ساتھ دینے والی، محبت کرنے والی۔ میں اس کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ مگر ملے صرف اٹھارہ سال۔ ایک عورت، جس سے محبت بھی ہو، پھر وہ بیوی بھی ہو اور بچے کی ماں بھی، اگر موت اسے الگ کر دے تو کیسا لگتا ہے، جانتے ہو؟" وہ ہانپتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ نورالہدیٰ نے کچھ بولے بغیر نظر جھکا لی اور بابا جان سر پیچھے ٹکا کر ملیحہ کی تصویر کو دیکھنے لگے۔

"ملیحہ، فریال کا دیا ہوا سب سے خوب صورت تحفہ تھی۔ میں سب کو کھو چکا تھا لیکن ملیحہ کو کیسے کھو سکتا تھا؟ اس میں تو میری جان تھی۔ تم خود بھی باپ ہو نورالہدیٰ! اولاد کیا ہوتی ہے، جانتے ہو۔ اولاد سے ایک پل کی جدائی برداشت نہیں ہوتی، دائمی جدائی کا تو تصور کون کرے گا؟ مگر یہ خوف میرے ذہن میں بیٹھ گیا تھا۔ میں نے جس سے بھی محبت کی، وہ جدا ہو گیا۔ مگر مجھ میں ملیحہ کی جدائی سہنے کی طاقت نہیں تھی۔ میں نے سوچ لیا، میں اس سے محبت نہیں کروں گا۔ مگر دل بھاگ بھاگ کر اس کی طرف جاتا۔ لیکن میں اس کے چہرے پر نظر ڈالنے سے ڈرتا کہ کہیں اسے میری نظر نہ لگ جائے۔ مگر وہ خود ہی میرے پاس آ جاتی۔ میرے قدموں میں بیٹھ جاتی، پھر میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر مجھے "بابا جان" کہہ کر پکارتی تو میرے اندر زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ خود پر چڑھایا خول چٹخنے لگتا۔ لیکن کہیں ٹوٹ نہ جائے، اس ڈر سے میں اسے خود سے دور کر دیتا۔ یہ سب کرنا آسان نہیں تھا نورالہدیٰ! ملیحہ بیٹی تھی، مجھے پیار آتا تھا اس پر، اس کی مسکراہٹ پر۔ لیکن نظر نہ لگ جائے، اس خوف سے میں نے خود پر اس کی خوشیاں حرام کر لیں۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ چاہے نظر نہ آئے مگر وہ خوش ہے، اتنا ہی کافی تھا میرے لئے۔"

"اُسے نظر لگ جانے کے ڈر نے آپ کو اتنا خوف زدہ کر دیا کہ خود اس کی خوشیوں سے دُور رہتے رہتے اسے ہی خوشیوں سے دُور کر دیا۔" اس حیرت انگیز انکشاف پر شاکڈ نورالہدیٰ نے شکوہ کیا تو بابا جان نے کہا۔

"ملیحہ بالکل اپنی ماں جیسی تھی۔ بس ایک فرق تھا۔ فریال شوخ تھی اور ملیحہ خاموش۔ اس کی خاموشی نے مجھے فیصلے سنانے کی عادت ڈالی تھی۔ ملیحہ نہیں جانتی تھی مگر تمہیں تو پتہ ہے کہ تم دونوں کی شادی کا فیصلہ میں بہت

پہلے کر چکا تھا۔ پھر ملیحہ نے وجدان کا ذکر کیا تو مجھے غصہ آ گیا اور غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا۔ مگر اُس کی اُداس صورت دیکھی نہیں گئی اور زندگی میں پہلی بار میں نے فیصلہ بدلنے کا ارادہ کر لیا۔ اس دن میں شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ ملیحہ کسی بھی وقت وجدان کو لے کر آ جائے گی۔ مگر وہ لوٹی تو تنہا تھی۔ پھر جب اس نے چپ چاپ تمہارے ہاتھوں سے انگوٹھی پہن لی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وجدان، شادی کا ارادہ کر کے مکر گیا ہے.....''

نورالہدیٰ اُن کی بات کاٹ کر بولے۔ ''آپ نے اس سے پوچھا کیوں نہیں؟.......فرض کیوں کر لیا کہ وجدان نے انکار کر دیا ہوگا؟''

''میں اُس کا بھرم نہیں توڑنا چاہتا تھا۔'' وہ بول کر ہونٹ کاٹنے لگے۔ پھر سسک کر بولے۔ ''مجھ سے غلطی ہو گئی تھی نورالہدیٰ! اور اس غلطی کی سزا بھی ملی۔ میری بیٹی مر گئی ہے۔'' وہ اس طرح بول کر رو پڑے جیسے ملیحہ آج مری ہو۔ انہوں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ نورالہدیٰ کے گال بھی بھیگنے لگے تھے۔ انہوں نے تاسف کی نگاہ بابا جان پر ڈالی، پھر ان کے ہاتھوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولے۔

''ہم کب تک ایک ہی دکھ پر الگ الگ آنسو بہائیں گے بابا جان! کیوں نہ مل کر رو دیا کریں۔''

بابا جان نے اچانک ہی اپنے ہاتھ ان کے آگے جوڑ دیئے اور بھرّائی آواز میں بولے۔ ''مجھے معاف کر دو نورالہدیٰ!''

نورالہدیٰ تیزی سے ان کے ہاتھ الگ کرتے ہوئے بولے۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں بابا جان؟ میں کہہ چکا ہوں، یہ حق مجھے نہیں ہے۔''

''تمہیں حق ہے نورالہدیٰ! میں نے اس لڑکی کو مارا ہے، جس سے تمہیں محبت تھی۔ میرے ہاتھوں تمہارے دل کی دنیا برباد ہوئی ہے۔ میں تمہارا مجرم ہوں اور مجھے اپنے جرم کا اعتراف ہے۔ اور جانتے ہو، اعتراف کے بعد جزا و سزا کے عمل میں تاخیر بہت گراں گزرتی ہے۔ یہ سکوت ناقابلِ برداشت ہے نورالہدیٰ! اسے توڑ دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' نورالہدیٰ ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے بولے۔ ''اگر میرے کہہ دینے سے آپ کو سکون ملتا ہے تو کہہ دیتا ہوں۔'' وہ رُکے، پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بولے۔ ''میں نے آپ کو معاف کیا۔''

بابا جان کو لگا، کسی نے ان کے سینے سے خنجر کھینچ نکالا ہے۔ مگر زخم تو باقی تھا اور درد بھی......انہوں نے سر کرسی کی پشت سے ٹکاتے آنکھیں بند کر کے سکون کا سانس لیا۔

''تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ایک معافی اور مل جائے تو باقی کا بوجھ بھی اُتر جائے گا۔ پھر بس تھکن باقی رہ جائے گی۔'' پھر وہ آنکھیں کھول کر چھت کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''کاش وقت لوٹ آئے اور تمہاری جگہ ملیحہ میرے سامنے بیٹھی مجھ سے وجدان کا ساتھ مانگ رہی ہو.......اس بار میں انکار نہیں کروں گا۔'' ان کی آواز میں حسرت گھلی ہوئی تھی۔

نورالہدیٰ نیچی آواز میں بولے۔ ''وقت لوٹ آیا ہے بابا جان! لیکن ملیحہ کی جگہ تانیہ نے لے لی ہے اور فیصلہ آج بھی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس بار انکار مت کیجئے گا۔'' نورالہدیٰ کی آواز رندھ گئی تھی۔ بابا جان مضطرب ہو گئے۔

''اقرار بہت مشکل ہے۔''

''پلیز بابا جان! تاریخ خود کو دہرا رہی ہے...... جو ہو چکا ہے، اسے دوبارہ مت ہونے دیں۔ میری بیٹی کو کچھ نہ ہونے دیں۔ ستائیس سال پہلے ایک گھاؤ دل پر لگا تھا جو آج بھی رِس رہا ہے۔ میرے دل پر دوسرا زخم نہ لگائیں۔ میری تانیہ خوش نہ رہی تو میں بھی خوش نہیں رہ پاؤں گا۔ پلیز بابا جان! تانیہ کی خاطر شایان کو قبول کر لیں۔ آپ کا سچ میری بیٹی کو مار دے گا...... میری بیٹی کو اس کی زندگی بخش دیں۔'' وہ عاجزی سے نم آواز میں منتیں کر رہے تھے اور بابا جان کے ماتھے پر سلوٹیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

تانیہ گہری نیند میں تھی کہ اچانک اس کے بھائیوں نے اس کے کمرے میں دھاوا بول دیا۔

"آپی اُٹھیں۔ جلدی سے اُٹھیں نا۔" وہ اس پر سے کمبل کھینچ کر اسے جھنجھوڑ رہے تھے۔ وہ بے چاری حواس باختہ سی "کیا ہوا، کیا ہوا؟" کرتی جلدی سے اُٹھ بیٹھی۔

"جلدی نیچے چلیں۔ آپ کو کچھ دکھانا ہے۔"

"کیا بدتمیزی ہے عمیر! میں رات کو تین بجے سوئی ہوں اور تم دونوں صبح صبح میرے سر پر ڈھول پیٹنے آ گئے ہو۔"

"افوہ آپی! آپ چلیں تو۔ کیوں ٹائم ویسٹ کر رہی ہیں؟" عذیر بولا۔ پھر اس کے نہ نہ کرتے وہ دونوں زبردستی اسے بازو سے پکڑ کر بستر سے کھینچتے نیچے لے آئے۔

"وہ دیکھیں۔" لان میں لے جا کر انہوں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ تانیہ نے جھنجلا کر اس طرف دیکھا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

نورالہدیٰ اور بابا جان چیئرز پر بیٹھے ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ایسا کوئی منظر ان تینوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے خوشگوار حیرت ہوئی اور مسکراتے ہوئے فریش ہونے کے لئے باتھ روم میں گھس گئی۔

اس کے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ ایک طرف تو وہ خوش تھی کہ آج شایان اس کے پاپا سے ملنے آ رہا ہے، دوسری طرف اسے بابا جان کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ متضاد کیفیتوں میں گھری وہ ناشتے کے لئے ڈائننگ روم میں آئی تو نورالہدیٰ اور بابا جان کے علاوہ عمیر اور عذیر بھی ٹیبل پر موجود تھے۔

"تم دونوں کالج نہیں گئے؟" اپنے لئے چیئر گھسیٹ کر بیٹھتی وہ بولی تو عمیر بولا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ پاپا آفس نہیں گئے۔" سلائس پر جیم لگاتے وہ اس جواب پر حیرت سے بولی۔

''پاپا تو اس لیئے آفس نہیں گئے کیونکہ آج کوئی ان سے ملنے آ رہا ہے۔''
عذیر اس کی بات دہرا کر بولا۔ ''میں بھی اسی لیئے کالج نہیں گیا کہ آج کوئی پاپا سے ملنے آ رہا ہے۔ ویسے آپ آفس کیوں نہیں گئیں؟'' عذیر نے معنی خیزی سے کہہ کر آنکھیں نچائیں تو وہ چڑ کر بولی۔
''میری مرضی۔'' پھر سلائس دانتوں سے کتر کر بولی۔ ''ماما نظر نہیں آ رہیں۔''
''وہ کمرے سے ہی نہیں نکلیں۔ لگتا ہے، ابھی تک ان کا موڈ خراب ہے۔'' عمیر کے سنجیدگی سے بتانے پر تانیہ چپ سی رہ گئی اور ایک نگاہ نورالہدیٰ کے خاموش چہرے پر ڈال کر کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔
ابھی وہ سب ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ مریم غیر متوقع طور پر ڈائننگ روم کے دروازے سے اندر آتی نظر آئیں۔ وہ چلتی ہوئی آئیں اور نورالہدیٰ کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگے۔ انہوں نے کہا۔
''مجھے ملیحہ کے کمرے کی چابی چاہیئے۔'' ان کے تیور عجیب سے ہو رہے تھے۔ نورالہدیٰ تذبذب میں گھر گئے۔ وہ ان کی آفت مچانے والی طبیعت سے واقف تھے مگر بچوں کے سامنے کوئی حوالہ دے کر منع بھی نہیں کر سکتے تھے۔
''ٹھہرو، میں لاتا ہوں۔'' آخر وہ کہہ کر چابی لانے کے لیئے اٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو مریم نے انہیں دیکھتے ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ نورالہدیٰ نے چابی ان کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔
''خیال رکھنا۔''
مریم مٹھی بند کر کے عجیب سے انداز میں مسکرائیں۔ نورالہدیٰ ان کی مسکراہٹ کا مطلب اخذ نہ کر سکے اور وہ جھٹکے سے ہال کی طرف جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ سب ناشتے سے ہاتھ روک کر بیٹھے تھے۔ عمیر اور عذیر تو ٹھیک سے صورتِ حال کو سمجھے ہی نہیں تھے مگر بابا جان کے چہرے پر تشویش تھی۔ نورالہدیٰ اپنی جگہ پر خاموش کھڑے تھے اور تانیہ بھی ان کی طرح چپ بیٹھی اٹھا پٹخ کی آوازوں کا شعوری طور پر انتظار کر رہی تھی۔ مگر کوئی آواز نہیں آئی۔ نورالہدیٰ اپنے اندر کے اضطراب کو دبا نہ پائے اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے دروازے تک آئے تو ہال سے اندر آتی مریم سامنے آ گئیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رک گئے تھے۔ مریم ہاتھوں میں کچھ فوٹو فریم اٹھائے ہوئے تھیں۔ انہیں ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے انہوں نے دوسرے ہاتھ میں پکڑی چابی نورالہدیٰ کی طرف بڑھائی۔
''تمہاری امانت۔'' نورالہدیٰ نے کچھ کہے بغیر چابی ان کے ہاتھ سے لی تو بولیں۔ ''جا کر تسلی کر لو۔'' پھر بہادر کو آواز دے کر اپنے ساتھ آنے کا کہتی لاؤنج کی طرف بڑھ گئیں۔
نورالہدیٰ کچھ دیر اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے، پھر چابی پاکٹ میں ڈال کر لاؤنج میں چلے آئے۔ بہادر ان کی ہدایت پر دیوار پر سے کئی فریم اُتار چکا تھا۔ پھر مریم نے ملیحہ کی تصویروں والے فریم ان کی جگہ لگوا دیئے۔

''ان تصویروں کو کہاں لگانا ہے بیگم صاب؟'' بہادر تصویریں لگا چکا تو اسٹول سے اُتر کر صوفے پر پڑی تصویروں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''ابھی تو انہیں رکھ دو۔ تھوڑی دیر میں ملیحہ کا شوہر اور بیٹا آنے والے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد بتاؤں گی کہ ان تصویروں کو کہاں لگانا ہے۔''

''جی بیگم صاب!'' وہ نورالہدیٰ کو کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا بولا اور رفو چکر ہو گیا۔

نورالہدیٰ چلتے ہوئے مریم کے پاس آ گئے۔ اپنی پشت پر ان کا رکنا محسوس کر کے وہ پلٹیں۔ نورالہدیٰ سامنے لگی تصویروں کو دیکھ رہے تھے، بولے۔

''یہ سب کیا ہے؟''

مریم ان کی بات سن کر اُداسی سے بولیں۔ ''جب میں ملیحہ کی تصویر تمہارے دل سے ہی اُتار نہ پائی تو دیوار سے اُتارنے کا کیا فائدہ؟''

نورالہدیٰ نے انہیں دیکھا، پھر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے پکارا۔

''مریم!''

وہ ایک دم سے ہاتھ اٹھا کر بولیں۔ ''بس نورالہدیٰ! کچھ نہ کہنا۔ میری عمر بھر کی ریاضت بے کار گئی ہے۔''

نورالہدیٰ ان کے چہرے پر دکھ کے سائے لرزتے دیکھتے رہے، پھر ان کے گرد بازو پھیلا کر انہیں خود سے قریب کر لیا۔

''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مریم! میرا اعتبار کرو۔'' وہ ان کے کان میں کہہ رہے تھے۔ مریم نے بے بسی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔

''صاب!'' بہادر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو کر اچانک سے بولا تو نورالہدیٰ نے مریم کے شانے سے بازو ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بولو۔''

''وجدان صاب آ گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم بابا جان کو اطلاع کرو۔'' وہ جلدی سے اسے کہہ کر وجدان کے استقبال کے لئے باہر جانے لگے۔ دو تین قدم آگے جا کر انہیں احساس ہوا، مریم ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ وہ رک کر پلٹے اور انہیں دیکھ کر بولے۔

''آج چاہے ملیحہ کے بیٹے کی شکل نہ دیکھو پر کیا کل تانیہ کے شوہر کی صورت دیکھنے سے بھی انکار کرو گی؟ اور یاد رکھنا! یہ فیصلہ میرا نہیں، ہماری بیٹی کا ہے۔''

انہوں نے ایک پل کو سوچا، پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پاس آ کر بولیں۔ ''چلو۔''

نورالہدیٰ کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''تھینکس۔''
مریم ان کی مسکراہٹ کا برا مان کر بولیں۔ ''میں یہ سب اپنی بیٹی کے لئے کر رہی ہوں۔ تمہارے لئے نہیں۔''
''میں بھی یہ سب اپنی بیٹی کے لئے کر رہا ہوں۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور فوراً پلٹ کر چلنے لگے۔
گاڑی پورچ میں رُک چکی تھی۔ کار کا دروازہ کھول کر اُترتے وجدان کو دیکھ کر نورالہدیٰ ان کی طرف چلے آئے۔

''السلام علیکم ہادی بھائی!'' وجدان نے ان کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
نورالہدیٰ ان کا ہاتھ تھام کر ''وعلیکم السلام'' کہتے ان سے بغل گیر ہو گئے۔
''کیسے ہو؟''
''اللہ کا کرم ہے۔ آپ سنائیں۔'' وہ ان سے الگ ہوتے ہوئے بولے۔ پھر شایان کو دیکھنے لگے جو گاڑی لاک کر کے انہی کی طرف آ رہا تھا۔ ورزشی جسم پر بلیک ڈریس پینٹ کے ساتھ میرون کلر کی شرٹ پہنے لمبے چوڑے سراپے والا شایان، نورالہدیٰ کو پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔
''السلام علیکم ہادی انکل!'' کہہ کر وہ ان کے گلے لگ گیا۔ ان سے گلے ملتے ہوئے اس کی نظر باہر آتی تانیہ پر پڑی تھی۔ تانیہ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ دونوں کی ہی آنکھوں میں چمک لہرائی تھی پر لب مسکرا نہ سکے۔ شایان اس کے چہرے سے نظر ہٹاتا نورالہدیٰ سے الگ ہو گیا۔
''وعلیکم السلام بیٹا۔'' نورالہدیٰ اسے توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر مریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وجدان سے بولے۔ ''ان سے ملو وجدان! یہ مریم ہیں۔ میری بیوی۔''
''کیسی ہیں بھابی؟'' وجدان خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے بولے۔
''ٹھیک ہوں۔ آپ اندر آئیے۔ اور شایان بیٹا! تم بھی آؤ نا۔'' وہ اندر جانے لگے تو تانیہ نے جھٹ سے آگے ہو کر وجدان کو سلام کیا۔ پل بھر کو اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر سلام کا جواب دیتے وہ نورالہدیٰ کی ہمراہی میں اندر آ گئے۔ نورالہدیٰ انہیں ڈرائنگ روم میں لے جانے کے بجائے سیدھے لاؤنج میں لے آئے۔
''بابا جان کہاں ہیں؟'' عذیر نے عمیر کے چپ رہنے کے اشارے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
''وہ تو وجدان انکل کا سن کر اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔''
ایک پل کے لئے ہر کوئی چپ سا رہ گیا، پھر نورالہدیٰ، وجدان سے بولے۔ ''تم بیٹھو، میں بابا جان کو لے کر آتا ہوں۔'' اور جانے لگے تو وجدان نے ان کا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔
''آپ اجازت دیں تو میں انہیں لے آؤں۔''
نورالہدیٰ نے ذرا سا مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے اجازت دے دی۔ پھر انہیں لئے بابا جان کے کمرے تک آئے اور ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کا کہتے ہوئے پلٹ گئے۔

وجدان نے دروازہ کھولتے ہوئے اندر قدم رکھا اور ان کی نگاہیں سیدھی ملیحہ کی تصویر سے جاٹکرائیں۔ ایک پل کے لئے وجدان کی آنکھیں، وجدان کا دل بن گئی تھیں۔ مگر انہوں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور راکنگ چیئر پر بیٹھے بابا جان کو دیکھنے لگے جو ان کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ چلتے ہوئے ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

''کیوں آئے ہو تم یہاں؟'' بابا جان چیخ کر بولے۔ ''میرے پچھتاوے کو بڑھانے کے لئے کہ ستائیس سال پہلے جب ملیحہ میری منتیں کر رہی تھی کہ ایک بار تم سے مل لوں تو تم سے کیوں نہیں ملا۔ جاؤ وجدان! چلے جاؤ۔ میں آج بھی تم سے ملنا نہیں چاہتا...... تمہاری صورت میری تکلیف کو بڑھا رہی ہے۔'' انہوں نے منہ پھیر لیا تو وجدان دکھ سے بولے۔

''لیکن میری تکلیف کا کیا ہوگا بابا جان! آپ نے ستائیس سال پہلے بھی مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اب ستائیس سال بعد بھی مجھے قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں، ملیحہ کی آخری خواہش کیا تھی؟'' بابا جان نے ان کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں تھے۔ وجدان توقف کے بعد کہنے لگے۔

''وہ مجھے، آپ کو اور ہادی بھائی کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ آپ مجھے قبول کر لیں۔ مرنے والے کی آخری خواہش اس کی زندگی میں ہی پوری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر ستائیس سالوں میں ملیحہ کی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش نہ میں نے کی، نہ آپ نے اور نہ ہادی بھائی نے...... مگر میں مجبور تھا۔ ملیحہ کے انتقال کے بعد کے دس سال تو جیسے میری عمر سے تحلیل ہو گئے اور اس کے بعد میں ان کی خواہش کی تکمیل کے لئے آپ کے پاس آنا چاہتا تھا پر شایان نے مجھے کمزور کر دیا۔ لیکن آج اسی نے اتنی طاقت دی ہے کہ آپ کے پاس آسکوں۔ اب تو مجھے قبول کر لیجئے بابا جان!'' انہوں نے عاجزی سے کہا تو بابا جان حسرت بھرے لہجے میں بولے۔

''کاش تم اس کی زندگی میں مجھ سے ملنے آجاتے تو میں تمہیں قبول کر لیتا۔ پھر شاید ملیحہ بھی نہ مرتی...... مگر اب کیا فائدہ؟ میری بیٹی تو مر چکی۔'' ان کی آواز بھیگ گئی تھی۔ ''جانتے ہو، اولاد کو قبر میں اترتے دیکھنا کیسا لگتا ہے؟ پھر مجھے تو اللہ نے اولاد کے لئے ترسایا بھی بہت تھا۔ ملیحہ میری شادی کے سات سال بعد پیدا ہوئی تھی اور آج مجھے اس کی موت کا سوگ مناتے ہوئے ستائیس سال ہو گئے ہیں۔'' ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ ''میری بیٹی صرف بیس سال زندہ رہی۔ کیا اس سے بہتر نہیں تھا کہ اللہ مجھے بے اولاد ہی رکھتا؟''

انہیں سسکتا ہوا دیکھ کر وجدان ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے اور ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''اللہ کے کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتے بابا جان! یقیناً آپ کو اولاد دے کر لینے میں اس کی کوئی مصلحت ہوگی اور اللہ کی مصلحتیں سمجھ آجائیں تو صحیح، نہ سمجھ آئیں تو ضد نہیں کرتے، قبول کر لیتے ہیں۔ میں مانتا ہوں، آپ کا دکھ بڑا ہے۔ مگر وقت بھی تو بہت گزر چکا...... وقت ہر درد کی دوا ہے۔ آپ اگر صبر کرنے کی کوشش کرتے تو آپ کا

درد کم ہو ہی جاتا۔"

"تم تو صبر کرنے کی کوشش کرتے رہے ہو...... کیا تمہارا درد کم ہوا؟" وہ ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ وجدان نظر چرا گئے۔

"برداشت درد سے بڑھ گئی ہے۔" پھر کچھ دیر پہلے بابا جان کی کہی بات کو یاد کر کے بولے۔ "میں آپ کی تکلیف کو بڑھانے نہیں آیا تھا بلکہ اس تکلیف کو فتح کرنے آیا تھا جو کل آپ کو مجھ سے پہنچی ہے۔ میں اپنے ساتھ شایان کو بھی لایا ہوں۔ وہ باہر بیٹھا ہے۔ آپ میرا ایک کام کریں گے بابا جان!...... مجھ میں شایان کو سچ بتانے کی طاقت نہیں۔ آپ جائیں اور جا کر اس سے کہہ دیں کہ اس کا ملیحہ سے کوئی رشتہ نہیں۔ بلکہ یہ بھی کہہ دیں کہ اس کا مجھ سے بھی کوئی رشتہ نہیں۔ وہ ان لوگوں کی اولاد ہے جو رات کے اندھیرے میں اپنے بچوں کو پھینک آتے ہیں مگر دن کے اُجالے میں کسی سے نہیں کہتے کہ کچرے کے ڈھیر پر پڑی مسخ شدہ لاش ان کے بچے کی ہے۔ مگر پہلے وعدہ کریں کہ اس کے بعد آپ اسے دھتکاریں گے نہیں اور تانیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیں گے۔"

"اس کے بعد شایان کا کیا ردِعمل ہو گا؟" پتہ نہیں کیوں وہ یہ سوال کر رہے تھے۔ وجدان نے سوچا اور کہا۔

"ظاہر ہے، ناراض ہو گا۔ پوچھے گا کہ کیوں میں نے اسے دھوکے میں رکھا۔ لڑے گا بھی بہت۔ مگر مجھ سے محبت کرتا ہے، اس لئے مان بھی جائے گا۔"

ان کی بات سن کر بابا جان بولے۔ "نورالہدیٰ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے مگر اس نے ایک عمر مجھ سے ناراض رہنے میں گزار دی۔ اگر شایان بھی نہ مانا تو؟"

"تو کیا ہو گا؟" پتہ نہیں کیوں وہ ہنس پڑے۔ "اللہ کو میرے ایمان پر بڑا شک ہے۔ بار بار آزما کر بھی اسے یقین نہیں آتا اور مجھے ایک کے بعد دوسری آزمائش میں ڈالتا رہتا ہے۔ جہاں اتنی آزمائشیں بھگت لیں، وہاں ایک اور کے آ جانے سے کیا ہو گا؟ بلکہ اچھا ہو گا جو ایسا ہو جائے۔ مولوی صاحب مرحوم کہا کرتے تھے، شایان کا نصیب میرے نصب سے جڑا ہے۔ اچھا ہو گا اگر اس کا نصیب میرے نصیب سے الگ ہو جائے۔ میرے نصیب کی سختیاں اب اس کے نصیب پر سایہ ڈالنے لگی ہیں۔" کل وہ بار بار شایان کو اپنی برباد عمر کا حاصل کہہ رہے تھے اور آج اسے خود سے الگ کرنے کی بات کر رہے تھے۔ بابا جان حسرت سے اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کو دیکھ رہے تھے جو کسی اور کے فائدے کے لالچ میں اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی لٹانے کو کمربستہ تھا۔ انہیں یاد آیا کہ ملیحہ کی ڈائری میں انہوں نے پڑھا تھا کہ ایک بار ملیحہ کی کسی بات پر وجدان نے مذاقاً اقرار کیا تھا۔

"میں پاگل بھی ہوں اور دیوانہ بھی......" اور بابا جان ایمان لے آئے۔ وہ واقعی پاگل اور دیوانہ تھا۔ ٹھیک ہے، آج کوئی اسے پتھر نہیں مارتا اور اس کے پاس مینٹل نارملٹی کا سرٹیفکیٹ بھی ہے مگر دیوانہ پھر بھی دیوانہ تھا۔

اور بابا جان کو یقین ہونے لگا تھا کہ دنیا بھر کے سائیکاٹرسٹ مل کر بھی علاج کر لیں تو بھی اس کی دیوانگی نہ جائے گی۔

وجدان، بابا جان کو ساتھ لیئے لاؤنج میں آئے تو وہاں بیٹھے ہر شخص کی نظریں ان دونوں پر ٹھہر گئیں۔ شایان تو ان دونوں کو دیکھ کر اضطراب میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اندر ہیجان برپا تھا مگر وہ افراتفری کا مظاہرہ کیئے بغیر بڑے بڑے قدم اٹھاتا ان کے سامنے جا رکا تو بابا جان بھی رک گئے اور اسے دیکھنے لگے۔ بابا جان کے نقوش میں ملیحہ کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی، جسے محسوس کر کے شایان گویا ہوا۔

''سر! میری ماں نہیں ہے۔ مگر دل تو ہے جو چاہتا ہے کہ میری ماں زندہ ہوتی۔ جو مجھے اُنگلی پکڑ کر چلنا سکھاتی، مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی۔ اور پھر جب میں تھک جاتا تو مجھے گود میں لے کر لوری سناتی۔ جسے سنتے سنتے میں ان کی گود میں سو جاتا۔ مگر میں ایک پل کے لئے بھی اپنی ماں کی آغوش کو محسوس نہیں کر سکا۔ اور شاید انہیں خود سے قریب محسوس کرنے کے لیئے ہی مجھے ہر اس شے سے محبت ہو جاتی ہے جس سے امی کو محبت تھی۔ ابو بتاتے ہیں، امی کو آپ سے بہت محبت تھی۔ مجھے بھی آپ سے بہت محبت ہے۔'' وہ رُکا، پھر کہنے لگا۔

''مگر میں جانتا ہوں سر! آپ کو مجھ سے پیار نہیں ہے۔ لیکن میری ماں آپ کی بیٹی تھیں۔ ان کی خاطر مجھے اتنی اجازت دے دیجئے کہ کبھی کبھی آپ سے ملنے آ جاؤں۔''

وہ جب تک بولتا رہا، بابا جان چپ رہے۔ جب وہ چپ ہوا تو بولے۔

''جسے تم نے ماں کہا ہے، وہ میری بیٹی تھی۔'' اُن کی آواز کی وہ گونج...... وجدان نے دعا کی، کاش وہ بہرے ہو جائیں۔ بھلا وہ ان لفظوں کو کیسے سن پائیں گے جو شایان کی زندگی میں اندھیرا کرنے والے ہیں۔ وہ چشمِ تصور سے شایان کے تاریک ہوتے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ نورالہدیٰ نے بے ساختہ وجدان کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا پھر فوراً ہی ان کی نظر تانیہ پر گئی جس کا سانس تک رک چکا تھا۔ بابا جان نے اسی گونج دار آواز میں اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لئے دوبارہ مجھے سر کہنے کی جرأت نہیں کرنا۔''

وجدان نے بے اختیار شکر اختیار کیا کہ ان کی دعا قبول نہ ہوئی ورنہ وہ شایان کے چہرے پر روشنی بکھیرتے لفظوں کو کیسے سن پاتے؟ تانیہ کا سانس بھی بحال ہو چکا تھا اور نورالہدیٰ کی جان میں بھی جان لوٹ آئی تھی۔ شایان ان کی بات سن کر مسکراتا ہوا بولا۔

''تو کیا میں آپ کو نانا جان کہوں؟''

''تم مجھے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہو؟'' وہ پوچھ رہے تھے۔ شایان کندھے اچکا کر بولا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' پھر کہا۔ ''کیا میں آپ کے گلے لگ سکتا ہوں؟''

اور انہوں نے مسکرا کر شایان کو گلے لگا لیا۔ اس نے ملیحہ کی کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا، پھر بھی بابا جان کو ایک پل کے لئے یوں لگا کہ انہوں نے ملیحہ کو گلے لگایا ہو۔

''میرا بہت دل چاہتا تھا کہ آپ سے ملوں مگر ڈر بھی لگتا کہیں آپ ملنے سے انکار نہ کر دیں۔ نانا جان! آپ کا کبھی دل نہیں چاہا کہ آ کر مجھ سے ملتے؟'' وہ ان سے لپٹا ہوا کہہ رہا تھا۔ بابا جان خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولے۔

''جو ہونا چاہیے تھا اور جو نہ ہوا، اسے جانے دو۔ یوں بھی وقت گزر جانے کے بعد ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ملال کرنے سے کب گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا ہے؟ چلیں چھوڑیں ان باتوں کو۔ میں پہلی بار آپ سے مل رہا ہوں۔ اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ آیئے!'' وہ انہیں لے کر صوفے کی طرف بڑھا۔ وجدان بھی انہونی کو ہوتا دیکھ کر حیرانی سے نورالہدیٰ کے ساتھ جا بیٹھا۔ دونوں کے بیچ کوئی بات نہیں ہوئی مگر نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔ بیٹھنے کے بعد شایان بولا۔

''میں جانتا ہوں نانا جان! کہ آپ امی سے بہت ناراض ہیں۔ اسی لئے کبھی مجھ سے اور ابو سے نہیں ملے۔ لیکن اگر آج میں امی کی طرف سے آپ سے معافی مانگوں تو بھی کیا آپ کی ناراضی ختم نہ ہوگی؟''

بابا جان اس کی بات سن کر بولے۔

''میں ملیحہ سے ناراض نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے وجدان سے کوئی شکایت ہے۔''

وجدان نے فوراً نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ وجدان کے دیکھنے پر نظر جھکاتے ہوئے بولے۔

''مجھے نورالہدیٰ کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ یہ اپنی بیٹی سے اتنا قریب ہے کہ وہ اپنے دل کی ہر بات نورالہدیٰ سے بے جھجک کہہ دیتی ہے۔ اور نورالہدیٰ بھی اس کے دل کی بات سنتا ہے اور اس کی خوشی کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ جیسے وجدان نے تمہاری خوشیوں کے آگے کوئی حد نہیں رکھی اور صرف تمہاری خاطر یہاں تک چلا آیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر اظہر فاروقی نے نورالہدیٰ سے باپ بننا نہ سیکھ لیا ہوتا تو آج وجدان مصطفیٰ، قصرِ فاروقی میں اپنی زندگی کی آخری بازی بھی ہار جاتا۔ یہ دونوں دنیا کے سب سے اچھے باپ ہیں اور ملیحہ دنیا کی سب سے اچھی بیٹی...... اور مجھے یقین ہے اگر اس کی آغوش میں تم ہوتے تو وہ سب سے اچھی ماں ہوتی۔'' وہ چپ ہو گئے تھے۔ پھر ان کے برابر بیٹھے شایان نے عجیب سی حرکت کی۔ وہ اپنی جگہ سے کھسک کر کارپٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا پھر ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر سر اٹھا کے انہیں دیکھتے ہوئے پکارا۔

''نانا جان!'' اس کا انداز ملیحہ کی عادت سے اس قدر مشابہہ تھا کہ بابا جان کے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ ان کی آنکھوں میں نمی اُمڈتے دیکھ کر شایان نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیا نانا جان؟'' وہ قصداً مسکرا کر بولے۔ ''تم نے اس طرح پکارا کہ ملیحہ یاد آ گئی۔ وہ مجھے اسی طرح پکارا کرتی تھی۔'' پھر اسے آزردہ ہوتے دیکھ کر فوراً خود کو سنبھال کر بولے۔ ''کہو، کیا کہہ رہے تھے؟''

اور وہ نیچی آواز میں بولا۔ ''میں کبھی امی کی قبر پر نہیں گیا نانا جان! آپ مجھے وہاں لے جائیں گے؟''

''تم نے کبھی وجدان سے نہیں کہا؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہے تھے۔ شایان بتانے لگا۔

''ہر سال 21 دسمبر کو ابو، امی کے لئے قرآن خوانی کا اہتمام کر کے ان کے نام کی فاتحہ پڑھواتے ہیں۔ پھر میری سالگرہ کا کیک کٹتا ہے اور مجھ سے کہتے ہیں جو دل چاہے وہ تحفہ مانگ لو۔ اور میں ہر سال ان سے کہتا ہوں، مجھے امی کی قبر پر لے جائیں لیکن ابو کہتے ہیں کہ انہیں امی کی قبر کی جگہ یاد نہیں۔''

بابا جان اُس کی بات سن کر وجدان کو دیکھنے لگے جو نظر چرا گئے تھے۔ نورالہدیٰ نے بھی ٹھٹک کر انہیں دیکھا تھا اور بولے۔

''وجدان جھوٹ بولتا ہے۔ وہ اپنے گھر کا پتہ بھول جائے گا لیکن ملیحہ کی قبر کا نشان نہیں بھول سکتا۔''

''لیکن وہ جھوٹ کیوں کہیں گے؟'' شایان نے اچنبھے سے کہا۔ نورالہدیٰ بولے۔

''کیونکہ جسے زندگی سے زیادہ چاہا ہو، اس کی قبر پر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھانا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔''

ان کی بات سن کر شایان بولا۔ ''پھر تو آپ بھی امی کی قبر پر نہیں جاتے ہوں گے۔ کیونکہ آپ کو بھی تو امی سے بہت محبت ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جس دن سے ملیحہ کو دفنا کر آیا ہوں، دوبارہ وہاں جانے کی ہمت نہیں کر سکا۔'' نورالہدیٰ کی آواز ست ہو گئی تھی۔ ان کی بات سن کر مریم کے دل میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ وہ آہستگی سے اُٹھیں اور وہاں سے چلی گئیں۔ اور تو کسی نے محسوس بھی نہیں کیا تھا مگر تانیہ نے انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر دکھ سے سوچا تھا۔

'کچھ درد شاید ہمیشہ زندگی کے ساتھ رہیں گے۔' جبکہ شایان، بابا جان سے کہہ رہا تھا۔

''آپ بھی امی کی قبر پر نہیں جاتے؟''

''نہیں۔'' وہ بولے۔ ''لیکن صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہاں جا کر تکلیف ہو گی۔ بلکہ اس لئے بھی کہ میں ملیحہ سے شرمندہ تھا اور اپنی پیشانی سے ندامت کے داغ کو دھوئے بغیر میں اس کی قبر پر کیسے جاتا؟ میری بیٹی کو خود سے زیادہ دوسروں کی خوشیاں عزیز تھیں۔ اسے دوسروں کا دکھ بھی اپنے دکھ سے بڑا لگتا تھا، اس لئے میں سوچتا اگر نورالہدیٰ نے مجھے ملیحہ کی موت کے لئے معاف کر دیا تو وہ بھی مجھے معاف کر دے گی۔ مگر آج جب نورالہدیٰ مجھے معاف کر چکا ہے، پھر بھی لگتا ہے جیسے ملیحہ ابھی تک مجھ سے ناراض ہے، دل پر رکھا بوجھ ہلکا تو ہوا ہے ابھی اُترا نہیں ہے...... مگر اب سمجھ آ رہا ہے کہ وہ بوجھ وجدان کے نام کا ہے اور اس کے معاف کر دینے کے بعد ہی دل سے ہٹے گا۔''

''کس چیز کے لئے معافی کی بات کر رہے ہیں بابا جان؟'' وجدان نے ان کی بات سنی تو حیرت سے چونک کر بولے۔ بابا جان نے ان کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"کیوں، کیا تم مجھے قصوروار نہیں سمجھتے؟ اگر میں تمہیں قبول کر لیتا تو ملیحہ کیوں مرتی؟...... ملیحہ کی موت کے لئے، تمہاری بربادی کے لئے میں ہی ذمہ دار ہوں۔ میرے ہی فیصلے نے تین زندگیوں کو عذاب میں ڈالا تھا۔"

"نہیں بابا جان! میں آپ کو قصوروار نہیں سمجھتا۔" وجدان پُرسکون انداز میں کہہ رہے تھے۔ "اور نہ آپ کا فیصلہ غلط تھا۔ اگر آج بھی مجھے ملیحہ کے لئے کسی شخص کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو میں سب سے پہلے ہادی بھائی کا نام لوں گا۔ کیونکہ ان سے زیادہ کوئی شخص ملیحہ کو خوش نہیں رکھ سکتا...... میں بھی نہیں۔" نورالہدیٰ نے حیران ہو کر خود سے ایک فٹ دور بیٹھے شخص کو دیکھا جو بابا جان کو بھی حیرت میں مبتلا کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"پھر آپ کا فیصلہ غلط کیسے ہوا؟ غلطی تو وقت میں تھی جو کسی کے اختیار میں نہیں۔ اور بابا جان! اب خود کو یا کسی دوسرے کو الزم دے کر کیا حاصل ہو گا؟ جو ہوا، برا ہوا۔ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مگر مشیت ایزدی یہی تھی۔ ملیحہ اتنی ہی عمر لکھا کر لائی تھیں جو انہوں نے گزار لی۔ بیس سال واقعی بہت کم ہیں مگر اب ان میں اضافہ ممکن نہیں۔ اور جس دن سے میں نے یہ جانا کہ ان کی موت نے مجھے جو سکھایا، ان کی زندگی نہیں سکھا سکتی تھی، میرے دل سے ان کے جانے کا گلہ مٹ گیا۔ بس افسوس ہی باقی ہے۔ اور جس دن جان گئی، وہ بھی چلا جائے گا۔" ان کی باتوں نے بابا جان کو ٹرانس میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ خواب جیسے عالم میں بولے۔

"ستائیس سال تک میں حیران رہا کہ ملیحہ نے تم سے محبت کیوں کی؟ اور اتنی محبت کہ مر ہی گئی۔ لیکن آج مجھے اس سوال کا جواب مل گیا ہے۔ آج مجھے تم میں وہ نظر آ رہا ہے جو ملیحہ نے تم میں دیکھا تھا۔ آج سمجھ آیا، کیوں ملیحہ کو یقین تھا کہ اگر میں ایک بار تم سے مل لوں گا تو اس کے انتخاب کو قبول کر لوں گا۔ وہ میری منتیں کرتی رہی کہ وجدان بہت اچھا ہے بابا! آپ اس سے ملیں گے تو آپ کو بھی اچھا لگے گا۔ وہ پورا دن تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی رہی کہ بس ایک بار تمہیں میرے سامنے لے آئے۔ تم اسے کیوں نہیں ملے وجدان؟" وہ سسکنے لگے۔ "ملیحہ کا یقین سچا تھا۔ میں اگر تم سے مل لیتا تو واقعی انکار نہ کر پاتا۔ کاش تم اسے مل گئے ہوتے۔" وہ رُکے اور اپنی آواز کی لرزش کو قابو کر کے بولے۔

"آج اگر مجھے ملیحہ کے لئے کسی شخص کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو میں سب سے پہلے تمہارا نام لوں گا۔ کیونکہ ملیحہ کی خوشی صرف تمہارے ساتھ میں تھی۔ اور میری بیٹی کا انتخاب، میرے انتخاب سے بہتر ہے۔" ان لفظوں میں وہ جادو تھا کہ وجدان کو لگا ان کی محبت، احترام پا گئی ہے۔ برسوں کی رائیگانی کا صلہ ایک پل میں مل گیا تھا۔ بابا جان کہہ رہے تھے۔

"مجھے یہ اعتراف کرنے میں بہت دیر ہو گئی ہے، پھر بھی یہ میری بیٹی کی خواہش تھی کہ میں تمہیں اپنا لوں۔ مگر میں اس کی زندگی میں یہ خواہش پوری نہیں کر سکا۔ لیکن آج میں ملیحہ کی خواہش کو پورا کر دینا چاہتا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور گم سم بیٹھے وجدان کے پاس چلے آئے۔ انہیں بازوؤں سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کیا

اور گلے لگالیا۔ انہیں گلے لگاتے ہی ان کے سینے پر سے تمام بوجھ اُتر گیا تھا اور انہیں ایسا لگا کہ کہیں بہت پاس ان کی بیٹی انہیں دیکھ کر مسکرائی تھی۔

''کاش....'' نم آنکھوں کے ساتھ وجدان کو سینے سے لگائے ان کے ذہن میں اسی لفظ کی تکرار ہو رہی تھی۔

❁❁❁

شام ڈھلنے کو تھی۔ قبرستان کی خاموش فضا میں ہوا کے جھونکے دبی دبی سرگوشیوں کا شور پیدا کرتے خشک پتوں کو اُڑائے چلے جا رہے تھے جب سب لوگوں کا یہ قافلہ اس قبر کے پاس چلتا ہوا آ پہنچا جو برسوں سے تنہا تھی۔ سفید سنگ مرمر کی قبر کے اوپری حصے پر مدفن کی مٹی نظر آ رہی تھی اور کتبے پر سیاہ روشنائی سے لکھا تھا۔

ملیحہ فاروقی بنت اظہر فاروقی

تاریخ پیدائش: 15 ستمبر 1960ء

تاریخ وفات: 21 دسمبر 1981ء

بابا جان کی نظر کتبے کی تحریر پر پڑی اور ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ مگر ان کے دائیں بائیں موجود نورالہدیٰ اور وجدان نے فوراً انہیں سنبھال لیا۔ جان تو شایان کے پیروں میں بھی نہ رہی تھی۔ وہ بے دم سا ہو کر قبر کی پائینتی کے پاس بیٹھ گیا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ بس اتنا پتہ تھا کہ اپنے دل پر قیامت بیت رہی ہے۔

تانیہ نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ دعا مانگ کر اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سامنے دیکھا۔ بابا جان کے دائیں جانب نورالہدیٰ اور بائیں جانب وجدان کھڑے تھے اور تینوں کے ہاتھ فاتحہ کے لئے اُٹھے ہوئے تھے۔ وہ تین لوگ جنہیں ملیحہ نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا......وہ تین لوگ جن میں سے کوئی ایک بھی اگر کم ہو جاتا تو ملیحہ جی نہیں پاتی......جی نہ پائی......وہ تین لوگ جن کے بارے میں ملیحہ کو یقین تھا کہ کبھی ایک ساتھ کھڑے نہ ہو پائیں گے۔ مگر انہیں ایک ساتھ کھڑے دیکھنے کی خواہش اس نے پوری شدت سے کی تھی۔ آج......ملیحہ کے مرنے کے ستائیس سال بعد وہ تین لوگ ایک ساتھ کھڑے تھے......کیا یہ معجزہ نہیں تھا؟......مگر یہ معجزہ اس وقت رونما ہو رہا تھا جب اسے دیکھنے کی منتظر آنکھیں مدتوں پہلے تھک کر سو چکی تھیں۔ تانیہ کا جی چاہا وہ قبر میں سو رہی ملیحہ کو جھنجوڑ کر اٹھا دے اور کہے۔

''ذرا آنکھیں کھول کر اس منظر کو تو دیکھ لو جسے دیکھنے کی حسرت میں تم دنیا سے اُٹھ گئیں......ستائیس برس کا ہی تو انتظار تھا۔ کاش کر لیا ہوتا......تم تو بے کار میں مر گئیں۔''

ایک آنسو، تانیہ کی آنکھ سے ٹپک گیا تھا۔ اسے اپنی پوروں میں جذب کرتے ہوئے اس نے شایان کو دیکھا جس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے اور قبر کی مٹی کو مٹھی میں جکڑے اس کی آنکھوں کی نمی بے خیالی میں ہی اس کے چہرے کو بھگوتی جا رہی تھی۔ تانیہ چلتے ہوئے اس کے پاس آئی اور نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ

دیئے۔ یہ سہارا اسے مضبوط کرنے کی بجائے کمزور کر گیا اور وہ بھرائی آواز میں بولا۔

''میرا دل چاہ رہا ہے، میں مٹی کی اس دیوار کو ہٹا کر قبر میں اُتر جاؤں۔ بے شک امی مجھے گلے نہ لگا سکیں گی مگر میں ان کا چہرہ تو دیکھ لوں گا۔''

''ایسی باتیں نہ کرو'' تانیہ نے اسے ٹوکا مگر وہ پھر بھی بولتا رہا۔

''تانیہ! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرا آدھا وجود قبر میں دفن ہو چکا ہے۔ یہ قبریں اتنی تاریک اور گھٹن زدہ کیوں ہوتی ہیں؟''

'وہ عورت بدنصیب ہے شایان! جس نے تمہیں پیدا کیا اور پھر خود کو تم سے محروم کر دیا۔ مگر یہ قبر والی خوش نصیب ہے جس نے تمہیں پیدا نہیں کیا، پھر بھی حشر کے دن تم اس کے نام سے پکارے جاؤ گے۔'

قبرستان، زندوں کی سرائے اور مُردوں کا ٹھکانہ ہے۔ یہاں وہی ٹھہرتا ہے جو کندھوں پر آئے۔ پیروں سے چل کر آنے والوں کو واپس جانا ہی ہوتا ہے۔ وہ سات لوگ بھی واپس جا رہے تھے۔ شام سرمئی ہو گئی تھی۔ کہیں سے ایک سفید کبوتر اُڑتا ہوا آیا اور مٹی کے پیالے سے گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔ قبر کے کتبے کے پاس رکھے دیے کی لو تیز ہوا سے پھڑ پھڑائی پھر بجھنے کے بجائے اور تیز ہو کر جلنے لگی۔ پاگلوں کی طرح چلتی ہوا کے ساتھ ایک دبی دبی سرگوشی، ایک تھکن بھری آواز اس ویرانے میں پھیل گئی۔

''وہ چیز جو میں زندگی میں کبھی نہیں سیکھ پائی، محبتوں کو کیٹگرائز کرنا ہے۔ میں کبھی جان نہیں پائی کہ کیسے کسی محبت کو سب سے اوپر والے خانے میں رکھتے ہیں اور کسی دوسری محبت کو نیچے والے خانے میں۔ مجھے تو بس محبت کرنا آتا تھا اور وہی میں نے کی۔'' ہوا نے رُک کر اس سوگ بھری آواز کو سنا، پھر سر جھٹک کر اپنی راہ ہو لی۔

'کیا کبھی ایسا ہو گا کہ میں گھر لوٹوں اور تمہاری یاد میری منتظر نہ ہو؟' ہر روز کی طرح آج بھی خالی صوفہ ان کے اندر کے خالی پن کو بڑھا گیا۔

'ایک تم جو نہیں ہو تو لگتا ہے کچھ نہیں ہے...... کہیں سے آ جاؤ ملیحہ! تمہیں دیکھے ہوئے مدت گزر گئی۔ مگر تم کہاں سے آؤ گی؟' انہوں نے ہمیشہ کی طرح اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے ہر روز کی جانے والی خواہش کی تھی اور روز کی طرح ہی اپنی خواہش کا گلا خود ہی گھونٹ ڈالا تھا۔

'سنا تھا لوگ پیار میں مر جاتے ہیں۔ پر کبھی کسی کو مرتے نہیں دیکھا تھا۔ تم مر گئیں تو یقین آ گیا اور اُمید بھی بندھ گئی کہ ایک دن میں بھی تم سے محبت کرتے کرتے مر جاؤں گا۔ مگر تمہارے بغیر جینے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ موت نہیں آتی۔ ویسے تمہیں نہیں لگتا کہ میری عادتیں کافی بگڑ گئی ہیں۔'

آنکھوں میں اس کا عکس لئے وہ خالی صوفے کی طرف دیکھتے ہوئے پُرتشویش انداز میں سوال کر رہے تھے۔

'مگر عادتیں تو تمہاری بھی خراب ہو گئی ہیں...... میں اکیلا بولتا جا رہا ہوں اور تم جواب نہیں دیتیں۔ بری عادت ہے یہ۔' وہ خفگی سے کہہ رہے تھے۔

''کھانا لگادوں صاب؟'' بہادر پاس آ کر بولا تھا۔ نورالہدیٰ نے اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلایا اور انٹرنس کا دروازہ بند کرتے خالی صوفے سے نظر بچا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

نورالہدیٰ دروازہ کھول کر اپنے بیڈروم میں آئے تو کمرے میں اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے انہوں نے اندازے سے سوئچ بورڈ ٹٹول کر لائٹ جلا دی۔ وہ پلٹے تو دیکھا، مریم دونوں پاؤں اٹھا کر بیڈ کے کنارے گھٹنوں میں چہرہ چھپائے اپنے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں سنی تھی اس لئے کمرے میں روشنی بکھرتے ہی انہوں نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

''تم نے کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟'' نورالہدیٰ حیرت سے بولے، پھر ٹھٹک گئے۔

''تم رو رہی ہو؟'' بات حیرانی کی ہی تھی۔ ازدواجی زندگی کے پچیس سالوں میں نورالہدیٰ نے کبھی انہیں روتے نہیں دیکھا۔ مگر آج اس وقت ان کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کئی گھنٹوں سے لگاتار رو رہی تھیں۔ چہرے کے تیکھے نقوش ملاحت میں ڈوبے تھے۔ آنسوؤں سے دھل کر ان کے چہرے کی چاندنی نکھر آئی تھی۔ مستقل رونے سے ان کی آنکھیں اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ انہوں نے بس ایک پل کے لئے سر اٹھا کر نورالہدیٰ کو دیکھا تھا پھر دوبارہ سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور بے آواز رونے لگیں۔ نورالہدیٰ کو انہیں روتے ہوئے دیکھ کر تکلیف ہوئی تھی۔ وہ پاس بیٹھ کر ان کے بال سہلاتے ہوئے نرمی سے بولے۔

''تم رو کیوں رہی ہو؟''

انہوں نے سر اٹھائے بغیر چہرہ موڑ کر انہیں دیکھا۔ ان کی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر نورالہدیٰ کے اندر بے چینی بڑھ گئی تھی۔ ان کے سر پر رکھے ہاتھ کو ان کے چہرے تک لا کر انگوٹھے سے ان کے گال سے نمی سمیٹتے ہوئے بولے۔

''پچیس سال میں آج پہلی بار تمہیں روتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور تم مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہیں۔ تم بس لڑتی جھگڑتی ہی اچھی لگتی ہو۔ اگر مجھ سے شکایت ہے تو کہو۔ بلکہ ایسا کرو، جھگڑا ہی کر لو۔ مگر یوں رو کر میری عمر بھر کی محبت برباد نہ کرو۔''

''تم نے ملیحہ سے محبت کیوں کی؟'' ہمیشہ ہی یہ شکایت کرتے ہوئے مریم آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتیں۔ مگر آج واقعی کچھ ہوا تھا جو وہ یوں ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے شکوہ کر رہی تھیں۔ نورالہدیٰ اپنا ہاتھ ان کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے نیچی آواز میں بولے۔

''کی کب تھی؟ ہو گئی تھی۔''

''مجھ سے محبت کیوں نہیں ہوئی؟'' انداز روٹھا روٹھا سا تھا۔ نورالہدیٰ بے ساختہ مسکرائے۔

''کون کہتا ہے، میں تم سے محبت نہیں کرتا؟''

وہ تھکن بھری آواز میں بولیں۔ ''محبت کرنے میں اور محبت ہو جانے میں فرق ہے۔ یہ معاملہ اختیار اور بے

اختیاری کا ہے۔ مجھ سے محبت کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔ مگر ملیحہ کو نہ چاہنا تمہارے اختیار میں نہیں۔"

نورالہدیٰ عاجز آ کر بولے۔ "تم میری بیوی ہو مریم!...... میرے بچوں کی ماں ہو۔ ملیحہ میری کچھ نہیں تھی۔ صرف محبت ہی اس سے کی تھی، کبھی اسے پانے کی آرزو نہیں کی۔ مگر تمہیں پانا چاہا تھا اور پالیا۔"

وہ حسرت سے بولیں۔ "کاش! میں تمہاری بیوی نہ ہوتی، تمہارے بچوں کی ماں نہ ہوتی۔ کاش تم مجھے پانے کی خواہش ہی نہ کرتے، بس مجھ سے محبت کرتے..... ویسی محبت جیسی تمہیں ملیحہ سے ہے۔"

وہ آواز میں بے چارگی سمو کر بولے۔ "تم کیوں اپنا مقابلہ ملیحہ سے کرتی ہو؟ کیوں تمہیں یقین نہیں آتا کہ میرے دل میں ہر طرف تم ہی ہو۔ بس ایک کونہ ایسا ہے جہاں ملیحہ رہتی ہے۔ مگر میرے دل میں حکم صرف تمہارا چلتا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ ملیحہ بھی نہیں۔" ان کی آواز کا سچ ان کی آنکھوں سے بھی جھلک رہا تھا جس نے مریم کو اور بھی آزردہ کر دیا۔

"وہ میری جگہ لے گی بھی کیوں؟ جبکہ اس کی جگہ میری جگہ سے اچھی ہے۔"

"تم میری بیوی ہو مریم!" نورالہدیٰ نے انہیں احساس کرانا چاہا مگر وہ ان کی بات کاٹ کر بولیں۔

"مجھے خود سے اپنے رشتے نہ گنواؤ نورالہدیٰ!" پھر اچانک ہی ان کے ہاتھ تھام کر منت کرنے لگیں۔ "میرا ایک کام کرو گے؟ اپنے سارے رشتے، ملیحہ کو دے دو۔ اسے چاہو...... ہر سانس کے ساتھ اس کی آرزو کرو۔ اپنے دل کی حکمرانی کا تاج میرے سر سے اُتار کر ملیحہ کے سر پر رکھ دو اور بدلے میں مجھے وہ کونا دے دو، جو تم نے ملیحہ کے نام کر رکھا ہے۔" ان کا وہ جنون اور دیوانگی..... نورالہدیٰ بوکھلا گئے۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے مریم؟"

مگر انہوں نے سنا ہی نہیں۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے کہتی جا رہی تھیں۔

"مجھے تمہارا دل نہیں چاہئے۔ بس مجھے وہ کونا دے دو۔ تمہیں ملیحہ کی قسم ہے، مجھے تہی دامن کر دو۔ مجھے اپنے گھر سے، اپنی زندگی سے نکال دو، بس وہ کونا مجھے دے دو۔ مجھے تمہارا دل نہیں چاہئے، مجھے تمہارے دل کا وہ کونا چاہئے جہاں ملیحہ کے سوا کسی کی دسترس نہیں۔"

"ہوش میں آؤ مریم!" نورالہدیٰ نے انہیں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تو وہ چپ ہو کر انہیں دیکھنے لگیں۔ پھر اپنے شانوں سے ان کے ہاتھ ہٹا کر دور جا بیٹھیں اور دکھ سے بولیں۔

"میں جانتی ہوں، تم کبھی ایسا نہیں کرو گے۔ وہ کونا ہی تو تمہارے دل کی کائنات ہے۔ تم کیسے ملیحہ کو اپنی کائنات سے بے دخل کر سکتے ہو؟"

نورالہدیٰ بہت پیار سے ان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر کر بولے۔

"میری کائنات تمہارے بغیر ادھوری ہے۔"

وہ اُداس مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

''تم خود نہیں جانتے نورالہدیٰ! کہ تم نے جو کونا ملیحہ کے نام کیا تھا، وہ تمہارے دل کی چوکھٹ ہے جس پر پاؤں رکھنے کی مجھے اجازت نہیں..... میں اندر کیسے آؤں؟'' وہ روہانسی ہو گئیں تو نورالہدیٰ مضبوط آواز میں بولے۔

''تم میرے دل میں ہو مریم!...... میں نے تمہیں محسوس کیا ہے۔ تمہیں کیوں محسوس نہیں ہوتا؟''

''کاش تم نے مجھے اس طرح چاہا ہوتا جیسے ملیحہ کو چاہا ہے۔ حسرتیں ہیں کہ تمام نہیں ہوتیں۔''

نورالہدیٰ تھک کر بولے۔ ''یہ جھگڑا پھر کسی دن کر لینا۔ آج میں بہت اُداس ہوں۔ آج ایسا کرو کہ میری اُداسی سمیٹ لو۔ وہاں ملیحہ کے کمرے میں ہر چیز میری تکلیف کو بڑھاتی ہے مگر تمہاری تکلیف نہ بڑھے اس لئے کبھی تمہارے پاس اپنے درد لے کر نہیں آیا۔ لیکن آج اکیلے نہیں رو پاؤں گا۔ ملیحہ یاد آئے تو بکھرنا لازم ہے لیکن آج مٹ جانے کا ڈر ہے۔ تم پاس ہوئیں تو سنبھال لو گی۔''

''مجھے حیرت ہوتی ہے نورالہدیٰ! ملیحہ کو مرے ہوئے ستائیس سال ہو گئے اور تم آج بھی اس سے محبت کرتے ہو۔'' وہ سچ مچ حیران تھیں۔

''تمہاری حیرت میرا دکھ ہے مریم! میں جس سے محبت کرتا ہوں، وہ لڑکی ستائیس سال پہلے مر چکی ہے۔'' نورالہدیٰ یہ کہہ کر رو پڑے۔ ان کی آواز میں وہ درد تھا کہ مریم بھی کانپ گئیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''کوئی چیز اس اذیت کی برابری نہیں کر سکتی۔ مگر تم اس درد کو اس وقت سمجھو گی، جب میں مر جاؤں گا۔''

صرف یہ سن کر ہی مریم کی روح فنا ہو گئی۔ انہوں نے تڑپ کر اپنا ہاتھ نورالہدیٰ کے ہونٹوں پر رکھ دیا اور وہ ان کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے ہٹا کر مریم کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئے۔ مریم ساکت نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ مریم کا ہاتھ نورالہدیٰ کے سینے پر ان کے ہاتھ کے نیچے دبا تھا اور ان کی بند آنکھوں کے کونوں سے گرم سیال بہہ کر مریم کے کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا۔ آج انہیں ملیحہ کو یاد کرتے دیکھ کر ملیحہ کو اعتراض نہ ہوا کیونکہ آج وہ صرف ان کے دکھ کو محسوس کر رہی تھیں۔ ان کا دل گداز ہونے لگا۔ وہ انہیں پُرسکون کرنے کے لئے دھیرے دھیرے ان کے بالوں میں اُنگلیاں چلانے لگیں اور نورالہدیٰ نے ستائیس سال بعد اپنی رگوں میں سکون اُترتا محسوس کیا تھا۔

''ہم بہت اچھی زندگی گزار سکتے تھے مریم!'' نورالہدیٰ نے بند آنکھوں سے کہا اور ان کی آواز میں وہ افسوس تھا کہ ان کے بالوں میں گردش کرتا مریم کا ہاتھ لرز گیا۔

❀❀❀

لان میں دھوپ کھلی ہوئی تھی مگر ہلکی ہلکی خنکی میں یہ دھوپ خوشگوار لگ رہی تھی۔ راڈ کی ڈبل سیٹر چیئر پر تانیہ، وجدان کے بازو سے لگی بیٹھی تھی۔ وجدان کے ہاتھ میں اخبار تھا اور تانیہ خبروں پر بے تکے تبصرے کرتے مستقل انہیں ہنسا رہی تھی کہ شایان نے ٹیرس پر آ کر اسے آواز دی۔ مگر وہ اتنی مگن تھی کہ سنا ہی نہیں۔ وجدان

نے اخبار رول کر کے اس کے سر پر ہلکے سے مارا، پھر ٹیرس کی طرف اشارہ کر کے بولے۔
''شوہر کی تو سن لو۔''
تانیہ نے ٹیرس کی طرف دیکھا تو شایان نے وہیں سے آواز لگائی۔ ''میرے یونیفارم کے بیجز نہیں مل رہے۔ آ کر دیکھو۔''
''آتی ہوں۔'' تانیہ نے اونچی آواز میں کہا تو وہ اندر پلٹ گیا۔ تانیہ جھنجلا کر بڑبڑائی۔ ''اچھی مصیبت ہے۔ چھٹی کے دن بھی یہ آدمی مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ جب دیکھو تانیہ تانیہ کی آوازیں لگاتا ہے۔'' اس بے زاری میں جو ناز چھپا تھا، وجدان اسے محسوس کر کے مسکرائے تو وہ اُن پر چڑھ دوڑی۔
''یہ غلط بات ہے ابو! آپ کا بیٹا مجھے پریشان کرتا ہے تو آپ اسے ڈانٹنے کے بجائے ہنستے ہیں۔''
''میں نے کیا، کیا ہے؟'' وہ فوراً ہنسی ضبط کر کے معصومیت سے بولے تو تانیہ چڑ کر بولی۔
''ساری غلطی ہی آپ کی ہے۔ لاڈ پیار کر کے صاحبزادے کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اوپر سے دادا جان نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ مگر آپ لوگوں کا کیا بھگتنا تو مجھے ہے۔'' وہ خفگی سے کہہ کر اُٹھی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔
''یار! میرے بیجز نہیں مل رہے۔ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔'' شایان نے اسے دیکھتے ہی دہائی دی۔ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آئی اور ڈراز کھینچ کر باہر نکال لیا۔ شایان نے آگے ہو کر دیکھا، اس میں اس کے سارے بیجز موجود تھے۔
''بس یہیں پر نہیں دیکھا۔'' وہ گدی سہلانے لگا۔ تانیہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔
''صاف کیوں نہیں کہتے، میں پاس نہ دِکھوں تو چین نہیں پڑتا؟''
''جب جانتی ہو تو خود ہی میرے پاس آ جایا کرو۔'' اُس کی ڈھٹائی پر تانیہ گھور کر بولی۔
''شرم تو نہیں آتی اس حالت میں مجھ سے اوپر نیچے کے چکر لگواتے ہو۔''
''کس حالت میں؟'' اس نے محظوظ ہو کر پوچھا۔ تانیہ بری طرح شرما گئی اور جھینپ مٹانے کو بولی۔
''اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ جاؤ جا کر تیار ہو۔ میں ناشتے کا کہتی ہوں۔''
''ارے بھئی ناشتے کا ٹائم نہیں ہے۔ ڈی آئی جی آپریشن نے فوراً میٹنگ کے لئے بلایا ہے۔'' وہ یونیفارم اٹھا کر عجلت میں باتھ روم کی طرف بڑھا تو تانیہ بولی۔
''اتنی جلدی ہوتی ہے تو وقت پر کیوں نہیں اُٹھتے؟ فجر کی نماز بھی بند آنکھوں سے پڑھتے ہو۔ دیر تک سونے کی عادت تو نہ ابو میں ہے نہ امی میں تھی۔ پتہ نہیں، تم میں کہاں سے آ گئی؟''
وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔ ''تمہیں امی کی عادتوں کا کیا پتہ؟''
''ان کے بارے میں، میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔'' وہ اِٹھلائی۔

''کیا جانتی ہو؟'' وہ تو بحث کے موڈ میں آ گیا۔ تانیہ بولی۔

''بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی تمہارا ناشتہ تیار کرلوں۔''

''میں ناشتہ نہیں کروں گا۔'' وہ باتھ روم کی طرف جاتا ہوا بولا۔

''جتنی دیر یہ بحث کرنی ہے، دو سینڈوچ آرام سے کھائے جا سکتے ہیں۔ اور جوس تو میں نے صبح ہی بنا کر فریج میں رکھ دیا تھا۔''

اس کی بات کے جواب میں ٹھک سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ وہ منہ بناتی کچن میں آ گئی۔ اور جب وہ سینڈوچ کی پلیٹ اور جوس کا گلاس لے کر کمرے میں آئی تو شایان ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا یونیفارم کی شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا، میں ناشتہ نہیں کروں گا۔'' شایان نے اسے گلاس اور پلیٹ ٹیبل پر رکھتے دیکھ کر کہا۔

''اور میں نے بھی ہزار بار تم سے کہا ہے کہ مجھے تمہارا خالی پیٹ گھر سے جانا پسند نہیں۔'' یہ کہہ کر تانیہ نے سینڈوچ اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس کے بٹن بند ہونے تک سینڈوچ ختم ہو چکا تھا۔ تانیہ نے دوسرا سینڈوچ اس کے ہاتھ میں دیا اور خود اسے بٹھا کر اس کے بال بنانے لگی۔ وہ بال بنا کر فارغ ہوئی تو شایان آخری نوالہ منہ میں رکھ کر جوس کا گلاس اٹھا چکا تھا۔ اس نے ایک سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

''اب اجازت ہے؟'' شایان نے گلاس ٹیبل پر رکھ کر پوچھا۔ تانیہ نے اسٹک اور کیپ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

''جاؤ۔'' وہ اسے باہر تک چھوڑنے گئی تو ساتھ ساتھ کہتی رہی۔ ''اس سے تو اچھا تھا شایان! تم سکھر میں ہی رہتے۔ ہفتے میں ایک دن آتے تھے، پر وہ پورا دن گھر میں گزرتا تھا۔ اب جب سے کراچی ٹرانسفر ہوا ہے، سارا دن آفس میں رہتے ہو۔ گھر تو بس سونے کے لئے آتے ہو۔ مجھے کمپنی دینے کے لئے تمہارے پاس ذرا وقت نہیں ہے۔''

''کیا کریں جانِ من! نوکری ہی ایسی ہے۔'' وہ جیپ کا دروازہ کھول کر اس کی طرف مڑ تا ترنگ میں بولا۔

''بدتمیز۔'' تانیہ نے گھورا۔ وہ ہنسا۔ پھر نرمی سے بولا۔

''بس تین چار مہینے اور انتظار کرلو، پھر تمہیں کمپنی دینے والا آ جائے گا۔''

وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔ ''وہ تم تو نہیں ہو گے۔''

''اس مسئلے کا تو کوئی حل نہیں ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کندھے اچکا کر کہا پھر لان چیئرز کی طرف منہ کر کے زور سے کہا۔

''اللہ حافظ ابو!''

''اللہ حافظ!'' انہوں نے وہیں سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

پولیس جیپ پورچ سے نکل گئی تو تانیہ، وجدان کے پاس چلی آئی۔

''میرا چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔ آپ پئیں گے؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ؟'' وہ مسکرائے۔ تانیہ ہنس کر بولی۔

''ابھی لائی۔'' اور اندر کی طرف پلٹ گئی۔

وجدان اسے ہی دیکھ رہے تھے کہ ٹیرس پر رنگین آنچل لہراتا ہوا محسوس ہوا۔

'تانیہ تو نیچے ہے، پھر یہ کون؟' انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا اور پتھر کے ہو گئے۔ ملیحہ ٹیرس کی ریلنگ پر آگے کو جھکی ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھے بہت دلچسپی سے انہیں دیکھتے ہوئے دلکشی سے مسکرا رہی تھی۔ اس کے کھلے بال ہوا سے اُڑتے اس کے چہرے پر آ رہے تھے اور آنچل ہوا کے دوش پر لہراتا دھنک بکھیر رہا تھا۔ وہ اس منظر میں کھو کر بولے۔

'اٹھارہ سال بعد......' اور ایک یاسیت ان کے اندر پھیل گئی۔ 'کہا تھا آپ سے، جب تک سانسیں ہیں تب تک جی لینے دیں۔ پھر...... پھر آج کیوں؟' منظر حسین سہی، پر اٹھارہ سال بعد بھی وجدان میں اسے دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

انہیں یقین تھا، اگر وہ یوں ہی اس منظر کو دیکھتے رہے تو ایک بار پھر دیوانے ہو جائیں گے......اور تب نہ جانے کیا واہمہ حقیقت بنا کہ حقیقت واہمہ بن گئی، ملیحہ کو دیکھتے ہوئے وجدان نے اپنا دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر بے قابو ہوتی دھڑکنوں کو سہارا دیا تھا۔ اور اب ان کے ہاتھ کی پشت پر نرم انگلیوں کا لمس جاگا تھا۔ وہ ابھی اس احساس سے سنبھلے نہ تھے کہ ان انگلیوں نے بڑھ کر ان کے ہاتھ پر ملائمت سے گرفت کر لی اور انہیں لگا کہ گداز ہتھیلی سے درد کی گرم سلاخ نکل کر ان کے ہاتھ سے گزرتی دل میں جا کھبی ہے۔ بہت تیز درد تھا۔ وجدان نے تڑپ کر آنکھیں کھولنی چاہیں مگر پلکیں تھرتھرا کر رہ گئیں۔ تبھی کسی نے ان کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ ان کا بایاں پہلو بدن کے لمس سے سنسنا اٹھا تھا۔ وجدان کی دھڑکنیں ڈگمگائیں اور پھر تال سے ہٹ گئیں۔ انہیں محسوس ہوا کہ درد، خون کے ساتھ بہتا ان کے جسم کے بائیں حصے میں مکڑی کے جال کی طرح پھیل گیا ہے۔ درد بہت شدید تھا...... رگوں کو کاٹتا ہوا۔ مگر اس میں عجیب سا نشہ ملا تھا۔ وجدان مدہوش ہونے لگے.....ان کے چہرے پر ریشمی زلفیں لہرائی تھیں جن کی مہک نے ان کے رہے سہے ہوش بھی چھین لیے۔ اپنی گردن پر گرم سانسوں کو محسوس کر کے ان کی سانسیں اُکھڑتی جا رہی تھیں۔ بے قابو دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ اور تیز..... اور تیز...... درد چھانے لگا تھا۔ نشہ بڑھنے لگا...... اور کیف کے لمحے دراز ہوتے چلے گئے۔

ہم نے بھلا کس سے کہا
کرتے رہے ہیں عمر بھر
کس راہ گزر کی جستجو

آنکھوں سے کیوں اوجھل ہوا
منسوب جس کے نام تھی
ہر روشنی، ہر آرزو
تیز تھی موجِ بلا
مرگِ تمنا عام تھی
چپ چاپ ہم کس کے لئے
تھامے رہے جلتے رہے
دیکھو کہ پھر صیقل ہوئے
شہرِ وفا کے آئینے
آتی رُتوں کی آہٹیں
بیتے دنوں کے نقش پا
دیکھو کہ وہ آرام جاں
ہم پر ہوا پھر مہرباں
ہم نے بھلا کس سے کہا۔

''لیجئے ابو! آپ کی چائے۔'' تانیہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بڑے خوشگوار انداز میں وجدان سے کہا تھا۔ پھر ان کی طرف سے جواب نہ پا کر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے ایک ہاتھ سینے پر رکھے بہت پُرسکون نظر آ رہے تھے۔ تانیہ ان کے چہرے پر نظر ڈال کر مسکرائی۔

''ابو!''

مگر اُس کی پکار کا جواب نہیں آیا تو اسے عجیب سا لگا۔

''کیا سو گئے؟'' اُس نے حیرت سے کہا اور پھر سے پکارنے لگی۔ ''ابو! چائے تو پی لیں۔ پھر اندر جا کر سو جائیے گا۔''

وہاں اب بھی خاموشی تھی۔ تانیہ کے اندر بے چینی پھیل گئی۔ اسے یہ سکوت غیر فطری لگنے لگا تھا۔ وہ اُٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔

''ابو!'' آواز دینے کے ساتھ ہی اس نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھا، کہنی سے پکڑ کر ہلایا تو وہ بے جان سے انداز میں پہلو میں جا گرا۔ اُس نے گھبرا کر دو قدم پیچھے کئے اور کچھ سیکنڈ تک بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی۔ پھر اس کے حلق سے فلک شگاف چیخ بلند ہوئی تھی۔

''ابو......!'' اور دوڑ کر وجدان کے بے روح جسم سے لپٹتی اور اُونچی آواز میں رونے لگی۔ ملازم اس کے

بین کی آوازیں سن کر دوڑے چلے آئے مگر انہیں سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وجدان کے چہرے کا سکون اور تانیہ کے گالوں پر بہتے آنسو بتا رہے تھے کہ وجدان راہیٔ ملکِ عدم ہو چکے..... بظاہر یہ اختتام ہے لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی......اس اختتام سے نئی شروعات کی ابتدا ہوگی۔

محبت جسے بخش دے زندگانی
نہیں موت پر ختم اُس کی کہانی

(ختم شد)